بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تیرے پُراسرار بندے

طالب الہاشمی

فہرست مضامین

(یہ تیرے پُراسرار بندے)

تابعین، تبع تابعین اور دوسرے مشاہیر اُمّت

فرمودۂ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

انتساب

حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری، مدظلہ العالی

کے نام

جن کی بے پایاں شفقت اور حوصلہ افزائی نے میرے جذبۂ عمل

کو مہمیز لگائی اور بارگاہِ ربُّ العزّت میں جن کی

پُرسوز دعاؤں کی بدولت

مجھے یہ کتاب تالیف کرنے کی توفیق نصیب ہوئی

ناچیز: طالب الہاشمی

تمہید

بادہ در جوش است و یاراں منتظر
ساقیا! خُذ ما صفا دَعْ ما کدر

اُس ذاتِ بے ہمتا کا کما حقہٗ شکر ادا کرنے سے زبان قاصر ہے جس نے مجھ جیسے ہیچمدان کو یہ کتاب تالیف کرنے کی توفیق نصیب فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے سیرت و سوانح کے موضوع پر میری جو کتابیں شائع ہوئیں، میری توقع سے کہیں بڑھ کر ان کی قدر ہوئی اور اسی بات نے مجھے ولولۂ تازہ عطا کیا ـــــ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے میری تحریر میں تاثیر پیدا کی، اس کو مقبولیت عامہ سے نوازا اور میرے رہوارِ قلم کو مسلسل تیس سال سے سیرت نگاری کی راہ پر گامزن رکھا۔

یہ کتاب اصحابِ صُفّہ رضؓ کے عمومی حالات کے علاوہ ۵۳ صحابۂ کرامؓ، ۱۰ تابعین عظامؒ اور ۱۳ دوسرے مشاہیرِ اُمّت کے انفرادی حالات پر مشتمل ہے۔
مشہور مقولہ ہے کہ جس نے کوئی کتاب تصنیف کی وہ اعتراضات کا ہدف بنا۔ ـــــ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے بعض مندرجات سے بھی کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے اصحاب کو اتفاق نہ ہو لیکن قارئینِ کرام سے میری دردمندانہ

استدعا ہے کہ وہ ان مندرجات کا کسی خاص مسلک یا فقہی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ نہ کریں بلکہ خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدَرْ پر عمل کریں۔ جو بات ان کے نزدیک درست ہے اسے قبول کرلیں اور جس سے ان کو اختلاف ہے اسے نظر انداز کردیں۔ ویسے میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے حتی الوسع داستان طرازی سے بچنے کی کوشش کی ہے اور کتاب کو مرتب کرتے وقت نہ صرف مستند مآخذ بلکہ امام عبداللہ الذہبیؒ کے اس ارشاد کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے کہ:

"جو قوم اپنے اسلاف (اکابر) کے صحیح اور سچے حالات سے بے خبر ہے اور اس کو علم نہیں کہ اس کے رہبروں اور بزرگوں نے دین و ملت کی کیا خدمت کی ہے، ان کے اعمال کیسے تھے، وہ کیا کرتے تھے اور کیا کہتے تھے تو وہ قوم تاریکی میں بھٹک رہی ہے اور یہ تاریکی اس کو گمراہی میں بھی مبتلا کرسکتی ہے اس لیے کہ بزرگانِ سلف کے صحیح حالات سے ناواقفیت اس کو غیر مصدقہ اور فرضی حالات گھڑنے اور جھوٹے افسانے تراشنے پر مجبور کردیتی ہے۔ لہٰذا قوم کا یہ فرض ہے کہ وہ اکابر ملت کے ان تذکار کو تلاش کرکے پڑھے جو حقائق پر مبنی ہوں اور جھوٹ کی آمیزش سے پاک ہوں۔"

اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے مسلمان بھائی اس کے نشانات پر اپنا جادۂ حیات طے کرنے کے لیے ہمت اور رہنمائی حاصل کریں اور ان کے حسنِ عمل سے میرے نامۂ اعمال کی سیاہی بھی دُھل جائے۔

آخر میں قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس کتاب کے اسقام سے ناشر یا مؤلف کو آگاہ کرکے عنداللہ ماجور ہوں۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن۔

المذنب ــــــ راجیٔ غفران و شفاعت

طالب الہاشمی

پی اینڈ ٹی کالونی - ملتان روڈ لاہور

۵ اشعبان المعظم ۱۴۰۴ سنہ ہجری

مطابق ۱۶ مئی ۱۹۸۴ء

حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب — عمِّ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۱)

سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت (سنہ ۱۸ ہجری) میں ایک مرتبہ طویل خشک سالی نے اہلِ عرب پر قیامت ڈھا دی اور وہ شدید قحط کی لپیٹ میں آگئے۔ امیرالمومنینؓ نے لوگوں کے مصائب و آلام کم کرنے کے لیے جو بھی انسانی تدبیر ممکن تھی، اختیار کی لیکن بارانِ رحمت کے بغیر لوگوں کے مصائب ختم ہوتے نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ ایک دن حضرت عمر فاروقؓ دوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر نمازِ استسقا کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے۔ مجمع میں ایک گورے چٹے، حسین و جمیل، بلند و بالا سفید ریش بزرگ بھی تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہم حضورؐ کے توسل سے بارش کی دعا کیا کرتے تھے اب آپ کے وسیلہ سے بارگاہِ الٰہی میں بارش کی استدعا کرتے ہیں۔"

یہ سن کر وہ بزرگ منبر پر تشریف فرما ہوئے، دستِ دعا اٹھائے اور نہایت عجز و الحاح اور خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں بارش کے لیے التجا کی۔ تمام حاضرین نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ابھی وہ دعا مانگ کر فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ یکایک صاف شفاف آسمان پر سیاہ بادل چھا گئے اور اس قدر بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ یہ بارش صحیح معنوں میں بارانِ رحمت تھی اس لیے لوگ فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے۔ بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے اور ان بزرگ کے ہاتھ پاؤں چوم چوم کر کہتے تھے، "ساقیٔ حرمین مبارک ہو، ساقیٔ حرمین مبارک ہو۔"

نورانی صورت کے یہ مستجاب الدعوات بزرگ جن کو اہلِ مدینہ نے ساقیٔ حرمین کا خطاب دیا، سیّدنا حضرت عبّاسؓ بن عبدالمطّلب تھے۔

(۲)

حضرت ابوالفضل عبّاسؓ بن عبدالمُطّلب کے حسب و نسب کے بارے میں اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ حضورؐ کے والدِ ماجد جناب عبداللہ بن عبدالمُطّلب حضرت عبّاسؓ کے علّاتی بھائی تھے اور ان سے عمر میں تقریباً بائیس برس بڑے تھے۔ حضورؐ کی ولادتِ باسعادت سے کچھ مدّت پہلے انہوں نے وفات پائی تو اس وقت حضرت عباسؓ کی عمر اڑھائی تین برس کی تھی گویا وہ حضورؐ سے تقریباً تین برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔

حضرت عبّاسؓ کی والدہ کا نام نُتَیلہ بنتِ جناب تھا۔ وہ قبیلہ النّمر سے تعلق رکھتی تھیں۔ علامہ ابنِ اثیرؒ نے "اُسدُ الغابہ" میں لکھا ہے کہ عہدِ طفلی میں حضرت عبّاس ایک مرتبہ گم ہو گئے تھے۔ نُتَیلہ نے نذر مانی کہ اگر میرا گم گشتہ فرزند مل گیا تو خانہ کعبہ پر دیبا و حریر کا غلاف چڑھاؤں گی۔ خوش قسمتی سے حضرت عباسؓ بالکل صحیح و سالم مل گئے۔ چنانچہ ان کی والدہ نے بڑی دھوم دھام سے اپنی منّت پوری کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلی عرب خاتون ہیں جنہوں نے زمانۂ جاہلیت میں خانۂ کعبہ پر دیبا و حریر کا غلاف چڑھایا۔

زمانۂ جاہلیت میں حضرت عبّاسؓ کا شمار قریش کے سربرآوردہ رؤسا میں ہوتا تھا۔ وہ ایک کامیاب تاجر تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ یمن اور بعض دوسرے علاقوں میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور لوگوں کو سود پر روپیہ بھی قرض دیا کرتے تھے۔ طائف میں ان کا ایک باغ بھی تھا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی جناب ابوطالب بن عبدالمُطّلب سے زیادہ خوشحال تھے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عباسؓ کو خانۂ کعبہ کا انتظام و انصرام اور سقایۃ کا عہدہ اپنے والد جناب عبدالمُطّلب سے ورثہ میں ملا تھا لیکن بعض دوسرے مؤرّخین نے لکھا ہے کہ حاجیوں کو پانی پلانے (سقایۃ) اور کھانا کھلانے (رفادہ) کا منصب انہیں جناب ابوطالب نے ایک قرض کی ادائی کے سلسلے میں تفویض کیا تھا۔
(دائرۂ معارف اسلامیہ)

بہر صورت حضرت عباسؓ زمانۂ جاہلیت کی نہایت ممتاز شخصیت تھے۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ قریشِ مکّہ نے انہیں "ذوالرائی" کا خطاب دے رکھا تھا اور تمام اہم معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت عباسؓ طبعاً بڑے فیاض اور کنبہ پرور تھے۔ انہوں نے بنو ہاشم کے تمام مسکینوں، محتاجوں اور بے کسوں کے لیے روٹی، کپڑا اور دوسری ضروریات کی فراہمی اپنے ذمہ لے رکھی تھی اور ان کے دسترخوان پر بیسیوں نادار اور محتاج پرورش پاتے تھے۔

(۳)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو جن سعید روحوں نے اس پر لبیک کہنے میں سبقت کی ان میں حضرت عباسؓ کی اہلیہ حضرت اُمّ الفضلؓ بنتِ حارث بھی تھیں۔ بعض روایات کے مطابق اُمّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد دوسری خاتون تھیں جو سعادت اندوزِ ایمان ہوئیں۔ خود حضرت عباسؓ نے کھلم کھلا قبولِ اسلام کا اظہار تو نہ کیا لیکن مشرکینِ قریش کے مقابلے میں انہوں نے حضورؐ کی حفاظت اور مُعاونت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ معتبر روایات کی رو سے حضرت عباسؓ نے فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور اسی موقع پر ہجرت الی المدینہ کا شرف بھی حاصل کیا۔ لیکن بعض اربابِ سِیَر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عباسؓ بعثتِ نبوی کے اوائل ہی میں ایمان لا چکے تھے لیکن کچھ مصلحتوں کے پیشِ نظر انہوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا اور ظاہری طور پر مشرکین سے ہمیشہ کے معمول کے مطابق ملتے جلتے رہے۔ "مدارج النبوۃ" میں ہے کہ حضورؐ کی ہجرت کے بعد وہ مشرکوں کی خبریں آپؐ کو لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہجرت کرکے مدینہ چلے جائیں لیکن حضورؐ نے ان کو پیغام بھیجا کہ آپ کا مکہ ہی میں اقامت گزیں رہنا زیادہ منفعت بخش ہے۔

دعوتِ توحید کے آغاز کے بعد مشرکینِ مکہ نے حق کے داعیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے نام لیواؤں کو جس طرح ستایا اور حق کے راستے میں جس طرح روڑے اٹکائے وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ اس پُرآشوب دور میں حضرت عباسؓ نے ہمیشہ حضورؐ

کا ساتھ دیا اور آپ کو کفار کے دستِ تظلم سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ ایامِ حج میں یا دوسرے موقعوں پر قبائلِ عرب کو دعوتِ توحید دینے تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی حضرت عباسؓ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ حافظ ابو نعیمؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عباسؓ کے ساتھ بنی کندہ بنی بکر بن وائل اور بنی عامر بن صعصعہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو حق کی طرف بلایا۔ ایک اور موقعہ پر آپؐ حضرت عباسؓ کے ساتھ بنو ثقیف اور بعض دوسرے قبائل کے پاس بھی تشریف لے گئے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ ۱۳ سنہ بعدِ بعثت میں مدینہ سے حاجیوں کے قافلے میں کچھ اہلِ ایمان بھی حضورؐ کی زیارت اور بیعت سے مشرف ہونے کے لیے مکہ آئے۔ ان میں سے حضرت عبداللہؓ بن جبیر، معنؓ بن عدی اور سعدؓ بن خثیمہؓ سب سے پہلے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپؐ حضرت عباسؓ کے مکان پر تشریف رکھتے تھے۔ دورانِ گفتگو میں حضرت عباسؓ نے ان سے کہا کہ تمہارے ساتھ تمہاری قوم کے وہ لوگ بھی ہیں جو تمہارے مخالف ہیں اس لیے اپنا معاملہ مخفی رکھو یہاں تک کہ حاجی منتشر ہو جائیں۔ پھر حضورؐ نے مدینہ کے اہلِ ایمان سے ملاقات کے لیے وہ رات تجویز فرمائی جس کی صبح کو "یوم النفر الآخر" کہا جاتا ہے (یعنی وہ آخری دن جب حاجی منیٰ سے روانہ ہو جاتے ہیں) اور مقامِ ملاقات آپؐ نے عقبہ کی گھاٹی کا نشیبی حصہ مقرر فرمایا۔ مقررہ تاریخ اور وقت پر اوس و خزرج کے اہلِ ایمان عقبہ کی گھاٹی میں جمع ہوئے تو حضورؐ حضرت عباسؓ کے ساتھ ان کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ اہلِ مدینہ نے حضورؐ کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت دی تو حضرت عباسؓ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے گروہِ خزرج (اس زمانے میں اوس اور خزرج کے مجموعے کو خزرج کہا جاتا تھا)، تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی ہے اور حال یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان اور

رشتہ داروں میں بے حد قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ ہم میں سے جنھوں نے ان کا دین قبول کر لیا ہے اور جنھوں نے نہیں کیا، سب حسب اور شرف کی بناء پر ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ مگر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) سب کو چھوڑ کر تمہارے پاس ہی جانا چاہتے ہیں۔ اب تم دیکھ لو کہ تم اتنی طاقت ہمت اور جنگی بصیرت رکھتے ہو یا نہیں کہ تمام عرب کی عداوت کے مقابلے میں استقامت دکھا سکو کیونکہ عرب متحد ہو کر تم پر یلغار کر دیں گے۔ لہٰذا باہمی مشورہ سے خوب سوچ سمجھ کر کوئی ایسا فیصلہ کرو جس پر سب کا اتفاق ہو کیونکہ سب سے اچھی سچی بات ہے۔"

پھر انہوں نے پوچھا:

"ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اپنے دشمن سے کس طرح نبرد آزما ہوتے ہو؟"

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن حرام نے اٹھ کر کہا:

"اے عباسؓ! خدا کی قسم ہم جنگ آزما لوگ ہیں۔ رزم آرائی ہم نے باپ دادا سے ورثے میں پائی ہے، پہلے ہم دشمن پر تیر برساتے ہیں۔ جب تیر ختم ہو جائیں تو نیزوں سے دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں یہاں تک کہ نیزے بھی بیکار ہو جائیں، پھر ہم تلواریں سونت کر دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں یہاں تک کہ ہم مر جاتے ہیں یا دشمن فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔"

حضرت عباسؓ نے کہا: "بے شک تم جنگ آزما لوگ ہو۔"

پھر حضرت براءؓ بن معرور نے کہا:

"واللہ ہمارے دلوں میں کچھ اور ہوتا تو ہم صاف صاف کہہ دیتے مگر ہم تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچی وفاداری کرنا اور آپؐ کے لیے اپنی جانیں لڑا دینا چاہتے ہیں۔ ہم نے تلواروں کی گود میں پرورش پائی ہے اور ہم ہمیشہ حضورؐ کے لیے سینہ سپر رہیں گے۔"

اس کے بعد اہلِ مدینہ میں سے کچھ اور اصحاب نے اپنی جاں نثاری اور وفا شعاری

کا یقین دلایا۔ پھر جب سب حضورؐ کی بیعت سے مشرف ہو چکے تو آپؐ نے حضرت عباسؓ کے ساتھ اپنے کاشانۂ اقدس کو مراجعت فرمائی۔

(۴)

بیعت لیلۃ العقبہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ رمضان ۲ھ ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا تو مسلمانوں کے مقابلے پر اہل مکہ کے لشکر میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جو مشرکین کے مجبور کرنے پر سخت ناگواری کے ساتھ شریکِ جنگ ہوئے تھے۔ حضرت عباسؓ، ابو البختری بن ہشام اور کچھ دوسرے اشخاص ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ حضورؐ کو حقیقتِ حال کا علم تھا اس لیے لڑائی سے پہلے آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "بعض لوگ زبردستی ہمارے مقابلہ پر کھینچ لائے گئے ہیں وہ ہم سے قطعاً لڑنا نہیں چاہتے لہٰذا اثنائے جنگ میں میرے چچا عباس بن عبدالمطلب یا بنو ہاشم کا کوئی دوسرا آدمی اور ابو البختری بن ہشام تمہارے سامنے آجائیں تو ان کو قتل نہ کرنا۔"

جلیل القدر صحابی حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ، حضورؐ کے ارشاد کی حکمت کو نہ سمجھ سکے اور بول اٹھے:

"یہ حق و باطل کا مقابلہ ہے۔ یہ کیا تفریق ہے کہ ہم اپنے باپ بیٹے بھائی اور خاندان والوں کو تو قتل کریں اور عباس اور دوسرے بنو ہاشم کو چھوڑ دیں، واللہ اگر میں نے عباس کو پالیا تو انہیں اپنی تلوار کی لگام دوں گا۔"

حضورؐ کو حضرت ابو حذیفہؓ کی بات ناگوار گزری، آپؐ نے حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ابو حفص، تم نے سنا، کیا عمِ رسولؐ کا چہرہ تلوار کے قابل ہے؟" حضرت عمرؓ فرطِ غضب سے بے تاب ہو گئے اور عرض کی:

"یا رسول اللہ اگر اجازت ہو تو میں ابو حذیفہ کا سر قلم کر دوں۔"

حضرت ابو حذیفہؓ نہایت مخلص اور جاں نثار صحابی تھے اور یہ جذباتی بات ان

کے منہ سے اتفاقیہ نکل گئی تھی اس لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے درگزر سے کام لیا۔

غزوۂ بدر میں مشرکین کو عبرتناک شکست ہوئی۔ ان کے تقریباً ستّر آدمی میدانِ جنگ میں کام آئے اور اسی قدر مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گئے۔ قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی شامل تھے۔ اتفاق سے ان کی مُشکیں اس قدر کس کر باندھی گئیں کہ وہ رات کو تکلیف سے بار بار کراہتے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کراہیں سن کر بےتاب اور مضطرب ہو گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ آرام نہ فرما سکے اور حالتِ بےخوابی میں کروٹیں بدلنے لگے۔ آخر صحابہؓ نے دریافت کیا، یارسول اللہ! آپ مضطرب اور بےچین کیوں ہیں؟ فرمایا، میرے چچا عباس کی کراہوں نے مجھے بےچین کر رکھا ہے۔ صحابہؓ نے حضرت عباسؓ کے پاس جاکر کراہنے کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ان کا بند بہت سخت ہے۔ انہوں نے بند ڈھیلا کر دیا اور وہ سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضورؐ نے صحابہؓ کو پھر بلایا اور پوچھا کہ کیا وجہ ہے اب عبّاسؓ خاموش ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ، ان کا بند بہت سخت تھا، انہیں اسی کی تکلیف تھی۔ ہم نے اس کو ڈھیلا کر دیا ہے اور وہ سو گئے ہیں۔ فرمایا تو دوسرے قیدیوں کے بند بھی ڈھیلے کر دو (ابنِ سعد)

صحیح بخاری میں ہے کہ بدر کے قیدیوں کے کپڑے لڑائی میں پھٹ گئے تھے حضورؐ نے حکم دیا کہ سب کے لیے کپڑے مہیا کیے جائیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرداً فرداً سب کو کپڑے دلوائے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عباسؓ کا قد اتنا بلند و بالا تھا کہ ان کے بدن پر کسی کا پیرہن ٹھیک نہیں اترتا تھا۔ اس موقعہ پر رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ نے جو حضرت عباسؓ کی طرح بلند قامت تھا، گھر سے اپنا کرتہ منگوا کر انہیں پہنایا۔ چند سال بعد حضورؐ نے ابنِ اُبَیّ کے مرنے پر اپنا پیرہن مبارک اس کی لاش کو پہنانے کے لیے دیا، وہ درحقیقت اس کے اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

چند دن بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ غزوۂ بدر کے جو قیدی فدیہ دینے کی مقدرت رکھتے ہیں ان سے بقدرِ استطاعت فدیہ لیا جائے اور جو فدیہ نہیں دے سکتے اور لکھنا جانتے ہیں وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا

سکھا دیں۔ جب وہ اچھی طرح لکھنا سیکھ جائیں تو قیدیوں کو رہا کر دیا جائے اور جو نہ فدیہ دے سکتے ہیں اور نہ کتابت جانتے ہیں ان کو بطورِ احسان چھوڑ دیا جائے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عباسؓ کی والدہ کا تعلق انصار کے قبیلہ خزرج سے تھا اس لیے انصار نے حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی کہ عباس ہمارے بھانجے ہیں، ہم ان کا فدیہ چھوڑتے ہیں لیکن حضورؐ نے اصولِ مساوات کے پیشِ نظر (حضرت عباسؓ کے صاحبِ حیثیت ہونے کی بناء پر) انصار کی درخواست کو قبول نہ فرمایا اور حضرت عباسؓ سے ایک بڑی رقم بطورِ فدیہ طلب فرمائی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے "مدارج النبوۃ" میں یہ روایت درج کی ہے کہ حضرت عباسؓ مکہ سے اپنے ساتھ بیس اوقیہ سونا اس غرض سے لائے تھے کہ واپسی کے وقت قریش کے لشکر کو کھانا کھلائیں گے لیکن جب وہ گرفتار ہو گئے تو ان سے سونا لے کر مالِ غنیمت میں داخل کر دیا گیا۔ حضرت عباسؓ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی کہ وہ بیس اوقیہ سونا میرا فدیہ سمجھا جائے لیکن حضورؐ نے ان کی استدعا کو قبول نہ کیا۔

امام احمد بن حنبلؒ اور ابن جریر طبری نے بیان کیا ہے کہ حضرت عباسؓ نے زرِ فدیہ کے مطالبہ کے جواب میں عرض کیا کہ میں تو دربردہ مسلمان تھا قریش نے مجھ کو زبردستی اس لڑائی میں شریک کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، دل کے حال سے اللہ تعالیٰ زیادہ واقف ہے اگر آپ کا بیان صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا لیکن بظاہر تو آپ مشرکین کے لشکر میں شریک ہو کر اہلِ حق سے لڑنے آئے تھے اس لیے آپ کو فدیہ دینا ہوگا۔

اب حضرت عباسؓ نے اپنی بے مائیگی کا عذر کیا اور کہنے لگے، اے بھتیجے یہ سخت شرم کی بات ہوگی کہ آپ کا چچا زرِ فدیہ کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

ادھر وحیٔ الٰہی کے ذریعہ حضورؐ کو حضرت عباسؓ کے گھریلو حالات کا علم ہو چکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دے رکھا ہے، مکہ سے چلتے وقت آپ سونے کی ایک بڑی مقدار اُمّ الفضل کے پاس رکھ آئے تھے اور ان سے کہا تھا کہ معلوم نہیں لڑائی کا کیا انجام ہو۔ اگر میں بخیریت واپس آ گیا تو بہتر ورنہ چار بیٹوں میں سے فضل کو

اس قدر، عبداللہ کو اس قدر، قثم کو اس قدر اور عبید اللہ کو اس قدر دینا۔
حضرت عباسؓ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا، آپ کو کیسے علم ہوا؟
ارشاد ہوا، مجھے وحیٔ الٰہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا۔ حضرت عباسؓ نے بے ساختہ کہا، خدا کی قسم اس رقم کا حال میرے اور ام الفضلؓ کے سوا کوئی نہ جانتا تھا، بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں ـــــ اس کے بعد حضرت عباسؓ نے اپنا اور اپنے بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ ادا کر کے آزادی حاصل کی۔

۵

ایک طرف مدینہ منورہ میں یہ معاملات طے ہو رہے تھے دوسری طرف مکہ میں مشرکین کی ہزیمت کی خبر سن کر حضرت عباسؓ کے اہل خانہ خوشیاں منا رہے تھے۔ ابن سعدؒ نے حضرت ابو رافعؓ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت عباسؓ کا غلام تھا اور اسلام ہمارے گھر میں داخل ہو چکا تھا، حضرت عباسؓ ان کی زوجہ اُمِّ الفضلؓ اور میں سب اسلام لا چکے تھے مگر حضرت عباسؓ اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے۔ غزوۂ بدر کے بعد جب کفار کے ہر گھر میں ماتم برپا تھا، ہمارے ہاں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔
ابن سعدؒ اور ابن جریر طبریؒ نے اس سلسلہ میں حضرت ابو رافعؓ کی زبانی ایک دلچسپ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ابو رافعؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں مشرکین کی شکست کی خبر مکہ پہنچی تو ہمیں بے حد مسرت ہوئی۔ میں اس وقت چاہِ زمزم کے قریب ایک حجرے میں تیر سازی میں مشغول تھا اور میری مالکہ اُمّ الفضلؓ بھی وہیں تشریف فرما تھیں۔ اتنے میں ابولہب گھسٹتا ہوا ہماری طرف آیا اور حجرہ کی طناب کے پاس میری پیٹھ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ابو سفیان بن حارث بن عبد المطلب (حضورؐ کے عم زاد بھائی جو ہنوز مشرف بایمان نہیں ہوئے تھے) اُدھر سے گزرے۔ ابولہب نے انہیں آواز دی کہ بھتیجے ذرا اِدھر آنا۔ وہ آئے تو ابولہب نے ان سے پوچھا، برادرزادے! کہو بدر میں کیا حالات پیش آئے۔ ابو سفیان بن حارث کہنے لگے، واللہ مسلمانوں نے

ہماری قوت تباہ کردی، قریش کی حالت مسلمانوں کے سامنے ایسی تھی جیسے مردہ غسال کے ہاتھوں میں بے بس ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے جس کو چاہا قتل کردیا اور جس کو چاہا اسیر کر لیا۔ ایک عجیب منظر ہم نے یہ دیکھا کہ سفید رنگ کے بہت سے آدمی (یا سفید پوش) ابلق گھوڑوں پر سوار مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے۔

میں نے ابوسفیان کی بات سن کر فوراً کہا، "وہ فرشتے تھے۔" اس پر ابولہب بھڑک اٹھا۔ اس نے میرے منہ پر بڑے زور سے تھپڑ مارا، میں بھی اس سے لپٹ گیا لیکن وہ طاقتور تھا، مجھے گرا کر میرے سینے پر سوار ہو گیا اور بے تحاشا مارنے لگا۔ امّ الفضلؓ پہلے تو خاموش بیٹھی دیکھتی رہیں پھر وہ اٹھیں اور ایک موٹا سا لٹھ لے کر اس زور سے ابولہب کے سر پر مارا کہ اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں:

"بے حیا اس کا آقا یہاں نہیں ہے اس لیے کمزور سمجھ کر مارتا ہے۔"

ابولہب کو بھاوج کے سامنے بولنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ کان دبا کر وہاں سے چلا گیا۔

ابن اثیرؒ نے "اسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد حضرت عباسؓ نے کئی بار حضورؐ سے ہجرت کی اجازت طلب کی لیکن آپؐ نے باز رکھا اور فرمایا کہ فی الحال آپ کا مکّہ میں قیام زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مجھ پر نبوت ختم کی اسی طرح آپ پر ہجرت ختم کرے گا۔

اوائل سنہ ہجری میں خیبر فتح ہوا تو ایک صاحب رسول حضرت حجاجؓ بن علاط سلمی حضورؐ سے اجازت لے کر مکّہ آئے۔ ان کا کل اثاثہ مکّہ میں تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں سے ان کو اپنا قرض بھی وصول کرنا تھا چونکہ حضرت حجاجؓ غزوۂ خیبر سے چند ہی دن پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اس لیے اہل مکّہ کو نہ ان کے قبول اسلام کا علم تھا اور نہ غزوۂ خیبر کے نتیجے کا۔ حضرت حجاجؓ نے اپنی گفتگو سے انہیں یہ تاثر دیا کہ خیبر کی لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی ہے اور ان کا تمام مال و اسباب یہود خیبر کے ہاتھ آیا ہے جسے وہ عنقریب فروخت کر دیں گے۔ اگر ان (حجاج) کا قرض وصول ہو جائے تو وہ اسے اپنے اثاثے میں ملا کر دوسرے تاجروں کو خبر ہونے سے پہلے یہود سے تمام مالِ غنیمت خرید لیں گے۔ مشرکین قریش کو اس خبر سے

بے پناہ مسرت ہوئی اور سارے مکّہ میں جشن کا سماں پیدا ہوگیا۔ مشرکین نے کوشش کرکے حضرت حجاجؓ کا سارا قرض وصول کرا دیا۔ حضرت عباسؓ کے کانوں تک یہ خبر پہنچی تو انہیں سخت صدمہ ہوا۔ ان کے اہلِ خانہ بھی اس غم میں ان کے برابر کے شریک تھے واقعہ کی تفصیل جاننے کے لیے حضرت عباسؓ نے حضرت حجاجؓ کو بلا بھیجا وہ آکر تخلیہ میں ان سے ملے اور بتایا کہ خیبر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح مند کیا ہے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بالکل محفوظ ہیں، رئیسِ خیبر حُیَیّ بن اخطب کی بیٹی آپ کے حرم میں داخل ہوئی ہے میں خود شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو چکا ہوں اور اپنا اندوختہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ کفار کو میں نے مسلمانوں کی شکست کا تأثر اس لیے دیا کہ وہ میرے مزاحم نہ ہوں۔ آپ میرے جانے کے بعد تین دن تک اس خبر کو پوشیدہ رکھیں تاکہ میں محفوظ مقام پر پہنچ جاؤں۔

حقیقتِ حال سے آگاہ ہو کر حضرت عباسؓ کی مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ چوتھے روز جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ حجاجؓ بن علاط مشرکینِ مکّہ کی دسترس سے باہر ہو گئے ہیں تو نہا دھو کر اور عمدہ لباس پہن کر ہاتھ میں عصا لیے خراماں خراماں خانۂ کعبہ آئے اور طواف کرنے لگے۔ مشرکین نے طنزیہ انداز میں کہا "مصیبت میں صبر کے اظہار کا یہ اچھا طریقہ ہے۔" حضرت عباسؓ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "مصیبت کیسی؟ خدا کی قسم خیبر کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فتح کر لیا اور اب اس کے ایک ایک چپّے پر ان کا قبضہ ہے۔"

مشرکین نے حیران ہو کر پوچھا: "آپ کو یہ خبر کہاں سے ملی؟"

انہوں نے کہا، "حجاج بن علاط سے۔ وہ اسلام قبول کر چکے ہیں اور محض اپنا مال لینے آئے تھے۔" یہ سن کر کفّار سر پیٹ کر رہ گئے۔ (اُسدُ الغابہ، ابنِ اثیرؒ)

(۶)

۸ھ ہجری میں فتح مکّہ سے کچھ عرصہ پہلے حضرت عباسؓ نے اپنے اسلام کا کھلم کھلا اظہار کر دیا۔ حضورؐ نے انہیں ہجرت کی اجازت بھی دے دی۔ چنانچہ وہ اپنے اہل و عیال

سمیت مکہ سے مدینہ آگئے۔ حضورؐ نے بڑی مُسرت سے ان کی پذیرائی فرمائی اور مدینہ منوّرہ میں ان کی مستقل سکونت کا انتظام کردیا۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت عباسؓ ان دس ہزار جان بازوں میں شامل تھے جن کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ نے مکہ کے قریب پہنچ کر مرالظہران میں قیام فرمایا۔ لشکرِ اسلام میں شامل بہت سے صحابۂ کرامؓ کے اعزہ و اقربا مکہ میں موجود تھے۔ حضرت عباسؓ کے دل میں خیال آیا کہ حضورؐ مکہ میں داخل ہو گئے اور قریش نے پہلے سے جان و مال کی امان نہ لے لی تو سب برباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ اس تلاش میں لشکر سے باہر نکلے کہ مکہ کا کوئی آدمی مل جائے تو اس کے ہاتھ قریش کو پیغام بھیجیں کہ مرالظہران آکر حضورؐ سے امان کی استدعا کریں۔ اتفاق سے انہیں قریش کے سربرآوردہ رئیس حضرت ابوسفیانؓ بن حرب مل گئے۔ حضرت عباسؓ نے انہیں حضورؐ کی آمد کی خبر دی تو وہ سراسیمہ ہو گئے اور حضرت عباسؓ سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنی پناہ میں لے کر حضورؐ کی خدمت میں لے چلیں۔ حضرت عباسؓ انہیں اپنے ساتھ سوار کرکے حضورؐ کے خیمۂ اقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں حضرت عمر فاروقؓ کی نظر ان پر پڑی تو وہ جوشِ غضب میں پکار اٹھے "او دشمنِ خدا، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کسی عہد و پیمان اور ذمہ داری کے بغیر ہمیں تجھ پر قابو دے دیا۔۔۔" لیکن حضرت عباسؓ ساتھ تھے اس لیے وہ سیدھے حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت عباسؓ ان سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ یہ ابوسفیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بغیر کسی عہد و پیمان کے اس پر قابو دے دیا ہے، اجازت ہو تو اس دشمنِ خدا کی گردن اڑا دوں۔"

حضرت عباسؓ نے عرض کیا، "یا رسول اللہ میں نے اس کو پناہ دی ہے۔۔۔"

لیکن حضرت عمر فاروقؓ برابر ابوسفیانؓ کے قتل کی اجازت طلب کر رہے تھے۔ ان کا اصرار دیکھ کر حضرت عباسؓ نے فرمایا، "عمر اگر تمہارے قبیلہ کا کوئی آدمی ہوتا تو تم کبھی اس کی جان لینے پر اتنا اصرار نہ کرتے لیکن تمہیں بنی عبد مناف کی کیا پروا؟" حضرت عمر فاروقؓ

نے جواب میں فرمایا "عباس! خدا کی قسم مجھ کو آپ کے اسلام کی اس قدر خوشی ہوئی کہ اگر میرا باپ خطاب بھی اسلام لاتا تو میں اتنا خوش نہ ہوتا۔"

حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا، اس وقت انہیں اپنے ساتھ لے جایئے اور کل صبح پھر ساتھ لے کر آیئے اسی وقت کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ حضرت عباسؓ انہیں لے گئے اور دوسرے دن پھر بارگاہِ نبوی میں لا کر پیش کیا۔ حضورؐ نے حضرت ابوسفیانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

ابوسفیان افسوس کا مقام ہے کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم خدا کی وحدانیت کا اقرار کرو۔"

حضرت ابوسفیانؓ نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا:

"ابوسفیان کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم مجھے اللہ کا رسول مانو۔"

جواب میں حضرت ابوسفیانؓ نے حضورؐ کی شرافت، حلم و تحمل اور صلۂ رحمی کا اعتراف کیا لیکن رسالت پر ایمان لانے میں مذبذب کا اظہار کیا۔ اس پر حضرت عباسؓ نے حضرت ابوسفیانؓ کو ایسے مؤثر انداز میں سمجھایا کہ وہ فوراً کلمۂ توحید پڑھ کر مشرف بہ ایمان ہو گئے۔ جب وہ لوٹنے لگے تو حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیانؓ کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دیں تاکہ وہ لشکرِ اسلام کے جلال اور اللہ کے سپاہیوں کے جوشِ ایمان کا منظر دیکھ سکیں۔ حضرت عباسؓ انہیں ساتھ لے کر پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو گئے اور جب تک سارا لشکر ان کے سامنے سے نہ گزر گیا، وہیں کھڑے رہے۔

فتح مکہ کے بعد حضرت عباسؓ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ جب بنو ہوازن کی بے پناہ تیر باری سے مسلمانوں کی صفیں ابتر ہو گئیں تو حضرت عباسؓ ان چند سرفروشوں میں تھے جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدانِ جنگ میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے تھے۔ حضرت عباسؓ نے حضورؐ کی سواری کی باگ تھام رکھی تھی اور حضورؐ یہ رجز پڑھ رہے تھے: أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

(میں نبی ہوں اس میں مطلق کوئی جھوٹ نہیں، میں عبدالمطّلب کا فرزند ہوں)

مسندِ احمد میں خود حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ لڑائی میں جب مشرکوں کا غلبہ ہوا اور مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ نیزہ برداروں کو آواز دوں۔ قدرت نے مجھے بلند آواز دی تھی۔ میں نے پوری قوت سے نعرہ مارا "اَیْنَ اَصْحَابُ السَّمُرَۃِ ؟" (اے ببول کے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو کہاں ہو؟) میرا نعرہ سنتے ہی تمام مسلمان پلٹ پڑے اور انہوں نے کفار کو اپنی تلواروں اور نیزوں پر رکھ لیا۔

غزوۂ حنین کے بعد حضرت عباسؓ نے غزوۂ طائف اور جیشِ عسرۃ (غزوۂ تبوک) میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ "دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں ہے کہ انہوں نے غزوۂ تبوک کے لیے مالی امداد بھی دی۔ سنہ ۱۰ ہجری میں حضورؐ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت عباسؓ بھی ساتھ تھے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں حضورؐ نے سودی کاروبار کے باطل ہونے کا اعلان فرمایا تو اس سلسلے میں خاص طور پر حضرت عباسؓ کا نام لیا کیونکہ وہ قبولِ اسلام سے پہلے سود کا کاروبار کرتے تھے اور بہت سے لوگوں کے ذمہ ان کا سود باقی تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود، عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

(صحیح مسلم و ابوداؤد)

حجۃ الوداع سے واپس آکر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم علیل ہو گئے (صفر سنہ ۱۱ھ) ازواجِ مطہراتؓ، حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے بنو ہاشم نے تیمارداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن حضورؐ کی علالت بڑھتی ہی گئی۔ وفات کے دن حضرت علیؓ حجرۂ اقدس سے باہر نکلے تو لوگوں نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ چونکہ اس دن بظاہر آفاقہ ہو گیا تھا، حضرت علیؓ نے فرمایا، اللہ کے فضل سے رو بصحت ہیں۔ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں الگ لے جا کر کہا،

"علی، تم کس خیال میں ہو؟ میں خاندانِ عبدالمطلب کے چہروں سے موت

کا اندازہ کر لیتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ اقدس بتا رہا ہے کہ آپ بہت جلد ہمیں داغِ مفارقت دے جائیں گے، آؤ حضورؐ سے پوچھ لیں کہ آپؐ کے بعد منصب خلافت کون سنبھالے گا، اگر ہم اس کے مستحق ہیں تو معلوم ہو جائے گا، ورنہ آپؐ سے استدعا کریں گے کہ ہمارے حق میں وصیت فرما جائیں۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا: "چچا جان، خدا کی قسم میں یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہرگز نہ پوچھوں گا۔ اگر آپؐ نے انکار فرما دیا تو اس کا مطلب خلافت سے ہمیشہ کے لیے محرومی ہوگا۔" (صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۲)

حضرت علیؓ کا جواب سن کر حضرت عباسؓ خاموش ہو گئے۔ آفتاب رسالت اللہ تعالیٰ کی شفق رحمت میں غروب ہوا تو دوسرے دن تجہیز و تکفین کی خدمت حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت قثمؓ بن عباسؓ، حضرت اسامہؓ بن زیدؓ اور حضرت اوسؓ بن خولی انصاری نے انجام دی۔ مسند ابو داؤد اور طبقات ابن سعد میں ہے کہ غسل دیتے وقت حضرت اوسؓ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے، حضرت علیؓ نے جسدِ اطہر کو سینہ سے لگا رکھا تھا، حضرت عباسؓ اور ان کے صاحبزادے فضلؓ اور قثمؓ جسمِ مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے اور اسامہؓ بن زیدؓ اوپر سے پانی ڈالتے تھے بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت علیؓ غسل دیتے تھے اور حضرت عباسؓ نے پردہ کر رکھا تھا۔

حضرت عباسؓ چونکہ حضورؐ کے چچا اور عمر کے لحاظ سے بنو ہاشم کی بزرگ ترین شخصیت تھے، حضورؐ کے وصال کے بعد لوگ تعزیت کے لیے ان ہی کے پاس آئے۔

(الاستیعاب۔ حافظ ابن عبد البرؒ)

(۷)

حضرت عباسؓ قبولِ اسلام سے پہلے بھی حضورؐ کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن اسلام کے بعد تو انہوں نے حضورؐ کو اپنا مرجعِ عقیدت و محبت بنا لیا۔ رشتہ اور عمر میں بزرگ ہونے کے باوجود وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے اور آپؐ کو اپنا آقا و مولا جانتے تھے۔ حضورؐ کی ہر بات کو اپنے لیے حکم جانتے اور

آپؐ کا ذکر نہایت احترام اور ادب کے ساتھ کرتے۔

"مسندِ احمد حنبل" میں ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت عباسؓ سے پوچھا، آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ حضرت عباسؓ نے جواب دیا، گو میں کچھ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پیدا ہوا لیکن ہیں آپؐ ہی بڑے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حضرت عباسؓ سے بہت محبت تھی اور آپؐ اپنے اعزہ واقارب میں ان سے زیادہ کسی کا احترام نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ شام سے کچھ خشک پھل حضورؐ کے پاس آئے۔ اتنے میں حضرت عباسؓ آ گئے۔ حضورؐ نے انہیں دیکھا تو روئے انور پر بشاشت پھیل گئی اور فرمایا:

"چچا جان اس وقت میری خواہش تھی کہ میرا کوئی بہت پیارا عزیز ان پھلوں کو کھائے، میری یہ آرزو پوری ہوئی اور آپ آ گئے۔"

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضورؐ اپنے اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے اور آپؐ کے پہلو میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ تھے اتنے میں حضرت عباسؓ آ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے لیے جگہ خالی کر دی۔ اس پر حضورؐ نے ابوبکرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اہلِ فضل کی فضیلت اہلِ فضل ہی جانتا ہے۔" (ابنِ عساکر)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کی مجلس مبارک میں دائیں جانب مخصوص جگہ پر بیٹھا کرتے تھے لیکن حضرت عباسؓ آجاتے تو حضرت ابوبکرؓ ان کے لیے اپنی جگہ خالی کر دیا کرتے تھے ان کی یہ بات حضورؐ کو بہت خوش کیا کرتی تھی۔ (طبرانی)

ایک مرتبہ حضرت عباسؓ نے بارگاہِ رسالت میں شکایت کی کہ یا رسول اللہ قریش جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بہت بشاشت سے ملتے ہیں لیکن جب ہم سے ملتے ہیں تو ان کے چہروں پر کراہیت کے آثار ہوتے ہیں۔ یہ سُن کر حضورؐ کو غصہ آگیا یہاں تک کہ آپؐ کی پیشانی مبارک پر دونوں آنکھوں کے درمیان کی رگ اُبھر آئی۔ آپؐ نے فرمایا، قسم

اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے ، کسی آدمی کے دل میں ایمان نہیں داخل ہوگا جب تک وہ تم لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کے لیے دوست نہ رکھے ۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا ، لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ مجھے عباس کے بارے میں تکلیف دیتے ہیں ؟ آدمی کا چچا اس کے باپ جیسا ہے یعنی ایک درخت کی دو شاخیں ہیں ۔

(مستدرک حاکم ، جامع ترمذی و مسندِ احمد)

ایک اور موقع پر حضورؐ نے فرمایا ، عباسؓ مجھ سے ہیں اور میں عباسؓ سے ہوں ۔

(مستدرکِ حاکم)

ایک دفعہ حضورؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کو اہلِ مدینہ سے زکوٰۃ اور صدقات کی وصولی کے لیے بھیجا ۔ انہوں نے حضرت عباسؓ سے مال کی زکوٰۃ کا مطالبہ کیا تو انہوں نے کچھ دینے سے انکار کر دیا ۔ اس پر دونوں بزرگوں کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہو گئی ۔ حضرت عمر فاروقؓ حضرت علیؓ کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کیا ۔ حضورؐ نے فرمایا ، میں نے عباس سے دو سال کی زکوٰۃ پہلے ہی وصول کر رکھی ہے ۔ اب تم ان سے کچھ نہ کہنا ۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ (عباس رسول خدا کا چچا ہے) چچا اور والد ایک ہی درخت کی دو شاخوں جیسے ہیں ۔ (ابن عساکر)

بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ مالِ غنیمت کے خمس سے حضرت عباسؓ کی اعانت فرمایا کرتے تھے اور خیبر کی پیداوار سے بھی انہیں سالانہ حصہ دیا کرتے تھے ۔

(دائرہ معارف اسلامیہ و سیر الصحابہ)

حضورؐ کے وصال کے بعد بھی تمام صحابہ کرامؓ حضرت عباسؓ کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آتے اور ہر اہم کام میں ان سے مشورہ لیتے ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت عباسؓ کا بہت زیادہ خیال رکھا ۔ اگر وہ سواری پر کہیں جا رہے ہوتے اور راستے میں حضرت عباسؓ مل جاتے تو فوراً سواری سے اتر پڑتے اور حضرت عباسؓ کو سواری پر بٹھا کر اس کی لگام پکڑ کر پیدل ساتھ چلتے یہاں تک کہ حضرت عباسؓ اپنے مکان پر

یا جہاں ان کو جانا ہوتا، پہنچ جاتے۔

حضرت عمر فاروق رضؓ کے نزدیک حضرت عباس رضؓ کا مقام اور مرتبہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں وظائف پر نظرِ ثانی کی تو حضرت عباس رضؓ کا وظیفہ اصحابِ بدر کے وظیفہ کے برابر کر دیا۔ (دائرۂ معارفِ اسلامیہ)

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ حضرت عباس رضؓ کے مکان کا پرنالہ حضرت عمر رضؓ کے راستہ پر تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عباس رضؓ کے اہلِ خانہ نے ان کے لیے دو چوزے ذبح کیے اور ان کا خون پرنالہ میں بہا دیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور حضرت عمر رضؓ کپڑے بدل کر مسجد کی طرف جا رہے تھے چوزوں کا خون ان کے کپڑوں پر پڑا تو انہوں نے اس پرنالہ کو اکھیڑنے کا حکم دیا پھر گھر جا کر خون آلود کپڑے تبدیل کیے اور مسجد میں آکر لوگوں کو نماز پڑھائی۔ اس کے بعد حضرت عباس رضؓ ان کے پاس آئے اور کہا، خدا کی قسم یہ وہی جگہ ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پرنالے کو رکھا تھا۔ یہ سُن کر حضرت عمر رضؓ نے حضرت عباس رضؓ سے فرمایا، میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ آپ میری کمر پر سوار ہو جائیں اور پرنالہ کو دوبارہ اسی جگہ رکھیں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا۔ چنانچہ حضرت عباس رضؓ نے اسی طرح کیا۔ (ابنِ سعد و مسندِ احمد)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت عباس رضؓ کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور انہوں نے پرنالہ کو اپنی اصل جگہ پر لگا دیا۔ (ہیثمی)

بعض اہلِ سیر نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت عباس رضؓ کا مکان مسجدِ نبوی سے متصل تھا اس کا پرنالہ مسجدِ نبوی میں گرتا تھا جس کی وجہ سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اس پرنالے کو اکھڑوا دیا۔ اس وقت حضرت عباس رضؓ اپنے مکان پر موجود نہ تھے وہ باہر سے واپس آئے تو پرنالے کے اکھڑوائے جانے پر بہت ناراض ہوئے اور حضرت اُبی رضؓ بن کعب کی عدالت میں حضرت عمر فاروق رضؓ پر دعویٰ دائر کر دیا۔

حضرت اُبی رضؓ نے حضرت عمر فاروق رضؓ کو جوابدہی کے لیے بُلا بھیجا، خلیفۂ وقت

نے عدالت میں حاضر ہو کر بیان کیا کہ میں نے پرنالہ اس لیے اکھڑوایا کہ اس کے پانی سے بعض اوقات نمازیوں کو تکلیف پہنچتی تھی۔ میری کوئی ذاتی غرض اس میں پنہاں نہ تھی۔

حضرت عباسؓ نے فرمایا: ”واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھڑی سے جو نشانات لگائے تھے میں نے ان کے مطابق مکان بنایا۔ مکان بن گیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ میرے کندھوں پر کھڑے ہو جاؤ اور پرنالہ یہاں لگا دو۔“

پھر حضرت عباسؓ نے اپنے بیان کی تائید میں بعض گواہ بھی پیش کر دیئے۔ ابھی عدالت نے کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا تھا کہ امیر المومنین معاً آگے بڑھے اور حضرت عباسؓ سے مخاطب ہو کر کہا:

”اے ابو الفضل، خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیجئے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرنالہ اس جگہ لگوایا تھا۔ اب آپ میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر پرنالہ کو وہیں لگا دیں۔“

چنانچہ حضرت عباسؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے کندھوں پر دونوں پاؤں رکھ کر پرنالہ وہیں نصب کر دیا۔ یہ کام ہو چکا تو حضرت عباسؓ نے حضرت عمر فاروقؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

”امیر المومنین آپ کی انصاف پسندی کی بدولت مجھے اپنا حق مل گیا۔ اب میں برضا و رغبت اپنے سارے مکان کو خدا کی راہ میں وقف کرتا ہوں آپ اسے گرا کر مسجد نبوی میں شامل کر لیں۔ تنگی کی وجہ سے نمازیوں کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ دور ہو جائے گی۔“

صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو اس بات پر سب اربابِ سیر کا اتفاق ہے کہ حضرت عباسؓ نے اپنا مکان مسجدِ نبوی کی توسیع کے لیے خلیفۃ المسلمین کی نذر کر دیا۔

حضرت عمر فاروقؓ اہم معاملات میں اکثر حضرت عباسؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے اور قحط و مصیبت کے موقعوں پر ان سے دعا کراتے تھے۔ قحط الرمادہ میں حضرت عباسؓ کی دعا کے معاً بعد موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ لوگ اس غیر متوقع بارش سے اس قدر

خوش ہوئے کہ حضرت عباسؓ کو "ساقیِ حرمین" کا خطاب دیا۔
حضرت عثمان ذوالنورینؓ بھی حضرت عباسؓ کی نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ ان کے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت عباسؓ کی توہین کی۔ حضرت عثمانؓ نے اس شخص کو دُرّے لگوائے۔ بعض لوگوں نے اس سزا پر اعتراض کیا تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے چچا کی تعظیم کریں اور میں آپؐ کے چچا کی توہین کیے جانے پر رخصت دے دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو شخص اس بات کو روا رکھتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہے۔"

اس پر معترضین کا منہ بند ہو گیا۔

۸

حضرت عبّاسؓ نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے دورِ خلافت (۳۲ھ ہجری) میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر باختلافِ روایت ۸۶ سال یا ۸۸ سال کی تھی۔ امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور فرزندِ گرامی حِبر الامّۃ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ نے لحد میں اتارا۔
حضرت عباسؓ نے اپنے پیچھے چار بیٹیاں اور آٹھ بیٹے چھوڑے۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ علم و فضل کے اعتبار سے اساطینِ اُمّت میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت فضل بن عبّاسؓ اور قثم بن عبّاسؓ کا شمار بھی مشہور صحابہ میں ہوتا ہے۔
سیدنا حضرت عبّاسؓ کے صحیفۂ اخلاق میں جود و سخا، مہمان نوازی، ہمدردیٔ خلائق اور حُبِّ رسولؐ کے ابواب سب سے نمایاں ہیں۔ وہ مکّہ میں ہر وقت غریبوں اور مظلوموں کی حمایت پر کمربستہ رہتے تھے۔ ہجرت کر کے مدینہ میں مستقل اقامت اختیار کی تو ان کی سخاوت اور فیاضی کا یہ عالم تھا کہ کسی حاجت مند اور سوالی کو ناکام واپس

نہ لوٹاتے، ہر ایک کی مدد کرتے، بے شمار غلام خرید کر آزاد کیے، بہت سی بیواؤں کے اخراجات کی کفالت کی، بہت سے یتیم بچوں کی پرورش اپنے ذمہ لی اور راہِ حق میں کبھی کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔

علامہ ابن اثیرؒ نے "اُسدُ الغابہ" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع میں تشریف فرما تھے کہ حضرت عباسؓ کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ حضورؐ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"یہ عباس ہیں، قریش میں سب سے بڑھ کر فراخ دست ہیں اور اپنے اقربا کا خیال رکھتے ہیں۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں فتنۂ ردّہ کا آغاز ہوا اور بعض سرکش قبائل نے "ذی القصہ" میں جمع ہو کر مدینہ منوّرہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو حضرت عباسؓ نے مدینہ منوّرہ کی حفاظت کرنے میں بڑی سرگرمی سے خلیفۃ الرسول کی اعانت کی۔

"دائرۂ معارفِ اسلامیہ" میں ہے کہ روایات کی رُو سے حضرت عباسؓ نے محارباتِ شام میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں انہوں نے اپنا وسیع مکان محض رضائے الٰہی کی خاطر مسجدِ نبوی کی توسیع کے لیے دے دیا۔

عبادتِ الٰہی سے بھی خاص شغف تھا۔ رقیق القلبی کی یہ کیفیت تھی کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

حضرت عباسؓ کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ سیرت کے ساتھ حُسنِ صورت سے بھی نوازا تھا۔ قد طویل، رنگ میدہ و شہاب، جلد نازک اور چہرے کے نقوش دلاویز تھے۔

خلفائے عباسیہ حضرت عباسؓ کی اولاد ہی سے تھے۔ حضرت عباسؓ کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ صدیوں سے لاکھوں منبروں پر جمعہ کے خطبوں میں ان کا نام برابر لیا جا رہا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت یاسرؓ بن عامر

(۱)

قُدرت کے بھید نرالے ہیں۔ بعثتِ نبویؐ سے تقریبًا نصف صدی پہلے یمن کا ایک گمنام باشندہ اپنے ایک مفقود الخبر کی تلاش میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ مکّہ پہنچتا ہے گم شدہ بھائی وہاں نہیں ملتا تو اُس کے دونوں بھائی مایوس ہوکر اپنے وطن کو لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس شخص کے پاؤں سرزمینِ مکّہ پکڑ لیتی ہے اور وہ وہیں مستقل اقامت اختیار کرلیتا ہے۔ اسی جگہ اللہ تعالیٰ اس کو وہ بلند مرتبہ عطا کرتا ہے کہ اس کا نام صفحۂ تاریخ پر نقشِ جاوداں بن کر ثبت ہوجاتا ہے۔ یہ گمنام اور غریب الدیار شخص جنہوں نے راہِ حق میں اپنی جان سپاری کی بدولت شہرتِ عام اور بقائے دوام کا تاج پہنا، حضرت یاسرؓ بن عامر تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابو عامر یاسرؓ بن عامر قحطانی النسل اور یمن کے باشندے تھے۔ سلسلہ نسب یہ ہے۔

"یاسرؓ بن عامر بن مالک بن کنانہ بن قیس بن حصین بن ودیم بن ثعلبہ بن عوف بن حارثہ بن عامر الاکبر بن یام بن عنس بن مالک بن اود بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا بن یشجب بن یعرب قحطان۔"

حضرت یاسرؓ کا ایک بھائی جس سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے، کہیں غائب ہوگیا۔ اپنے علاقے کا چپّہ چپّہ اس کی تلاش میں چھان مارا لیکن وہ نہ ملا۔ آخر اپنے دو بھائیوں مالک اور حارث کو ساتھ لے کر برادرِ گم گشتہ کی تلاش میں مکّہ پہنچے۔ یہ بعثتِ نبویؐ سے پینتالیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ بھائی یہاں

بھی نہ مِلا تو مالک اور حارث تو مایوس ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے لیکن یاسرؓ نے بنو مخزوم کے ایک رئیس ابو حذیفہ بن مغیرہ سے حلیفانہ تعلق قائم کر کے مکّہ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابو حذیفہ نے اپنی ایک نیک بخت لونڈی سُمیّہ بنتِ خیاط سے حضرت یاسرؓ کی شادی کر دی۔ اس کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دو فرزند عطا کیے۔ عمار اور عبداللہ۔ یہ سارا کنبہ ابو حذیفہ بن مغیرہ کے ساتھ رہتا تھا ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ جب تک ابو حذیفہ حیات رہا، حضرت یاسرؓ اور اُن کے اہلِ خاندان کے ساتھ حُسنِ سُلوک سے پیش آتا رہا۔ اس کی وفات کے بعد مکّہ میں خورشید رسالتؐ کا طلوع ہُوا تو حضرت یاسرؓ حضرت سُمیّہؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت عبداللہؓ، سب سعادت اندوزِ ایمان ہو گئے۔ اس وقت تک صرف تیس بتیس نفوس نے قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا تھا۔ جوں جوں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا مُشرکینِ قریش کے قہر و غضب کی آگ بھی تیز ہوتی جاتی تھی۔ حضرت یاسرؓ اور ان کے اہلِ خاندان کا قبولِ اسلام مُشرکین بالخصوص بنو مخزوم پر سخت شاق گزرا۔ اللہ کے یہ چاروں پاکباز بندے غریب الدّیار اور بے سہارا تھے۔ بنو مخزوم نے ان سب کو اپنی مشقِ ستم کا نشانہ بنا لیا اور ان پر ظلم و ستم کے ایسے پہاڑ توڑے کہ انسانیت سر پیٹ کے رہ گئی۔

(۳)

جیابرۂ بنو مخزوم ان چاروں مظلوموں پر نت نئے ستم ڈھاتے تھے۔ وہ انہیں لاتوں گھونسوں اور لکڑیوں سے اتنا پیٹتے کہ وہ بے ہوش ہو جاتے، جب ہوش میں آتے تو اُن سے پوچھتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین کو ترک کرو گے یا نہیں؟ چاروں جواب دیتے "محمد رسول اللہؐ پر ہماری ہزار جانیں قربان ——— ظالم کبھی انہیں جھلستی ہوئی ریت پر لِٹاتے، کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیتے لیکن وہ چاروں نفوسِ قُدسی نشۂ توحید میں کچھ ایسے مخمور ہُوتے تھے کہ جادۂ حق سے ہٹنے کا نام بھی نہ لیتے تھے۔ طبرانیؒ نے حضرت عثمانؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک دن جب وہ چاروں کفار کے ہاتھوں لرزہ خیز اذیتیں جھیل رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُدھر سے گزر ہُوا۔ ان مظلوموں کو مبتلائے اذیّت دیکھ کر آپؐ کا دل بھر آیا اور آپؐ نے فرمایا" صبر کرو اے

آلِ یاسرؓ، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔"

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں حضرت عثمانؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس مقام سے گزرا، جہاں اس خاندان کو عذاب دیا جارہا تھا حضورؐ نے ان سے فرمایا "صبر کرو، الٰہی آلِ یاسرؓ کی مغفرت فرمادے اور تُو نے ان کی مغفرت کرہی دی"۔

حضرت سُمیّہؓ کو ابھی بنو مخزوم نے آزاد نہیں کیا تھا اور وہ ابوجہل، عمرو بن ہشام مخزومی کی چاکری کرتی تھیں۔ ابوجہل اسلام لانے کے جرم میں انہیں سخت اذیتیں دیتا رہتا تھا۔ ایک دن اس قدر غضبناک ہُوا کہ اپنا برچھا حضرت سُمیّہؓ کو کھینچ مارا۔ وہ اسی وقت زمین پر گرگئیں اور جامِ شہادت پی کر فردوسِ بریں کو سدھاریں۔ پھر ایک دن اس بدبخت نے تیر مار کر حضرت عبداللہ بن یاسرؓ کو شہید کر ڈالا۔ بوڑھے اور ناتواں یاسرؓ کب تک یہ لرزہ خیز اذیتیں سہتے۔ جلد ہی وہ بھی خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ کفار نے انہیں بھی برچھی مار کر شہید کیا۔ (اُسُد الغابہ)

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت سُمیّہؓ اور حضرت عبداللہؓ کو حضرت یاسرؓ کی وفات (شہادت) کے بعد شہید کیا گیا۔ صُورتِ واقعہ کچھ بھی ہو، ان تینوں مظلوموں نے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خاطر اپنی جانیں قربان کردیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

حضرت عمارؓ پر بھی مُشرکین نے بے پناہ مظالم ڈھائے۔ کبھی انہیں گرم لوہے سے داغا، کبھی انگاروں پر لٹایا کبھی پانی میں غوطے دیے لیکن وہ سخت جان تھے کسی نہ کسی طرح بچ گئے اور ۹۱ کانوے برس کی عمر پاکر جنگِ صفین (۳۶ ہجری) میں شہید ہُوئے۔ ان کی پشت پر سیاہ لکیریں اور انگاروں سے جلنے کے داغ ساری عمر موجود رہے۔ یہ راہِ حق میں مصیبتیں جھیلنے کی یادگار ہی نہیں بلکہ اُن کے لیے پروانۂ مغفرت بھی تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

حضرت نُعیمُ النَّحَّام عدوی

(۱)

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ توحید کا آغاز فرمایا تو وہی اہلِ مکّہ جو حضورؐ کو صادق اور امین کہتے نہ تھکتے تھے، انہوں نے آپؐ کو جھٹلانے اور ستانے پر کمر باندھ لی۔ جو اللہ کا بندہ دعوتِ حق قبول کرتا یہ لوگ اس کی جان کے دشمن بن جاتے اور اس کو طرح طرح سے ستانے لگتے۔ ۱۳ھ بعد بعثت میں حضورؐ نے صحابۂ کرام کو مشرکینِ مکّہ کے دستِ تعدّی سے بچنے کے لیے ہجرت الی المدینہ کا اِذن دیا تو بنو عدی کے ایک مردِ حق بھی ہجرت کی تیاری کرنے لگے۔ مشرکینِ بنو عدی کو اُن کے ارادے کا علم ہُوا تو ان میں حشر برپا ہو گیا۔ یہ وہ صاحب تھے جنہوں نے بنو عدی کے یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کی خبر گیری اپنے ذمہ لے رکھی تھی اور بیسیوں حاجت مند اُن کے دستر خوان پر پلتے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد کون ان سب کا سہارا بنے گا؟

اسی خیال نے بنو عدی کے لوگوں کو بے چین کر دیا۔ وہ سب جمع ہو کر اپنے اس محسن کے پاس گئے اور اُن سے استدعا کی کہ ہم پر رحم کیجئے اور ہمیں چھوڑ کر نہ جائیے۔ آپ بے شک اپنے نئے دین (اسلام) پر قائم رہیئے۔ اگر کسی نے آپ پر ہاتھ اُٹھایا تو ہم اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

ان لوگوں نے رو رو کر اس قدر منتیں کیں کہ ان صاحب کا دل پسیج گیا اور وہ مکّہ ہی میں رُک گئے ــــــ یہ صاحبِ رسول جن کی بے مثل فیّاضی اور رحم دلی نے اعدائے اسلام کے دلوں کو بھی مُسخّر کر لیا تھا یہاں تک کہ وہ نہ صرف اُن کے اسلام کو گوارا کرنے پر تیار ہو گئے تھے، بلکہ اُن کی حفاظت کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے پر تُل گئے تھے حضرة نُعیم بن عبداللہ عدوی تھے۔

(۲)

سیدنا حضرت نُعیمؓ بن عبداللہ کا تعلق قریش کے خاندان بنو عدی سے تھا۔ قریش چونکہ خانۂ کعبہ کے متولّی بھی تھے اس لیے دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ مذہبی عظمت کا تاج بھی ان کے سر پر تھا۔ اپنے وسیع کام کو چلانے کے لیے انہوں نے مختلف شعبے قائم کیے تھے۔ ہر شعبے کا اہتمام جدا تھا بنو عدی کے ذمہ سفارت کا شعبہ تھا، اگر قریش کو کسی دوسرے قبیلے کے ساتھ کوئی ملکی معاملہ پیش آتا تو بنو عدی کے لوگ ہی سفیر بن کر جایا کرتے، اس کے علاوہ وہ مفاخرت کے مقابلوں میں ثالثی کے فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے۔ اس فرض کی بطریق احسن انجام دہی کے لیے انہیں فصاحت اور زورِ تقریر میں خاص مہارت حاصل کرنی پڑتی تھی۔ یہ دونوں منصب بنو عدی میں نسلاً بعد نسلٍ چلے آرہے تھے اور وہ صرف قریش میں ہی نہیں بلکہ سارے عرب میں بڑی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت سعیدؓ بن زید اور متعدد دوسری عظیم المرتبت شخصیتیں اسی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ حضرت نُعیمؓ کے والد عبداللہ بن اسید بنو عدی کے ایک آسودہ حال رئیس تھے۔ انہوں نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا، البتہ اپنے بیٹے کے لیے کافی اثاثہ چھوڑ گئے۔

حضرت نُعیمؓ کا سلسلۂ نسب یہ ہے :۔

نُعیمؓ بن عبداللہ بن اسید بن عوف بن عبید بن عویج بن عدی بن کعب۔

حضرت نُعیمؓ تاریخ میں عام طور پر "نُعیم النّحّام" کے نام سے مشہور ہیں۔ نحّام ان کا لقب تھا۔ امام حاکمؒ نے اپنی "مستدرک" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جنت میں نُعیمؓ کی نحمہ یعنی آواز سُنی۔ حضورؐ کا ارشادِ مبارک حضرت نُعیمؓ کے لیے بہت بڑی بشارت اور بہت بڑا اعزاز تھا۔ لوگوں نے اسی وقت سے اُن کو نُعیمؓ النّحام کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔

حضرت نُعیمؓ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دولت و ثروت کو اپنے گھر کی لونڈی پایا۔

اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم عطا کی تھی اس دولت کو اللوں تللوں میں اڑانے کی بجائے اپنے خاندان کی بیوہ خواتین، یتیموں اور حاجت مندوں کے لیے وقف کر دیا۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ وہ بنو عدی کی بیواؤں اور یتیموں کے مستقل کفیل تھے اور دوسرے مساکین کو مہینہ مہینہ کر کے کھانا کھلایا کرتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے قبیلے کی نہایت ہر دلعزیز شخصیت بن گئے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو انہوں نے اس پر بلا تامّل لبّیک کہا۔ حافظ ابنِ عبد البرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ حضرت نُعیمؓ کے قبولِ اسلام کے وقت صرف نو یا دس اصحاب مشرّف بہ ایمان ہوئے تھے۔ گویا حضرت نعیمؓ "سابقون الاوّلون" کی مقدس جماعت کی پہلی صف میں تھے۔ امام حاکمؒ نے "مستدرک" میں بیان کیا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو ہجرت الی الحبشہ کا مشورہ دیا تو حضرت نعیمؓ بھی ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، لیکن دوسرے اربابِ سِیَر نے امام حاکمؒ کی یہ روایت قبول نہیں کی۔ ان سب کا بیان ہے کہ حضرت نعیمؓ مہاجرینِ حبشہ میں شامل نہیں ہیں بلکہ وہ ۶ھ ہجری تک مسلسل مکّہ ہی میں مقیم رہے۔ حضرت نعیمؓ نے اپنے قبولِ اسلام کا زیادہ چرچا نہ کیا۔ اس لیے سوائے چند اہلِ حق کے دوسرے لوگ ان کے اسلام سے آگاہ نہ ہو سکے، اس طرح وہ مشرکین کے دستِ تعدّی سے بچے رہے۔

(۳)

سیّدنا حضرت عمر فاروقؓ کے قبولِ اسلام کے سلسلے کی مشہور روایت کے مطابق حضرت عمرؓ ۶ھ بعدِ بعثت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو راستے میں انہیں حضرت نُعیم النّحّام ملے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے تیور دیکھے تو پوچھا "عمر آج کدھر کا ارادہ ہے"؟ حضرت عمرؓ خشمناک لہجے میں بولے "آج اپنے دین سے منحرف ہو جانے والے اس شخص کو قتل کرنے جاتا ہوں جس نے قریش میں پھوٹ ڈال دی ہے، ہم سب کو احمق قرار دیا ہے، ہمارے معبودوں کی مذمّت کی ہے اور ہمارے دین میں کیڑے ڈالے ہیں"۔ حضرت نعیمؓ نے کہا "واللہ اے عمر تمہارے نفس نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اگر تم محمدؐ کو

قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کیا بنی عبدِ مناف تمہیں زمین پر چلنے پھرنے کے لیے جیتا چھوڑ دیں گے؟۔

حضرت عمر رضؓ :۔ مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے بھی اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا ہے کیوں نہ پہلے تمہیں ہی اس کا مزہ چکھا دوں۔

حضرت نعیم رضؓ :۔ مجھ کو تم کیا مزہ چکھاؤ گے۔ تمہیں تو اپنے گھر والوں کی خبر بھی نہیں ہے۔

حضرت عمر رضؓ :۔ میرے کون سے گھر والے؟

حضرت نُعَیم رضؓ :۔ تمہاری بہن فاطمہ رضؓ اور بہنوئی سعیدؓ بن زید، دونوں حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے ہیں اور میری نسبت تم پر ان کا زیادہ حق ہے۔

حضرت نُعَیم رضؓ کی باتیں سُن کر حضرت عمر رضؓ جوشِ غضب سے بے قرار ہو گئے اور سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے، وہاں جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے۔ حضرت فاطمہؓ بنت خطّاب اور سعیدؓ بن زید کی استقامت نے حضرت عمر رضؓ کے دل کی دنیا بدل ڈالی اور وہ سعادتِ اندوزِ ایمان ہو کر عمر بن خطّاب سے عمر فاروقِ اعظم رضؓ بن گئے۔

(۴)

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضؓ کو ہجرت الی المدینہ کا اِذن دیا تو حضرت نعیم رضؓ نے بھی ہجرت کی تیاری کی لیکن بنو عدی کے لوگ ان کے راستے میں حائل ہو گئے اور انہوں نے بصد منت حضرت نعیم رضؓ کو مکّہ ہی میں روک لیا۔ اس وقت تو انہوں نے اپنے اہلِ قبیلہ کی بات مان لی لیکن ان کے دل میں ہمیشہ ہجرت کا شرف حاصل کرنے کی آرزو مچلتی رہتی تھی۔ آخر ۶ھ ہجری میں انہوں نے ہجرت کا پختہ ارادہ کر لیا اور اپنے خاندان کے چالیس افراد کو ساتھ لے کر مدینہ منوّرہ پہنچ گئے۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تو حضورِ پُر نورؐ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی۔ آپؐ نے حضرت نعیم رضؓ سے معانقہ فرمایا اور اُن کا منہ سر چُوما۔ پھر فرمایا "نعیم تمہارا قبیلہ تمہارے حق میں میرے قبیلہ سے بہتر تھا"، انہوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! میرے

ماں باپ آپؐ پر قربان، آپؐ کا قبیلہ بہتر تھا۔"

حضورؐ نے فرمایا " وہ کیسے ؟ میرے قبیلے نے تو مجھ کو وطن سے نکال دیا لیکن تمہارے قبیلے نے تم کو وطن سے نہ نکلنے دیا۔"

حضرت نعیمؓ نے عرض کیا " یارسول اللہ ! آپؐ کی قوم آپؐ کے شرفِ ہجرت کا باعث ہوئی اور میری قوم اس سعادت کے حصول میں مانع ہوئی۔"

مدینہ آنے کے بعد حضرت نُعَیمؓ نے تمام غزوات میں سید المرسلینؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سریر آرائے خلافت ہوئے، اور شام سے معرکہ آرائیوں کا آغاز ہُوا تو حضرت نعیمؓ بھی شام جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے، اور کئی معرکوں میں رومیوں کے خلاف دادِ شجاعت دی۔ بعض اہل سِیَر نے لکھا ہے کہ انہوں نے اجنادین کی لڑائی میں شہادت پائی اور بعض کا بیان ہے کہ وہ جنگِ یرموک (۱۵ھ ہجری) میں رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک لڑکا ابراہیم اور ایک لڑکی امہ اپنی یادگار چھوڑیں۔ حضرت نعیم النحّامؓ کے گلشنِ اخلاق میں سبقت الی الاسلام، اخلاص فی الدین، جود و سخا اور شوقِ جہاد سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ جس شخص کو خود سیّد الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہو اُس کی خوش بختی اور جلالتِ قدر کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

حضرت سلیطؓ بن عمرو عامری

①

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو وہی قریش مکہ جو حضورؐ کی صداقت و امانت کے دل و جان سے معترف تھے، آپؐ کو جھٹلانے پر تُل گئے۔ ان میں بنو عامر بن لوئی کے رئیس سہیل بن عمرو پیش پیش تھے۔ یہ صاحب بڑے زبان آور اور شعلہ بیان تھے۔ ان کے زورِ خطابت اور طلاقتِ لسانی کا یہ عالم تھا کہ آناً فاناً بڑے بڑے مجمعوں کو متحرک کر دیتے تھے۔ اسی بنا پر اہلِ مکہ نے خطیبِ قریش کا لقب دے رکھا تھا۔ ذہانت و فطانت اور اثر و رسوخ میں بھی ان کا ایک خاص مقام تھا لیکن افسوس کہ دعوتِ توحید کے جواب میں انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں حق کی مخالفت کے لیے وقف کر دیں اور فتح مکہ (۸ھ ہجری) تک اسی ڈگر پر چلتے رہے، قدرت کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ جس سعادتِ عظمیٰ سے سہیل آٹھ سال تک محروم رہے، اُن کے بھائی دعوتِ اسلام کے آغاز ہی میں اس سے بہرہ ور ہو گئے اور اس مقدس جماعت کے رکن بن گئے جس کو اللہ تعالیٰ نے "اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" کہہ کر واضح الفاظ میں جنت کا حقدار ٹھہرایا ہے۔ خطیبِ قریش سہیل بن عمرو کے یہ خوش بخت بھائی حضرت سلیطؓ بن عمرو تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

سلیطؓ بن عمرو بن عبدِ شمس بن عبدِ ودّ بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لوئیؒ۔

والدہ کا نام خولہ تھا جو عمرو بن حارث کی بیٹی تھیں۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کا بیان ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت سلیطؓ بھی دوسرے اہلِ حق کی طرح مشرکین کی ستمرانیوں کا ہدف بن گئے اور کئی سال تک راہِ حق میں طرح طرح کے مصائب و آلام جھیلتے رہے۔

حافظ ابنِ حجرؒ نے "اصابہ" میں حضرت سلیطؓ کو سہیل بن عمرو کا بھتیجا لکھا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس معاملہ میں کسی وجہ سے تسامح ہوا ہے کیونکہ دوسرے تمام اربابِ سیَر اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت سلیطؓ سہیل بن عمرو کے بھائی تھے۔

حضرت سلیطؓ کی اہلیہ کا نام باختلافِ روایت یقظہ بنت علقمہ تھا۔ ("اصابہ" میں ان کا نام اُمِّ یقظہ لکھا ہے) وہ بھی ان خوش بخت خواتین میں سے ہیں جنہیں دعوتِ توحید کے ابتدائی تین سالوں کے اندر ہی قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوگیا۔ گویا دونوں میاں بیوی صحیح الفکر اور سلیم الفطرت انسان تھے۔

(۲)

جب اہلِ حق پر مشرکینِ قریش کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ مکہ سے ہجرت کرکے حبشہ چلے جائیں۔ چنانچہ ۵ سنہ اور ۶ سنہ بعدِ بعثت میں بہت سے مظلوم مسلمان راہِ حق میں اپنے گھر بار کو خیرباد کہہ کر حبشہ کے دار الغربت کو ہجرت کرگئے۔ ان مہاجرین میں حضرت سلیطؓ بن عمرو بھی تھے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت سلیطؓ نے دوسری ہجرت حبشہ (۶ سنہ بعدِ بعثت)

میں اپنی اہلیہ سمیت ہجرت کی اور دونوں میاں بیوی کئی سال تک حبشہ میں غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے یہاں تک کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے۔ جب حضورؐ کی ہجرتِ مدینہ کی خبر حبشہ پہنچی تو وہاں کے مہاجرین کے دلوں میں بھی مدینہ منورہ پہنچنے کی تڑپ پیدا ہوئی لیکن ناداری اور تہی دستی طویل بحری سفر کی راہ میں حائل تھی۔ تاہم حضرت سلیطؓ اور ان کی اہلیہ سمیت ۳۳ مردوں اور آٹھ خواتین نے مکہ معظمہ کے راستے مدینہ منورہ جانے کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ یہ تمام حضرات بخیریت مکہ پہنچ گئے۔ لیکن جب انہوں نے مدینہ منورہ جانے کا عزم کیا تو ان میں سے سات اصحاب مکہ میں روک لیے گئے اور باقی مدینہ منورہ پہنچ گئے ان میں حضرت سلیطؓ اور ان کی اہلیہ بھی شامل تھے۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ جو ۳۴ نفوس قدسی حبشہ سے مدینہ منورہ پہنچے ان میں سے چودہ کو غزوۂ بدر میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے "اصابہ" میں وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت سلیطؓ بن عمرو بھی اصحاب بدر میں سے ایک تھے۔

بدر کے بعد حضرت سلیطؓ نے اُحدؔ، احزاب اور دوسرے تمام معرکوں میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت و بسالت کی دھاک بٹھادی۔ ان کے جذبۂ اخلاص و فدویت کو حضورؐ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور انہیں نہایت عزیز جانتے تھے۔

(۳)

۶ھ ہجری میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آس پاس کے مقتدر رئیسوں اور حکمرانوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے تو ایک خط عمان کے رئیس ہوذہ بن علی حنیفی کے نام بھی لکھوایا۔ عمان اس زمانے میں ایران کا زیرِ اثر علاقہ تھا۔ ہوذہ بن علی کو کسرائے ایران نے ایک

جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اس لیے وہ ذوالتاج یا صاحب التاج کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ اپنے علاقے میں بڑے اثر و اقتدار کا مالک تھا اور ایرانی روایتوں کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ہوزہ بن علی کو خط پہنچانے کی خدمت حضورؐ نے حضرت سلیطؓ بن عمرو کے سپرد فرمائی۔ حضرت سلیطؓ نے مکتوبِ نبوی ہوزہ بن علی کو پہنچایا تو اُس نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم اور خاطر مدارت کی۔ ایک روایت کے مطابق اُس نے حضرت سلیطؓ کو انعام و اکرام اور خلعت سے بھی نوازا۔ تاہم اُس نے مکتوبِ نبوی کا جو جواب بھیجا اُس میں لکھا کہ آپ بہت اچھی چیز کی دعوت دیتے ہیں لیکن میں بھی بنو حنیفہ کا سردار اور عرب کا معزز اور مقتدر آدمی ہوں اگر آپ مجھے اپنا شریکِ اقتدار بنالیں تو مجھے اسلام قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔

زرقانیؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ہوزہ بن علی کا جواب سُنا تو فرمایا کہ اگر وہ (اسلام قبول کرنے کے عوض) زمین کا ایک چھوٹا سا قطعہ بھی مانگے تو میں نہیں دوں گا۔

سیرۃ ابنِ ہشام میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت سلیطؓ کو ثمامہ بن اثال رئیسِ نجد کے پاس بھی سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ ثمامہؓ اس وقت تو مسلمان نہ ہوئے لیکن بعد میں شرفِ ایمان سے بہرور ہو گئے اور اپنے حُسنِ کردار سے سابقہ زندگی کی تلافی کر دی۔

۱۱ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند نشینِ خلافت ہوئے تو یکایک فتنۂ ارتداد نے سارے عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صدّیقِ اکبرؓ نے بے مثال عزم و ہمت سے اس فتنے کا مقابلہ کیا اور مرتدّین کا قلع قمع کرنے کے لیے ہر طرف لشکر بھیجے۔ حضرت سلیطؓ بھی اس لشکر میں شامل ہو گئے جس کی قیادت حضرت خالد بن ولیدؓ کر رہے تھے۔ کئی خونریز معرکوں کے بعد فتنۂ ارتداد کا استیصال ہو گیا۔ اس سلسلے کی سب سے خوفناک جنگ مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کے میدان میں لڑی گئی۔ اس لڑائی میں سینکڑوں صحابہ کرامؓ اور حفّاظ قرآن نے جامِ شہادت پیا۔ ان میں حضرت سلیطؓ بن عمرو بھی شامل تھے۔ انھوں نے اپنے سینکڑوں ساتھیوں سمیت سر کٹانا منظور کیا۔ لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ اسلام پر

کوئی آنچ آئے۔ انہی سرفروشوں کی قربانی کا نتیجہ تھا کہ سفینۂ اسلام گرداب بلا سے نکل گیا اور چند سالوں کے اندر اندر فرزندانِ توحید دنیا کی سب سے بڑی قوت بن گئے۔ حضرت سلیطؓ نے اپنے پیچھے صرف ایک فرزند چھوڑا، اُن کا نام بھی سلیطؓ تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابوسبرہ بن ابی رُہم رضی اللہ عنہ

(۱)

سیّدنا حضرت ابوسبرہؓ شمعِ رسالت کے ان پروانوں میں سے ہیں جو آسمانِ فضیلت پر ماہِ کامل بن کر چمکے لیکن اربابِ سیر جن کا اصل نام معلوم کرنے سے قاصر رہے ہے —— ابی رُہم بن عبد العزیٰ کے فرزندِ سعید کی کنیت ابوسبرہ تھی. اس کنیت نے اتنی شہرت پائی کہ اُن کا اصل نام ہی لوگوں کو بھول گیا —— سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

ابوسبرہ بن ابی رُہم بن عبد العزیٰ بن ابی قیس بن عبدِ وُدّ بن نصر بن مالک بن حسل بن عامر بن لُوئی۔

حضرت ابوسبرہؓ کی والدہ کا نام "برّہ" تھا۔ جو حضرت عبد المطلب کی بیٹی اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ برّہ کا پہلا نکاح عبد الاسد بن ہلال سے ہُوا۔ اِس سے جلیل القدر صحابی حضرت ابوسلمہؓ بن عبد الاسد متولّد ہُوئے۔ حضرت ابوسلمہؓ اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہؓ کے پہلے شوہر تھے۔ غزوۂ اُحد کے کچھ عرصہ بعد جب انہوں نے جرعۂ شہادت نوش فرمایا تو حضرت اُمِّ سلمہؓ کو ازواجِ مُطہّرات کے مُقدّس زمرہ میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہُوا۔ عبد الاسد بن ہلال کے بعد برّہ کا عقد ابورُہم بن عبد العزیٰ سے ہُوا جس سے حضرت ابوسبرہؓ پیدا ہُوئے۔ اس لحاظ سے حضرت ابوسبرہؓ، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد اور حضرت ابوسلمہؓ کے اخیافی بھائی تھے۔

(۲)

حضرت ابوسبرہؓ جوان ہُوئے تو اُن کی شادی اپنے ہی خاندان (بنو عامر بن لُوئی) کے رئیس سہیل بن عمرو خطیبِ قریش کی صاحبزادی اُمِّ کلثوم سے ہوگئی۔ دونوں میاں بیوی کو

اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ توحید کا آغاز فرمایا تو دونوں نے اس پر بلا تامّل لبیک کہا۔ اُس وقت اسلام قبول کرنا آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا جو بندۂ خدا شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوتا، کفار کے قہر و غضب کا نشانہ بن جاتا۔ حضرت ابو سبرہؓ اور اُن کی اہلیہ بھی قبولِ حق کے جُرم میں مُشرکینِ مکّہ کے جور و تعدّی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ۵ھ ہجری بعد بعثت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاکشانِ اسلام کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا اذن دیا تو حضرت ابو سبرہؓ اور حضرت اُمِّ کلثوم بھی مہاجرینِ حبش کے پہلے قافلے میں شامل ہو کر حبش چلے گئے۔ بعض اہلِ سِیَر نے لکھا ہے کہ حضرت اُمِّ کلثومؓ پہلی ہجرتِ حبشہ میں نہیں بلکہ دوسری ہجرتِ حبشہ میں شوہر کے ساتھ گئیں۔ لیکن جمہور اربابِ سِیَر نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔ حضرت ابو سبرہؓ اور حضرت اُمِّ کلثوم تین ماہ بعد حبش سے مکّہ واپس آ گئے۔ اور اخنس بن شریق کی پناہ حاصل کر لی۔ اُن کی واپسی کی محرّک یہ غلط اطلاع تھی کہ مُشرکینِ قریش اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین صُلح ہو گئی ہے لیکن جب انہوں نے مکّہ آ کر دیکھا کہ مُشرکین کے رویّہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اور وہ اہلِ حق کو بدستور ستا رہے ہیں تو دونوں میاں بیوی دوبارہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔

تقریباً چھ سات سال تک حبش میں غریب الوطنی کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد دونوں حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے مکّہ واپس آ گئے اور پھر حضورؐ کا اذن پا کر ہجرتِ مدینہ کی سعادت حاصل کی۔ مدینہ میں حضرت منذرؓ بن محمد جحجبی انصاری نے انہیں اپنا مہمان بنایا۔ ہجرتِ نبویؐ کے چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم ہوئی تو حضورؐ نے حضرت ابو سبرہؓ کو حضرت سلمہؓ بن سلامہ انصاری کا دینی بھائی بنایا۔

(۳)

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں حق و باطل کا معرکۂ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت ابو سبرہؓ کو اصحابِ بدرؓ میں سے ایک ہونے کا عظیم الشان شرف حاصل ہوا۔ اس

کے بعد وہ اُحد، احزاب اور دوسرے تمام غزوات میں ملتزمِ رکابِ نبوی رہے۔ عہدِ رسالت کی شاید ہی کوئی سعادت ہو جو انہیں نصیب نہ ہوئی ہو۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو کچھ عرصہ بعد حضرت ابوسبرہؓ مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے مکہؐ آ گئے۔ حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ اصحابِ بدر میں وہ واحد صحابی ہیں جو مدینہ منورہ کی سکونت ترک کر کے مکہ میں بالاستقلال مقیم ہو گئے۔ اس کے پس منظر یا وجوہ پر اربابِ سیَر نے روشنی نہیں ڈالی

ابنِ اثیرؒ کے بیان کے مطابق حضرت ابوسبرہؓ نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اس وقت وہ مکہ معظّمہ ہی میں مقیم تھے۔ اور وہیں اُن کی آخری آرام گاہ بنی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت طلیبؓ بن عمیرؓ

①

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد تبلیغِ حق کا آغاز فرمایا تو پہلے تین سالوں میں جن پاک طینت نفوس کو قبولِ حق کی سعادت نصیب ہوئی ان میں ایک ایسے مستقیم الفطرت نوجوان بھی تھے جن کی ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی محبّت اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے خلاف کسی سے ایک لفظ سُننا بھی گوارا نہ تھا۔ ایک دن منوسہم کے ایک مشرک عوف بن صبرہ نے ان کے سامنے حضورؐ کی شان میں کچھ نامناسب الفاظ استعمال کیے۔ نوجوان جوشِ غضب سے بے قرار ہو گئے۔ پاس ہی اونٹ کے کلّے کی ایک ہڈی پڑی تھی اُسے اُٹھا کر عوف بن صبرہ پر پل پڑے یہاں تک کہ وہ لہولہان ہو گیا۔ وہ تو اس کو جان سے مار دینا چاہتے تھے لیکن کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے اس کی جان بچا دی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والہ و شیفتہ یہ نوجوان جن کے جوشِ ایمان نے انہیں ہر خطرے سے بے خوف کر دیا تھا اور جو حُرمتِ نبویؐ پر ہر وقت مر مٹنے کے لیے تیار رہتے تھے، حضورِ پُرنور کے پھوپھی زاد بھائی حضرت طُلیبؓ بن عُمیرؓ تھے۔

②

سیّدنا حضرت ابو عدی طُلیبؓ بن عمیر کا تعلق بنی عبد بن قصیّ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے۔

”طُلیبؓ بن عمیر بن وہب بن عبد بن قصیّ بن کلاب بن مُرّہ۔ ان کی والدہ حضرت اروٰیؓ بنتِ عبد المطّلب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں“۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے ”الاستیعاب“ میں بیان کیا ہے کہ بعثتِ نبویؐ کے اوائل میں حضرت طُلیبؓ کے کانوں میں توحید کی آواز پڑی تو انہوں نے اس پر بلا تامّل لبّیک کہا لیکن حضرت اروٰیؓ کچھ متامّل رہیں۔ حضرت طُلیبؓ ایک دن ان کی خدمت

میں حاضر ہوئے اور کہا، اماں جان! میں نے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اختیار کر لی ہے اور آپ کے بھائی حمزہ نے بھی، اب آپ کو اسلام قبول کرنے میں کیا عذر ہے؟ حضرت اروٰیؓ نے جواب دیا، میں یہ انتظار کر رہی ہوں کہ میری بہنیں کیا کرتی ہیں حضرت طُلَیبؓ نے عرض کیا، اماں جان! میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں، آپؐ کی رسالت کی تصدیق کریں اور گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ـ حضرت اروٰیؓ نے فوراً کہا، میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتی ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنے بڑھاپے کے باعث رسولؐ اللہ کے کام میں زبانی امداد سے کام لیتیں یعنی کہتی سُنتی تھیں اور اپنے بیٹے کو آپؐ کی اطاعت اور مدد پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اروٰیؓ نے حضرت حمزہؓ کے قبولِ اسلام (۶ بعثت) کے بعد مُشرّف بہ ایمان ہوئیں لیکن دوسرے اربابِ سیر کی روایات کے مطابق حضرت طلیبؓ اور حضرت اروٰیؓ دونوں نے بعثتِ نبویؐ کے تیسویں اور چھتیسویں مہینوں کے درمیان کسی وقت اسلام قبول کیا۔ اس وقت حضورؐ دارِ ارقم میں تشریف لے جا چکے تھے۔ (حضورؐ نے بعثت کے تیس ماہ بعد دارِ ارقم کو اپنا مرکز بنایا)

طبقاتِ ابنِ سعد میں حضرت ابوسلمہؓ سے روایت ہے کہ طُلَیبؓ بن عمیر دارِ ارقم میں اسلام لائے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی والدہ اروٰیؓ بنتِ عبدالمطلب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت اختیار کر لی اور اللہ پر ایمان لے آیا جو تمام عالم کا پروردگار ہے اور اس کا ذکر سب سے بڑا ذکر ہے۔ حضرت اروٰیؓ نے کہا، تمہارے لیے اپنے ماموں زاد بھائی کی امداد و اعانت کرنا بڑی اچھی بات ہے اور حق کی ادائیگی ہے۔ اگر ہم عورتوں میں مردوں جیسی طاقت ہوتی تو ہم بھی آپؐ کی متابعت اور مدافعت کرتے۔ طُلَیبؓ نے کہا، اماں جان! پھر آپ کو اسلام لانے سے کیا چیز روکتی ہے؟ حضرت اروٰیؓ نے اپنے فرزند کے سوال کے جواب میں فوراً کلمہ توحید پڑھ لیا اور دولتِ ایمان سے

بہرور ہو گئیں۔

(۳)

حضرت طُلَیبؓ کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ انہوں نے عوف بن صبرہ کو حضورؐ کے بارے میں ناروا الفاظ بکنے کی بنا پر زخمی کیا تو لوگوں نے حضرت اروٰیؓ کے پاس ان کی شکایت کی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اروٰیؓ کے بھتیجے ہی نہیں تھے بلکہ آقا و مولا بھی تھے۔ وہ طُلَیبؓ کا کارنامہ سُن کر بہت خوش ہوئیں اور شکایت کرنے والوں کو جواب دیا۔

ان طلیبا نصر ابن خالہ واساہ فی دمہ ومالہ

طُلَیبؓ نے اپنے ماموں کے بیٹے کی مدد کی، اور اس کے خون اور اس کے مال کی غمخواری کی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ بعض اشقیاءِ قریش نے ابو عزیز بن دارمی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ موقع پا کر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو زدوکوب کرے۔ حضرت طُلَیبؓ کے کان میں کسی ذریعے سے مشرکین کے اس ناپاک منصوبے کی بھنک پڑ گئی۔ وہ غیرتِ دینی سے شعلۂ جوّالہ بن گئے۔ فوراً ابو عزیز کی تلاش کے لیے نکل کھڑے ہوئے جب وہ مل گیا تو انہوں نے اس کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔

علاّمہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ جس زمانے میں مشرکینِ قریش نے بنو ہاشم اور بنو مُطّلِب کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر رکھا تھا، ابولہب نے چند مسلمانوں کو محبوس کر دیا۔ حضرت طُلَیبؓ کو خبر ہوئی تو وہ ماموں (ابولہب) کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ ان بےکس مظلوموں کو رہا کر دو، اُس نے صاف انکار کر دیا۔ صحابۂ کرام نے اپنے خون کے رشتوں کو اپنے رشتۂ ایمانی پر قربان کر دیا تھا، جب حضرت طُلَیبؓ کی منّت سماجت کے باوجود ابولہب مظلوم مسلمانوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہُوا تو انہوں نے اس کی بُری طرح پٹائی کر دی۔ اس پر مُشرکین نے ان کو پکڑ کر باندھ دیا۔ آخر ابولہب ہی نے جا کر ان کو چھڑایا اور اپنی بہن حضرت اروٰیؓ کے پاس

جا کر اُن کی شکایت کی، انہوں نے جواب دیا کہ طُلَیبؓ کی زندگی کا بہترین اور سعید ترین دن وہی ہے جس میں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کرے۔

جب مکّہ میں کفّار کا ظلم وستم حد سے گزر گیا تو حضورؐ نے مسلمانوں کو حبش چلے جانے کا مشورہ دیا چنانچہ حضرت طُلَیبؓ بھی دوسری ہجرتِ حبشہ (۶ سنہ بعدِ بعثت) میں ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ کئی سال وہاں غریب الوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد مدینہ منورہ آگئے اور حضرت عبداللہؓ بن سلمہ عجلانی کے مہمان ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد کفر وحق کا معرکۂ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت طَلَیبؓ نے بھی حضورؐ کے ہمرکاب ہو کر اصحابِ بدر میں سے ایک ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ابنِ اسحٰقؒ، موسیٰ بنؒ عقبہ اور ابو معشرؒ نے ان کا نام بدری صحابہ کی فہرست میں درج نہیں کیا لیکن واقدی، ابنِ مندہ اور حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ان کے بدری ہونے کا ذکر کیا ہے۔ بدر کے بعد حضرت طُلَیبؓ کے مشاغل اور سرگرمیوں کے بارے میں تمام اربابِ سیر خاموش ہیں البتہ ابنِ سعدؒ نے لکھا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں جہادِ شام پر جانے والے مجاہدین میں شامل تھے اور جنگِ اجنادین (جمادی الاولیٰ ۱۳ سنہ ہجری) میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۵ سال سے کچھ اوپر تھی۔ اولاد کوئی نہیں چھوڑی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سائبؓ بن عثمانؓ جمحی

(۱)

ہجرتِ مدینہ کے بعد سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا معمول تھا کہ جب آپؐ کسی مہم پر مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اپنے کسی جاں نثار کو شہر میں اپنا قائم مقام مقرر فرما کر چھوڑ جاتے، عام طور پر اس شرف سے کوئی ایسے صاحب ہی بہرہ مند ہوتے جن کو بارگاہِ نبوّت میں درجۂ اختصاص حاصل ہوتا۔ علاّمہ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ ربیع الاوّل ۲ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بواط کے لیے تشریف لے گئے تو مدینہ منوّرہ میں اپنی نیابت کے لیے جن صاحب کو منتخب فرمایا وہ بیس اکیس برس کے ایک مہاجر نوجوان تھے۔ اگرچہ اُن کا جوشِ ایمان اور ولولۂ شباب میدانِ جہاد میں حضورؐ کی ہمرکابی کا تقاضا کرتا تھا لیکن اپنے آقا و مولاؐ کے حکم کی تعمیل میں انھوں نے مدینہ منوّرہ میں ہی رہ کر حضورؐ کی نیابت کا فرض انجام دیا۔ ——— یہ جوان رعنا جن کو عنفوانِ شباب میں ہی اتنا عظیم شرف حاصل ہو گیا، حضرت سائبؓ بن عثمانؓ تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت سائبؓ قریش کے خاندان بنو جمح کے چشم و چراغ تھے اور جلیل القدر صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کے فرزندِ سعادت مند تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔

"سائبؓ بن عثمانؓ بن مظعون بن حبیب بن وہب بن خدافہ بن جمح بن عمرو بن ہنیص بن کعب بن لُوئیؓ بن غالب۔

والدہ کا نام خولہ بنتِ حکیم تھا۔ وہ بنو سلیم سے تھیں۔ نسب نامہ یہ ہے۔ خولہ بنتِ حکیم بن اُمیّہ بن اوقص بن

مرّہ بن ہلال بن فالح بن ذکران بن ثعلبہ بن بہثہ بن سلیم۔

حضرت سائبؓ ابھی کم سن ہی تھے کہ اُفقِ مکّہ سے خورشیدِ رسالت کا طلوع ہُوا۔ اُن کے والد حضرت عثمانؓ بن مظعون اور والدہ خولہؓ بنت حکیم دونوں کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو ان دونوں نے بلا تامّل اس پر لبّیک کہا اور السابقون الاولون کی مقدس جماعت میں داخل ہو گئے۔ کمسن سائبؓ نے بھی اپنے سعید الفطرت والدین کی پیروی کی۔ اُس زمانے میں اسلام قبول کرنا کوئی آسان کام نہ تھا بلکہ شہادت گاہ عشق میں قدم رکھنے کے مترادف تھا۔ جو شخص سعادتِ اندوزِ ایمان ہوتا کفّار کے قہر و غضب کا نشانہ بن جاتا۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بھی یہی حال ہُوا۔ جب مکّہ میں اہلِ حق کے لیے حالات سخت ناسا عد ہو گئے تو ۵ھ بعد بعثت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستم زدہ مسلمانوں سے فرمایا:۔

لَوْ خَرَجْتُمْ اِلٰی اَرْضِ الْحَبَشَۃِ فَاِنَّ بِھَا مَلِکًا لَا یُظْلَمُ عِنْدَہٗ اَحَدٌ وَھِیَ اَرْضُ صِدْقٍ حَتّٰی یَجْعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ فَرَجًا مِمَّا اَنْتُمْ فِیْہِ۔

(”بہتر ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ، وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو دور کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہیں قیام کرو“)

حضورؐ کے ارشاد کے مطابق سب سے پہلے گیارہ مردوں اور چار خواتین نے حبش کی راہ لی۔ ان اوّلین مہاجرینِ حبشہ میں حضرت عثمانؓ بن مظعون بھی شامل تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی اور بیٹے کو مکّہ میں خدا کے سُپرد کیا اور حبش کے دار الغربت میں پہنچ گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ان مہاجرین کو خبر ملی کہ رسولِ اکرمؐ اور کفّار کے درمیان صُلح ہو گئی ہے کیونکہ کفّار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ خبر سُن کر سب کے سب یا ان میں سے بیشتر مہاجرین عازمِ مکّہ ہو گئے۔ شہر کے قریب پہنچ کر معلوم ہُوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ باہم مشورے کے بعد انہوں نے طے کیا کہ اب واپس جانا مناسب نہیں چنانچہ

ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کی پناہ لے کر شہر میں داخل ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے ولید بن مغیرہ کی پناہ لی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ دوسرے مسلمان بدستور مشرکین کا ہدفِ ستم بنے ہوئے ہیں تو انہوں نے ولید کی پناہ واپس کر دی اور پہلے کی طرح بلاکشانِ اسلام میں شامل ہو گئے۔ جب مشرکین کا ظلم شدید سے شدید تر ہو گیا تو ۶ھ بعد بعثت میں حضورؐ نے پھر ہدایت فرمائی کہ یہ مظلوم لوگ حبش ہی کی طرف ہجرت کر جائیں چنانچہ تقریباً ایک سو ذکور و اناث پر مشتمل ایک قافلہ عازمِ حبش ہو گیا۔ اس قافلے میں حضرت عثمانؓ بن مظعون اور اُن کے فرزندِ سعید حضرت سائبؓ بھی شامل تھے۔ اللہ کے یہ پاکباز بندے کئی سال تک حبش میں غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ ان میں سے باختلاف روایت ۳۲ یا ۳۸ صحابہ وصحابیات سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصہ پہلے یا کچھ عرصہ بعد حبش سے واپس مکّہ معظمہ آ گئے اور پھر سوائے ان حضرات کے جنہیں اہلِ مکّہ نے زبردستی وہاں روک لیا۔ باقی سب وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ پہنچ گئے۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون بھی اپنے فرزند اور بھائیوں کے ساتھ ارضِ مکّہ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر مدینہ منوّرہ آ گئے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون مکّہ سے اس طرح رخصت ہوئے کہ ان کے خاندان کا ایک فرد بھی وہاں نہ رہا اور ان کے مکانوں میں تالے پڑ گئے۔

(۳)

ہجرت الی المدینہ کے وقت حضرت سائبؓ کی عمر انیس برس کے لگ بھگ تھی حضرت عثمانؓ بن مظعون نے اپنے فرزندِ سعادت مند کی تربیّت ایسے عمدہ انداز سے کی تھی کہ وہ اعلیٰ درجہ کے قدر انداز اور شمشیر زن بن گئے تھے۔ مدینہ منوّرہ میں اس خاندان کو حضرت عبداللہؓ بن سلمہ عجلانی نے اپنا مہمان بنایا۔ کچھ عرصہ بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ بن مظعون اور ان کے بھائیوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے وسیع قطعاتِ زمین مرحمت فرمائے۔ حضورؐ نے ہجرت کے چھٹے یا ساتویں مہینے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت سائبؓ کو حضرت حارثہؓ بن سراقہ انصاری کا دینی بھائی بنایا۔ ربیع الاوّل ۲ھ ہجری میں حضورؐ غزوہ بواط کے لیے تشریف لے گئے

تو حضرت سائبؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنایا۔ یہ روایت ابنِ ہشام کی ہے بعض دوسری روایات میں حضرت سعدؓ بن معاذ کا نام بھی آیا ہے۔

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں حق وباطل کا معرکۂ اوّل بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت عثمانؓ بن مظعون اور حضرت سائبؓ دونوں نے بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ رحمتِ عالمؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ دونوں باپ بیٹے سر سے کفن باندھ کر لڑے اور شجاعت و بسالت کا حق ادا کر دیا۔

غزوۂ بدر کے چند دن بعد حضرت عثمانؓ بن مظعون سخت علیل ہو گئے۔ ان کے انصاری بھائی اور اہلِ خاندان نے بڑی دلسوزی کے ساتھ تیمارداری کی لیکن ان کا مرض روز بروز شدت اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اخیر ۲ھ ہجری میں انہوں نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی وفات کی خبر سُن کر سخت صدمہ ہُوا۔ آپؐ بادیدۂ گریاں حضرت ام العلا انصاریہؓ کے گھر تشریف لے گئے جہاں حضرت عثمانؓ نے وفات پائی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ جُھک کر میّت کی پیشانی کو دیا اور فرمایا

"ابو السائبؓ میں تم سے جدا ہوتا ہوں۔ تم دنیا سے اس طرح رخصت ہُوئے کہ تمہارا دامن ذرہ برابر اس سے آلودہ نہ ہونے پایا۔"

شفیق باپ کی جُدائی سے حضرت سائبؓ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا لیکن انہوں نے بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیا اور پہلے سے دوچند جوش کے ساتھ اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ حضرت سائبؓ نے اُحدؓ، احزاب اور دوسرے تمام معرکوں میں بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ دادِ شجاعت دی اور اپنی قدر اندازی کی دھاک بٹھا دی۔

۱۱ھ ہجری میں آفتابِ رسالت اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں غروب ہُوا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند نشینِ خلافت ہُوئے تو دفعتہً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ اس موقع پر صدیق اکبرؓ نے بے مثال عزم و ہمت اور قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کیا اور مرتدین

کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ فتنۂ ردّہ کے استیصال کے سلسلہ میں بہت سے معرکے پیش آئے۔ ان میں سب سے زیادہ خونریز یمامہ کی لڑائی تھی جو مسیلمہ کذّاب کے خلاف لڑی گئی۔ طبری نے جنگِ یمامہ کی بابت لکھا ہے

لم یلق المسلمون حربًا مثلها قط۔

(مسلمانوں کو اس سے زیادہ سخت معرکہ کبھی پیش نہیں آیا)

اس معرکے میں مسلمانوں کی قیادت حضرت خالدؓ بن ولید کر رہے تھے اور حضرت سائبؓ بھی ان کے لشکر میں شامل تھے۔ وہ اس شان سے لڑے کہ شجاعت بھی آفریں پکار اٹھی عین معرکۂ کارزار میں شدید زخمی ہوکر گر پڑے۔ مسلمان انہیں اٹھا کر خیمے میں لے گئے اور علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن زخم بگڑتا ہی چلا گیا اور چند دن بعد وہ خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ اس وقت تیس سال سے کچھ اوپر عمر تھی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ذوالشمالین رضؓ

اصل نام عمیر تھا اور کنیت ابو محمد تھی، لیکن انہوں نے تاریخ میں ذوالشمالین کے لقب سے شہرت پائی۔ نسبی تعلق بنو خزاعہ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

عمیر بن عبد عمرو بن نضلہ بن عمرو بن غبشان بن سلیم بن مالک بن افصیٰ بن حارثہ بن عمرو بن عامر خزاعی۔

ان کے والد عبد عمرو نے اپنا قبیلہ چھوڑ کر مکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور عبد الحارث بن زہرہ سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ عبد الحارث نے اپنی بیٹی نعمیٰ کا نکاح عبد عمرو سے کر دیا تھا اسی کے بطن سے عمیر ذوالشمالین پیدا ہوئے۔ ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا اور جب ہجرت کا اذن ہوا تو ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ جا پہنچے۔ ان کا شمار مہاجرین حلفائے بنی زہرہ میں ہوتا ہے۔

مدینہ میں حضرت ذوالشمالینؓ کو حضرت سعد بن خیثمہ انصاریؓ نے اپنا مہمان بنایا۔ چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت ذوالشمالینؓ کو یزیدؓ بن حارث خزرجی انصاری (معروف بہ ابنِ فسحمؓ) کا اسلامی بھائی بنایا۔ یہ دونوں بھائی بڑے ذوق شوق سے غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور دونوں مردانہ وار لڑتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ حضرت ذوالشمالینؓ نے ابو اسامہ جشمی کے ہاتھ سے شہادت پائی اور یزیدؓ بن حارث نے طعیمہ بن عدی (یا نوفل بن معاویہ) کے ہاتھ سے جامِ شہادت پیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت فضلؓ بن عباسؓ

ہمرکابِ رسول اللہؐ

(۱)

سنہ۱۰ ہجری میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مکّہ معظّمہ تشریف لے گئے تو لوگوں نے دیکھا کہ آپؐ نے اپنے مرکب ہمایوں پر ایک حسین وجمیل نوجوان کو بٹھار کھا ہے جن کے رُخِ تاباں سے نور کی شعاعیں اسطرح پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں کہ کوئی اُس کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حج پر آنے والے مجمع میں بنو خثعم کی ایک نہایت خوش جمال خاتون بھی تھیں۔ اُن کی نظر حضورؐ کے ردیف نوجوان کے چہرے پر پڑی تو وہیں ٹِک کر رہ گئی۔ خاتون کو حضورؐ سے کوئی مسئلہ پوچھنا تھا اس لیے وہ آپؐ کی سواری کے بہت قریب کھڑی تھیں اور حج پر ہونے کی وجہ سے ان کا چہرہ بے نقاب تھا۔ حضورؐ کے ردیف نوجوان کی نظر خاتون پر پڑی تو وہ بھی ان کی طرف بغور دیکھنے لگے۔ حضورؐ نے نوجوان کی ٹھوڑی پکڑ کر ان کا چہرہ دوسری طرف کر دیا لیکن تھوڑی دیر بعد نوجوان کی نظریں اُن خاتون کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایسا دو تین مرتبہ ہُوا تو حضورؐ نے نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا :۔

”برادرِ عزیز! آج کے دن جو شخص اپنی آنکھ زبان اور کان پر قابو رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔“

حضورؐ کا ارشاد گرامی سُن کر نوجوان نے فوراً اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا اور پھر بھول کر بھی اُس طرف نہ دیکھا۔ یہ نوجوان رعنا جن کو حجۃ الوداع کے تاریخی موقعہ پر فخرِ موجودات سیّدالمرسلینؐ کا ردیف بننے کا شرف حاصل ہُوا اور جنہوں نے حضورؐ کے ارشادِ گرامی کے سامنے فوراً سرِ تسلیم خم کر

دیا۔ حضرت فضلؓ بن عباسؓ تھے۔

(۲)

سیدّنا ابو محمد فضلؓ بن عباسؓ کے حسب و نسب کے بارے میں یہی کہہ دینا کافی ہے کہ دودمان ہاشمی کے چشم و چراغ تھے اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبد المطّلب کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام ام الفضل لُبابہؓ تھا۔ ان کی جلالتِ قدر کا اندازہ حافظ ابن عبد البرؒ اور علامہ ابنِ اثیرؒ کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ پہلی خاتون تھیں جو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد سعادت اندوزِ ایمان ہوئیں اُمّ المومنین حضرت میمونہؓ بنتِ حارث حضرت فضلؓ کی خالہ تھیں۔ اُن کے والدِ گرامی حضرت عباسؓ بھی اسلام قبول کر چکے تھے لیکن انہوں نے بوجوہ کئی سال تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔ علاّمہ ابنِ سعدؒ کاتب الواقدی نے حضرت ابو رافعؓ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مَیں حضرت عباسؓ کا غلام تھا اور اسلام ہمارے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ حضرت عباسؓ، ان کی اہلیہ ام الفضلؓ اور مَیں سب مسلمان ہو چکے تھے مگر حضرت عباسؓ اپنا اسلام چُھپاتے ہُوتے تھے۔ حضرت فضلؓ بھی بعثتِ نبویؐ کے اوائل ہی میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے لیکن اپنے والدِ گرامی کی طرح انہوں نے بھی اسلام کا چرچا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فتح مکّہ سے کچھ عرصہ پہلے حضرت عباسؓ نے ارضِ مکّہ کو الوداع کہا اور ہجرت کر کے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں مدینہ منوّرہ پہنچ گئے۔ اہل و عیال بھی ہمراہ تھے۔ حضرت عباسؓ اپنے فرزندوں کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہُوتے تو حضورؐ بے حد مسرور ہُوئے اور سب کو دعائے خیر و برکت سے نوازا۔

حضرت فضلؓ کو سب سے پہلے فتح مکّہ کے موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہُوا۔ اِس کے بعد وہ بڑے جوش اور جذبہ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوتے اور تحیّر خیز سرفروشی کا مظاہرہ کیا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ جب دشمن کی بے پناہ تیراندازی سے مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت فضلؓ اس وقت بھی چند دوسرے جانبازوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں کوہِ استقلال

بن کر کھڑے تھے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تیروں کی زد سے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ ان سرفروشوں کی ہمتِ مردانہ ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان بہت جلد واپس پلٹ پڑے اور مشرکین بنو ہوازن کو عبرتناک شکست دی۔

(۳)

حجۃ الوداع میں حضرتِ فضل رضؓ کو یہ عظیم سعادت نصیب ہوئی کہ سیّد الانام رحمتِ دوعالم صلعم نے انہیں اپنی سواری پر اپنے ساتھ بٹھایا، اس طرح وہ ردفِ رسولُ اللہؐ (ہمرکابِ رسول اللہؐ) کے قابلِ فخر لقب سے مشہور ہو گئے۔ اسی موقع پر وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ مسندِ ابو داؤد میں ہے کہ حجۃ الوداع میں رمی جمار کے وقت حضرت فضلؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشتِ مُبارک کے پیچھے کھڑے تھے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر چادر تان رکھی تھی تاکہ آپؐ دھوپ سے بچے رہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کے آخری دنوں میں جن اصحابؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی حضرت فضلؓ بھی ان میں شامل تھے حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ حضورؐ جس دن آخری خطبہ دینے کے لیے حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے تو حضرت فضلؓ نے ایک دوسرے صاحب کے ساتھ مل کر آپؐ کو سہارا دے رکھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت فضلؓ ہی نے عامۃ المسلمین کے سامنے اعلان کیا تھا کہ آج رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپؐ کے جن اعزّہ کو جسدِ اطہر کو غسل دینے کی سعادت نصیب ہوئی ان میں سے ایک حضرت فضلؓ تھے۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "استیعاب" میں بیان کیا ہے کہ حضرت فضلؓ پانی ڈالتے تھے اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ غسل دیتے تھے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عہدِ صدیقی میں قیصرِ روم سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت فضلؓ شام جانے والے مجاہدینِ اسلام کے لشکر میں شامل ہو گئے اور رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ بعض اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ حضرت فضلؓ

نے طاعون عمواس (۱۸-۱۷ھ ہجری) میں وفات پائی اور بعض کا قول ہے کہ انہوں نے جنگِ اجنادین (۱۳ھ ہجری) میں مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت فضلؓ نے اپنے پیچھے صرف ایک لڑکی اُمِّ مکتومؓ چھوڑی۔ اُن کا پہلا نکاح سیدنا حضرت حسنؓ بن علیؓ سے ہوا۔ انہوں نے طلاق دے دی تو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے عقدِ نکاح میں آئیں۔

حضرت فضل بن عباسؓ کا شمار راویانِ حدیث صحابہؓ کے طبقۂ پنجم میں ہوتا ہے ان سے چوبیس احادیث مروی ہیں۔ ان کے رواۃ میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ اور سلیمان بن یسارؒ، شعبیؒ اور عطاء بن ابی رباحؒ جیسے اکابر تابعین شامل ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ

١

غزوہ حنین (۸ ہجری) میں اہلِ حق کو فتح مبین نصیب ہوئی تو ہزیمت خوردہ مشرکین کے تین گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ قلعۂ طائف میں پناہ گزین ہوا، دوسرا بطن نخلہ کی طرف چلا گیا اور تیسرا وادئ اوطاس میں بنوہوازن کے آزمودہ کار سردار دُرید بن الصمہ کی قیادت میں پھر مجتمع ہونے لگا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اوطاس میں جمع ہونے والے مشرکین کے جارحانہ عزائم کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اپنے ایک جاں نثار ابوعامرؓ عبید بن سلیم کو ایک جمعیت دے کر مشرکینِ اوطاس کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت ابوعامرؓ طوفان کی طرح وادئ اوطاس کی طرف بڑھے اور دُرید بن صمہ کو قتل کرکے اس کے لشکر کو عبرتناک شکست دی تاہم اثنائے جنگ میں بنوجشم کے ایک شخص کے تیر سے وہ خود سخت زخمی ہو گئے۔ مجاہدین اسلام میں ابوعامرؓ کے بھتیجے بھی موجود تھے۔ چھوٹے سے قد کے یہ دُبلے پتلے صاحب بڑے دم خم کے آدمی تھے انہوں نے ابوعامر کو مجروح ہو کر گرتے دیکھا تو دوڑ کر ان کے پاس گئے اور پوچھا، چچا جان آپ کو کس نے زخمی کیا؟ ابوعامرؓ نے اشارے سے بتایا تو وہ تیر چلانے والے جشمی پر باز کی طرح جھپٹے۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ان صاحب نے اس کا تعاقب کیا اور غیرت دلائی کہ اس طرح بھاگنا بزدلوں کا کام ہے۔ وہ تاؤ کھا کر رُک گیا اور تلوار نکال کر مقابلہ کرنے لگا۔ حضرت ابوعامرؓ کے شجاع بھتیجے نے اس کو چند لمحوں میں خاک و خون میں لوٹا دیا اور واپس آکر حضرت ابوعامرؓ کو خوشخبری سنائی کہ چچا جان اللہ نے آپ کے دشمن کو ہلاک کر ڈالا۔ حضرت ابوعامرؓ نے فرمایا، میرے زانو سے تیر نکالو، انہوں نے تیر باہر کھینچا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا اور حضرت ابوعامرؓ کی حالت سخت نازک ہو گئی۔ دمِ نزع انہوں نے سعادتمند بھتیجے کو اپنا جانشین

بتایا اور انہیں وصیت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا اور میرے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کرنا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

شہید راہِ حق حضرت ابو عامرؓ کے بھتیجے نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر لڑائی کے تمام واقعات عرض کیے اور ساتھ ہی حضرت ابو عامرؓ کی وصیت بیان کی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت وضو فرمایا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی:

"اے اللہ عبید بن سلیم (ابو عامر) کو بخش دے اور اس کو جنت میں بہت سی مخلوق پر برتری عطا کر۔"

حضرت ابو عامرؓ کے بھتیجے نے عرض کیا، یا رسول اللہ میرے لیے بھی دعا کریں۔

حضورؐ نے پھر دعا کی:-

"الٰہی عبداللہ بن قیس کی خطائیں بخش دے اور قیامت کے دن (جنت میں) اس کو باعزت داخلہ سے شرف یاب کر۔"

حضرت ابو عامر شہیدؓ کے یہ خوش بخت برادر زادے جن کے لیے فخرِ موجودات خیر الخلائق سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں باعزت داخلہ کی دعا مانگی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ تھے ——— انہی کا نام عبداللہؓ بن قیس تھا۔

(۲)

سیدنا حضرت عبداللہؓ بن قیس جنہوں نے تاریخ میں اپنی کنیت ابو موسیٰ سے شہرت پائی، قبیلۂ اشعر سے تعلق رکھتے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ابو موسیٰ عبداللہؓ بن قیس بن سلیم بن حضار بن حرب بن عامر بن عنز بن بکر بن مذر بن وائل بن ناجیہ بن جماہر بن الاشعر بن ادد بن زید بن یشجب۔

حضرت ابو موسیٰؓ یمن کے رہنے والے تھے اور اپنے قبیلے کے ذی اثر رؤسا

میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔

خورشیدِ رسالتؐ فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تو چند سال کے اندر اندر اس کی کرنیں سرزمینِ عرب کے دُور دراز گوشوں پر بھی پڑنے لگیں جن میں یمن بھی شامل تھا۔ حضرت ابو موسیٰؓ تجارت کے سلسلے میں مختلف ملکوں میں خوب گھومے پھرے تھے اور نئے لوگوں سے میل جول اور مختلف مذاہب کے مشاہدہ سے ان کا ذہنی افق وسیع ہو گیا تھا۔ مکہ سے اٹھنے والی صدائے توحید ان کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے بلا تامل اس پر لبیک کہا اور پھر بسرعت تمام عازمِ مکہ ہو گئے۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر بیعت کا شرف حاصل کیا اور بنو عبد شمس سے حلیفانہ تعلق قائم کر کے وطن کو مراجعت کی۔ وطن پہنچ کر انہوں نے بڑے جوش و خروش سے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں بنو اشعر کی ایک معقول تعداد کو دائرۂ اسلام میں لے آئے ان میں ان کی والدہ حضرت طیبہؓ بنت وہب بھی تھیں جو قبیلہ عک سے تعلق رکھتی تھیں۔ حافظ ابن کثیرؒ کا بیان ہے کہ جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے ہیں تو وہ اپنے پچاس سے زائد نو مسلم رفقاء کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہو کر عازمِ مدینہ ہوئے۔ اتفاق سے ان کی کشتی شاہی کشتیوں کے ساتھ حبشہ پہنچ گئی (یا بروایتِ دیگر طوفان اور بادِ مخالف نے اسے حجاز کے بجائے حبشہ پہنچا دیا)۔ وہاں ان کی ملاقات مکہ کے مہاجرین کرامؓ سے ہوئی تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے حضرت ابو موسیٰؓ کو مشورہ دیا کہ آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ یہیں ٹھہر جائیں۔ جب مدینہ میں حالات سازگار ہو جائیں گے تو سب ایک ساتھ مدینۃ النبیؐ چلیں گے۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰؓ اپنے ساتھیوں سمیت حبشہ ہی میں ٹھہر گئے۔ اواخر سنہ ۶ ہجری میں مکہ کے مہاجرین کرامؓ حبشہ سے عازمِ مدینہ ہوئے تو حضرت ابو موسیٰؓ اور ان کے ساتھی بھی اس قافلے میں شریک ہو گئے۔ یہ تمام حضرات اس وقت بارگاہِ رسالت میں پہنچے جب خیبر فتح ہو چکا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان ملاکشانِ اسلام کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے،

ہر ایک سے معانقہ فرمایا، سب کی پیشانی چومی اور ہر ایک کو خیبر کے مالِ غنیمت سے حصہ عطا فرمایا۔

(۳)

مدینہ منورہ آنے کے بعد حضرت ابو موسیٰؓ اپنے وقت کا بیشتر حصہ فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے میں گزارتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سفر ہو یا حضر ہر وقت بارگاہِ نبوی میں حاضر رہیں۔ ایک مرتبہ پانچ رفقاء کے ساتھ ایک غزوہ میں حضورؐ کے ہمرکاب تھے ان چھ کے پاس صرف ایک اونٹ تھا۔ باری باری اس پر سوار ہوتے تھے۔ پیادہ پا چلتے چلتے سب کے پاؤں پھٹ گئے اور ناخن گر گئے تو سب نے پاؤں پر چیتھڑے لپیٹ لیے۔ ایک اور غزوہ میں فوج نے رات کو ایک جگہ پڑاؤ ڈالا یہ دشمن کا علاقہ تھا، حضرت ابو موسیٰؓ کو حضورؐ کی حفاظت کے خیال سے نیند نہ آتی تھی اٹھ کر آپؐ کے خیمہ مبارک میں گئے وہاں حضورؐ کو نہ پایا تو بے چین ہو گئے اور آپ کی تلاش میں نکلے۔ راستے میں ایک اور صحابی کو اسی فکر میں سرگرداں پایا۔ دونوں آگے بڑھے، اتنے میں حضورؐ واپس تشریف لاتے نظر پڑے۔ دونوں نے عرض کیا:

"یارسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپؐ پر قربان، یہ دشمن کا علاقہ ہے ہمیں ہر وقت آپ کی سلامتی کی فکر رہتی ہے اس لیے آپ کو جس وقت کوئی ضرورت پیش آئے تو کسی کو حکم دے دیا کریں وہ ساتھ ہو جایا کریگا"

رمضان ۸ھ ہجری میں حضرت ابو موسیٰؓ کو ان دس ہزار سرفروشوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو فتح مکہ کے موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ اس کے بعد انہوں نے غزوۂ حنین میں دادِ شجاعت دی۔ پھر اپنے چچا حضرت ابو عامر اشعریؓ کی قیادت میں اوطاس میں جمع ہونے والے مشرکین کی سرکوبی کے لیے گئے۔ اس واقعہ کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے۔

۹ھ ہجری میں غزوۂ تبوک کی تیاری شروع ہوئی تو حضرت ابو موسیٰؓ کے رفقاء نے ان کو بارگاہِ نبوت میں اس غرض سے بھیجا کہ کچھ سواریاں حاصل کریں۔ اتفاق

سے اس وقت حضورؐ حالتِ جلال میں تھے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے سواریوں کے لیے عرض کیا، تو آپؐ نے غصہ سے فرمایا، "میں تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا۔" حضرت ابو موسیٰؓ دل شکستگی کے عالم میں واپس آئے اور اپنے ساتھیوں کو حضورؐ کے جواب سے آگاہ کیا۔ ان کو زیادہ غم اس بات کا تھا کہ معلوم نہیں حضورؐ ان سے کیوں ناراض ہیں لیکن ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ حضرت بلالؓ پکارتے ہوئے آئے "عبداللہ بن قیس چلو تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا ہے۔" حضرت ابو موسیٰؓ فوراً حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گئے۔ حضورؐ نے انہیں دو اونٹ مرحمت فرمائے وہ انہیں لے کر اپنے اہلِ قبیلہ کے پاس آئے اور ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا "شاید تم سوچو کہ پہلے میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا وہ بہانہ سازی تھی۔ خدا کی قسم ایسا نہیں، تم میرے ساتھ چند آدمی کسی ایسے شخص کے پاس بھیجو جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنا تھا۔"

اہلِ قبیلہ نے کہا، "خدا کی قسم ہم آپ کو سچا سمجھتے ہیں تاہم آپ اپنی بات کی تصدیق ضرور کرانا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔" چنانچہ حضرت ابو موسیٰؓ اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر گئے اور حضورؐ کا ارشاد سننے والے اصحاب سے واقعہ کی تصدیق کرائی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد ایک دن بنو اشعر کے دو صحابی حضرت ابو موسیٰؓ کو ساتھ لے کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ انہیں کسی عہدے پر فائز کیا جائے۔ حضورؐ اس وقت مسواک کر رہے تھے۔ آپؐ نے ان کی درخواست سنی تو مسواک چھوڑ دی اور حضرت ابو موسیٰؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ابو موسیٰ ابو موسیٰ؟" انہوں نے عرض کیا، "یا رسول اللہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ میرے ساتھی کسی عہدے کے خواہشمند ہیں۔"

حضورؐ نے فرمایا: "جو کسی عہدہ کی خواہش کرے گا میں اس کو اس

عہدے پر ہرگز مامور نہ کروں گا لیکن ابو موسیٰ تم یمن جاؤ۔ میں تم کو وہاں کا عامل مقرر کرتا ہوں۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابو موسیٰؓ کو یمن کے ضلع مارب کا حاکم مقرر فرمایا اور بعض اہل سِیَر کا بیان ہے کہ آپؐ نے ان کو زبید اور ساحل کے علاقے کا عامل بنایا۔ تعلیمِ قرآن اور تحصیلِ زکوٰۃ ان کے خاص فرائض تھے۔ یمن کے دوسرے حصوں پر حضورؐ نے حضرت معاذؓ بن جبل انصاری کو حاکم بنایا اور دونوں کو رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ اپنے علاقے کے لوگوں پر سختی نہ کرنا۔ اپنا رویہ ان کے ساتھ نرم رکھنا تاکہ وہ خوش رہیں اور تم سے نفرت نہ کرنے لگیں اور باہم میل جول سے رہنا۔ اس موقع پر حضرت ابو موسیٰؓ نے حضورؐ سے پوچھا "یا رسول اللہ ہمارے ملک میں دو قسم کی شراب بنائی جاتی ہے، ایک جَو سے جسے مزر کہتے ہیں اور دوسری شہد سے جس کو بتع کہتے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

حضورؐ نے فرمایا: "ہر وہ شے جو نشہ لائے حرام ہے۔" (بخاری کتاب المغازی)

حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت معاذؓ بن جبل یمن پہنچ کر اپنے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دینے لگے۔ چند ماہ بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تو حضرت ابو موسیٰؓ بھی یمن سے مکہ آئے۔ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے پوچھا: "عبداللہ بن قیس کیا تم حج کے ارادے سے آئے ہو؟"

انہوں نے عرض کیا: "ہاں یا رسول اللہ"

حضورؐ نے فرمایا: "نیت کیا تھی؟"

عرض کیا: "میں نے دل میں کہا تھا کہ جو رسول اللہؐ کی نیت ہے وہی میری نیت ہے۔"

حضورؐ نے پوچھا: "کیا قربانی کے جانور اپنے ساتھ لائے ہو؟"

عرض کیا: "نہیں۔"

ارشاد ہوا کہ تم طواف اور سعی کر کے احرام کھول دو۔

حضرت ابو موسیٰؓ نے تعمیل ارشاد کی اور پھر اپنے عہدے پر واپس یمن آ گئے۔ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ نبوت کے ایک جھوٹے مدعی اسود عنسی نے سارے ملک میں شورش برپا کر دی۔ اس شورش نے اس قدر زور باندھا کہ حضرت معاذؓ بن جبل مجبوراً اپنے مرکزِ حکومت جند سے نکل کر حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس مارب آ گئے۔ جب مارب بھی باغیوں کے حملوں کی زد میں آ گیا تو دونوں حضر موت کی طرف چلے گئے۔ اسود عنسی جلد ہی حضرت فیروز دیلمیؓ اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ اس کے قتل کی خبر مدینہ منورہ پہنچی تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ یہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دن تھے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو فتنۂ ارتداد کی آگ سارے عرب میں بڑی شدت سے بھڑک اٹھی۔ صدیق اکبرؓ نے اس فتنہ کا مقابلہ کمال درجے کے عزم اور حوصلے سے کیا اور چند ماہ کے اندر اندر اس کا استیصال کر دیا اس کے ساتھ ہی یمن اور دوسرے تمام علاقے از سرِ نو خلافتِ اسلامیہ کے زیرِ تسلط آ گئے۔ حضرت ابو موسیٰؓ بھی حضر موت سے اپنے عہدے پر واپس آ گئے اور خلافتِ فاروقی کی ابتداء تک اپنے فرائض نہایت احسن طریقے سے انجام دیتے رہے۔

(۴)

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو عراق عرب کی تسخیر پر مامور فرمایا تو حضرت ابو موسیٰؓ کو بھی شوقِ جہاد نے بے چین کر دیا۔ انہوں نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا اور ایک مجاہد کی حیثیت سے حضرت سعدؓ کے لشکر میں جا شامل ہوئے۔ طبریؒ کا بیان ہے کہ عراقِ عرب کے اکثر حصوں کی تسخیر کے بعد حضرت سعدؓ نے ۱۷ھ میں الجزیرہ (دریائے دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقے) پر لشکر کشی کی تو حضرت ابو موسیٰؓ کو الجزیرہ کے شہر نصیبین کی تسخیر پر مامور کیا۔ وہ اس شہر پر پرچم اسلام بلند کر کے مظفر و منصور واپس آئے۔

اسی سال امیرالمؤمنین حضرت عمر فاروق ؓ نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو معزول کر کے حضرت ابوموسیٰؓ کو ان کی جگہ بصرہ کا والی (گورنر) مقرر کیا۔ بصرہ میں اپنے فرائض سنبھالنے کے ساتھ ہی ان کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جس میں وہ ایک اعلیٰ درجے کے منتظم اور ایک عظیم فاتح کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ واقدی، مدائنی، اعثم کوفی اور بعض دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ ولایتِ بصرہ پر فائز ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد حضرت ابوموسیٰؓ کو دربارِ خلافت سے حکم موصول ہوا کہ وہ خوزستان پر لشکر کشی کریں جہاں فارسیوں نے اہواز، مناذر، تستر اور کئی دوسرے مقامات پر مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لیے فوج جمع کی ہے۔ حضرت ابوموسیٰؓ یہ حکم موصول ہوتے ہی ایک فوج لے کر سب سے پہلے خوزستان کے سب سے بڑے شہر اہواز کی طرف بڑھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ اہواز کے حاکم نے ١٦ھ ہجری میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی اطاعت قبول کر لی تھی اور ایک مختصر سی رقم ہر سال بطور خراج ادا کرنا منظور کر لیا تھا۔ بصرہ میں انقلابِ حکومت کے بعد اس نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور علانیہ سرکشی پر تل گیا۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے اہواز کی طرف پیشقدمی کی تو اہواز کے جاٹوں اور اساورہ (گھوڑا فوج کے منصب داروں) نے ان کی شدید مزاحمت کی لیکن بالآخر شکست کھائی اور شہر فتح ہو گیا۔ اسلامی فوج نے ہزاروں جاٹوں اور اساورہ کو غلام بنا لیا، چونکہ مفتوحہ علاقہ کی کھیتی باڑی جاٹوں کے ہاتھ میں تھی اور اساورہ بڑے زمیندار (چودھری یا وڈیرے) تھے اس لیے کاشتکاری کا کام یکسر رک گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت ابوموسیٰؓ کو لکھا کہ کاشتکاری تمہارے بس سے باہر ہے اس لیے غلاموں کو رہا کر دو اور ان سے زمین کا لگان وصول کرو۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے اس حکم کی تعمیل میں تمام غلام چھوڑ دیئے جو حسبِ سابق کھیتی باڑی میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوموسیٰؓ نے مناذر کا رُخ کیا جو اہواز کا نہایت اہم شہر تھا۔ ملک کی تمام سڑکیں یہاں آ کر ملتی تھیں اور یہ کئی طرف سے دریاؤں اور نہروں سے گھرا ہوا تھا۔

اس کی فصیل اور دوسرے دفاعی انتظامات بھی نہایت مستحکم تھے۔ اہلِ شہر نے بڑی پامردی سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور کئی ماہ تک محصور رہ کر مزاحمت کرتے رہے لیکن بالآخر مغلوب ہو گئے اور شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اثنائے محاصرہ میں اسلامی فوج کے ایک معزز افسر مہاجر بن زیاد شہید ہو گئے۔ قلعہ والوں نے ان کا سر کاٹ کر برج کے کنگرہ پر لٹکا دیا۔ چونکہ محاصرہ کافی طول پکڑ گیا تھا اس لیے حضرت ابو موسیٰؓ نے مہاجر بن زیادؓ کے بھائی ربیعؓ بن زیاد کو یہاں چھوڑا اور خود سوس کی طرف بڑھے۔ اہلِ سوس نے بھی مقابلہ کی زبردست تیاری کر رکھی تھی تاہم انہوں نے کھلے میدان میں نکلنے کے بجائے قلعہ بند ہو جانا مناسب سمجھا۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے شہر کا محاصرہ کر کے ہر طرف سے رسد بند کر دی۔ اس اثنا میں حضرت ربیعؓ نے مناذر فتح کر لیا اور اپنی کچھ فوج حضرت ابو موسیٰؓ کی مدد کے لیے بھیج دی۔ سوس میں جلد ہی کھانے پینے کی اشیاء کا قحط پڑ گیا مجبوراً حاکم شہر نے اس شرط پر صلح کی درخواست کی کہ اس کے خاندان کے سو آدمیوں کی جان کی امان دی جائے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے یہ شرط منظور کر لی۔ حاکم شہر نے جن سو آدمیوں کو جان بخشی کے لیے نامزد کیا بدقسمتی سے اپنے آپ کو ان میں شامل کرنا بھول گیا۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰؓ نے اس کے نامزد کیے ہوئے آدمیوں کو تو چھوڑ دیا۔ لیکن خود اسے قتل کرا دیا۔

علامہ بلاذریؒ نے "فتوح البلدان" میں بیان کیا ہے کہ سوس کی فتح کے بعد مسلمان شہر میں داخل ہوئے تو وہاں شاہی محل کے ایک کمرے میں ایک لاش پڑی پائی جو زربفت میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس لاش کے پاس بہت سا زر و مال رکھا تھا اور ساتھ ہی اس مضمون کی ایک تحریر بھی کہ "اگر کسی کو روپیہ کی ضرورت ہو تو وہ ایک مقررہ مدت کے لیے اس مال میں سے قرض لے سکتا ہے اگر مقررہ مدت کے بعد قرض واپس نہیں کرے گا تو جذام (کوڑھ) میں مبتلا ہو جائے گا۔"

حضرت ابو موسیٰؓ نے لاش کے بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضرت دانیالؑ

کی ہے۔ حضرت دانیالؑ سوس میں کیسے پہنچے ؟ اس کے متعلق حضرت ابو موسیٰؓ کو بتایا گیا کہ حضرت دانیالؑ کے زمانے میں ایک مرتبہ امساکِ باراں کی وجہ سے سوس میں سخت قحط پڑ گیا اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ حضرت دانیالؑ اس وقت بابل میں تھے۔ اور مشہور تھا کہ ان کی دُعا سے بارش ہوتی ہے چنانچہ اہلِ سوس کا ایک وفد بابل جا کر حضرت دانیالؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ سوس تشریف لائیں لیکن وہاں کے حکام نے یہ شرط رکھی کہ اہلِ سوس اپنے پچاس آدمی بطورِ یرغمال بابل میں چھوڑ جائیں تبھی وہ حضرت دانیالؑ کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ اہلِ سوس نے یہ شرط مان لی اور اپنے پچاس آدمی وہاں چھوڑ کر حضرت دانیالؑ کو اپنے ساتھ سوس لے آئے۔ ان کی دُعا سے خوب بارش ہوئی اور قحط دور ہو گیا ابھی وہ سوس ہی میں تھے کہ پیغامِ اجل آ پہنچا۔ ان کی وفات پر اہلِ سوس کو بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے ان کی لاش کو بڑے احترام سے مومیائی لگا کر محفوظ کر دیا اور پھر اسے زربفت میں لپیٹ کر شاہی محل میں رکھ دیا۔

حضرت ابو موسیٰؓ نے اس لاش اور روپیہ کے بارے میں ساری تفصیل حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجی۔ انہوں نے فرمان بھیجا کہ لاش کو کفناؤ اور خوشبو لگا کر نمازِ جنازہ پڑھو، پھر دفن کر دو جس طرح دوسرے انبیاء دفن کیے گئے ہیں اور روپیہ کو بیت المال میں جمع کر دو۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے اسی کے مطابق عمل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے رامہُرمز کے پہاڑی شہر کی طرف ایک فوج بھیجی جس نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ شہر محاصرہ کی تاب نہ لا سکے اور آٹھ لاکھ درہم سالانہ خراج دینا منظور کر کے مطیع ہو گئے۔

۵

جس زمانے میں اہواز، مناذر، سوس اور رامہُرمز فتح ہوئے، یزدجرد شہنشاہِ ایران اصطخر یا قم میں مقیم تھا اس کو مسلمانوں کی فتوحات کی خبریں پہنچیں تو اس نے اپنے ایک نامور سردار ہرمزان کو ایک زبردست لشکر دے کر مسلمانوں کو

خوزستان سے نکالنے کے لیے بھیجا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ہرمزان خود یزدجرد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اہواز و فارس کی حکومت کے عوض یہ ذمہ لیا کہ وہ مسلمانوں کے سیلاب کو روک دے گا۔ یزدجرد نے اس کی بات منظور کر لی اور وہ ایک لشکر گراں اور بے شمار زر و مال اپنے ساتھ لے کر خوزستان کے صدر مقام تستر پہنچ گیا یہاں اس نے بہت سے کرد اور فارسی بھی اپنی فوج میں شامل کر لیے یہاں تک کہ اس کے لشکر کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار سے متجاوز ہو گئی۔ فوج کی فراہمی کے ساتھ ہرمزان نے شہر اور قلعہ کے دفاعی استحکامات کو بھی ناقابلِ تسخیر بنانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ابو حنیفہ دینوری نے "اخبار الطوال" میں لکھا ہے کہ تستر کی شہر پناہ بہت بلند اور محفوظ تھی۔ دریائے دجیل اور دوسری قدرتی رکاوٹوں نے اس کو بہت محفوظ بنا دیا تھا۔ ہرمزان نے اس کی مرمت کرائی اور کھانے پینے کے سامان اور گھوڑوں کے چارے کا کافی ذخیرہ کر لیا۔ دوسری طرف حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس اس وقت صرف دس ہزار مجاہدین تھے انہیں ہرمزان کی جنگی تیاریوں اور تستر کے دفاع کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے فوراً دربارِ خلافت کو خط بھیج کر مدد طلب کی۔ ان کا خط ملتے ہی حضرت عمر فاروقؓ نے کوفہ کے گورنر حضرت عمار بن یاسرؓ اور حلوان کے عامل حضرت جریرؓ بن عبداللہ بجلی کو فرمان بھیجے کہ فوراً ابو موسیٰؓ کی مدد کو پہنچو۔ امدادی فوجیں پہنچنے سے حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس بیس ہزار کی جمعیت ہو ہو گئی۔ اب انہوں نے تستر کا رُخ کیا اور شہر کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔

ہرمزان کو اپنی فوج اور ساز و سامان پر بڑا ناز تھا اس لیے وہ شہر سے باہر نکل کر اسلامی لشکر پر حملہ آور ہوا حضرت ابو موسیٰؓ نے بڑے عمدہ انداز سے اپنی فوج کی صف بندی کی حضرت انسؓ بن مالک کو رسالے کا افسر بنایا، میمنہ کی قیادت حضرت براءؓ بن مالک اور میسرہ کی حضرت براءؓ بن عازب کے سپرد کی۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ حضرت براءؓ بن مالک لڑتے بھڑتے شہر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ یہاں ان کا سامنا ہرمزان سے ہوا۔ براءؓ اور ان کے ایک ساتھی مجزاءؓ بن ثور نے

ہرمزان کے ہاتھوں جام شہادت پیا۔ تاہم لڑائی میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ ایک ہزار ایرانی مارے گئے اور چھ سو مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ اب ہرمزان نے شہر کے اندر جا کر دروازے بند کر لینے ہی میں اپنی خیریت سمجھی۔ چنانچہ وہ قلعہ بند ہو گیا۔ اور مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جن دنوں سوس کا محاصرہ جاری تھا یزدجرد نے ایک فوج اہلِ سوس کی مدد کے لیے اصطخر سے روانہ کی تھی۔ اس فوج میں شاہی خاندان کے بیسیوں افسر تھے۔ یہ فوج ابھی راستہ ہی میں تھی کہ سوس اور پھر رامہرمز کو مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ طبری اور بلاذری کا بیان ہے کہ شاہی امدادی فوج نے سوس اور رامہرمز کے سقوط کی خبر سنی تو اس کے حوصلے پست ہو گئے اور اس کے اعلیٰ فوجی افسروں نے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انھوں نے دس آدمیوں کا ایک وفد حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس بھیجا جو اس وقت تستر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ وفد کے قائد شیرویہ اسواری نے حضرت ابو موسیٰؓ سے کہا کہ اگر آپ ہماری یہ چھ شرطیں قبول کر لیں تو ہم اسلام لانے کو تیار ہیں:

۱۔ ہم مسلمانوں کی باہمی لڑائیوں میں غیر جانب دار رہیں گے۔
۲۔ ہم مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایرانیوں سے لڑیں گے اور ہم پر کسی عرب نے حملہ کیا تو آپ ہماری مدد کریں گے۔
۳۔ ہم کو کسی بھی جگہ آباد ہونے کی آزادی ہوگی۔
۴۔ ہم جس قبیلہ سے چاہیں گے حلیفانہ تعلق قائم کر سکیں گے۔
۵۔ ہم کو "شرفِ عطاء" (ممتاز درجہ کا وظیفہ) دیا جائے گا۔
۶۔ مسلمانوں کا خلیفہ اس عہد نامے پر خود دستخط کرے گا۔

حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا، یہ شرطیں غیر معمولی ہیں۔ تم کسی شرط کے بغیر اسلام قبول کر لو تو تمہارے حقوق و فرائض دوسرے مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔ وفد اس پر رضا مند نہ ہوا۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے سارا واقعہ حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجا۔ ان کا جواب آیا کہ ایرانیوں کی تمام شرطیں بلا تاخیر منظور کر لو۔ انھوں نے

ایسا ہی کیا اور تمام ایرانی سو سوار (شاہی فوجی افسر) مشرف بہ اسلام ہو گئے اور تستر کے محاصرے میں مسلمانوں کے دوش بدوش لڑنے لگے تاہم ان کے اندازِ جنگ میں کوئی جوش اور ولولہ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک دن حضرت ابو موسیٰؓ نے ان کے سردار سیاہ سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے تم لوگوں نے صدقِ دل سے اسلام قبول نہیں کیا اس لیے تم بیدلی سے لڑتے ہو۔

سیاہ نے کہا: "اے امیر ہم ابھی تازہ تازہ مسلمان ہوئے ہیں اس لیے ہمارے دلوں میں وہ دینی جوش اور جذبہ نہیں ہے جو قدیم مسلمانوں کے سینوں میں ہے۔ پھر یہ سبب بھی کہ آپ نے ہمیں ابھی تک ممتاز درجہ کا وظیفہ نہیں دیا۔"

حضرت ابو موسیٰؓ نے اس معاملہ میں مرکز کی طرف رجوع کیا تو وہاں سے فرمان آیا:

"اگر یہ ایرانی فوجی افسر اپنی شجاعت اور جنگی کارکردگی کی بناء پر سب سے اونچے وظیفے کے مستحق ہیں تو ان کو ضرور اونچے سے اونچا وظیفہ دو جو کسی عرب کو دیا گیا ہو۔"

اس فرمان کے مطابق حضرت ابو موسیٰؓ نے چھ اعلیٰ افسروں کو شرف عطاء (سب سے اونچا وظیفہ) دیا جس کی مقدار دو ہزار پانچ سو درہم سالانہ تھی اور سو افسروں کو درجہ اوّل کا وظیفہ دیا جس کی مقدار دو ہزار درہم سالانہ تھی۔ چند دن بعد ان افسروں کے سردار سیاہ (اور ایک دوسری روایت کے مطابق تستر کے ایک شہری) نے جان پر کھیل کر تستر کا وہ خفیہ راستہ مسلمانوں کو بتا دیا جو دریا کی طرف کھلتا تھا۔ مسلمانوں کے سو منتخب سرفروش اس راستے سے شہر میں داخل ہو گئے اور پہریداروں کو تہ تیغ کر کے اندر کی طرف سے دروازے کھول دیئے۔ اُدھر حضرت ابو موسیٰؓ فوج کے ساتھ موجود تھے دروازے کھلتے ہی سارا لشکر شہر میں داخل ہو گیا اور ہر طرف ہلچل پڑ گئی۔ ہرمزان نے بھاگ کر قلعہ میں پناہ لی اور اس شرط پر اپنے آپ کو مسلمانوں کے سپرد کر دینے پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کو بحفاظت مدینہ پہنچا دیا جائے اور جو کچھ فیصلہ ہو خلیفۃ المسلمین کے ہاتھ سے ہو۔ حضرت ابو موسیٰؓ

نے یہ شرط منظور کرلی اور ہرمزان کو ایک فوجی دستے کی حفاظت میں مدینہ بھیج دیا۔ ہرمزان نے جنگ قادسیہ کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے ساتھ کئی دفعہ معاہدۂ صلح کیا تھا اور ہمیشہ اس کو توڑ دیا تھا۔ معرکۂ تستر میں اس نے حضرت براءؓ بن مالک اور مجزاۃؓ بن ثور کو شہید کیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ان باتوں کا اس قدر رنج تھا کہ انہوں نے ہرمزان کے لیے موت کی سزا تجویز کی تھی لیکن ہرمزان بہت چالاک نکلا اور ایک عجیب حیلے سے اپنی جان بچائی۔ ابن عبد ربہ نے "عقد الفرید" میں لکھا ہے کہ ہرمزان نے پینے کے لیے پانی مانگا اور پیالہ ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ سے وعدہ لیا کہ جب تک وہ یہ پانی نہیں لے گا قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور ساتھ ہی اس نے پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا کہ میں پانی نہیں پیوں گا اور اپنے عہد کے مطابق آپ مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ حضرت عمر فاروقؓ کو اس کی حیلہ سازی پر بڑی حیرت ہوئی لیکن ہرمزان نے یکایک کلمۂ توحید پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ میں پہلے ہی حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا لیکن یہ حیلہ اس لیے کیا کہ لوگ یہ نہ کہیں ہرمزان نے تلوار کے ڈر سے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد ہرمزان نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ امیر المؤمنین نے اس کے مصارف کے لیے دو ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔

تستر کی تسخیر کے بعد حضرت ابو موسیٰؓ جندی سابور کی طرف بڑھے جو تستر سے ۲۴ میل کے فاصلے پر ہے۔ اہل شہر نے فصیل کے دروازے بند کر لیے اور محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ چند دن بعد انہوں نے یکایک تمام دروازے کھول دیئے اور اطمینان سے اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ مسلمانوں کو ان کے اطمینان پر بڑی حیرت ہوئی۔ سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ تم ہم کو جزیہ کی شرط پر امان دے چکے ہو اس لیے اب ہم تمہاری طرف سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ ابو موسیٰؓ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ایک غلام نے درپردہ جندی سابور کے لوگوں کو امان کا رقعہ لکھ دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک غلام کا امان نامہ ہمارے لیے حجت نہیں بن سکتا۔ اہل شہر نے کہا کہ ہم نے تو ایک مسلمان کی تحریر پر بھروسہ کیا ہمیں آزاد اور غلام کی کیا خبر؟ بالآخر حضرت ابو موسیٰؓ نے اس معاملہ میں دربار خلافت سے

استصواب کیا تو وہاں سے فرمان آیا کہ مسلمانوں کا غلام بھی مسلمان ہے اور جس کو اس نے امان دے دی، سب مسلمانوں کی طرف سے اس کو امان مل گئی۔

جندی سابور کی فتح سے سارے خوزستان کی تسخیر مکمل ہو گئی اور حضرت ابو موسیٰؓ نے مظفر و منصور اپنے مرکزِ حکومت بصرہ کو مراجعت کی۔

۶

حضرت ابو موسیٰؓ نے بصرہ کا نظم حکومت جس حسن و خوبی سے چلایا اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ ایک مجاہد اور فاتح ہی نہیں بلکہ بہترین منتظم بھی ہیں۔ چند سال پہلے عتبہؓ بن غزوان نے بصرہ کی بنیاد ڈالی تھی تو لوگوں نے نرکل کے مکانات بنا لیے تھے جن کے گھنے جنگل بصرہ کے نواح میں موجود تھے۔ حضرت ابو موسیٰؓ بصرہ کے والی مقرر ہو کر آئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ نرکل کے مکانات بہت غیر محفوظ ہیں کیونکہ ان میں بار بار آگ لگ جاتی ہے چنانچہ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو خط لکھا کہ لوگوں کو اینٹ گارے اور چونے کے مکانات بنانے کی اجازت دی جائے۔ امیر المومنین نے اس شرط پر مکانات بنانے کی اجازت دے دی کہ ان کی چھتیں نیچی رکھی جائیں اور دیواریں چوڑی ہوں۔

انتظامی امور میں حضرت ابو موسیٰؓ کو جب کوئی مشکل پیش آتی تو وہ حضرت عمر فاروقؓ کی طرف رجوع کرتے اور پھر وہ جو ہدایات بھیجتے ان کے مطابق عمل کرتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے بنو تمیم کے ایک شخص کو شراب نوشی کے جرم میں کوڑے لگوائے، پھر اس کا سر منڈوا کر اور منہ کالا کر کے سڑکوں پر گشت کرایا اور منادی کرا دی کہ کوئی اس کے ساتھ نہ کھائے پیئے اور نہ بیٹھے۔ اس شخص نے دربارِ خلافت میں اپنی رسوائی کی شکایت کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس شخص کو کپڑے اور دو سو درہم عطا کیے اور حضرت ابو موسیٰؓ کو لکھا کہ ایسے جرم میں کسی کو بیس کوڑوں سے زیادہ نہ مارو، سر منڈوانے اور منہ کالا کرنے کی سزا کسی کو ہرگز نہ دو اور میرا خط پا کر لوگوں سے کہو کہ اس شخص کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں، اس سے ملیں جلیں اور وہ توبہ کر لے تو اس کی شہادت قبول کر لیں۔

ابنِ سعدؒ اور بلاذریؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ کو اس

بات کا پابند کر دیا تھا کہ وہ سال میں ایک دن ایسا مقرر کریں جب خزانہ میں ایک درہم تک نہ رہے اور وہاں جھاڑو پھیر دی جائے تاکہ ہر حق دار کا حق ادا ہو جائے۔ حضرت ابو موسیٰ رضؓ اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضؓ نے حضرت ابو موسیٰ رضؓ اور دوسرے گورنروں کو اس مضمون کا خط بھیجا۔

"مجھے ان سب لوگوں کی فہرست بھیجو جن کو قرآن حفظ یاد ہے تاکہ میں ان کا امتیازی وظیفہ (۲۵۰۰ درہم سالانہ) مقرر کروں اور ان کو اسلامی قلمرو میں تعلیم دینے بھیجوں۔"

حضرت ابو موسیٰ رضؓ نے بصرہ کے تین سو سے زائد حفاظِ قرآن کی فہرست حضرت عمر فاروق رضؓ کو بھیجی۔ ابن جوزیؒ نے "صفوۃ الصفوۃ" میں لکھا ہے کہ اسی زمانے میں حضرت ابو موسیٰ رضؓ نے حفاظِ قرآن کو ایک جگہ جمع کیا، اس جلسے میں لگ بھگ تین سو حفاظ شریک تھے۔ حضرت ابو موسیٰ رضؓ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"بلاشبہ قرآن حکیم آپ کے حق میں باعثِ اجر اور آپ کے خلاف باعثِ سزا ہونے والا ہے۔ پس قرآن کا اتباع کریں اور قرآن کو اپنی خواہشات کا آلۂ کار نہ بنائیں کیونکہ جو قرآن کو اپنا راہ نما بنائے گا قرآن اس کو جنت کے باغوں میں لا اتارے گا اور جو قرآن کو خواہشاتِ نفس کا آلہ بنائے گا، قرآن اس کے دھپ مار کر جہنم میں دھکیل دے گا۔"

۲۱ ہجری میں ایرانیوں نے مسلمانوں کے خلاف پھر بڑے زور شور سے لڑائی کی تیاری کی۔ یزدجرد نے ایک نامی جرنیل مرداں شاہ کو ڈیڑھ لاکھ فوج دے کر نہاوند کی طرف روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ ایک مسلمان بھی ایران کی سرزمین پر باقی نہ رہنے دے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت نعمان بن مقرن کو ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ایرانیوں کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا اور ساتھ ہی حضرت ابو موسیٰ رضؓ کو حکم بھیجا کہ وہ حضرت نعمان رضؓ کی مدد کو پہنچیں۔ حضرت ابو موسیٰ رضؓ بصرہ سے ایک مضبوط فوج لے کر نہاوند پہنچ گئے۔ اور پہلے حضرت نعمان رضؓ کی قیادت میں اور

ان کی شہادت کے بعد حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی قیادت میں ایرانیوں کے خلاف سربکف ہو کر لڑے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ نہاوند کی اس فتح الفتوح کے بعد حضرت ابو موسیٰؓ اپنی فوج کے ساتھ بصرہ واپس آ گئے۔

خوزستان کی فتح کے بعد اہل بصرہ کی خواہش تھی کہ رامہرمز، ماسپندان اور کچھ دوسرے مفتوحہ علاقے صوبہ بصرہ سے ملحق کر دیئے جائیں کیونکہ اس صوبہ کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی لیکن اہل کوفہ ان علاقوں کے بصرہ سے الحاق کے خلاف تھے، حضرت ابو موسیٰؓ نے ان علاقوں کے بصرہ سے الحاق کے لیے دربار خلافت میں تحریک کی تو اہل کوفہ نے اپنے گورنر حضرت عمار بن یاسرؓ پر زور دیا کہ وہ ان علاقوں کو کوفہ سے ملحق کرانے کی کوشش کریں لیکن حضرت عمارؓ نے اس معاملہ میں بالکل غیر جانبداری اختیار کی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مفتوحہ علاقے صوبہ بصرہ میں شامل کر دیئے گئے۔ حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کے غیر جانبدارانہ رویّہ سے اہل کوفہ ان سے ناراض ہو گئے اور انہوں نے ان کے خلاف شکایتوں کا طومار باندھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں معزول کر دیا اور اہل کوفہ کی خواہش پر حضرت ابو موسیٰؓ کو بصرہ سے تبدیل کر کے کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ یہ ۲۲ھ کا واقعہ ہے۔ اہل کوفہ نے حضرت ابو موسیٰؓ کو اپنا امیر بنانے کی درخواست محض اس بنا پر کی تھی کہ انہوں نے اپنے صوبے (بصرہ) کے لوگوں کی پُر زور حمایت کی تھی اور مفتوحہ علاقوں کو بصرہ میں شامل کرنے کے مطالبہ کو دربار خلافت سے منظور کرانے کا باعث ہوئے تھے لیکن حضرت ابو موسیٰؓ کو کوفہ میں زیادہ عرصہ قیام کرنے کا موقع نہ ملا اور اگلے سال ۲۳ھ ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں کوفہ سے پھر بصرہ تبدیل کر دیا۔ بصرہ کے زمانہ امارت میں ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰؓ کے خلاف کچھ شکائتیں دربار خلافت میں پہنچیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ کو مدینہ منورہ طلب کر کے تمام شکایتوں کی تحقیق کی تو ان میں سے بیشتر بے بنیاد ثابت ہوئیں البتہ ایک آدھ میں وہ بے احتیاطی کے مرتکب پائے گئے جس کے لیے حضرت عمرؓ نے انہیں معمولی فہمائش کی اور پھر باعزت بصرہ واپس بھیج دیا۔

طبری کا بیان ہے کہ ۲۲ھ میں حضرت ابوموسیٰ ؓ نے اصفہان پر یلغار کی اور اس کو فتح کر کے واپس آئے۔ (اس کے بعد وہ بصرہ سے کوفہ تبدیل کر دیئے گئے) اسی طرح اعثم کوفی نے اپنی "فتوح" میں فارس اور کرمان کی فتح کا سہرا بھی حضرت ابوموسیٰ ؓ کے سر باندھا ہے لیکن دوسرے قدیم مؤرخین طبری اور اعثم کوفی کی تائید نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اصفہان، فارس اور کرمان کی تسخیر پر دوسرے اصحاب (عبداللہ بن عبداللہ ؓ، حضرت عثمان ؓ بن ابی العاص اور سہیل ؓ بن عدی) مامور ہوئے تھے اور انہوں نے ہی ان پر پرچم اسلام بلند کیا۔ البتہ بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکز کے زیر ہدایت حضرت ابوموسیٰ ؓ کئی بار بصرہ سے کمک لے کر فارس کی لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔

امارتِ بصرہ کے زمانے میں حضرت ابوموسیٰ ؓ کا ایک بڑا کارنامہ دریائے دجلہ سے اہلِ بصرہ کو پانی کی بہم رسانی کا ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے حضرت عمر فاروق ؓ کے ایماء پر دریائے دجلہ کی ایک شاخ سے بصرہ شہر تک ایک چھ میل لمبی نہر کھدوائی اس طرح بصرہ میں قلتِ آب کی دیرینہ شکایت ہمیشہ کے لیے دُور ہو گئی۔ یہ نہر اب تک "نہر ابی موسیٰ" کے نام سے مشہور ہے۔

(۷)

محرم ۲۴ھ کے آغاز میں سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ جامِ شہادت پی کر عازمِ خُلدِ بریں ہوئے اور سیدنا حضرت عثمان ذوالنورین ؓ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ انہوں نے بھی حضرت ابوموسیٰ ؓ کو بصرہ کے منصب امارت پر برقرار رکھا لیکن ۲۹ھ میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا جو ان کی معزولی پر منتج ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس سال کردوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ حضرت ابوموسیٰ ؓ نے مسجد میں ان کے خلاف خطبہ دیا جس میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پیادہ پا چلنے کے فضائل بیان کیے ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ جن لوگوں کے پاس گھوڑے موجود نہ ہوں وہ بھی ضرور پیادہ پا چلیں لیکن ان کے بعض مخالفین نے ان کے وعظ کو غلط رنگ دے دیا اور کہا کہ ہم دیکھیں گے، امیر بھی پیادہ پا چلتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے دن حضرت ابوموسیٰ ؓ گھوڑے پر سوار ہو کر دارالامارت سے باہر

سے برآمد ہوئے تو ان لوگوں نے ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا کہ آپ لوگوں کو تو پیادہ پا چلنے کی تلقین کرتے ہیں اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر جہاد کے لیے چلتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے ان کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہ ملنے اور مدینہ پہنچ کر امیر المومنینؓ سے ان کی معزولی کا مطالبہ کیا۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے ان کو معزول کر کے ایک نوجوان صحابی حضرت عبداللہؓ بن عامر کو بصرہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

۳۴ھ میں اہل کوفہ نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ سے درخواست کی کہ حضرت سعیدؓ بن العاص کی جگہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا جائے۔ امیر المومنینؓ نے ان کی بات مان لی اور حضرت سعیدؓ کو امارت سے سبکدوش کر کے حضرت ابو موسیٰؓ کو کوفہ کا امیر بنا دیا۔ ۳۵ھ میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی المناک شہادت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسند نشین خلافت ہوئے تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عثمان غنیؓ کے قصاص اور اصلاح کا علم بلند کر کے بصرہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ حضرت علیؓ ان کے مقابلہ کے لیے مقام ذی قار میں آئے اور وہاں سے حضرت حسنؓ کو حضرت عمار بن یاسرؓ کے ساتھ کوفہ بھیجا کہ وہاں کے لوگوں کو اپنی حمایت پر آمادہ کریں۔ ادھر حضرت ابو موسیٰؓ مسلمانوں کو ہر قیمت پر خانہ جنگی سے بچانا چاہتے تھے۔ حضرت حسنؓ کوفہ پہنچے تو حضرت ابو موسیٰؓ جامع مسجد میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کر رہے تھے کہ

"اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس فتنہ کی خبر دی تھی وہ نمودار ہو گیا ہے۔ اس لیے اپنی تلواریں نیام میں کر لو، نیزوں کی سنانیں نکال دو، کمانوں کی تانتیں توڑ دو اور گھروں کے تنگ تر گوشوں میں لگ کر بیٹھ رہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فتنہ و فساد کے زمانے میں سونے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا چلنے والے سے بہتر ہے۔"

حضرت حسنؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ کی تقریر کو پسند نہ کیا اور ان سے کہا کہ آپ ہماری مسجد چھوڑ دیں اور جہاں چاہے تشریف لے جائیں۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ

منبر سے اتر آئے اور شام کے کسی غیر معروف گاؤں میں جا کر عزلت گزین ہو گئے۔ جنگ جمل میں انہوں نے مطلق کوئی حصہ نہ لیا۔ اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امیر معاویہؓ کے درمیان صفین کی معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا تو بھی حضرت ابو موسیٰؓ نے اپنے گوشۂ خلوت کو نہ چھوڑا تا آنکہ انہیں ایک قاصد بھیج کر حَکَم کا فرض انجام دینے کے لیے دومۃ الجندل بلایا گیا۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ ۱۰ صفر ۳۷ھ (کو صفین) کے معرکے میں شامی فوج نے حضرت علیؓ کے لشکر کا پلہ بھاری دیکھا تو انہوں نے یہ نعرہ لگاتے ہوئے نیزوں پر قرآن اٹھا لیا —— هٰذا حَكَمٌ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم ہے۔)

قرآن حکیم کو سامنے دیکھ کر حضرت علیؓ کے بہت سے لشکریوں نے اپنے ہاتھ روک لیے اور امیر المومنینؓ کو مجبور کیا کہ جنگ بند کر کے حضرت معاویہؓ سے تحکیم کا معاہدہ کر لیں۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کی طرف سے حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابو موسیٰؓ حَکَم مقرر ہوئے۔ یہ دونوں حَکَم ایک مقررہ تاریخ پر دومۃ الجندل میں اکٹھے ہوئے اور حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان طے شدہ معاہدے کی اس شق کے مطابق گفتگو کا آغاز کیا۔

> "دونوں حَکَم جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں اس پر عمل کریں اور جو کچھ کتاب اللہ میں نہ پائیں اس کے بارے میں سنتِ عادلۂ جامعہ غیر مُفرِّقہ پر عمل کریں۔"

ان دونوں بزرگوں کے درمیان گوشۂ خلوت میں کیا گفتگو ہوئی اس کو خدائے علیم و خبیر ہی جانتا ہے لیکن ہمارے بعض مؤرخین نے اس گفتگو کو طویل مکالمہ کی صورت میں اس طرح نقل کیا ہے گویا یہ سب باتیں ان کے سامنے ہوئی ہوں۔ بہرصورت دونوں بزرگ دوسرے دن مجمع عام میں آئے تو حضرت ابو موسیٰؓ نے اٹھ کر اعلان کیا کہ "میں اور میرے یہ دوست (یعنی عمروؓ بن العاص) اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ہم علیؓ اور معاویہؓ دونوں کو الگ کر دیں اور لوگ باہمی مشورہ سے اپنی

پسند کا امیر منتخب کرلیں۔ لہٰذا میں علیؓ اور معاویہؓ کو معزول کرتا ہوں اب لوگ اس معاملے کو خود اپنے ہاتھ میں لیں اور جسے اہل سمجھیں خلیفہ منتخب کرلیں۔"

حضرت ابوموسیٰؓ کے بعد حضرت عمروؓ بن العاص کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا:-

"صاحبو! ابوموسیٰؓ نے جو کچھ کہا ہے وہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ علیؓ کو ان کی طرح میں بھی معزول کرتا ہوں لیکن معاویہؓ کو برقرار رکھتا ہوں کیونکہ وہ عثمانؓ بن عفان کے ولی اور ان کے خون کے دعوے دار اور خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔"

حضرت ابوموسیٰؓ نے حضرت عمروؓ بن العاص کی تقریر سے سخت اختلاف کیا اور فرمایا "جو باتیں تم نے کہی ہیں ان پر ہمارا اتفاق نہیں ہوا تھا بلکہ جو کچھ میں نے کہا ہم دونوں اسی پر متفق ہوئے تھے۔" بعض مؤرخین نے ان سے یہ الفاظ منسوب کیے ہیں:

"یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے دھوکا دیا اور عہد کی خلاف ورزی کی۔"

حضرت علیؓ کے بعض حامی صحابہؓ نے حضرت ابوموسیٰؓ کے موقف کو کمزوری سے تعبیر کیا تو انہوں نے آزردہ ہوکر کہا: "اب میں کیا کروں اس شخص نے مجھ سے ایک بات پر اتفاق کیا اور پھر اس سے دامن چھڑا لیا۔"

اس واقعہ سے حضرت ابوموسیٰؓ کی طبیعت سخت مکدر ہوگئی اور وہ دل شکستگی کے عالم میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ اہلِ سیر کا بیان ہے کہ اس کے بعد وہ جب تک حیات رہے ملکی معاملات سے یکسر کنارہ کش رہے۔

حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ذی الحجہ ۴۴ھ ہجری میں کچھ عرصہ علیل رہ کر وفات پائی۔ اس وقت ۶۱ برس کی عمر تھی۔ بعض دوسرے اہلِ سیر نے سالِ وفات ۴۲ھ اور ۵۲ھ بھی بیان کیا ہے۔

مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ انہوں نے وفات سے پہلے وصیت کی کہ میرا جنازہ جلد جلد لے چلنا، جنازہ کے ساتھ انگیٹھی نہ لے جانا، میری میت اور لحد کے درمیان مٹی روکنے والی کوئی چیز نہ رکھنا، قبر پر کوئی عمارت نہ بنانا اور میں نوحہ و بکا کرنے والی،

کپڑے پھاڑنے والی اور سر کے بال نوچنے والی عورتوں سے بری ہوں۔

حضرت ابوموسیٰؓ نے اپنے پیچھے چار لڑکے چھوڑے، موسیٰ، ابوبردہ، ابراہیم اور ابوبکر۔ نحیف الجثہ اور پست قد تھے لیکن شجاعت اور بے خوفی میں اپنی مثال آپ تھے۔

(۸)

علم و فضل کے اعتبار سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا شمار اساطینِ اُمّت میں ہوتا ہے۔ وہ ان چیدہ اکابر میں سے ایک ہیں جن کو عہدِ رسالت میں فتویٰ دینے کی اجازت تھی اور جن سے لوگوں نے دین کی واقفیت حاصل کی یعنی حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت اُبیؓ بن کعب، حضرت زیدؓ بن ثابت اور وہ خود۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرمایا کرتے تھے:

"ابوموسیٰ مجسمۂ علم ہیں۔"

حضرت ابوموسیٰؓ کو بارگاہِ رسالت میں درجۂ تقرب حاصل تھا اور وہ سالہا سال تک نبوّت کے چشمۂ فیض سے براہِ راست سیراب ہوتے رہے تھے اس لیے ان کا پایۂ علم و فضل اتنا بلند ہو گیا تھا کہ مرجعِ خلائق بن گئے تھے۔ انہیں خود بھی علم کی اشاعت میں بڑا انہماک تھا۔ فرماتے تھے کہ جس شخص کو خدا علم دے اس کا فرض ہے کہ اپنے دوسرے بھائیوں میں بھی اس کی اشاعت کرے اور جس چیز کا اسے علم نہ ہو اس کے بارے میں سکوت اختیار کرے۔

ان کا اندازِ تعلیم بڑا نرم اور پُر حکمت تھا اگر کبھی کوئی شخص لاعلمی کی بناء پر ان کی کسی بات پر معترض ہوتا تو وہ برہم ہونے کے بجائے اسے بڑے تحمّل اور شفقت سے سمجھا دیتے۔ قرآن کریم سے غیر معمولی شغف تھا۔ فرصت کا سارا وقت قرآنِ پاک کی تلاوت اور اس کی تعلیم میں صرف کرتے تھے۔ یمن کی گورنری کے زمانے میں ایک درسگاہ قائم کی تھی جس میں نومسلموں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نور کا گلا عطا کیا تھا۔ قرآنِ کریم کی قرأت ایسی خوش الحانی سے کرتے کہ خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سمعِ مبارک میں اس کی آواز پڑتی تو آپ سننے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ ابنِ سعدؒ نے حضرت ابو موسیٰؓ کی قرأت کے بارے میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ " ابو موسیٰ کو لحنِ داؤدی سے حصہ ملا ہے۔" "مستدرک حاکم" میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ حضرت ابو موسیٰؓ قرآنِ حکیم پڑھ رہے تھے۔ حضورؐ وہیں کھڑے ہو گئے اور سُن کر آگے بڑھے۔ صبح کو حضرت ابو موسیٰؓ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا:

"ابو موسیٰ گزشتہ شب تم قرآن پڑھ رہے تھے میں نے تمہاری قرأت سُنی تھی۔"

انہوں نے کہا: "یا رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اگر مجھے یہ علم ہو جاتا کہ آپؐ میری قرأت سُن رہے ہیں تو میں اور زیادہ خوش الحانی سے قرأت کرتا۔"

ابنِ سعدؒ نے "طبقات" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰؓ مسجدِ نبوی میں بلند آواز سے عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے۔ ان کی آواز سُن کر ازواجِ مطہرات اپنے اپنے حجروں کے پردوں کے پاس کھڑی ہو کر سننے لگیں۔ صبح کو حضرت ابو موسیٰؓ کو کسی نے بتایا کہ اُمہات المومنین آپ کی قرأت سن رہی تھیں تو بے ساختہ کہا، اگر مجھ کو اس وقت علم ہو جاتا تو میں ان کو قرآنِ حکیم کی قرأت سننے کا اس سے بھی زیادہ شائق بنا دیتا۔

حضرت ابو موسیٰؓ کی آواز میں جو سوز اور اثر تھا، سیدنا حضرت عمر فاروقؓ اس کے بے حد معترف اور مداح تھے، وہ وقتاً فوقتاً ان سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ ابو موسیٰ خدا کی یاد دلاؤ۔ جب وہ قرأت کرتے تو حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھیں شدتِ تاثر سے نم ہو جاتیں۔

روایت حدیث کے اعتبار سے حضرت ابو موسیٰؓ کا شمار راویانِ حدیث صحابہ کے طبقۂ سوم میں ہوتا ہے۔ ان سے تین سو ساٹھ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے پچاس

متفق علیہ ہیں۔ ان کے علاوہ ۴ میں بخاری اور ۲۵ میں مسلم منفرد ہیں۔ اکثر احادیث انہوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست روایت کی ہیں اور باقی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عمر فاروق رضؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت عمارؓ بن یاسر رضؓ، حضرت اُبیؓ بن کعب اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بالواسطہ روایت کی ہیں۔ ان کے ارشد تلامذہ میں حضرت ابوسعید خدری رضؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت زر بن حبیشؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت ابو عثمان نہدیؒ، حضرت ربعی بن خراشؒ، حضرت قیس بن ابی حازمؒ اور حضرت ابو وائلؒ جیسے اکابرِ اُمّت شامل ہیں۔

(۹)

حضرت ابو موسیٰؒ کے صحیفۂ اخلاق میں سبقت الی الاسلام، حُبِّ رسول، شوقِ جہاد، شجاعت، بے خوفی، تدبیر و فراست، تقویٰ، زہد، استغنا اور سادگی کے ابواب نہایت روشن تھے۔ اتّباعِ نبوی کی یہ کیفیت تھی کہ سُنّت سے لے کر مستحبات تک کی پابندی کرتے اور اہلِ خانہ سے بھی پابندی کراتے۔ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل بھی کثرت سے پڑھا کرتے تھے اور رمضان کے روزوں کے علاوہ حضورؐ کے اتّباع میں نفلی روزے بھی رکھا کرتے تھے۔ سادگی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ باوجود گورنر اور سپہ سالار ہونے کے جاہ وحشم سے کبھی سروکار نہ رکھا اور نہ کبھی مال و دولت جمع کرنے کا دل میں خیال لائے۔ ان کے لباس، چال ڈھال اور رہن سہن میں ہمیشہ سادگی کارفرما رہی۔ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور انکسار کے ساتھ ملتے۔ فقراء اور مساکین کے لیے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور پریشان حال لوگوں کی دلجوئی اور خبر گیری کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے اور اس کو بجا لانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ منصب امارت پر تقررؒ کے بعد ایک دن حضرت ابو موسیٰ رضؓ کی ملاقات حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے ہوئی، وہ بھائی بھائی کہتے ہوئے دوڑ کر حضرت ابوذرؓ سے لپٹ گئے لیکن حضرت ابوذر رضؓ انہیں بار بار یہ کہہ کر پرے ہٹاتے

تھے کہ اب تم میرے بھائی نہیں ہو، اس سرکاری عہدے پر فائز ہونے سے پہلے بھائی تھے۔ حضرت ابوموسیٰؓ خاموش ہو گئے۔ چند سال بعد پھر ملاقات ہوئی تو حضرت ابوموسیٰؓ، حسب عادت ان سے معانقہ کے لیے لپکے۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا، پہلے میرے سوالوں کا جواب دو پھر دیکھوں گا کہ تم سے گلے ملوں یا نہیں۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا، فرمایئے۔

اس کے بعد دونوں بزرگوں کے درمیان یہ مکالمہ ہوا:

حضرت ابوذرؓ: تم نے لوگوں پر حکومت کی ہے؟

حضرت ابوموسیٰؓ: ہاں۔

حضرت ابوذرؓ: عمارتیں تو نہیں بنوائیں؟

حضرت ابوموسیٰؓ: نہیں۔

حضرت ابوذرؓ: کھیتی باڑی اور زمینداری تو نہیں کی؟

حضرت ابوموسیٰؓ: نہیں۔

حضرت ابوذرؓ: جانور تو نہیں پالے؟

حضرت ابوموسیٰؓ: نہیں۔

یہ سوال و جواب ہو چکے تو حضرت ابوذرؓ کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور وہ حضرت ابوموسیٰؓ سے بھینچ بھینچ کر ملے۔

حضرت ابوموسیٰؓ نہایت پاکباز اور شرم و حیا کا پیکر تھے۔ ایک مرتبہ کچھ آدمیوں کو برہنہ غسل کرتے دیکھا تو فرمایا، مجھ کو بار بار مر کر زندہ ہونا پسند ہے مگر ننگا ہو کر نہانا پسند نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے ایک خاص قسم کا کپڑا پہن لیتے تھے تاکہ سونے کی حالت میں بے ستر نہ ہو جائیں۔ طہارت میں شدت کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ شیشی میں پیشاب کرتے تھے تاکہ کوئی چھینٹ جسم یا کپڑوں پر نہ پڑ جائے۔

طبیعت میں استغناء کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہؓ میں اختلاف کا آغاز ہوا تو امیر معاویہؓ نے اپنے قلم سے انہیں خط لکھا کہ اگر آپ میری بیعت کر لیں تو میں حلفیہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے ایک لڑکے

کو بصرہ کا گورنر بنا دوں گا اور دوسرے کو کوفہ کا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی تمام ضروریات کو پورا کرنا میری ذمہ داری ہوگی۔ حضرت ابوموسیٰ نے اس پیشکش کے جواب میں لکھا:

"آپ نے اُمتِ مسلمہ کے ایک بہت اہم اور نازک معاملہ کی بابت لکھا ہے اور جو پیشکش آپ نے کی ہے اس کی مجھ کو ضرورت نہیں۔"

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت اور محبت کی کوئی حد و نہایت نہیں تھی۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ کچھ دلوائیے۔ آپؐ نے فرمایا، بشارت ہو۔ اس نے کہا، بشارت ہو چکی کچھ دلوائیے۔ حضورؐ کے روئے انور پر تکدر کے آثار نمودار ہوئے آپؐ نے حضرت ابوموسیٰؓ اور حضرت بلالؓ سے فرمایا، اس نے بشارت سے انکار کیا تم دونوں قبول کرو۔ پھر پانی منگا کر ہاتھ منہ دھویا اور کلی کر کے ان دونوں سے فرمایا اس پانی کو پیو اور اپنے سینے اور چہرے پر ملو۔ دونوں نے یہ کام اس ذوق و شوق سے کیا گویا دین اور دنیا کی تمام نعمتیں ان کو مل گئی ہیں۔

ایک اور موقع پر حضورؐ نے ان کے لیے بطورِ خاص مغفرت کی دعا کی۔ ان واقعات سے ان کی جلالتِ قدر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد غنویؓ

۱

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۲، ۱۳ سنہ بعد بعثت میں صحابہ کرامؓ کو ہجرت الی المدینہ کی اجازت مرحمت فرمائی تو اللہ کے ان پاکباز بندوں میں سے بیشتر نے ــــــ محض رضائے الٰہی کی خاطر اپنے گھر بار اور مال و جائیداد کو چھوڑ کر وطنِ عزیز کو الوداع کہا اور تین سو میل دور مدینہ منورہ میں توطّن اختیار کر لیا۔ جو پرستارانِ حق مکّہ میں رہ گئے ان کو یا تو مشرکین نے زبردستی روک لیا تھا یا انہیں قید و بند میں ڈال دیا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منوّرہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرّف فرمایا تو چند سال تک اہلِ حق کو یہاں بھی حقیقی امن اور اطمینانِ قلب مُیسّر نہ ہُوا۔ صلح حدیبیہ تک مشرکینِ مکّہ اور یہود نے انہیں زک پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اِس پُرآشوب دَور میں بھی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان جاں نثاروں کو کسی وقت بھی فراموش نہ کیا جو مُشرکینِ مکّہ کے پنجۂ ستم میں گرفتار تھے اور قید و بند کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ حضورؐ وقتاً فوقتاً بعض مہاجر جانبازوں کو مکّہ معظمہ روانہ فرماتے رہتے تھے تاکہ وہ چھُپ چھپا کر مسلمان قیدیوں کو کفّار کی قیدِ محن سے نکال کر مدینہ لے آئیں۔ ان مہاجر جانبازوں میں ایک وجیہ اور خوبرو نوجوان اس کٹھن کام میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ یہ قوی اور بہادر نوجوان کئی مرتبہ مکّہ گئے اور اپنی جان پر کھیل کر کسی نہ کسی مسلمان اسیر کو ضرور چھڑا لائے۔ ہر مرتبہ جب وہ اپنی مہم سے کامیاب واپس آتے تو حضورؐ پُرنور اظہارِ مُسرّت فرماتے اور انہیں دُعائے خیر سے نوازتے۔ یہ بہادر نوجوان جنہوں نے مظلوم مسلمانوں کو مشرکین کے پنجۂ ستم سے چھڑانے کے لیے

اپنی جان وقف کر رکھی تھی اور یوں سرورِ کونین فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے موردِ لطف و کرم بن گئے تھے مرثد بن ابی مرثد غنویؓ تھے۔

(۲)

حضرت مرثد بن ابی مرثدؓ کا تعلق بنو مضر یا قیس عیلان سے تھا اور اُن کا خاندان مکّہ میں باختلافِ روایت بنو ہاشم یا بنو مُطّلب کا حلیف تھا۔ نسب نامہ یہ ہے :۔

"مرثد بن ابی مرثد کنازؓ بن حصین بن یربوع بن جہینہ بن سعد بن طریف بن خرشہ بن عبید بن سعد بن عوف بن کعب بن جلان بن غنم بن یحییٰ بن یعصر بن سعد بن قیس عیلان بن مضر"

حضرت مَرثَدؓ کے والد کنازؓ بن حصین جو تاریخ میں اپنی کنیت ابی مَرثَد سے مشہور ہیں بڑے نیک فطرت آدمی تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ عمِ رسولؐ سیّدنا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے حلیف تھے اس طرح ان کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے نسبت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ دعوتِ حق کے ابتدائی زمانے میں نعمتِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئےؓ اور ساتھ ہی ان کے نوجوان فرزند سعید مرثدؓ بھی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ یوں دونوں باپ بیٹے سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت کی صف میں آگئے۔ مَرثَدؓ اپنے قبیلے کے نہایت شہ زور، بہادر اور بانکے سجیلے نوجوان تھے۔ کشتی، تیغ زنی، شہسواری اور قدر اندازی میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ قبولِ اسلام سے پہلے بڑے رنگین مزاج تھے اور مکّہ کی ایک نہایت حسین اور خوش جمال طوائف عناق سے راہ و رسم رکھتے تھے لیکن قبولِ اسلام کے ساتھ ہی انہوں نے عناق سے تمام تعلقات منقطع کر لیے اور دوسرے جاہلی مشاغل سے بھی یکسر دستکش ہو گئے۔ اب وہ راہِ حق کے ایک جانباز سپاہی تھے اور ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے گزرتا تھا۔ صحابہ کرامؓ کو ہجرت الی المدینہ کا اِذن مِلا تو حضرت مرثدؓ اور حضرت ابو مرثدؓ دونوں ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ آگئے۔

حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے چند ماہ بعد

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے مابین عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو حضرت ابو مرثدؓ کو حضرت عبادہ بن صامتؓ انصاری کا دینی بھائی بنایا اور حضرت مرثدؓ کی مواخاۃ حضرت عبادہؓ کے بھائی حضرت اوسؓ بن صامت انصاری سے کرا دی۔

ہجرت کے ابتدائی دو تین سالوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء پہ حضرت مرثدؓ نے اپنے اسیر مسلمان بھائیوں کو چھڑانے کے لیے بڑی تگ و دو کی اور اس مقصد کے لیے کئی بار مکہ گئے۔ ایک مرتبہ اسی غرض سے مکہ مکرمہ پہنچے، چاندنی رات میں ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ عناق نے ان کو جاتے دیکھ لیا اور آواز دی، یہ رُک گئے۔ عناق نے بڑی گرمجوشی سے انہیں خوش آمدید کہا اور استدعا کی کہ میرے ساتھ چلو، وہیں رات کو آرام کرنا۔ حضرت مرثدؓ نے فرمایا، عناق تو کس خیال میں ہے۔ بحمد اللہ اب میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کے لیے غیر عورتوں سے ملنا جلنا حرام ہے۔

عناق نے عشوہ اور ناز و کرشمہ کے بہتیرے وار کیے لیکن مرثدؓ پاکباز نے سب وار خالی دیے اور بے رُخی اختیار کی۔ اس پر عناق آتش زیرپا ہو گئی اور چلانے لگی کہ لوگو! آؤ تمہارا مجرم یہاں موجود ہے جو قیدیوں کو نکال لے جایا کرتا ہے۔ اس کی دہائی سُن کر قریش کے آٹھ آدمیوں نے حضرت مرثدؓ کا تعاقب کیا لیکن وہ ایک غار میں جا چھُپے، جب دشمن واپس چلے گئے تو یہ کچھ عرصہ سستا کر پھر مکہ گئے اور ایک لحیم و شحیم مسلمان قیدی کو زنداں سے اپنے کندھے پر اُٹھا کر نکال لائے اور بخیریت تمام مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو پہلے اپنی مہم کے تمام واقعات بیان کیے اور پھر التماس کی، یا رسول اللہ! اگر آپؐ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں عناق سے نکاح کر لوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مرثدؓ کی درخواست کا کوئی جواب نہ دیا اور وحی کا انتظار فرمانے لگے یہاں تک کہ یہ آیت اُتری۔

اَلزَّانِي لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۔ وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲۴ : ۳)

(ترجمہ۔ زانی شخص کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ زانیہ یا مُشرکہ سے نکاح کرے اسی طرح زانیہ کے ساتھ زانی یا مُشرک ہی کو نکاح کرنا موزوں ہے لیکن مسلمانوں پر ایسا نکاح حرام قرار دیا گیا ہے۔)

اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مرثدؓ کو بُلا بھیجا۔ جب وہ حاضر ہُوئے تو آپؐ نے اُن کو یہ آیت سُنا کر ارشاد فرمایا کہ تم عناق سے نکاح نہ کرنا حضرت مرثدؓ نے ارشادِ نبویؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

(۳)

غزوات کا آغاز ہُوا تو حضرت مرثدؓ سب سے پہلے غزوۂ بدر (رمضان ۲ھ ہجری) میں والہانہ ذوق وشوق سے شریک ہُوئے اور خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ "مُستدرک حاکم" کی ایک روایت کے مطابق وہ اس غزوے میں "سبل" نامی گھوڑے پر سوار تھے اور حضورؐ کے پہلو بہ پہلو اپنی تلوار کے جوہر دکھا رہے تھے۔ اگلے سال شوال ۳ھ ہجری غزوۂ اُحُد پیش آیا تو حضرت مرثدؓ اس میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہُوئے۔

صفر ۴ھ ہجری میں بنو عضل و بنو قارہ کے چند آدمیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ہمارے ساتھ چند اہلِ علم صحابہؓ کو تعلیمِ دین کے لیے روانہ فرمائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کرامؓ کو اس کام کے لیے منتخب فرمایا اور انہیں بنو عضل و قارہ کے ساتھ روانہ فرما دیا۔ صحابہؓ کی اس مقدس جماعت میں حضرت مرثدؓ بھی شامل تھے۔ اس جماعت کے اراکین کی تعداد کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں بعض نے یہ تعداد دس لکھی ہے بعض نے آٹھ اور بعض نے چھ۔ اسی طرح اس جماعت کے امیر کا نام بعض نے حضرت مرثدؓ لکھا ہے اور بعض نے حضرت عاصمؓ بن ثابت بن ابی اقلح انصاری۔ بہرصورت جب یہ جماعت رجیع کے مقام پر پہنچی (جو مکّہ اور عسفان کے درمیان حجاز کی جانب عسفان سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے) تو عضل اور قارہ کے لوگوں نے غدّاری کی اور بنو ہذیل

کے دو سو تیر اندازوں کو اس مختصر جماعت پر چڑھا لائے۔ حضرت مرثد رضؓ، حضرت عاصمؓ بن ثابت اور حضرت خالدؓ بن بکیر مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ بعض روایتوں کے مطابق انکے ساتھ چار دوسرے صحابہؓ بھی اسی جگہ شہید ہوئے۔ تین صحابہ حضرت خبیبؓ بن عدیؓ، حضرت زیدؓ بن وثنہ اور حضرت عبداللہؓ بن طارق کو مشرکین نے گرفتار کر لیا۔ مرالظہران کے مقام پر حضرت عبداللہؓ بن طارق نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ اس پر کفار نے انہیں پتھر مار مار کر شہید کر دیا۔ حضرت خبیبؓ اور حضرت زید رضؓ کو ان ظالموں نے مشرکینِ مکہ کے پاس فروخت کر دیا۔ انہوں نے اشہرِ حُرم گزرنے کے بعد بدر اور اُحد کے مقتولوں کا بدلہ لینے کے لیے ان دونوں مردانِ حق کو سُولی دے دی۔

حضرت مرثدؓ ہجرت کے تین ہی سال بعد رُتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے اس لیے اُن کے فضل و کمال کے جوہر کھُلنے نہ پائے۔ پھر بھی اُن سے مروی کچھ احادیث کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔

حضرت مرثد رضؓ کے والد حضرت ابو مرثد رضؓ نے نوجوان فرزندِ سعید کی شہادت پر کمال درجے کے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ وہ بدر اور اُحد کے معرکوں میں پہلے ہی دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ بعد میں جتنے غزوات پیش آتے اُن میں پہلے سے دو چند جوش کے ساتھ سرفروشی دکھائی۔ انہوں نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں ۱۲ھ ہجری میں بعہدِ خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضؓ وفات پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت یزیدؓ بن زمعہ بن الاسود

ان کا تعلق بنی عبد العزیٰ بن قصی سے تھا سلسلۂ نسب یہ ہے۔

یزیدؓ بن زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی۔ ماں کا نام قریبہ تھا، جو اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہؓ کی بہن تھیں۔ حضرت یزیدؓ قریش کے سرآوردہ لوگوں میں سے تھے اور اہلِ مکّہ مہماتِ قومی میں ان کا مشورہ ضروری سمجھتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں بیان کیا ہے کہ قریش نے دوسرے عہدوں کے علاوہ ایک عہدہ "مشاورت" کا بھی قائم کر رکھا تھا اور یہ عہدہ بنی عبد العزیٰ بن قصی کے پاس تھا۔ بعثتِ نبویؐ کے وقت یزید بن زمعہ رئیس قبیلہ ہونے کی حیثیت سے اس عہدے پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سعید سے نوازا تھا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو انہوں نے بلا تامّل اس پر لبیک کہا اور بلاکشانِ اسلام کی صف میں شامل ہو گئے۔ ۶ بعد بعثت میں مکّہ کے مظلوم مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے حبش کی طرف ہجرت کی تو وہ بھی ہجرت کر کے حبش چلے گئے اور وہاں سالہا سال تک غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ پھر حبش سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے اور بعض غزوات میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ غزوۂ حنین میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور طبریؒ کے بیان کے مطابق اسی غزوہ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوتے لیکن ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ غزوۂ طائف میں شہید ہوئے۔ شہادت کا واقعہ اس طرح پیش آیا کہ ان کا گھوڑا بھڑک کر قلعۂ طائف کی طرف بھاگا اور دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے حضرت یزیدؓ کو شہید کر ڈالا۔ شہادت کے وقت کوئی اولاد نہ تھی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت عیاض رضؓ بن زُہیر فہری

سیّدنا حضرت ابوسعید عیاض رضؓ بن زُہیر اُن نفوسِ قدسی میں سے ایک ہیں جو اس وقت سعادت اندوزِ ایمان ہوئے جب مُشرکینِ مکّہ کے قہر وغضب کی بجلیاں اہلِ حق کے خرمنِ عافیّت پر تڑپ تڑپ کر گر رہی تھیں۔ حضرت عیاضؓ کا تعلق قریش کے خاندان بنو فہر سے تھا۔

سلسلۂ نسب یہ ہے :-

"عیاض بن زُہیر بن ابی شداد بن ربیعہ بن ہلال بن مالک بن عنبہ بن حارث بن فہر"

اُن کی والدہ سلمیٰ بنتِ عامر بھی بنو فہر سے تھیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ کے مظلوم مسلمانوں کو کفّار کے جور وتعدّی سے بچنے کے لیے حبش کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا تو دوسری ہجرتِ حبشہ (۵ھ بعدِ بعثت) میں حضرت عیاض بھی ہجرت کر کے حبش چلے گئے اور راہِ حق میں کئی سال تک پردیس میں مقیم رہے۔ غزوۂ بدر سے کچھ عرصہ پہلے حبش سے مدینہ منوّرہ آئے۔ جہاں حضرت کلثوم رضؓ بن الہدم انصاری نے انہیں اپنا مہمان بنایا۔ حضرت عیاض رضؓ نہایت مخلص مسلمان تھے اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل وجان سے شیدائی تھے۔ غزوات کا آغاز ہُوا تو سب سے پہلے حضرت عیاض رضؓ بن زُہیر کی تلوار بدر کے میدانِ جہاد میں بے نیام ہوئی اور دشمنانِ حق کے سروں پہ برقِ خاطف بن کر گری۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے اصحابِ بدر کی فہرست میں عیاض رضؓ بن زہیر کے بجائے عیاض رضؓ بن غنم لکھا ہے لیکن

دوسرے اربابِ سیر کی روایات کی روشنی میں یہ صحیح نہیں حضرت عیاض بن غنم فاتح جزیرہ، ابوسعید عیاض بن زہیر کے بھتیجے تھے اور بدری نہیں تھے۔ (تجرید اسماء الصحابہ جلد ۱ ص ۴۶۲)

بدر کے بعد حضرت عیاض بن زہیر نے اُحد، احزاب اور دوسرے تمام غزوات میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر غزوے میں سربکف ہو کر لڑے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد وہ تقریباً اُنیس ۱۹ برس تک حیات رہے۔ اس طویل عرصے میں اُن کی کسی سرگرمی کا کُتبِ سیر میں سراغ نہیں ملتا۔ علامہ ابنِ اثیرؒ نے "اُسد الغابہ" میں اُن کا سالِ وفات ۳۰ھ ہجری بیان کیا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت مَحمیہؓ بن الجزء

حضرت مَحمیہؓ بن جزء اس مقدس جماعت کے ایک معزز رکن تھے جس کے بارے میں سورۃ توبہ میں ارشاد ہوا ہے: "وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی ــــــ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔"

حضرت مَحمیہؓ کا تعلق بنی زبید سے تھا اور وہ باختلافِ روایت قریش کے خاندان بنو سہم یا بنو جمح کے حلیف تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔

"مَحمیہؓ بن جزء بن عبدِ یغوث بن عویج بن عمرو بن زبید الاصغر"

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے پہلے تین سالوں میں نہایت رازداری کے ساتھ تبلیغ حق کا فریضہ انجام دیتے رہے اس دوران میں جو سلیم الفطرت اصحاب سعادت اندوزِ ایمان ہوئے حضرت مَحمیہؓ اُن میں سے ایک تھے۔ بعثت کے چوتھے سال جب حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے عام دعوتِ توحید کا آغاز فرمایا تو مشرکینِ مکّہ اہلِ ایمان کی جان کے لاگو ہو گئے اور ان پر جور و ستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ حق کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا تو دوسری ہجرتِ حبشہ (سنہ ۶ بعدِ بعثت) میں حضرت مَحمیہؓ بھی دوسرے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے حبش چلے گئے اور وہاں کئی سال تک غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "استیعاب" میں بیان کیا ہے کہ حضرت مَحمیہؓ غزوۂ بنو مصطلق (۵ سنہ ہجری)

سے کچھ پہلے حبش سے مدینہ منوّرہ آئے اور سب سے پہلے اسی غزوہ میں شریک ہوئے۔ ان کے اخلاص فی الدّین اور جذبۂ فدویّت کی وجہ سے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہایت عزیز جانتے تھے ویسے بھی ان کو خاندانِ نبوّت سے یوں نسبت حاصل تھی کہ وہ جلیل القدر صحابیہ حضرت اُمّ الفضلؓ (حضرۃ عباسؓ کی اہلیہ اور حضورؐ کی چچی) کے ماں جائے بھائی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت فضلؓ بن عباسؓ سے ان کی بیٹی بیاہی گئی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خمس کا عامل بنا دیا تھا۔ بقول ابنِ سعدؒ غزوۂ بنو مصطلق میں بھی انہوں نے یہ خدمت انجام دی تھی۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مَحمیہؓ کو اکثر انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ نے انہیں ایک خوبصورت لونڈی عطا فرمائی تھی۔ حضرت مَحمیہؓ کی زندگی کے مزید حالات کتبِ سِیَر میں نہیں ملتے یہاں تک کہ ان کا سالِ وفات بھی معلوم نہیں ہے۔ تاہم ان کی جلالتِ قدر پر سب اہلِ سِیَر کا اتفاق ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

حضرت عُقبہ رضؓ بن عامر جُہنیؓ

(۱)

ہجرتِ نبویؐ کے بعد کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے اور نورانی چہرے والے مضبوط ہاتھ پاؤں کے ایک صاحب آپؐ کی سواری کھینچ رہے تھے۔ ایک مقام پر حضورؐ نے دفعتہً سواری بٹھادی اور اُن صاحب سے فرمایا:

"اب تم سواری پر بیٹھو میں اس کی مہار پکڑوں گا۔"

حضورؐ کا ارشاد سن کر وہ صاحب سناٹے میں آ گئے۔ عرض کیا:

"یارسولؐ اللہ، میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، میں مسکین آپؐ کی سواری پر بیٹھوں؟"

حضورؐ نے فرمایا: "ہاں بھائی تم بہت تھک گئے ہو اب تمہارا حق ہے کہ تم سواری پر بیٹھو۔"

انہوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ مجھ غلام کی یہ جرأت کیسے ہوسکتی ہے کہ میں سواری پر بیٹھوں اور میرے آقا اس کو کھینچیں۔"

جب حضورؐ نے باصرار فرمایا کہ یہ میرا حکم ہے تمہیں سواری پر ضرور بیٹھنا ہو گا ——— تو الامر فوق الادب کے مصداق وہ صاحب تعمیل ارشاد پر مجبور ہو گئے ——— اور پھر چشمِ فلک نے یہ تحیّر خیز منظر دیکھا کہ ایک اعرابی سواری پر بیٹھے ہیں اور فخرِ موجودات سیّد الانام امام الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سواری کی مہار تھامے آگے آگے چل رہے ہیں۔

یہ صاحب رسولؐ جن کو یہ عظیم الشان شرف حاصل ہوا کہ سارے جہان سے

افضل و برتر اور سارے جہان کی رونق و برکت جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی سواری پر بٹھایا اور پھر اس کو دُور تک کھینچتے رہے، حضرت عُقبہؓ بن عامر جُہنی تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابو عمرو عُقبہؓ بن عامر کا شمار ان بزرگ صحابہؓ میں ہوتا ہے جنہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف پاکر دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان کا تعلق بنو جہنیہ سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عُقبہؓ بن عامر بن علبس بن عمرو بن عدی بن عمرو بن رفاعہ بن مودوعہ بن عدی بن غنم بن ربیعہ بن رشدان بن قیس بن جہنیہ۔

حضرت عُقبہؓ کا مسکن مدینہ کے نواح میں تھا۔ وہ اپنے قبیلے کے ذہین و فرس اور لکھے پڑھے آدمیوں میں سے تھے۔ فنِ خطابت اور شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ طبیعت نہایت سادہ پائی تھی اس لیے ان کا خاص مشغلہ بکریاں چرانا تھا۔ چند سال پہلے مکہ میں جو صدائے توحید بلند ہوئی تھی اس کی بھنک حضرت عقبہؓ کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا اس لیے دعوتِ توحید کا حال سن کر بہت متاثر ہوئے لیکن کسی وجہ سے مکہ جاکر شرفِ اسلام سے بہرہ ور نہ ہو سکے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو یہ خبر مدینہ کے نواحی علاقوں میں بڑی تیزی سے پھیل گئی۔ حضرت عقبہؓ کو جس وقت یہ خبر ملی وہ بکریاں چرا رہے تھے۔ مدینہ میں حضورؐ کی تشریف آوری سے ان کی دلی مراد بر آئی اور وہ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہونے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ بکریوں کے ریوڑ کو خدا کے حوالے کیا اور بسرعت تمام عازمِ مدینہ ہو گئے۔ مدینہ پہنچ کر سیدھے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر کلمۂ توحید پڑھا اور حضورؐ سے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول مجھ سے بیعت لیجئے۔ حضورؐ نے پوچھا، بیعت عربیہ کرنا چاہتے ہو یا بیعتِ ہجرت۔ عرض کیا، بیعتِ ہجرت۔ چنانچہ بیعت کر کے مدینہ منوّرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور ہر وقت

خدمتِ نبوی میں حاضر رہنے لگے۔ اہلِ سیر کا بیان ہے کہ عُقبہؓ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں سے ایسے دابستہ ہوئے کہ سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رہے اور حضور سے جدائی انہیں کبھی گوارا نہ ہوئی۔ حضورؐ سفر پر روانہ ہوتے تو عقبہؓ سواری کھینچنے کی خدمت انجام دیتے اور حضورؐ کو راستے میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیتے۔ عقبہ اپنی اس خوش بختی پر بڑے نازاں تھے۔ وہ سواریِ مبارک کی مہار یا لگام تھامے ہوتے تو انہیں ایسا معلوم ہوتا کہ کائنات کی تمام نعمتیں ان کے قدموں تلے جمع ہیں۔

بارگاہِ رسالت میں ہر وقت کی حاضر باشی سے ان کو فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہونے کا خوب موقع مل گیا تھا۔ قرآنِ کریم کی متعدد سورتیں خود مہبطِ وحی و رسالتؐ سے سیکھیں۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ فرطِ ذوق و شوق میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں سے چمٹ گئے اور عرض کی، یا رسول اللہ مجھے سورہ ہود و یوسف پڑھائیے۔ حضورؐ نے بڑے لطف و انبساط کے ساتھ انہیں ان سورتوں کی تعلیم دی۔ مُسندِ احمدؒ بن حنبل میں خود حضرت عقبہؓ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ سفر میں معمول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کھینچ رہا تھا ـــــ معاً حضورؐ نے ارشاد فرمایا، عقبہ کیوں نہ تمہیں قرآن کی دو بہترین سورتیں پڑھنے کے لیے بتاؤں، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ضرور بتائیے۔ فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عقبہؓ کی خدمتگزاری سے بہت خوش تھے اور ان پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اثنائے سفر میں انہیں سواری پر بٹھا کر خود اس کو کھینچا تھا۔ ایک اور موقع پر حضورؐ کا دریائے کرم ان کے حق میں اس قدر جوش میں آیا کہ انہیں بطورِ خاص ایک شرعی حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ صحیحین میں حضرت عقبہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ بکریاں میرے سپرد کیں تاکہ قربانی کے لیے آپ کے صحابہؓ میں تقسیم کر دوں۔ میں نے بکریاں تقسیم کر دیں۔ آخر میں صرف ایک بکری بچ رہی جو پورے سال کی نہ تھی۔ آپؐ نے فرمایا چلو تم تو بس اس کی قربانی کر لو۔

حضرت ابو بردہؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ خیر تم تو اس کو ذبح کر دو مگر تمہارے بعد اس عمر کی بکری آئندہ کسی شخص کے لیے بھی کافی نہ ہوگی۔ گویا یہ استثنا صرف حضرت عقبہؓ کے لیے تھا۔ تحصیلِ علم کے شوق نے حضرت عقبہؓ کو نہ صرف قرآن حکیم کا قاری اور عالم بنا دیا تھا بلکہ حدیث، فقہ اور فرائض میں بھی امتیازی درجہ پر فائز کر دیا تھا۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کے اہلِ علم طبقے میں ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک حضرت عقبہؓ جہاں حضورؐ کی خدمت کی سعادت حاصل کرتے رہے وہاں فیضانِ نبویؐ سے بھی برابر بہرہ یاب ہوتے رہے۔

(۳)

اربابِ سیر نے عہدِ رسالتؐ کے غزوات میں حضرت عقبہؓ بن عامر کی شرکت کا ذکر نہیں کیا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو عہدِ نبویؐ کے غزوات میں حضورؐ کی ہمرکابی کا شرف ضرور حاصل ہوا ہوگا کیونکہ بارگاہِ رسالتؐ میں ان کی مسلسل حاضر باشی پر تمام اہلِ سیر کا اتفاق ہے۔ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ سفر و حضر میں ہمیشہ حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر رہیں اور غزوات سے غیر حاضر رہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے اور فتنۂ ارتداد کے استیصال کے بعد شام سے معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا تو حضرت عقبہؓ شام جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے اور عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں رومیوں کے خلاف متعدد لڑائیوں میں دادِ شجاعت دی۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے "اصابہ" میں بیان کیا ہے کہ دمشق کو تسخیر کرنے والی فوج میں حضرت عقبہؓ بھی شریک تھے۔ فتح کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے انہیں بارگاہِ خلافت میں مسلمانوں کی کامیابی کی اطلاع دینے کے لیے مدینہ بھیجا۔ انہوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو یہ خبر پہنچائی تو وہ بے اختیار سجدۂ شکر بجا لائے اور حضرت عقبہؓ کو گلے سے لگا لیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بعد انہوں نے حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں اپنی تلوار

کے جوہر دکھائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا تو حضرت عقبہؓ امیر معاویہؓ کے طرفداروں میں شامل ہو گئے، اور جنگِ صفین میں ان کی طرف سے حصہ لیا۔ اسی بناء پر امیر معاویہؓ ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ جب انہوں نے مصر پر قبضہ کیا تو حضرت عقبہؓ کو وہاں کا امیر الخراج اور امامِ نماز مقرر کیا۔ وہ اپنے فرائض کو کئی سال تک نہایت خوش اسلوبی سے نباہتے رہے۔ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ مصر کے گورنر بھی رہے۔

۴۷ھ ہجری میں امیر معاویہؓ نے حضرت عقبہؓ کو جزیرہ روڈس پر فوج کشی کی ہدایت کی۔ انہوں نے ایک بحری بیڑے کے ساتھ روڈس پر چڑھائی کی۔ ابھی روڈس فتح نہیں ہوا تھا کہ امیر معاویہؓ نے کسی بناء پر انہیں معزول کر دیا اور ان کی جگہ حضرت مسلمہؓ بن مخلد انصاری کو مقرر کیا۔ حضرت عقبہؓ نے اپنی معزولی کو بہت محسوس کیا اور یہ کہہ کر اس مہم سے دست کش ہو گئے کہ میں معزولی کی حالت میں لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ملکی سیاست میں کسی قسم کا حصہ نہ لیا۔ حضرت عقبہؓ کے سالِ وفات کے بارے میں مختلف روائتیں ہیں لیکن جمہور اہلِ سیر اس طرف گئے ہیں کہ انہوں نے ۵۸ھ ہجری میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ ازواج و اولاد کے بارے میں کسی کتاب میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

(۴)

حضرت عقبہؓ بن عامر کا شمار فضلاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ انہوں نے حاملِ وحی رسالتؐ سے مسلسل دس برس تک براہِ راست کسبِ فیض کیا تھا اس لیے معدنِ فضل و کمال بن گئے تھے۔ تاہم وہ روایتِ حدیث میں بہت محتاط تھے۔ ان سے صرف ۵۵ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ۷ متفق علیہ، ایک میں بخاری اور سات میں مسلم منفرد۔ ایک مرتبہ میزبان رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ صرف ایک حدیث سننے کی خاطر ان کے پاس مصر گئے کیونکہ ان کے بقول اس حدیث کا جاننے والا اور کوئی شخص اس وقت عالمِ اسلام

میں موجود نہ تھا۔ اسی طرح حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوامامہ باہلیؓ جیسے اکابرِ اُمت بھی ان کے خوانِ علم سے بہرہ یاب ہوئے۔ ان کے علاوہ تابعین کرام کی ایک بڑی تعداد نے ان سے استفاضہ کیا۔

حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں حضرت عقبہؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ قرانِ پاک کے قاری، اونچے درجے کے فقیہ، فرائض کے ماہر، خوش گو شاعر اور بلند مرتبہ آدمی تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے "تہذیب التہذیب" میں بیان کیا ہے کہ حضرت عقبہؓ نے ایک قرآن خود مرتب کر کے لکھا تھا۔ قرآنِ کریم کا یہ نسخہ نویں صدی ہجری تک مصر میں موجود تھا اور اس کے آخر میں حضرت عقبہؓ کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر موجود تھی۔ "یہ قرآن عقبہ بن عامر نے اپنے ہاتھ سے لکھا"

حضرت عقبہؓ گوناگوں محاسنِ اخلاق کا پیکرِ جمیل تھے۔ اتباعِ رسول، تحمل، انفاق فی سبیل اللہ، عیب پوشی اور سادگی ان کے خاص اوصاف تھے۔ دس برس تک بڑے ذوق وشوق سے حضورؐ کی خدمت کرتے رہے۔ آپؐ کے وصال کے بعد بھی وہ ہر کام میں اسوۂ نبوی کو پیشِ نظر رکھتے۔ جس زمانے میں مصر میں امیر الخراج اور امامِ نماز تھے، ایک مرتبہ مغرب کی نماز میں کسی سبب سے دیر کر دی، اتفاق سے حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بھرے مجمع میں حضرت عقبہؓ سے مخاطب ہو کر کہا:

"ماھٰذا الصلوٰۃ یا عقبہ" عقبہ یہ کیسی نماز ہے؟

حضرت عقبہؓ نے نہایت تحمل سے جواب دیا: "ایک کام کی وجہ سے اتفاقاً دیر ہو گئی۔"

حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا: "یہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ مت بھولو کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو اور تمہارا قول وفعل لوگوں کے لیے حجت بن سکتا ہے۔ حضورؐ نے نمازِ مغرب میں عجلت کی تاکید فرمائی ہے اگر تم نماز میں تاخیر کرو گے تو لوگ خیال کریں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح نماز ادا کرتے ہوں گے۔ یاد رکھو کہ کسی صحابی کا کوئی فعل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔"

حضرت عقبہؓ نے سارے مجمع کے سامنے ندامت کا اظہار کیا اور آئندہ محتاط رہنے کا وعدہ کیا۔

مُسندِ احمدؒ بن حنبل میں ہے کہ امامِ نماز کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد بالعموم لوگوں کو نماز پڑھانے میں بہت محتاط تھے اور مقتدی بننے کو پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں نماز کا وقت آ گیا لوگوں نے ان سے درخواست کی، اے صاحبِ رسول آپ ہمارے امام بنیئے۔ حضرت عقبہؓ نے اس میں عذر کیا جب لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ امام نے اگر صحیح وقت پر پورے شرائط کے ساتھ نماز پڑھائی تو امام اور مقتدیوں سب کے لیے باعثِ ثواب ہے اور اگر اس میں کوئی کوتاہی یا غفلت ہو گئی تو امام سے باز پرس ہو گی اور مقتدی بری الذمہ ہوں گے۔

حضرت عقبہؓ کو اللہ نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ ایک غلام بھی پاس تھا لیکن وہ اس قدر سادہ مزاج تھے کہ اپنا تمام کام خود کرتے تھے اور غلام سے شاذ ہی کام لیتے تھے۔ عفو و درگزر اور دوسروں کے عیبوں سے چشم پوشی ان کا خاص وصف تھا۔ ایک مرتبہ غلام نے شکایت کی کہ ہمارا ہمسایہ شراب پیتا ہے، فرمایا، جانے دو کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ اس نے کہا کہ میں محتسب کو ضرور بتاؤں گا۔ حضرت عقبہؓ نے ناراض ہو کر فرمایا، بڑا افسوس ہے کہ تم اس معاملے کو طول دینا چاہتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے کسی کے عیب کو چھپایا اس نے گویا مردہ کو زندہ کیا۔

حضرت عقبہؓ کو تیر اندازی کے فن سے بڑا شغف تھا اس کا سیکھنا اور سکھلانا ہر مسلمان کے لیے لازم قرار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت خالدؓ بن ولید کو بُلا کر یہ حدیث سنائی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر کے بدلے میں تین اشخاص کو جنت میں داخل کرے گا، اس کے بنانے والے کو، خدا کی راہ میں اس کے لے جانے والے کو اور چلانے والے کو۔ اور حضورؐ نے تین

کھیلوں کو جائز قرار دیا ہے، تیر اندازی، گھوڑے کی تادیب اور اپنی بیوی سے ہنسی مذاق کرنا۔ جس نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اسے بھلا دیا اس نے بڑی نعمت کھو دی۔

امام احمدؒ نے اپنی مُسند میں بیان کیا ہے کہ وفات کے وقت حضرت عقبہؓ کے پاس ۷۰ کمانیں اور ان کے لوازم تھے۔ ان سب کو انہوں نے راہِ خدا میں وقف کر دیا تھا۔ طبیعت بڑی فیاض پائی تھی۔ اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کرتے رہتے تھے۔ حضرت عقبہؓ کے مرتبۂ علمی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ وہ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ، امیر معاویہؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ عاصم بن سفیان ثقفی نے آکر حضرت ابوایوبؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا۔ حضرت ابوایوبؓ نے بتا تو دیا لیکن ساتھ ہی حضرت عقبہؓ سے تصدیق چاہی کہ میرا جواب درست ہے یا نہیں۔ انہوں نے تصدیق کی تو وہ مطمئن ہوئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمرانؓ بن حصینؓ کعبی

(۱)

حضرت امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں عراق کے والی (وائسرائے) زیاد بن ابیہ کو بڑے وسیع اختیارات حاصل تھے وہ نہ صرف عراق کے داخلی نظم ونسق اور امن وامان کا ذمہ دار تھا بلکہ اس بات کا بھی مجاز تھا کہ بعض صوبوں کے گورنر اپنی صوابدید کے مطابق مقرر کر سکے۔ ایک مرتبہ خراسان کے گورنر کی جگہ خالی ہوئی تو اس نے بصرہ میں مقیم ایک معمر صاحبِ رسول کو بُلا بھیجا۔ جب وہ تشریف لائے تو زیاد نے ان کی حد سے زیادہ تعظیم وتکریم کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ خراسان کی گورنری قبول فرمائیں۔ اُن صاحبِ رسول نے زیاد کی پیشکش کا شکریہ ادا کیا لیکن اسے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ زیاد نے بہت اصرار کیا لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہے۔ یہ خبر عامۃ الناس میں پھیلی تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ کچھ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: "اے رسول اللہ کے صحابی، آپ نے خراسان کا گورنر بننے سے کیوں انکار کیا آپ کے اس منصب پر فائز ہونے سے یہ صوبہ خیر وبرکت سے معمور ہو جاتا۔" انہوں نے جواب دیا: "تم حیران ہو کہ میں نے اتنا بڑا عہدہ قبول نہیں کیا لیکن مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ میں تو اس کی تپش میں نماز پڑھوں اور تم لوگ اس کی ٹھنڈک میں سجدہ ریز ہو۔ مجھے یہ خوف دامنگیر ہوا کہ میں نے تو دشمنوں کے خلاف جان کی بازی لگائی ہو اور عین اس وقت میرے نام زیاد کا کوئی ناجائز حکم پہنچے۔ اگر اس صورت میں اس کی تعمیل کروں تو میری آخرت برباد ہو جائے اور اگر تعمیل نہ کروں اور واپس آ جاؤں تو میری گردن ماردی جائے۔" ——— یہ صاحبِ رسول جنہوں نے محض

خوفِ آخرت سے اتنا بڑا عہدہ مسترد کر دیا، حضرت عمرانؓ بن حصینؓ تھے۔

۲

سیدنا حضرت ابو نجید عمرانؓ بن حصینؓ کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق بنو کعب سے تھا جو مرالظہران اور اس کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:-

عمرانؓ بن حصینؓ بن عبید بن خلف بن عبد نہم بن حذیفہ بن جہمہ بن غاضرہ بن حبیشہ بن کعب۔

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمرانؓ اپنے والد اور ہمشیرہ کے ساتھ سنہ ہجری کی ابتداء میں سعادت اندوزِ اسلام ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے جا چکے تھے لیکن محدث ابنِ خزیمہؒ اور حافظ ابنِ حجرؒ نے اس سلسلہ میں جو روایت نقل کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اصحاب ہجرتِ نبوی سے پہلے کسی وقت مکہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے اس میں بھی حضرت عمرانؓ کو تقدم حاصل ہے۔ اس روایت کے مطابق حضرت عمرانؓ کے قبولِ اسلام کے بعد مشرکینِ قریش کی ایک جماعت ان کے والد حصین بن عبید کے پاس گئی۔ حصین اپنے قبیلے کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے اور قریش کے نزدیک ان کی بڑی قدر و منزلت تھی انہوں نے حصین سے کہا کہ آپ ہماری طرف سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جائیے اور ان سے کہئے کہ وہ ہمارے معبودوں کی توہین کرنا ترک کر دیں۔ حصین، مشرکینِ قریش کے ساتھ حضورؐ کی قیام گاہ پر گئے اور دروازے کے قریب بیٹھ گئے۔ ان سے پہلے حضرت عمرانؓ اور ان کے ساتھی حضورؐ کی خدمت میں پہنچ چکے تھے اور اس وقت بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے۔ حضورؐ نے حصین کو دیکھا تو فرمایا، شیخ کے لیے جگہ چھوڑ دو۔ حصین حضورؐ کے قریب چلے گئے اور آپؐ سے مخاطب ہو کر کہا، اے ابنِ عبد المطلب یہ کیا باتیں ہیں جو ہم سن رہے ہیں، آپ ہمارے معبودوں کی مذمت کرتے ہیں حالانکہ آپ کے

والد بڑے احتیاط پسند اور بھلے آدمی تھے۔ حضورؐ نے فرمایا، "تم بتاؤ کہ کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو"۔ حصین نے جواب دیا، "آٹھ کی، سات معبود زمین پر ہیں اور ایک آسمان میں ہے"۔

حضورؐ نے پوچھا، "اچھا تو جب تم پر مصیبت آتی ہے تب کس کو پکارتے ہو۔"

حصین نے کہا، "آسمان والے معبود کو۔"

حضورؐ نے پھر دریافت فرمایا: "اور جب تمہارے مال پر تباہی آجائے تب کس کو پکارتے ہو؟"

حصین نے کہا، "آسمان والے خدا کو۔"

حضورؐ نے فرمایا، وہ اللہ تو تنہا تمہاری فریاد سنتا ہے اور تم اس کے ساتھ شرک کرتے ہو۔ جب تم لوگ اس کو مصیبت کے وقت پکارتے ہو تو امن کی حالت میں غیروں کو معبود بنا کر کیوں پکارتے اور پوجتے ہو۔ شاید تم سمجھتے ہو کہ اللہ تم سے راضی ہے اس لیے امن کی حالت میں اس کو پکارنے کی ضرورت نہیں یا تم ڈرتے ہو کہ اللہ کا قہر و غضب تم پر نہ نازل ہو جائے اس لیے مصیبت میں اس کو یاد کر لیتے ہو۔

حصین نے کہا، دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں۔

اس طرح کچھ اور سوال و جواب ہوئے یہاں تک کہ حصین لاجواب ہو گئے۔ حضورؐ نے اس کے چہرے پر تغیّر کے آثار دیکھے تو فرمایا، اے حصین اسلام قبول کر، محفوظ رہے گا۔ حصین نے عرض کیا، میری برادری بڑی وسیع ہے میں اس کا سامنا کیسے کروں گا۔

حضورؐ نے فرمایا، یہ دعا مانگ :۔

"اے اللہ میں تجھی سے ہدایت چاہتا ہوں تو میرے امر کی اصلاح فرما اور مجھ کو ایسا علم فراوانی سے عطا فرما جو میرے لیے نفع مند ہو۔"

حصینؓ نے یہ دُعا مانگی تو ان کے آئینۂ دل سے کفر کا زنگ آناً فاناً کافور ہو گیا۔ اور وہ اسی وقت سعادت اندوزِ ایمان ہو گئے۔ یہ دیکھتے ہی حضرت عمرانؓ فرطِ مسرت سے بیخود ہو کر اپنے باپ کی طرف لپکے اور ان کے سر، ہاتھوں اور پاؤں کو چومنے لگے۔

یہ منظر دیکھ کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم چشم پُرآب ہو گئے اور فرمایا:

"حصین جب اس مجلس میں وارد ہوئے تو کافر تھے اس لیے عمرانؓ نے ان کی طرف التفات کیا نہ ان کی تعظیم بجالائے۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرفِ ایمان سے بہرہ ور کیا ہے تو عمرانؓ اپنے والد کے حق کی ادائیگی میں مشغول ہو گئے ہیں۔"

جب حضرت حصینؓ نے بارگاہِ رسالتؐ سے اٹھنے کا ارادہ کیا تو حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اٹھو اور حصینؓ کی قیام گاہ تک ان کی مشایعت کرو۔

وہ باہر نکلے تو قریش نے ان کو بالکل بدلا ہوا پایا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے ہیں۔ اب انہوں نے حصینؓ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کیا اور انہیں چھوڑ کر مارِ دم بریدہ کی طرح پیچ و تاب کھاتے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

امام ترمذیؒ نے حضرت عمرانؓ کی زبانی یہ روایت اس طرح نقل کی ہے:

"عمران روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے والد حصین سے پوچھا، تم موجودہ حالت میں کتنے خداؤں کی پوجا کرتے ہو، میرے والد نے جواب دیا، سات خداؤں کی جن میں سے چھ تو زمین میں ہیں اور ایک آسمان میں۔ آپؐ نے پوچھا، اچھا تو ان میں سے اپنی محبت اور خوف کے لیے تم نے کس کو بنا رکھا ہے۔ انہوں نے جواب دیا، آسمان والے کو۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، حصین اگر تم اسلام قبول کر لیتے تو میں تم کو دو کلمے ایسے تعلیم کرتا جو تمہارے لیے بڑے سودمند ہوتے۔ جب حصین حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بات یاد دلائی اور عرض کیا، یا رسول اللہ جن دو کلموں کا آپؐ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا اب وہ مجھے بتا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا یہ پڑھ لیا کر

اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَاَعِذْنِیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ

(اے اللہ میرے مقدر کی ہدایت میرے دل میں ڈال دے اور میرے نفس کے فریب سے مجھے بچالے)

ابن سعدؒ کے بیان کے مطابق حضرت حصینؓ کی بیٹی بھی ان کے ساتھ آئی تھیں۔ انہوں نے بھی بھائی اور باپ کی پیروی کی اور شرف اسلام سے بہرہ ور ہو گئیں۔ پھر یہ تینوں، باپ بیٹا اور بیٹی دولت ایمان کے ساتھ اپنے وطن لوٹ گئے۔

(۳)

حضرت عمرانؓ بن حصینؓ بعض وجوہ کی بناء پر ہجرت نہ کر سکے اور مستقل سکونت اپنے وطن ہی میں رکھی لیکن وہ حضورؐ کی زیارت اور فیضان سے سعادت اندوز ہونے کے لیے اکثر مدینہ منورہ آتے جاتے رہتے تھے۔ انہیں بعض غزوات میں بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ فتح مکہ میں وہ اس شان سے شریک ہوئے کہ بنو کعب کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ فتح مکہ کے بعد انہوں نے حنین اور طائف کے معرکوں میں داد شجاعت دی۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ (سنہ ۶ھ یا سنہ ۷ھ ہجری میں) حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک مہم پر گئے تو حضرت عمرانؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ جب تک سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں رونق افروز رہے، حضرت عمران تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مدینہ آکر حضورؐ کے جمال جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کرتے رہے۔ سنہ ۱۱ھ ہجری میں حضورؐ کا وصال ہوا تو حضرت عمرانؓ کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی، اور وہ دل شکستگی کے عالم میں گوشہ نشین ہو گئے۔ دن رات عبادت الٰہی کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ چند سال بعد حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو انہوں نے ترک وطن کر کے بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں فقہ کی تعلیم کے لیے سرکاری طور پر مامور فرمایا۔ فقہ کی تعلیم کے علاوہ حضرت عمرانؓ نے حدیث کی اشاعت کے لیے بھی مستقل حلقۂ درس قائم کیا۔ یہ حلقۂ درس بصرہ کی جامع مسجد میں تھا جہاں وہ

لوگوں کو باقاعدگی سے حدیثیں سنایا کرتے تھے۔ عمرانؓ کے ایک ہمعصر ہلال بن سیافؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے کسی کام سے بصرہ جانا پڑا۔ مسجد میں دیکھا کہ لوگ ایک سفید ریش بزرگ کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہیں اور وہ بزرگ ٹیک لگائے بڑے لطف و انبساط کے ساتھ حدیثیں بیان کر رہے ہیں۔ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں تو جواب ملا کہ حضرت عمرانؓ بن حصینؓ صحابی ہیں۔

حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے دورِ خلافت میں بڑے بڑے ہنگامے اٹھے لیکن حضرت عمران یکسر غیر جانبدار رہے اور کسی ہنگامے یا خانہ جنگی میں مطلق کوئی حصہ نہ لیا۔

بنو امیہ کے دَور میں انہیں زیاد بن ابیہ کی طرف سے خراسان کی گورنری کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن انہوں نے اسے مسترد کر دیا البتہ زیاد کے بعد اس کے بیٹے عبید اللہ نے محصلِ خراج کا عہدہ پیش کیا تو اسے مخلوقِ خدا کی خیر خواہی کے خیال سے قبول کر لیا۔ امام حاکمؒ نے اپنی "مستدرک" میں لکھا ہے کہ جب وہ تحصیل خراج کی خدمت انجام دے کر واپس آئے تو بالکل خالی ہاتھ تھے۔ عبید اللہ نے پوچھا، خراج کی رقم کیا کی؟ انہوں نے جواب دیا کہ جس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وصول ہوتا تھا میں نے بھی اسی طریقے وصول کیا اور جن مدوں پر عہدِ رسالت میں صرف ہوتا تھا، انہی پر صرف کر دیا۔ ان کا جواب سن کر عبید اللہ خاموش ہو گیا۔

مُسندِ احمدؒ میں ہے کہ خراسان کی گورنری کو ٹھکرانے کے بعد حضرت عمرانؓ کو اطلاع ملی کہ حکم بن عمرو غفاری نے یہ عہدہ قبول کر لیا ہے۔ انہوں نے حکم بن عمرو کو بلا کر فرمایا، تم نے یہ عہدہ قبول کر کے بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اپنے فرائض بڑی احتیاط سے انجام دینا اور ہر حالت میں اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کو پیش نظر رکھنا۔ کسی ناجائز حکم پر عمل نہ کرنا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں کسی بندہ کی اطاعت جائز نہیں —— ان نصائح سے حضرت عمرانؓ کا مقصد یہ تھا کہ حکم بن عمرو کہیں زیاد کی اطاعت کے جوش میں احکام الٰہی سے غافل

نہ ہو جائیں۔

(۴)

علم وفضل کے اعتبار سے حضرت عمرانؓ نہایت بلند مرتبے پر فائز تھے۔ ان کے ہمعصر فضلاء صحابہؓ کو بھی ان کے کمالات علمی کا اعتراف تھا۔ یہاں تک کہ سیدنا حضرت عمر فاروقؓ جیسے عبقری کی نگاہِ مردم شناس نے انہیں لوگوں کو فقہ کی تعلیم دینے کے لیے منتخب کیا۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں کیا اس صورت میں عورت کو مطلقہ سمجھا جائے گا یا نہیں۔ حضرت عمرانؓ نے فرمایا، اس طرح طلاق دینے والا گناہ کا مرتکب ہوا لیکن عورت مطلقہ ہو گئی۔ وہ شخص اب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے حضرت عمرانؓ کے جواب کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے نہ صرف حضرت عمرانؓ کے جواب سے اتفاق کیا بلکہ ساتھ ہی دعا کی کہ الٰہی ہماری جماعت میں ابونجیدؓ جیسے بہت سے آدمی پیدا فرما دے۔ (مستدرکِ حاکم) حضرت محمد بن منکدرؒ کا قول ہے کہ بصری صحابہ کرامؓ میں علم وفضل کے اعتبار سے حضرت عمرانؓ کا درجہ سب سے بلند تھا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عمرانؓ بن حصینؓ سے بہتر اور فاضل شخص کوئی ہمارے یہاں نہیں آیا۔

علمِ حدیث میں حضرت عمرانؓ کو درجۂ تبحّر حاصل تھا لیکن روایت میں بہت محتاط تھے اس لیے مرویات کی تعداد صرف ایک سو تیس ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بہت سے ایسے اصحابِ رسولؐ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے نزدیک صحیح احادیث بیان کرتے ہیں، ان کی نیّت بھی نیک ہوتی ہے پھر بھی الفاظ کا ردّوبدل ہو جاتا ہے۔ میں بھی ڈرتا ہوں کہ حدیث بیان کرتے ہوئے کہیں الفاظ میں کمی وبیشی یا ردوبدل نہ ہو جائے۔ اسی لیے میں حدیث بیان کرنے میں احتیاط کرتا ہوں حالانکہ چاہوں تو دو دن تک مسلسل احادیث بیان کرتا رہوں اور ان میں سے کسی ایک کا بھی اعادہ نہ ہو۔

حضرت عمرانؓ کو جس درجہ میں کوئی حدیث یاد ہوتی، حدیث بیان کرنے سے پہلے

یا بعد اس کا ذکر بھی کر دیتے۔ اگر حدیث کے الفاظ کے بارے میں یقین کامل ہوتا تو کہتے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح فرماتے ہوئے سُنا ہے۔ اگر شک ہوتا تو کہتے جہاں تک میرا خیال (یا حافظہ) ہے میں نے صحیح بیان کی۔

حضرت عمرانؓ کو تفقہ فی الدین میں جو کمال حاصل تھا اس کی بناء پر نہ صرف بصرہ بلکہ باہر کے لوگ بھی ان سے مسائل پوچھنے آتے تھے اور مطمئن ہو کر لوٹتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ حضرت عمرانؓ فضلاء اور فقہائے صحابہ میں تھے۔

(۵)

حضرت عمرانؓ اپنے ہر قول اور فعل میں اسوۂ نبوی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اہلِ سیر نے ان کی کثرتِ عبادت کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ نہایت استغراق اور محویت کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے اکثر ساری ساری رات عبادتِ الٰہی میں گزر جاتی تھی روزے بھی کثرت سے رکھتے تھے۔ معاشی حیثیت سے آسودہ حال تھے لیکن زندگی سادہ بسر کرتے تھے، ایسی کہ جس پر نہ فقر و عسرت کا گمان ہو اور نہ امارت و دولت مندی کا۔ ——دنیوی زیب و زینت سے طبعاً نفرت کرتے تھے لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیثِ مبارک کے پیش نظر کہ اللہ جب کسی بندہ پر احسان و اکرام کرتا ہے تو اس کا ظاہری اثر بھی اس پر ہونا چاہیئے، کبھی کبھار قیمتی لباس بھی پہن لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ خلافِ عادت خز کی چادر اوڑھ کر باہر نکلے۔ یہ بہت قیمتی ہوتی ہے۔ خیال ہوا کہ اتنی بیش قیمت چادر دیکھ کر لوگ کچھ اور نہ سوچیں، خود ہی فرمانے لگے، لوگو تم مجھے اتنی قیمتی چادر اوڑھے ہوئے دیکھ کر تعجب کرو گے اور کہو گے کہ یہ کیا نئی بات ہے لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کیا ہے۔ پھر مذکورہ حدیث پڑھی اور وضاحت کر دی کہ آسودہ حالی میں اگر انسان کبھی کبھی قیمتی کپڑا بھی پہن لے تو یہ اتباعِ سُنّت ہے۔

احترامِ نبوی کی انتہا یہ تھی کہ جس ہاتھ سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت

کی تھی ساری عمر اس کو کبھی اعضائے اسفل سے مَس نہ ہونے دیا۔

کثرتِ عبادت، عشقِ رسولؐ اور پاکبازانہ زندگی نے حضرت عمرانؓ کو خاصانِ خدا میں شامل کر دیا تھا۔ صحیح مسلم میں خود ان سے روایت ہے کہ فرشتے ہر روز مجھے سلام کیا کرتے تھے۔ مجھے تیس برس سے بواسیر کا عارضہ تھا۔ میں نے اس سے تنگ آ کر مسّوں کو داغنا شروع کر دیا تو فرشتوں نے سلام کرنا چھوڑ دیا اور جب میں نے یہ فعل ترک کر دیا تو وہ مجھے پھر سلام کرنے لگے۔

طبقات ابنِ سعد میں حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ فرشتے حضرت عمرانؓ سے مصافحہ کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے داغ لگوایا تو وہ مصافحہ سے رک گئے۔

ترمذی شریف میں روایت ہے کہ عمرانؓ بن حصینؓ کے اہل خانہ کسی سلام کرنے والے کو تو نہیں دیکھتے تھے مگر السّلامُ عَلَیکُم یا عمران السّلامُ عَلَیکُم یا عمران کی آوازیں برابر گھر میں سنائی دیتی تھیں۔

ان سے ملتی جلتی ایک روایت "مستدرک حاکم" میں بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص سے فرشتے مصافحہ کریں یا جس کو سلام کریں وہ یقیناً مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہی میں سے ہو سکتا ہے۔

۶

حضرت عمرانؓ کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ پہلے بواسیر تھی پھر استسقا کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ لوگوں نے بارہا داغے جانے کا مشورہ دیا لیکن وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت سن چکے تھے اور پھر ذاتی تجربہ بھی تھا کہ بواسیر کے مسوں کو داغنے پر فرشتوں نے سلام اور مصافحہ ترک کر دیا تھا۔ اس لیے پیٹ کو داغنے پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ جب تکلیف حد سے فزوں ہو گئی یہاں تک کہ پیٹ میں شگاف ہو گیا تو ابن زیاد اور دوسرے لوگوں کے بیحد اصرار سے طوعاً وکرہاً راضی ہو گئے۔

مرض میں پھر بھی تخفیف نہ ہوئی اور زندگی سے مایوسی ہو گئی تو اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق بہت سی وصیتیں کیں کہ جنازہ کے پیچھے آگ نہ جلانا، قبر زمین سے چار بالشت

اونچی مربع رکھنا، جنازہ یہود کی طرح آہستہ آہستہ نہیں بلکہ جلدی جلدی لے چلنا، تدفین سے فارغ ہو کر کھانا کھانا، مال متروکہ کے بارے میں اپنی وصیت میں یہ شرط بھی رکھی کہ جو عورت میری موت پر نالہ و شیون کرے اس کو متروکہ املاک سے کچھ بھی نہ دیا جائے۔ دوسرے اعزہ کو رونے پیٹنے کی سختی سے ممانعت کی۔

ان وصیتوں کے بعد اس آفتابِ رشد و ہدایت نے ۵۲ھ ہجری میں پیکِ اجل کو لبیک کہا اور خاکِ بصرہ نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ متعدد فرزند یادگار چھوڑے، ان میں سے محمدؒ اور نجیدؒ نے علم و فضل کے اعتبار سے بڑی شہرت پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت علاءؓ بن عبداللہ حضرمی

(۱)

حضرت علاءؓ بن عبداللہ حضرمی (العلاءؓ بن الحضرمی) کا شمار مشہور صحابہ کرام میں ہوتا ہے لیکن تعجب ہے کہ جس قدر وہ مشہور ہیں اسی نسبت سے ان کی زندگی کے ابتدائی حالات پردۂ اخفا میں ہیں۔ کتب سِیَر سے صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ نسلاً حضرمی تھے اور ان کے اسلاف نے یمن میں توطّن اختیار کر لیا تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

"علاءؓ بن عبداللہ بن ضماد بن سلمی بن اکبر"۔

علاءؓ کے والد عبداللہ بن ضماد یمن کی سکونت ترک کر کے مکّہ آ بسے تھے اور حرب بن اُمیہ سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عبداللہ بن ضماد حیات تھا یا نہیں؟ اس کے بارے میں کتب سِیَر خاموش ہیں البتہ علاءؓ کے بارے میں یہ بات یقین کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ وہ بعثتِ نبویؐ کے ابتدائی زمانے میں دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے تھے اور یوں "السابقون الاوّلون" کی مقدس جماعت کا ایک رکن بن گئے تھے۔ اس کے بعد سولہ سترہ برس تک ان کی سرگرمیوں اور مشاغل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ قبولِ اسلام کے بعد اُن کا نام پہلی بار اُس وقت منظرِ عام پر آتا ہے جب سنہ ۶ ہجری میں (صلح حدیبیہ کے بعد) سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بحرین کے گورنر المنذر بن ساوی العبدی کے پاس دعوتِ اسلام کا خط لے جانے کے لیے منتخب فرمایا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علاءؓ کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا اعتماد حاصل تھا کیونکہ آپؐ سفارت اور نامہ بری جیسی اہم

خدمات قابلِ اعتماد اصحاب ہی کے سُپرد فرمایا کرتے تھے۔ اس سے یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علاءؓ کو عہدِ رسالت کے بعض غزوات میں بھی حضورؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا ہوگا اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر انہوں نے اور بھی کتنی خدمات انجام دی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں اُس پروانۂ نبویؐ کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا جو حضورؐ نے فتح مکہ (۸ھ سنہ ہجری) سے پہلے خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم کو عطا فرمایا۔ ابنِ سعدؒ کے بیان کے مطابق یہ پروانہ حضورؐ کے حکم کے مطابق حضرت علاءؓ نے لکھا اس کا مضمون یہ تھا:۔

(۱) اسلم کے لیے جو خزاعہ کی شاخ ہے ان لوگوں کے لیے جو ان میں سے ایمان لاتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے دین کے بارے میں بھی خواہی دکھاتے ہیں۔

(۲) انہیں ان لوگوں کے خلاف مدد دی جائے گی جو ظلم سے اُن پر اچانک دھاوا بول دیں۔

(۳) اور اُن پر نبیؐ کی مدد واجب ہوگی جبکہ آپؐ ان کو [illegible]یں۔

(۴) اور اُن کے خانہ بدوش (بدویوں) کے لیے بھی وہی (حقوق، واجبات) ہیں جو اُن کی بستی میں رہنے والوں کے لیے ہیں۔

(۵) اور جو مہاجر ہیں جہاں بھی رہیں۔

(۶) اِسے العلاءؓ بن الحضرمی نے لکھا اور گواہی ثبت کی۔ اس پروانۂ نبویؐ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علاءؓ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

حضرت علاءؓ حضورؐ کا مکتوبِ مبارک لے کر منذر بن ساویٰ کے پاس گئے تو یہودیوں اور مجوسیوں کے سوا بحرین کے تمام لوگ اس مکتوبِ مبارک کا مضمون سُن کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ ان میں خود منذر بن ساویٰ بھی شامل تھے۔ وہ ایرانی حکومت کی طرف سے بحرین کے گورنر تھے۔ انہوں نے اپنے اور دوسرے اہلِ بحرین کے قبولِ اسلام کے بارے میں حضورؐ کو اطلاع دی تو آپؐ نے جواب میں انہیں یہ فرمان بھیجا ''تم جب تک ٹھیک ٹھاک رہو گے ہم تمہیں بحرین کی

امارت سے معزول نہیں کریں گے اور جو یہودیت یا مجوسیت پر قائم رہنا چاہے۔ اس پر جزیہ عائد ہوگا۔"
علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ہجر کے مجوسیوں کو بھی خط لکھا جس میں ان کو دعوتِ اسلام دی۔ یہ خط بھی حضرت علاءؓ لے کر گئے۔ حضورؐ نے ان کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کو بھیجا اور یہ ہدایات دیں۔

(۱) ابوہریرہؓ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

(۲) اگر اہلِ ہجر اسلام کی دعوت قبول نہ کریں تو ان سے جزیہ لینا۔ ان کی عورتوں سے نکاح نہ کرنا اور نہ ان کا ذبیحہ کھانا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علاءؓ کو اونٹوں، گایوں، بکریوں، پھلوں اور دوسرے اموال کے بارے میں (زکوٰۃ کی شرح کے) احکام تحریری فرمان کی صورت میں دیں۔ حضرت علاءؓ نے حضورؐ کا یہ فرمان لوگوں کو پڑھ کر سنایا اور اسی کے مطابق ان سے زکوٰۃ اور صدقات وصول کیے۔

(۲)

فتح مکہ کے کچھ عرصہ بعد حضورؐ نے حضرت علاءؓ کو بحرین کا عامل مقرر فرمایا۔ پھر کچھ مدت کے بعد انہیں اس خدمت سے سبکدوش کر کے حضرت ابانؓ بن سعید بن العاص کو بحرین کا عامل بنایا۔ ۱۱ھ ہجری میں حضورؐ نے وصال فرمایا تو حضرت ابانؓ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی جگہ حضرت علاءؓ کو دوبارہ بحرین کا عامل مقرر فرمایا کیونکہ وہ اس علاقے کے باشندوں اور دوسرے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد ارتداد کا فتنہ بڑی تیزی سے عرب میں پھیلنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں منذر بن ساویٰ نے وفات پائی اور بحرین بھی فتنۂ ارتداد کی لپیٹ میں آ گیا۔ غالباً ان ایام میں حضرت علاءؓ مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرتدین پر عام لشکر کشی کے لیے گیارہ لشکر مرتب کیے تو ان میں سے ایک لشکر کی قیادت آپؓ نے حضرت علاءؓ کے سپرد کی اور انہیں مرتدینِ بحرین کی سرکوبی پر مامور فرمایا۔

بحرین میں مرتدین کی قیادت نعمان بن منذر مغرور کا بیٹا منذر اور بنو قیس بن ثعلبہ کا سردار حطیم

بن ضبیعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بنو ربیعہ، بنو عبدالقیس اور کئی دوسرے قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا کر ہر طرف شورش اور بدامنی پیدا کر دی تھی۔ حضرت علاءؓ اپنے لشکر کے ساتھ یمامہ کے قریب پہنچے تو حضرت ثمامہؓ بن اثال حنفی، حضرت قیسؓ بن عاصم منقری اور بہت سے دوسرے مخلص مسلمان بھی ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ حضرت علاءؓ داہنا کے ریگستان میں پہنچے تو آدھی رات ہو گئی، انہوں نے وہیں ایک مناسب جگہ پر پڑاؤ ڈال دیا۔ بدقسمتی سے جن اونٹوں پر خیمے اور رسد کا سامان لدا ہوا تھا، وہ بِدک کر اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ اس ناگہانی اُفتاد نے مسلمانوں کو سخت تشویش میں مبتلا کر دیا کیونکہ پانی خوراک اور سائے کے بغیر اس بے آب و گیاہ صحرا میں زندہ رہنا محال تھا۔ حضرت علاءؓ نے مسلمانوں کو متفکر دیکھا تو ان سے کہا، ابھی تو سورج نکلنے میں کافی وقت ہے تم مایوس کیوں ہو گئے ہو؟ تمہیں اللہ تعالیٰ نے راہِ حق میں جہاد کے لیے نکلنے کی توفیق عطا کی ہے۔ میں تم کو بشارت دیتا ہوں کہ وہ تمہیں ضائع نہیں کرے گا۔ اللہ کی قدرت دیکھیے کہ حضرت علاءؓ فجر کی نماز کے بعد مسلمانوں کے ساتھ مل کر دعا مانگ رہے تھے کہ تھوڑے فاصلہ پر پانی نظر آیا۔ پانی دیکھ کر مسلمانوں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا اور وہاں جا کر پانی پیا اور غسل کیا۔ آفتاب اونچا ہونے سے پہلے مسلمانوں کے لدے لدائے اونٹ بھی آنے شروع ہو گئے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت علاءؓ کے لشکر کو بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا۔

یہاں سے حضرت علاءؓ ہجر کی طرف بڑھے۔ مرتدین نے اسلامی لشکر کی آمد کی خبر سُنی تو وہ سب قلعہ جواثا میں قلعہ بند ہو گئے۔ حضرت علاءؓ نے قلعہ جواثا کا محاصرہ کر لیا۔ مرتدین نے قلعہ میں خوراک کا کافی ذخیرہ کر رکھا تھا اور انہیں اپنے دفاعی استحکامات پر بڑا ناز تھا اس لیے مسلمانوں کے مقابلے پر ڈٹے رہے یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن رات کے وقت قلعہ کے اندر سے شور و غل اور لڑنے جھگڑنے کی آواز سُنائی دی۔ حضرت علاءؓ کو مسلمان جاسوسوں نے اطلاع دی کہ مرتدین شراب پی پی کر بدمست ہو رہے ہیں اور غُل مچا مچا کر آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ حضرت علاءؓ نے اُسی وقت اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ پر حملہ کر دیا۔ پہرے دار بھی شراب کے نشے میں مدہوش تھے۔

مسلمانوں کی مزاحمت نہ کر سکے۔ چند بہادروں نے فصیل پھاند کر قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور اسلامی لشکر آناً فاناً قلعہ میں داخل ہو گیا۔ شراب میں بدمست مرتدین کی ایک کثیر تعداد ماری گئی۔ کچھ دارین کی طرف بھاگ گئے اور کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ ایک مجاہد عفیفؓ بن منذر تمیمی نے مرتدین کے سردار حطیم بن ضبیعہ کا پاؤں کاٹ ڈالا۔ حضرت قیسؓ بن عاصم منقری نے اس کی گردن اڑا دی۔ ایک روایت کے مطابق مرتدین کا دوسرا بڑا سردار منذر بن نعمان مغرور بھی مارا گیا لیکن ایک دوسری روایت کے مطابق وہ گرفتار ہو گیا اور اسلام قبول کر کے رہائی پائی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ کسی طرح بچ کر نکل گیا۔ جواثی کی فتح کے بعد حضرت علاءؓ کو اطلاع ملی کہ ایک ایرانی جرنیل فیروز ایک لشکرِ جرار کے ساتھ بنو تمیم کی گوشمالی کے لیے آیا ہے (کیونکہ ان لوگوں نے ایک ایرانی قافلے کو لوٹ لیا تھا) فیروز نے زرارہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال رکھا ہے اور جواثی سے فرار ہونیوالے مرتدین اور مجوسی باغی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔

حضرت علاءؓ یہ اطلاع پا کر فیروز سے دو دو ہاتھ کرنے زرارہ کی طرف بڑھے اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین کئی دن تک مسلمانوں کے مقابلے پر ڈٹے رہے تاہم حضرت علاءؓ فیروز اور اس کے ساتھیوں پر برابر دباؤ ڈالتے رہے یہاں تک کہ ان کی قوتِ مقاومت جواب دے گئی۔ جلد ہی حضرت علاءؓ نے فیروز اور اس کے ساتھ مل جانے والے غداروں کو عبرتناک شکست دی۔ اس کے بعد وہ دارین کی طرف روانہ ہوئے جہاں مرتدین بڑی تعداد میں جمع تھے اور زور شور سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ دارین کے مرتدین اور مسلمانوں کے درمیان سمندر کی ایک شاخ حائل تھی۔ حضرت علاءؓ لشکر کے ساتھ سمندر کے کنارے پہنچے تو مسلمانوں کو سمندر عبور کرنے میں کچھ تردّد ہوا کیونکہ وہ اونٹوں پر بھی سوار تھے، گھوڑوں اور خچروں پر بھی اور پیدل بھی۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" میں لکھا ہے کہ اس موقع پر حضرت علاءؓ نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا، سب لوگ یہ دعا پڑھتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے سمندر میں داخل ہو جاؤ۔

يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ . يَا حَكِيْمُ يَا كَرِيْمُ يَا اَحَدُ

یَا صَمَدُ یَا حَیُّ یَا مُحْیِ یَا قَیُّوْمُ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ یَا رَبَّنَا۔

خدا کی قدرت تمام مسلمان سمندر سے اس طرح گزر گئے جس طرح ریت پر سے گزرتے ہیں۔ دارین میں مسلمانوں اور مرتدین کے درمیان گھمسان کا رن پڑا جو چوبیس گھنٹے تک جاری رہا۔ مرتدین جان توڑ کر لڑے لیکن جوشِ ایمان سے سرشار مسلمانوں کے سامنے اُن کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ خاکِ نامرادی چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔ اس لڑائی میں مرتدین کے چھ ہزار سوار اور دو ہزار پیادے مارے گئے اور باقی مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔

(۴)

دارین کے مرتدین سے نپٹنے کے بعد حضرت علاءؓ بحرین واپس آ گئے۔ اس اثناء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات پائی اور حضرت عمر فاروقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ اسی زمانے میں حضرت علاءؓ نے "دلتا النہرین" کو تسخیر کرنے کا ارادہ کیا اور ایک لشکر کے ساتھ بحری کشتیوں میں سوار ہوئے لیکن کچھ ایسے موانع پیش آئے کہ وہ خلیج فارس کے ساحل پر نہ اُتر سکے اور اصطخر جا پہنچے۔ خلیج فارس میں ایرانیوں کا ایک زبردست جنگی بیڑا موجود تھا۔ اس نے اصطخر کا محاصرہ کر لیا اور مسلمانوں کو رسد پہنچنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ اس طرح حضرت علاءؓ اور اُن کے ساتھی سخت مصیبت میں پھنس گئے لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور تہیہ کر لیا کہ آخری دم تک ایرانیوں کا مقابلہ کریں گے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو کسی ذریعے سے حضرت علاءؓ کے محصور ہونے کی خبر پہنچ گئی۔ انہوں نے حضرت علاءؓ کو اس مہم پر جانے کا حکم نہیں دیا تھا کیونکہ وہ بحری لڑائیوں میں نہیں الجھنا چاہتے تھے لیکن اب ہزاروں مسلمانوں کی جانیں بچانے کا سوال تھا چنانچہ حضرت علاءؓ کی اس مہم جوئی کو ناپسند کرنے کے باوجود انہوں نے بصرہ کے امیر حضرت عتبہؓ بن غزوان کو حکم بھیجا کہ ایک طاقتور لشکر لے کر علاءؓ کی مدد کو پہنچیں۔ حضرت عتبہؓ بارہ ہزار سرفروشوں کے ساتھ اصطخر کی طرف روانہ ہوئے اور محاصرہ کرنے والے ایرانیوں کو شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ یوں حضرت علاءؓ اور ان کے ساتھیوں کو ایک بلائے عظیم سے نجات مل گئی۔ اس کے بعد ان سب نے مل کر "اُبلہ" اور "اہواز"

کا رُخ کیا اور ان دونوں شہروں کو فتح کر کے واپس آتے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ اسی زمانے میں ایک موقع پر حضرت عمرِ فاروقؓ نے حضرت علاءؓ کو حکم بھیجا کہ وہ حضرت عرفجہؓ بن ہرثمہ کو حضرت عتبہؓ بن غزوان کی مدد کے لیے بھیجیں، جنہیں عراقِ عرب کے جنوبی حصّے کو دوبارہ مفتوح بنانے کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ حضرت علاءؓ نے امیر المؤمنینؓ کے حکم کی تعمیل کی۔ عرفجہؓ بن ہرثمہ ایک صاحبِ تدبیر اور جانباز آدمی تھے۔ انہوں نے حضرت علاءؓ اور حضرت عتبہؓ بن غزوان کی معیّت میں کئی شاندار کارنامے انجام دیے۔

(۴)

بصرہ آباد ہونے کے بعد حضرت عمرِ فاروقؓ نے حضرت عتبہ بن غزوان کو وہاں کا امیر (گورنر) مقرر فرمایا وہ چھ ماہ تک اس عہدے پر نہایت خوش اسلوبی سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے بعض وجوہ کی بناء پر انہیں اس عہدے سے سبکدوش کر دیا (بروایتِ دیگر وہ خود اس عہدے سے دستکش ہو گئے) ان کی جگہ امیر المؤمنینؓ نے حضرت علاءؓ کو بصرہ کا امیر نامزد فرمایا اور انہیں حکم بھیجا کہ بحرین کی امارت چھوڑ کر بصرہ کا انتظام سنبھال لو۔ یہ حکم ملتے ہی حضرت علاءؓ نے حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوبکرہؓ اور کچھ دوسرے آدمیوں کو ساتھ لیا اور بصرہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ حافظ ابونعیمؒ نے "دلائل" میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ ہم ایک بے آب وگیاہ مقام سے گزرے۔ ہمارے پاس پانی ختم ہو گیا تھا ہم نے حضرت علاءؓ سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر دُعا کی، اچانک ابر نمودار ہوا اور بارش ہونے لگی، ہم نے خوب پانی پیا اور اونٹوں کو بھی پلایا۔ خدا کی قدرت اسی مقام پر حضرت علاءؓ دفعتہً علیل ہو گئے اور وفات پا گئے۔ علامہ ابنِ سعدؒ نے اس مقام کا نام لباس لکھا ہے۔ حضرت علاءؓ کے ساتھیوں نے انہیں بارش کے پانی سے غُسل دیا اور تلوار سے قبر کھود کر اسلام کے اس مردِ جانباز کو اس بے آب وگیاہ میدان میں سپردِ خاک کر دیا حضرت علاءؓ کی ازواج واولاد کے بارے میں کتبِ سیر خاموش ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت وہبؓ بن سعد عامری

قریش کی شاخ بنی عامر بن لوئی میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:
وہبؓ بن سعد بن ابی سرح بن حارث بن حبیب بن جذیمہ بن مالک بن مسل بن عامر بن لوئیؒ۔

حضرت وہبؓ نے کون سے سالِ نبوت میں، اسلام قبول کیا، اہلِ سیر نے اس کی تصریح نہیں کی البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ ہجرتِ نبویؐ سے پہلے شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ جب ہجرت الی المدینہ کا اِذن ہوا تو انہوں نے راہِ حق میں گھر بار چھوڑ کر مدینہ کی راہ لی اور حضرت کلثومؓ بن ہدم انصاری صاحبِ رحل رسول اللہ کے مہمان بنے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے چند ماہ بعد مہاجرین اور انصار میں برادری قائم کی تو حضرت وہبؓ کو حضرت سویدؓ بن عمرو کا دینی بھائی بنایا۔ ابن اسحاقؒ نے کفر و حق کے معرکۂ اوّل کے شرکاء میں حضرت وہبؓ بن سعد کا ذکر نہیں کیا لیکن موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر اور محمد بن عمر کی روایت کے مطابق وہ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔

بدر کے بعد انھوں نے اُحد، احزاب اور خیبر کے غزوات میں دادِ شجاعت دی۔ ذیقعدہ ۶ھ ہجری میں "بیعت رضوان" کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اس میں چودہ سو صحابہ کرامؓ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر جاں نثاری کی بیعت کی اور بارگاہِ خداوندی سے کھلے لفظوں میں خوشنودی کی بشارت پائی۔ حضرت وہبؓ بن سعد بھی ان خوش بخت صحابہؓ میں شامل تھے۔

جمادی الاوّل سنہ ۸ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفیر حضرت حارث رضؓ بن عمیر ازدی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ایک مہم موتہ بھیجی۔ لشکرِ اسلام میں حضرت وہب رضؓ بن سعد بھی شامل تھے۔ موتہ کی خونیں لڑائی میں متعدد صحابہ نے رومیوں کے ٹڈی دل سے مردانہ وار لڑتے ہوئے جامِ شہادت پیا۔ بالآخر حضرت خالدؓ بن ولید نے رومیوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ حضرت وہب رضؓ بن سعد اسی لڑائی میں خلعتِ شہادت پہن کر خُلدِ بریں کو سدھارے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ربیعہ رضؓ بن اکثم اسدی

ربیعہ نام۔ ابو زید کنیت۔ بنو اسد بن خزیمہ سے تھے اور بنو عبد شمس کے حلیف تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ربیعہ رضؓ بن اکثم بن سنجرہ (یا شجیرہ) بن عمرو بن بکیر بن عامر بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمہ۔

غزوۂ بدر سے پہلے شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے اور پھر ہجرتِ مدینہ کی سعادت حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ بہت پست قامت تھے لیکن ہمت نہایت بلند تھی اور جوشِ ایمان کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سب سے پہلے سنہ ۲ ہجری میں غزوہ بدر میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا اس کے بعد اُحد اور خندق کے معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ بیعتِ رضوان میں بھی شریک تھے۔ اوائل سنہ ۷ ہجری میں غزوۂ خیبر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اسی غزوہ میں قلعۂ نطاۃ پر حارث یہودی کے ہاتھ سے جامِ شہادت پی کر خُلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت سعدؓ بن خولہ

بعض نے انہیں عجمی نژاد لکھا ہے اور بعض نے یمنی قرار دیا ہے معلوم نہیں وہ یا ان کے والدین مکہ میں کب اور کیسے آئے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ توحید کا آغاز فرمایا تو حضرت سعدؓ بن خولہ مکہ ہی میں مقیم تھے اور بنو عامر بن لؤیؓ کے حلیف تھے۔ ان کے کان جونہی توحید کی آواز سے آشنا ہوئے انھوں نے بلا تامل اس پر لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ یا سترہ برس کی تھی۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح مشرکین مکہ کے جور و ستم کا نشانہ بن گئے۔ سنہ ۶ بعد بعثت میں دوسری ہجرتِ حبشہ ہوئی تو حضرت سعدؓ بھی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرے بلاکشانِ اسلام کے ساتھ ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔ وہاں کئی سال غریب الوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے کچھ عرصہ پہلے مکہ واپس آئے اور جب حضورؐ نے صحابہؓ کو ہجرتِ مدینہ کا اذن دیا تو وہ ہجرت کر کے مدینہ جا پہنچے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے پہلے چند دن قبا میں حضرت کلثومؓ بن ہدم کے ہاں قیام کیا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور غزوات کا آغاز ہوا تو حضرت سعدؓ نے بدر، احد، خندق اور دوسرے تمام غزوات میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ سنہ ۶ ہجری میں انہیں "بیعتِ رضوان" میں شریک ہونے کی عظیم سعادت بھی نصیب ہوئی۔

سنہ ۱۰ ہجری میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تو حضرت سعدؓ بن خولہ بھی آپؐ کے ساتھ تھے مکہ پہنچ کر حضرت سعدؓ سخت بیمار ہو گئے اور مکہ ہی میں وفات پا گئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت صدمہ ہوا۔ کیونکہ آپ مہاجرین کے لیے مکہ میں مرنا پسند نہ فرماتے تھے لیکن قضائے الٰہی یہی تھی کہ ارضِ مکہ

ہی حضرت سعدؓ کا مدفن بنے۔ وفات کے وقت حضرت سعدؓ کی عمر ۳۳ برس کی تھی۔ ان کی اہلیہ سبیعہؓ بنتِ حارث اسلمیہ کو بھی شرفِ صحابیت حاصل تھا۔ شوہر کی وفات کے دو دن بعد ان کے ایک بچہ پیدا ہوا جو چند دن بعد فوت ہو گیا۔ اس طرح حضرت سعدؓ بن خولہ کی نسل آگے نہیں چلی۔

حضرت سعدؓ بن خولہ کا شمار رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت مخلص جاں نثاروں میں ہوتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

اَلقَعقَاعؓ

بَنُو تَمِیم کا جیالا شہسوار

۱

سلام ہو اس ماں پر جس نے اُلقَعقَاعؓ جیسا جوانمرد جنا۔

القعقاعؓ جو اسلام کی عظمت کا علمبردار تھا۔

القعقاعؓ جو عرب کی شجاعت اور غیرت کا نشان تھا۔

القعقاعؓ جو ایسا شہسوار تھا کہ طویل پُر صعوبت راستے اس کے سامنے سمٹ کر رہ جاتے تھے۔

القعقاعؓ جس کی شمشیرِ خاراشگاف کا وار کبھی خالی نہ جاتا تھا۔

القعقاعؓ جس کے نیزے کی اَنی دشمن کے سینے کی ہڈیوں کو توڑتی ہوئی آر پار ہو جاتی تھی۔

القعقاعؓ جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صفِ جنگاہ میں گھس جاتا تھا۔

القعقاعؓ جو ایسا مردِ میدان تھا کہ اگر جنگ اسے دانتوں سے کاٹتی تھی تو وہ جنگ کو کاٹ لیتا تھا۔ اگر جنگ پائنچے چڑھا لیتی تھی تو وہ بھی پائنچے چڑھا لیتا تھا۔

القعقاعؓ جو اکیلا ہزار شجاعانِ عرب کے برابر تھا۔

القعقاعؓ جس کی جانبازی کے سامنے رومیوں کی شجاعت اور ایرانیوں کی پامردی منہ چھپاتی پھرتی تھی۔

القعقاعؓ جس کی سرفروشی کے سامنے ہیبت ناک جنگی ہاتھی بے بس ہو جاتے تھے اور منہ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔

یہ ہے وہ خراجِ عقیدت جو عرب کی رزمیہ داستانوں اور نظموں میں حضرت قعقاعؓ بن عمرو بن مالک التمیمی کو پیش کیا گیا ہے۔ حضرت قعقاعؓ عرب کے مشہور قبیلے "بنو تمیم" کے چشم و چراغ تھے اور اپنے قبیلے کے نامور بہادروں اور شاعروں میں شمار ہوتے تھے اہلِ سیر نے ان کے قبولِ اسلام اور شرفِ صحابیت سے بہرہ ور ہونے کے زمانہ کی تصریح نہیں کی البتہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اواخرِ عہدِ رسالت میں سعادت اندوزِ اسلام ہوئے کیونکہ بنو تمیم کا وفد ۹ہجری میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور اس کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے بعد ہی بنو تمیم میں اسلام پھیلا۔ ایمان اور صحابیت کا شرف حاصل کرنے کے بعد حضرت قعقاعؓ اسلام کے نہایت قوی دست و بازو ثابت ہوئے اور اپنی شجاعت و شہامت، سخت کوشی اور بے خوفی کے ایسے محیر العقول نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے کہ ان کا حال پڑھ کر قلوبِ مردہ میں ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرمایا کرتے تھے کہ قعقاع کی آواز لشکر میں ہزار آدمیوں سے افضل ہے اور جس فوج میں وہ موجود ہوں اس کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی۔

عہدِ رسالت میں حضرت قعقاعؓ کو کوئی کارنامہ دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔ ان کے ولولہ انگیز کارناموں کا آغاز عہدِ صدیقی سے ہوتا ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ۱۱ہجری میں انہیں حضرت خالدؓ بن ولید کے ساتھ طُلیحہ بن خُویلد اسدی کی سرکوبی کے لیے بزاخہ بھیجا۔ طُلیحہ بنو اسد کے کاہنوں اور نامور بہادروں میں شمار ہوتا تھا، اس کو قبولِ اسلام کی سعادت حاصل ہو چکی تھی لیکن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایامِ علالت میں اس کے دماغ میں معلوم نہیں کیا فتور پیدا ہوا کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور قبائل اسد و طے وغیرہ کے بہت سے لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ نے حضرت ضرارؓ بن اَزْوَر کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ طُلیحہ کے فتنہ کو دفع کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت ضرارؓ نے "واردات" کے مقام

پر طُلَیحہ اور اس کے حواریوں پر کاری ضرب لگا کر ان کو منتشر کر دیا۔ اسی اثناء میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور حضرت ضرارؓ مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ ان کی واپسی کے بعد طُلَیحہ نے پھر ایک بڑی جمعیت اکٹھی کر لی اور بزاخہ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد مرتدین کے استیصال کے لیے مختلف اطراف کی طرف جیوش بھیجے تو حضرت خالدؓ بن ولید کو طُلَیحہ اور مالک بن نُویرہ بطاحی کی سرکوبی پر مامور فرمایا اور حضرت قعقاعؓ کو بھی ان کے ساتھ جانے کا حکم دیا۔ حضرت خالدؓ نے بزاخہ پہنچ کر طُلَیحہ کو عبرتناک شکست دی۔ اس نے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر راہِ فرار اختیار کی اور بنو کلب میں جا کر پناہ لی۔ بعد میں طُلَیحہ نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا اور ایرانیوں کے خلاف مختلف لڑائیوں میں سرفروشانہ حصہ لے کر اپنی لغزش کی تلافی کر دی۔ حضرت قعقاعؓ جنگِ بزاخہ میں حضرت خالدؓ کے پہلو بہ پہلو اس بے جگری سے لڑے کہ طُلَیحہ اور عُیَینہ بن حصن فزاری جیسے آزمودہ کار جنگجو بھی جی ہار بیٹھے اور پیٹھ دکھا کر اپنی جان بچائی۔

اربابِ سِیَر نے فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں پیش آنے والی لڑائیوں میں صرف جنگِ بزاخہ میں حضرت قعقاعؓ کی شرکت کا ذکر صراحت سے کیا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ وہ مرتدوں کے خلاف بعض دوسری لڑائیوں میں بھی ضرور شریک ہوئے ہوں گے کیونکہ جنگِ بزاخہ کے بعد ان کے میدانِ جنگ سے پلٹ آنے کی کوئی وجہ نہیں تھی البتہ مرتدین کا پوری طرح قلع قمع ہو جانے کے بعد وہ مدینہ منورہ واپس آ گئے۔

(۲)

جب فتنۂ ارتداد کا استیصال ہو گیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب سے پہلے عراقِ عرب کی طرف توجہ کی جہاں حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ شیبانی ایرانیوں سے برسرِ پیکار تھے اور مرکز سے کمک کے خواہاں تھے۔ اس وقت حضرت خالدؓ بن ولید مسیلمہ کذاب کی سرکوبی سے فارغ ہو کر وادیٔ الوبر میں خیمہ زن تھے اور دربارِ خلافت سے مزید احکام

کے منتظر تھے۔ حضرت ابُوبکر صدیق رضؓ نے انہیں حکم بھیجا کہ وہ اپنے لشکر کو لے کر زیریں عراق پہنچیں اور اُبلہ کی سرحد سے یلغار شروع کریں۔ حضرت خالدؓ نے خلیفۃ الرسولؐ کے حکم کی تعمیل میں فوراً عراقِ عرب کا رُخ کیا لیکن ان کے لشکر کی تعداد بہت کم تھی کیونکہ ایک تو اس کا بہت سا حصہ جنگِ یمامہ میں کام آچکا تھا دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں ہدایت کی تھی کہ وہ کسی ایسے شخص کو ان کی اجازت کے بغیر ساتھ نہ لیں جس نے فتنۂ ارتداد میں حصہ لیا ہو نیز کسی شخص پر جہاد کے سلسلے میں سختی نہ کی جائے اور صرف ان لوگوں کو فوج میں شامل کیا جائے جو بخوشی عراق جانے پر آمادہ ہوں۔ اس ہدایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں نے پیچھے رہنے کو ترجیح دی کیونکہ وہ کئی ماہ تک مرتدین سے لڑ لڑ کر تھک چکے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ عازمِ عراق ہوتے وقت حضرت خالدؓ کی فوج صرف دو ہزار مجاہدین پر مشتمل تھی اس لیے انہوں نے بنظرِ احتیاط حضرت ابُوبکر صدیقؓ کی خدمت میں مزید کمک بھیجنے کے لیے لکھا۔ حضرت ابُوبکر صدیق کو حضرت خالدؓ کا خط ملا تو انہوں نے صرف حضرت قعقاعؓ بن عمرو کو ان کی اعانت کے لیے روانہ فرمایا۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے خلیفۃ الرسولؐ کی خدمت میں عرض کی:

"آپ خالد کی مدد کے لیے صرف ایک شخص کو روانہ کر رہے ہیں حالانکہ لشکر کا بیشتر حصہ اب ان سے الگ ہو چکا ہے۔"

حضرت ابُوبکر صدیق رضؓ نے جواب دیا:

"جس فوج میں قعقاع جیسا شخص شامل ہو وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتی۔"

پھر بھی حضرت قعقاعؓ کے ہاتھ انہوں نے حضرت خالدؓ کو ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے لشکر میں شامل ہونے پر آمادہ کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ثابت قدمی سے اسلام پر قائم رہے اور فتنۂ ارتداد کے استیصال میں حصہ لیا۔ یہ خط موصول ہونے پر حضرت خالدؓ نے راستے میں قبائل مضر و ربیعہ کے آٹھ ہزار مجاہدین اپنے لشکر میں شامل کر لیے اور یوں دس ہزار کی جمعیت کے ساتھ عراق

کی سرحد پر پہنچ گئے جہاں حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ آٹھ ہزار مجاہدین کے ساتھ کمک کا انتظار کر رہے تھے۔ اس طرح اسلامی لشکر کی کل تعداد مل ملا کر اٹھارہ ہزار ہو گئی اور اس سارے لشکر کی قیادت حضرت خالدؓ نے سنبھال لی۔ زیریں عراق پر یلغار کرنے سے پہلے حضرت خالدؓ نے وہاں کے ایرانی گورنر ہرمز کو خط لکھا کہ یا تو اسلام قبول کر لو اور ہمارے بھائی بن جاؤ یا جزیہ دو اور ہماری پناہ میں آجاؤ، اگر ان میں سے کوئی بات بھی منظور نہیں تو پھر تم خود ذمہ دار ہو۔ میں ایک ایسی قوم اپنے ساتھ لایا ہوں جس کو موت اتنی ہی پیاری ہے جتنی تم کو زندگی۔

ہرمز حسب و نسب اور شاہی دربار میں اثر و رسوخ کے اعتبار سے بہت سے امرائے ایران سے بڑھ کر تھا صرف اس کی ٹوپی کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی جو اس سے کم درجے کا کوئی امیر ہرگز نہ پہن سکتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کے عربوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتا رہتا تھا اس لیے عرب اس سے سخت نفرت کرتے تھے یہاں تک کہ جب انہیں کسی شخص کی خباثت کا ذکر کرنا ہوتا تو اس طرح کہا کرتے تھے۔

"فلاں شخص تو ہرمز سے بھی زیادہ خبیث اور بد طینت ہے۔"

ہرمز کو حضرت خالدؓ کا خط ملا تو اس نے اس کا جواب خندۂ استہزا سے دیا اور تمام حالات کسریٰ کو لکھ کر بھیجے وہاں سے حکم موصول ہوا کہ حملہ آوروں کو کسی صورت میں آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ یہ حکم ملتے ہی وہ ایک جرار لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا۔ شہر کاظمہ کے قریب حفیر کے مقام پر دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہرمز نے آگے بڑھ کر حضرت خالدؓ کو دعوتِ مبارزت دی۔ ہرمز فی الواقع ایک مکار اور بد فطرت شخص تھا حضرت خالدؓ کو دعوتِ مبارزت دینے سے اس کی غرض یہ تھی کہ جب وہ اپنی صفوں سے باہر نکلیں تو انہیں نرغے میں لے کر شہید کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے چند سواروں کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ جونہی وہ خالد کو آتا دیکھیں، ان پر جھپٹ پڑیں اور کام تمام کر دیں۔ چنانچہ جب حضرت خالدؓ ہرمز کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے تو یہ ایرانی سوار

بھی ان پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ حضرت قعقاعؓ بڑے غور سے دشمن کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایرانی سواروں کو کمین گاہ سے نکلتے دیکھا تو ہرمز کی چال کو سمجھ گئے۔ فوراً اپنے دستے کے ساتھ اُدھر کا رُخ کیا اور انہیں تلواروں کی باڑ پر رکھ لیا۔ اُدھر حضرت خالدؓ نے ہرمز کا کمربند پکڑ کر اسے زمین پر گرا دیا اور پھر اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ ہرمز کے قتل سے ایرانیوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور انہوں نے بڑے زور شور سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بہت سے دستوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ آہنی زنجیروں سے جکڑ رکھا تھا تاکہ کوئی شخص میدان جنگ سے بھاگ نہ سکے۔

ایرانیوں کا حملہ اتنا تند و تیز تھا کہ اگر حضرت خالدؓ اور قعقاعؓ اپنے لشکر کو سنبھال نہ لیتے تو شاید ان کی صفیں ٹوٹ جاتیں۔ اب مسلمانوں نے سنبھل کر ایسا شدید جوابی حملہ کیا کہ دشمن کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے اور دو بدو دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ زنجیر بستہ ایرانی دستوں نے بڑی پامردی دکھائی اور مسلمانوں کے آگے آہنی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ حضرت قعقاعؓ کا جوشِ ایمان ان کو کیا خاطر میں لاتا وہ ان پر قہرِ خدا بن کر ٹوٹ پڑے اور آناً فاناً ان کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اس کے ساتھ ہی ایرانیوں پر ہزیمت کے آثار نمودار ہونے لگے یہاں تک کہ ان کا میمنہ اور میسرہ (دایاں اور بایاں بازو) بالکل برباد ہو گیا۔ باقی لشکر بدحواسی کے عالم میں بھاگ کھڑا ہوا۔

اس لڑائی میں بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ ایرانیوں نے جن زنجیروں سے اپنے آپ کو جکڑ رکھا تھا وہ میدانِ جنگ سے جمع کی گئیں تو ان کا وزن تقریباً ساڑھے سات من نکلا۔ ان زنجیروں کی نسبت سے اس لڑائی کو "ذات السلاسل" بھی کہا جاتا ہے۔

(۳)

جنگِ حفیر (ذات السلاسل) کے بعد مذار، دلجہ (کسکر)، الیس اور امغیشیا

کے معرکے پیش آئے۔ ان معرکوں میں ایرانیوں نے جان توڑ کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا لیکن حضرت خالدؓ بن ولید نے حضرت قعقاعؓ، حضرت ضرارؓ بن الازور، حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ اور دوسرے جانبازوں کی مدد سے ہر معرکے میں دشمن کو عبرتناک شکست دی اور آگے بڑھ کر حیرہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ حیرہ زیادہ عرصہ تک محصوری کی سختیاں نہ سہہ سکے اور ایک لاکھ نوے ہزار درہم سالانہ خراج پر مسلمانوں سے صلح کر لی۔ اس صلح کے بعد حیرہ کے نواحی علاقوں کے باشندوں نے بھی مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ حیرہ اور اس کے ملحقات کی تسخیر کے بعد حضرت خالدؓ نے حیرہ کو مسلمانوں کا فوجی مستقر اور مفتوحہ علاقے کا دارالحکومت بنایا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے حضرت قعقاعؓ، ضرارؓ بن الازور، مثنیٰؓ بن حارثہ الشیبانی، ضرارؓ بن خطاب اور عتیبہؓ بن نہاس کو سرحدوں کی حفاظت پر مقرر کیا اور انہیں حکم دیا کہ دشمن پر برابر یورش کرتے رہو اور اسے چین نہ لینے دو۔ چنانچہ ان اصحاب نے اپنی سرحد سے آگے دجلہ کے کنارے تک سارا علاقہ دشمن سے چھین لیا۔ چند دن بعد حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی کہ ایرانی انبار اور عین التمر میں جمع ہو کر لڑائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؓ کو حیرہ کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود آگے بڑھ کر پہلے انبار کو مسخر کیا اور پھر عین التمر میں جمع ایرانیوں کو جا گھیرا۔ انہوں نے بھی جلد ہی ہتھیار پھینک دیئے اور اطاعت قبول کر لی۔ عین التمر کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ حضرت عیاضؓ بن غنم کی مدد کے لیے روانہ ہوئے جنھوں نے اس وقت شام کے شہر دومۃ الجندل کا محاصرہ کر رکھا تھا اور حضرت خالدؓ سے مدد مانگ بھیجی تھی۔ حضرت خالدؓ بسرعت تمام دومۃ الجندل پہنچے اور چند دن کے اندر شہر کو مسخر کر لیا۔ ادھر ایرانیوں کو حضرت خالدؓ کے عراق چھوڑنے کا علم ہوا تو ان کی باسی کڑھی میں پھر ابال آیا اور دو ایرانی سرداروں زرمہر اور روزبہ نے فوجیں جمع کر کے حصید اور خنافس پر چڑھائی کر دی۔ حضرت زبرقانؓ بن بدر حاکم انبار کو ان کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت قعقاعؓ سے (جو حیرہ میں حضرت خالدؓ کی نیابت کر رہے تھے) امداد کی درخواست کی۔ حضرت قعقاعؓ نے اعبد بن فدکی السعدی کو حصید کی طرف اور عروہ بن جعد البارقی کو خنافس

کی طرف روانہ کیا کہ ایرانیوں کو آگے بڑھنے سے روک دیں۔ یہ دونوں سردار رلیف کے مقام پر ٹھہرے جہاں زرمہر اور روزبہ بنو ربیعہ کا انتظار کر رہے تھے جو ان سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کا عہد و پیمان کر چکے تھے، اسی اثناء میں حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت عیاضؓ بن غنم کو ساتھ لے کر واپس حیرہ پہنچ گئے یہاں انہیں امرؤالقیس کلبی کا خط ملا کہ ہذیل بن عمران نے مصیخ میں اور ربیعہ بن بشر نے ثنی اور بشر میں زرمہر اور روزبہ کی مدد کے لیے فوجیں جمع کی ہیں اور وہ جلد ہی امدادی فوجوں کے ساتھ ان کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے یہ خط ملتے ہی حضرت قعقاعؓ اور ابولیلیٰؓ کو روزبہ اور زرمہر کے مقابلے کے لیے روانہ کیا اور پھر حیرہ میں حضرت عیاضؓ کو چھوڑ کر خود بھی ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ حضرت قعقاعؓ اور ابولیلیٰؓ عین التمر پہنچے تو حضرت خالدؓ بھی ان سے آملے۔ وہاں سے انہوں نے حضرت قعقاعؓ کو امیر بنا کر حصید کی جانب اور ابولیلیٰؓ کو خنافس کی طرف روانہ کیا۔ اس وقت روزبہ حصید میں تھا اور زرمہر خنافس میں۔ روزبہ کو حضرت قعقاعؓ کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو اس نے زرمہر سے امداد طلب کی۔ زرمہر نے خنافس میں مہبوذان کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود اپنے لشکر کے ساتھ روزبہ کی مدد کے لیے حصید پہنچ گیا۔ حضرت قعقاعؓ حصید پہنچے تو روزبہ اور زرمہر کے متحدہ لشکر نے ان کا زبردست مقابلہ کیا لیکن حضرت قعقاعؓ کی قیادت میں مسلمانوں نے ایرانیوں پر تابڑ توڑ ایسی ضربیں لگائیں کہ ان کی ہمت جواب دے گئی۔ حضرت قعقاعؓ دشمن کی صفیں الٹتے زرمہر تک پہنچ گئے اور اپنی تلوار کے ایک وار سے اسے ڈھیر کر دیا۔ دوسری طرف ایک مجاہد عصمہؓ بن عبداللہ الضبی نے روزبہ کو قتل کر دیا۔ ان دونوں سرداروں کے قتل کے ساتھ ہی ایرانی بھاگ نکلے اور خنافس میں جا کر پناہ لی۔ حضرت ابولیلیٰؓ خنافس پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ مہبوذان اپنے لشکر سمیت مصیخ چلا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی مزاحمت کے بغیر خنافس پر قبضہ کر لیا۔ اب حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؓ، ابولیلیٰؓ، اعبدؓ اور عروہؓ کو مصیخ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور خود بھی ادھر کا رخ کیا۔ یہ پہلے ہی سے طے کر لیا گیا تھا کہ

تمام فوج اور قائدین کو کس رات اور کس وقت مصیخ کے قریب ایک خاص مقام پر جمع ہونا ہے۔ چنانچہ سب مجاہدین معینہ وقت پر مقررہ جگہ پر پہنچ گئے اور سارے متحدہ لشکر نے مصیخ میں مقیم ایرانی جنگ آزماؤں اور ان کے عرب حلیفوں پر شب خون مار کر سب کو تہس نہس کر دیا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد حضرت خالدؓ نے بنو تغلب کی طرف توجہ کی جو عرب ہونے کے باوجود کئی بار ایرانیوں سے مل کر مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنے کی کوشش کر چکے تھے۔ انہوں نے حضرت قعقاعؓ اور ابو لیلیٰؓ کو بنو تغلب کی بستیوں ثنی و لبشر پر یلغار کرنے کا حکم دیا جہاں ربیعہ بن بجیر تغلبی اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ قعقاعؓ اور ابو لیلیٰؓ کے پیچھے حضرت خالدؓ بھی روانہ ہو گئے۔ اس حملے میں بھی وہی طریق کار اختیار کیا گیا جو مصیخ پر حملے کے وقت اختیار کیا گیا تھا۔ اس طرح ثنی کا کوئی مرد بھی بچ کر نہ نکل سکا اور عورتیں گرفتار کر لی گئیں۔ اس کے بعد البشر کی باری آئی وہاں بھی تغلبیوں کا ایک جتھا موجود تھا۔ حضرت خالدؓ اسے صاف کرتے ہوئے رضاب کی طرف بڑھے، وہاں کے حاکم ہلال بن عقہ کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی اور وہ شہر سے بھاگ گیا۔ اس طرح مسلمانوں نے کسی مزاحمت کے بغیر رضاب پر بھی قبضہ کر لیا۔

رضاب کی تسخیر کے بعد حضرت خالدؓ، قعقاعؓ، مثنیٰؓ، ابو لیلیٰؓ اور دوسرے جانبازوں کے ساتھ فراض کی طرف بڑھے۔ یہ جنگی نقطۂ نگاہ سے بڑا اہم مقام تھا کیونکہ یہاں شام، عراق، اور الجزیرہ کی سرحدیں ملتی تھیں۔ اسلامی فوجیں فراض میں اکٹھی ہوئیں تو ان کے مقابلے میں ایرانی، رومی اور تغلب، ایاد و نمر کے عربی النسل قبائل سب متحد ہو گئے اور دریائے فرات کو عبور کر کے بڑے زور شور سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ مسلمانوں نے نہایت پامردی سے مقابلہ کیا۔ حضرت خالدؓ، حضرت قعقاعؓ اور دوسرے سرداروں نے اپنے اپنے دستوں کے ساتھ دشمنوں کے متحدہ لشکر کو لوہے کے چنے چبوا دیئے اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ حضرت خالدؓ نے للکار کر کہا، مسلمانو! ان کو گھیر لو اور کسی کو بچ کر نہ جانے دو۔

حضرت خالدؓ کی للکار سے مسلمانوں کے حوصلے دوچند ہو گئے اور انہوں نے آناً فاناً دشمن کے لشکر کو گھیر کر فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ فتح کے بعد حضرت خالدؓ نے فراض میں دس روز قیام کیا اور پھر اپنی فوج کے ساتھ حیرہ واپس آگئے۔

(۴)

جس زمانے میں حضرت خالدؓ عراق عرب میں ایرانیوں سے برسرپیکار تھے، شام کی رومی سلطنت سے بھی معرکہ آرائیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور تین چار اسلامی لشکر شام کے مختلف مقامات کی طرف پیشقدمی کر رہے تھے۔ رومی قدم قدم پر مزاحم ہو رہے تھے اور مسلمانوں کو آگے بڑھنے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت خالدؓ کو حکم بھیجا کہ وہ فوراً عراق سے شام جا کر اسلامی فوجوں سے مل جائیں۔ یہ حکم ملتے ہی حضرت خالدؓ نے حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ کو عراق عرب کا انتظام سپرد کیا اور خود ایک مضبوط دستۂ فوج کے ساتھ شام روانہ ہو گئے۔ حضرت قعقاعؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ حدودِ شام میں داخل ہو کر انہیں سویٰ، تدمر، قصم اور مرج راہط وغیرہ کئی مقامات پر رومی جمگھٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت قعقاعؓ نے ہر معرکے میں حضرت خالدؓ کے دوش بدوش دادِ شجاعت دی اور رومیوں کو شکستوں پر شکستیں دیتے بصریٰ پہنچ گئے۔ بصریٰ کا بطریق ایک ہی جھڑپ میں ہمت ہار بیٹھا اور جزیہ دینا منظور کر کے مسلمانوں سے صلح کر لی۔ بصریٰ سے حضرت خالدؓ قعقاعؓ کے ساتھ حضرت عمروؓ بن العاص کی مدد کے لیے اجنادین پہنچے جہاں ایک بہت بڑا رومی لشکر حضرت عمروؓ بن العاص کے مقابل خیمہ زن تھا۔ دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں رومیوں کو شکست فاش ہوئی۔ ان کے تین ہزار آدمی مارے گئے اور باقی نے بھاگ کر ایلیا، قیساریہ، حمص اور دمشق وغیرہ میں پناہ لی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے آگے بڑھ کر دمشق کا محاصرہ کر لیا —— یہ محاصرہ دو مہینے دس روز اور ایک دوسری روایت

کے مطابق چھ مہینے تک جاری رہا اس دوران میں اہلِ دمشق نے نہ اطاعت قبول کی اور نہ ان کو باہر نکل کر مقابلہ کی جراٗت ہوئی البتہ وہ فصیل کے اوپر سے مسلمانوں پر تیر اور پتھر برساتے رہتے تھے۔ ایک روز شب کے وقت حضرت خالدؓ کو اطلاع ملی کہ دمشق کے بطریق کے گھر لڑکا پیدا ہوا تھا اور آج اس نے اہلِ شہر کو دعوت دی تھی۔ انہوں نے خوب شراب پی ہے اور شام ہی سے مدہوش پڑے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی حضرت خالدؓ اپنی خاص فوج کے ساتھ شہر پناہ کی طرف بڑھے۔ شہر پناہ سے نیچے پانی سے بھری ہوئی خندق تھی۔ حضرت خالدؓ اور ان کے چند جانباز ساتھیوں نے اسے مشک کے ذریعے پار کیا۔ ان میں حضرت قعقاعؓ بھی تھے۔ حضرت خالدؓ نے انہیں ایک اور مجاہد مذعورؓ بن عدی کے ساتھ کمند کے ذریعے شہر پناہ پر چڑھا دیا۔ انہوں نے کمند کو کنگرے سے خوب مضبوط باندھ کر رسی کی سیڑھی نیچے لٹکا دی۔ حضرت خالدؓ چند مجاہدین کے ساتھ فصیل پر چڑھ گئے اور پھر شہر کے اندر اتر کر پہرے داروں کو قتل کر کے دروازہ کھول دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔ نعرۂ تکبیر سنتے ہی حضرت خالدؓ کی فوج جو باہر منتظر کھڑی تھی شہر میں داخل ہو گئی۔ رومیوں نے کچھ دیر مقابلہ کیا لیکن پھر ہتھیار پھینک دیئے اور باب جابیہ پر حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت خالدؓ کی ملاقات ہوئی۔ چونکہ حضرت ابو عبیدہؓ صلح منظور فرما چکے تھے اس لیے حضرت خالدؓ نے بھی تلوار نیام میں کر لی۔

فتح دمشق کے بعد بعلبک، فحل، مرج الروم، حمص اور لاذقیہ کے معرکے پیش آئے۔ ان سب میں رومیوں نے بری طرح شکست کھائی۔ قیصرِ روم نے ان شکستوں کی خبر سنی تو اس کو سخت غیرت آئی اور اس نے تہیہ کر لیا کہ سلطنت کا پورا زور صرف کر کے عربوں کو شام سے نکال دے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے انطاکیہ میں بہت بڑی فوج جمع کی جس میں بڑے بڑے آزمودہ کار سپاہی اور جرنیل شامل تھے۔ یہ فوج گراں انطاکیہ سے چلی تو مسلمانوں کو مناسب معلوم ہوا کہ شام کے جن جن شہروں پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے وہاں سے فوجیں ہٹا لی جائیں اور یہ ساری فوجیں ایک جگہ جمع ہو کر رومیوں

کا مقابلہ کریں۔ عرب مؤرخین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے دمشق حمص وغیرہ شہروں سے نکلتے وقت وہاں کے باشندوں کو جزیہ کی رقمیں یہ کہہ کر لوٹا دیں کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ مسلمان شام کے شہروں سے نکل کر یرموک پہنچے اور وہاں پاؤں جما کر کھڑے ہو گئے۔ اسلامی لشکر کی تعداد تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی اور رومی فوج اس سے کئی گنا زیادہ یعنی دو لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ پہلے دونوں طرف سے قاصد آتے جاتے رہے۔ رومیوں نے چاہا کہ مسلمان روپیہ لے لیں اور واپس چلے جائیں لیکن مسلمان اس پر آمادہ نہ ہوئے اور جنگ ناگزیر ہو گئی۔ حضرت خالدؓ نے اسلامی فوج کو اس طرح مرتب کیا کہ اس کے اڑتیس دستے بنا دیئے اور مجاہدین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے اور اسے اپنی کثرت تعداد پر بڑا گھمنڈ ہے اس کے مقابلے میں یہی تدبیر مناسب ہے کہ ہم اپنی فوج کے بہت سے دستے بنا دیں تاکہ دشمن کو ہماری تعداد اصل سے بہت زیادہ نظر آئے۔ قلب میں اٹھارہ دستے تھے جن کی قیادت حضرت ابو عبیدہؓ کر رہے تھے۔ حضرت قعقاعؓ بن عمرو انہی دستوں میں شامل تھے۔ میمنہ اور میسرہ کے دس دس دستوں کی قیادت حضرت عمروؓ بن العاص اور حضرت یزیدؓ بن ابو سفیانؓ کر رہے تھے۔ ہر دستے کا علیحدہ سردار بھی تھا جو قلب، میمنہ اور میسرہ کے سرداروں سے احکام حاصل کرتا تھا۔ ان دستوں کے سردار وہ لوگ تھے جو شجاعت، جوانمردی اور بے خوفی میں اپنی نظیر آپ تھے مثلاً حضرت قعقاعؓ، عکرمہؓ بن ابی جہل، ہاشمؓ بن عتبہ، ضرارؓ بن ازور، عیاضؓ بن غنم، شرحبیلؓ بن حسنہ اور عبدالرحمٰن بن خالدؓ بن ولید۔

ان انتظامات سے فارغ ہوتے ہی حضرت خالدؓ نے حضرت قعقاعؓ اور حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کو آگے بڑھنے اور دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ دونوں اپنے اپنے دستوں کے ساتھ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے اور رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی جو کئی دن تک پوری شدت سے جاری رہی۔ رومی اس جنگ میں شروع سے آخیر تک بڑی بے جگری سے لڑے۔

مسلمانوں نے کئی بار جی توڑ کر حملے کیے لیکن رومیوں نے انہیں ہٹا دیا۔ ایک بار تو رومیوں نے مسلمانوں کے میمنہ کو اس قدر دبایا کہ وہ فوج سے الگ ہو کر نہایت بے ترتیبی سے پیچھے ہٹا، یہاں تک کہ عورتوں کے خیموں تک پہنچ گیا۔ عورتوں کو یہ حالت دیکھ کر سخت غصّہ آیا۔ انہوں نے خیموں کی چوبیں اکھاڑ لیں اور پکاریں کہ مردو! ادھر آئے تو چوبوں سے تمہارا سر توڑ دیں گے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ کچھ خواتین نے جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا اور بہت سے رومیوں کو جہنم واصل کیا۔ عورتوں کا جوشِ ایمان دیکھ کر پیچھے ہٹتے والے مجاہدین نے ایک پرزور حملہ کر کے رومیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ جنگ کے آخری دن رومیوں نے بار بار خوفناک حملے کیے لیکن مسلمان بڑے ثابت قدم نکلے انہوں نے تلواروں کے نیام توڑ کر پھینک دیئے، تلواریں سونت لیں، نیزے سیدھے کر لیے اور کفن بردوش دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دشمن کے قدم لڑکھڑا گئے۔ رہی سہی کسر اسلامی فوج کے اس دستے نے پوری کر دی جو بجلی کی تیزی کے ساتھ رومیوں پر پیچھے سے آ کر گرا۔ اس جنگی چال نے دشمن کو حواس باختہ کر دیا۔ رومی فوج میں سے نصف تو میدان میں کام آئی اور جو لوگ زندہ بچ گئے وہ بھاگ نکلے۔

جنگ یرموک کا شمار شام کی فیصلہ کن لڑائیوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد قیصرِ روم کبھی اتنا بڑا لشکر جمع نہ کر سکا، وہ انطاکیہ میں تھا کہ شکست کی خبر پہنچی اس وقت اس کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے:

"الوداع اے شام"

اور پھر اس نے فی الواقع سرزمینِ شام کو الوداع کہہ کر قسطنطنیہ کی راہ لی۔

فتح یرموک کے موقع پر کئی عرب شعراء نے طبع آزمائی کی۔ اس سلسلے میں یاقوت حموی نے "معجم البلدان" میں حضرت قعقاعؓ کے متعدد اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:-

الم ترنا على اليرموك فزنا — كما فزنا بايّام العراق

قتلنا الروم حتیٰ ما تساوی   علی الیرموک مفروق الوراق
فضضنا جمعهم لما استحالو   علی الواقوصۃ البتر الرقاق
غداۃ تہافتوا فیہا فصاروا   الی امر تعضل بالذواق

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم جنگِ یرموک میں بھی اسی طرح فتحیاب ہوئے جس طرح ہم عراق میں کامیاب ہوئے تھے۔ ہم نے رومیوں کو بے دریغ قتل کیا اور ان کی جمعیت کو واقوصہ میں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ان کی تلواریں ان کے کسی کام نہ آسکیں۔ وہ واقوصہ کی گھاٹی سے گر کر ختم ہو گئے ان کا انجام بہت عبرتناک ہوا شکست اور نامرادی کے جو تلخ گھونٹ انہوں نے پیئے، ان کا بیناہر کس و ناکس کے بس میں نہیں)

جنگِ یرموک کے بعد مسلمان شام کے باقیماندہ مقامات کی تسخیر کے لیے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔

۵

حضرت خالدؓ بن ولید کے عراق سے آنے کے بعد ایران میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ایرانیوں نے اپنے اندرونی جھگڑے فراموش کر دیئے اور مسلمانوں کو عراق عرب سے نکالنے کے لیے متحد ہو کر زبردست جنگی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ نے نہایت پامردی سے ایرانی یلغار کا مقابلہ کیا لیکن ایرانیوں کی عسکری قوت مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اس لیے خدشہ تھا کہ کہیں مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ حضرت مثنیٰؓ نے ایک خط لکھ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جب جواب آنے میں تاخیر ہوئی تو وہ خود بارگاہِ خلافت میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس وقت شدید بیمار تھے اور زندگی کی آخری منزل طے کر رہے تھے۔ انہوں نے اسی حالت میں مثنیٰؓ سے عراق کے حالات سُنے اور پھر حضرت عمر فاروقؓ کو جنہیں وہ اپنا جانشین نامزد کر چکے تھے، بلا کر تاکیدی وصیت کی کہ مثنیٰؓ کے لیے جس قدر

جلد جمع ہو سکے امدادی فوج جمع کر دو، اگر میں آج مر جاؤں تو فوج جمع کرنے میں شام تک تاخیر نہ ہونے پائے اور اگر میں رات تک زندہ رہوں تو صبح کا انتظار نہ کیجیو، میری موت کا غم تمہیں اس کام سے ہرگز غافل نہ کرنے پائے۔

اس وصیت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پیکِ اجل کو لبیک کہا (۱۳ھ) اور حضرت عمر فاروقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ چند دن میں ایک ہزار مجاہدین فراہم کر کے انہیں ابو عبید ثقفیؓ کی قیادت میں حضرت مثنیٰؓ کی مدد کے لیے عراق روانہ کر دیا۔ راستے میں مختلف عرب قبائل کے اور کئی ہزار جوان ان کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ اس طرح جب وہ خفان میں حضرت مثنیٰؓ سے ملے تو ان کا لشکر جوشِ ایمان سے سرشار ہزارہا مجاہدین پر مشتمل تھا۔ حضرت ابو عبیدؓ نے نمارق، کسکر، اور باقیثیا کے مقامات پر ایرانیوں کو شکستیں دے کر فرات کے پار بھگا دیا۔ ایرانی سپہ سالار رستم ان شکستوں کی خبر سن کر سخت برہم ہوا اور اس نے ایک جرار لشکر بہمن جادویہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ یہ لشکر قس ناطف کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اسلامی لشکر فرات کی پرلی جانب مروحہ میں مقیم تھا۔ بہمن جادویہ نے ابو عبیدؓ کو پیغام بھیجا کہ تم دریا کے اس پار اتر کر آؤ گے یا ہم آئیں۔ حضرت ابو عبیدؓ جوشِ شجاعت میں اپنی فوج کے ہمراہ دریا کے پار اتر گئے۔ بدقسمتی سے دریا اور ایرانی لشکر کے درمیان میدان بہت تنگ تھا اس لیے مسلمان اپنی صف بندی مناسب طریقے سے نہ کر سکے پھر بھی وہ جان توڑ کر لڑے لیکن ایرانیوں کے جنگی ہاتھیوں نے قیامت ڈھا دی۔ حضرت ابو عبیدؓ اور ان کے بھائی حکمؓ بن مسعود مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ان کے علاوہ چھ ہزار دوسرے مجاہدین نے بھی جامِ شہادت نوش کیا باقی فوج کو حضرت مثنیٰؓ بڑی مشکل سے بچا کر دریا کی دوسری طرف لے گئے۔ یہ لڑائی "معرکہ جسر" کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کو سانحہ جسر کی اطلاع ملی تو انہوں نے حضرت جریرؓ بن عبداللہ البجلی کو ایک مضبوط فوج دے کر حضرت مثنیٰؓ کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ دو بویب کے مقام

پر حضرت مثنیٰؓ سے جا ملے۔ دربارِ ایران نے اب مہران بن مہرویہ ہمدانی کو ایک زبردست لشکر دے کر مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھیجا۔ بویب کے قریب دونوں فوجوں میں خونریز جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے سپاہی جی توڑ کر لڑے لیکن بالآخر مسلمانوں نے ایرانیوں کو عبرتناک شکست دی۔ ایک لاکھ ایرانی میدانِ جنگ میں کھیت رہے جن میں ان کا سپہ سالار مہران بھی تھا۔ بویب کا معرکہ فی الحقیقت معرکۂ جسر کا بھرپور جواب تھا۔ اس شکست سے سارے ایران میں کہرام مچ گیا۔ ایرانی امراء نے ملکہ پوران دخت کو تخت سے اتار کر ایک نوجوان شہزادے یزدجرد (یزدگرد) کو شہنشاہ بنایا اور تمام ایرانی عوام متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ جن علاقوں پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا تھا وہاں بھی بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے۔ حضرت مثنیٰؓ نے تمام حالات دربارِ خلافت کو لکھ بھیجے وہاں سے حکم موصول ہوا کہ اپنی فوجوں کو سمیٹ کر سرحدِ عرب کی طرف ہٹ آؤ اور کمک کا انتظار کرو۔ حضرت مثنیٰؓ نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنی فوجوں کو سمیٹ کر ذی قار میں مقیم ہو گئے۔ اُدھر حضرت عمر فاروقؓ نے تمام عرب میں جہاد کی منادی کرا دی۔ سارے عرب نے دعوتِ جہاد پر لبیک کہا اور چاروں طرف سے مدینہ منورہ میں مجاہدین کا تانتا بندھ گیا۔ امیر المومنین نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو عراق عرب کی مہم کا قائد بنایا اور مناسب ہدایات دے کر ایک مضبوط فوج کے ساتھ انہیں مدینہ منورہ سے رخصت کیا۔ حضرت سعدؓ نے مدینہ منورہ سے چل کر پہلے ثعلبہ اور پھر شراف میں پڑاؤ ڈالا۔ اس اثناء میں حضرت مثنیٰؓ نے جسر کی لڑائی میں جو زخم کھائے تھے ان کے ٹانکے کھل گئے اور انہوں نے ذوقار ہی میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ان کے بھائی معنیٰؓ آٹھ ہزار مجاہدین کو ساتھ لے کر شراف آ گئے اور حضرت سعدؓ کے لشکر میں شامل ہو گئے اب حضرت سعدؓ نے شراف سے آگے بڑھ کر قادسیہ کے سرسبز میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ وہاں سے انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کی ہدایت کے مطابق یزدجرد کے پاس سفیر بھیجے کہ جزیہ دو یا اسلام قبول کرو۔ یزدجرد یہ پیغام سن کر سخت غضبناک

ہوا۔ اس نے حضرت سعدؓ کے سفیروں کو بڑی حقارت کے ساتھ دربار سے نکلوا دیا۔ اور رستم کو ایک لاکھ اسی ہزار سپاہیوں اور تین سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے پر روانہ کر دیا۔

(۶)

رستم بڑی سست رفتاری سے چلتا ہوا قادسیہ کے سامنے پہنچا اور دریائے فرات کی دوسری جانب عتیق کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ پہلے چند دن سفیروں کے ذریعے رستم اور حضرت سعدؓ کے درمیان گفتگوئے مصالحت ہوتی رہی لیکن یہ گفتگو ناکام ہو گئی اور رستم بڑے جوش وخروش اور جاہ وجلال کے ساتھ مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے دریائے فرات کے پار اترا۔ اس کے لیے قلب لشکر میں ایک جواہر نگار طلائی تخت بچھایا گیا تھا جس پر سنہری چتر سایہ کیے ہوئے تھا۔ ساری کی ساری فوج لوہے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے آگے آگے سدھائے ہوئے خوفناک جنگی ہاتھی تھے جن کے قدموں کی دھمک سے زمین کانپ رہی تھی۔ رستم نے نہایت ترتیب سے اپنی صفیں آراستہ کیں اور مناسب جگہوں پر ہاتھیوں کے پرے جمائے، ساتھ ہی اس نے مدائن تک ڈاک کے ہرکارے بٹھا دیئے تاکہ وہاں سے تازہ دم فوجوں کی کمک آتی رہے۔ اس پُر جوش لشکر کے مقابلے میں اسلامی فوج کی تعداد تیس ہزار سے کچھ اوپر تھی لیکن دینِ حق کے جانباز سپاہی دشمن کی کثرتِ تعداد اور ساز وسامان کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ سروں سے کفن باندھ کر اپنے سے کئی گنا لشکر کے مقابلے پر صف آرا ہو گئے، اور قادسیہ کی خوفناک جنگ کا آغاز ہو گیا۔ لڑائی شروع ہونے سے چند دن پہلے حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھ بھیجا تھا کہ سعدؓ کی مدد کے لیے فی الفور شام سے کمک بھیجو۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ حکم ملتے ہی حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کو چھ ہزار سوار دے کر عراقِ عرب کی جانب روانہ کر دیا۔ حضرت ہاشمؓ نے حضرت قعقاعؓ کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنایا اور ایک ہزار سوار ان کی ماتحتی میں دے کر آگے روانہ کیا۔ ان کے پیچھے وہ خود بھی بسرعتِ تمام عراقِ عرب کے میدانِ جہاد کی

طرف روانہ ہوئے۔ حضرت قعقاعؓ ابھی راستے ہی میں تھے کہ قادسیہ میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان لڑائی کا آغاز ہو گیا۔ جب وہ میدانِ جنگ کے قریب پہنچے تو لڑائی کا ایک دن گزر چکا تھا اور دوسرے دن علی الصبح دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو رہی تھیں۔ حضرت قعقاعؓ نے اپنے ایک ہزار سپاہیوں کے دس دستے بنائے اور انہیں حکم دیا کہ جب تک ایک دستہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے دوسرا دستہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ وہ خود پہلے دستے کے ساتھ روانہ ہوئے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے وہ حضرت سعدؓ کے پاس پہنچ گئے اور انہیں کمک پہنچ جانے کی خوشخبری سنائی۔ پھر ان سے اجازت لے کر میدانِ جنگ میں پہنچے اور صفیں آراستہ کر کے لوگوں سے کہا، جو میں کروں وہی تم کرنا۔ اس کے بعد میدان میں نکل کر للکارے، کون مقابلے پر آتا ہے؟ ادھر سے ایرانیوں کا نامی امیر ذوالحاجب بہمن جادویہ (جس کے ہاتھوں مسلمانوں کو معرکہ جسر میں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی) باہر نکلا اور پکار کر کہا: "میں ہوں بہمن جادویہ" حضرت قعقاعؓ نے بھی بآوازِ بلند کہا، آج میں تم سے ابو عبیدؓ اور دوسرے شہدائے جسر کا بدلہ لوں گا۔ پھر دونوں تلواریں سونت کر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں حضرت قعقاعؓ نے اپنے حریف کو خاک و خون میں لوٹا دیا۔ اس کے بعد ایک اور ایرانی سردار بزرجمہر ہمدانی ان کے مقابل ہوا۔ حضرت قعقاعؓ نے اسے بھی اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے ڈھیر کر دیا۔ کچھ اور ایرانی سردار بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اور پھر عام جنگ شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی حضرت قعقاعؓ کے دستے میدانِ رزم میں ایک ایک کر کے پہنچنے شروع ہو گئے اس طرح تمام دن فوجوں کا تانتا بندھا رہا اور ایرانیوں پر رعب چھاتا گیا۔ ہر دستہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا آتا تھا اور حضرت قعقاعؓ اس کے ساتھ ہو کر دشمن پر حملہ آور ہوتے تھے۔ جنگ کے پہلے دن ایرانیوں کے جنگی ہاتھی بڑی تباہی مچا چکے تھے۔ آج ہاتھیوں کی تعداد اگرچہ کم تھی تاہم وہ مسلمانوں کے لیے مصیبت کا باعث بنے ہوئے تھے۔ اس مصیبت

کے تدارک کے لیے حضرت قعقاع رضؓ نے اونٹوں پر بڑی بڑی جھولیں اور برقعے ڈال کر انہیں بھی ہاتھیوں کی طرح مہیب بنا دیا۔ ایرانیوں کے گھوڑے انہیں دیکھ دیکھ کر بدکتے اور مسلمان ان کے سواروں کو اپنے نیزوں پر رکھ لیتے۔

جس وقت لڑائی پورے شباب پر تھی، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضؓ کے بھیجے ہوئے چند قاصد حضرت قعقاعؓ کے پاس پہنچے۔ ان اصحاب کے ساتھ نہایت گراں قیمت تلواریں اور عربی گھوڑے تھے انہوں نے مجاہدین کے سامنے پکار کر کہا کہ امیر المومنین نے یہ تحفے ان لوگوں کے لیے بھیجے ہیں جو ان کا حق ادا کر سکیں۔ چنانچہ حضرت قعقاعؓ نے طلیحہ بن خویلد، عاصم بن عمرو، عمرو بن معدی کرب، ربیل اور حمال بن مالک کو تلواریں حوالے کیں اور قبیلہ یربوع کے چار بہادروں کو گھوڑے عنایت کیے۔ ان مجاہدوں نے جنگِ قادسیہ میں جو غیر معمولی شجاعانہ کارنامے انجام دیئے ان کی بنا پر وہ بجا طور پر اس انعام کے مستحق تھے۔

شام تک میدانِ رزم گرم رہا۔ جب رات کا اندھیرا گہرا ہو گیا تو دونوں فوجیں اپنی اپنی قیام گاہوں کو لوٹیں۔ اس دن دس ہزار ایرانی مقتول ہوئے اور دو ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ مؤرخین نے جنگِ قادسیہ کے اس دوسرے دن کو "یوم الاغواث" کا نام دیا ہے۔

۷

اگلے دن لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضرت قعقاعؓ نے یہ تدبیر کی کہ اپنے ساتھ شام سے آنے والے سپاہیوں کو جنگل میں اس مقام پر بھیج دیا جہاں وہ "یوم الاغواث" کی صبح کو آ کر ٹھہرے تھے۔ ان لوگوں کو قعقاعؓ کا حکم تھا کہ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے سے گتھ جائیں تو وہ کل کی طرح ایک ایک سو کے دستوں میں بٹ کر تکبیر کے نعرے مارتے دوبارہ آئیں اور اگر اس دوران میں ہاشمؓ بن عتبہ بھی پہنچ جائیں تو ان کی فوج کو بھی اسی تدبیر پر عمل کرنے کا مشورہ دیں۔

لڑائی شروع ہوئی تو حضرت قعقاعؓ کے دستے وقفے وقفے کے ساتھ تکبیر کے نعرے بلند کرتے میدان میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ پہلا دستہ پہنچا تو تمام فوج نے اس کے ساتھ مل کر اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور غل پڑ گیا کہ امدادی فوجیں آ پہنچیں حسنِ اتفاق سے حضرت ہاشمؓ بن عتبہ بھی امدادی فوج کے ساتھ پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی حضرت قعقاعؓ کے مشورے کے مطابق اپنی فوج کے کئی دستے بنا دیئے سو یکے بعد دیگرے میدان میں داخل ہوتے رہے۔ آخری دستے میں سات سو جانباز تھے جن کی قیادت خود ہاشمؓ کر رہے تھے۔ وہ تیر برساتے ہوئے دشمن کے عقب میں گھستے چلے گئے یہاں تک کہ دریا تک پہنچے وہاں سے پلٹے اور پھر جھپٹے لیکن کسی کو انہیں روکنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس امدادی فوج کے آنے سے ایرانیوں پر کوئی خاص اثر نہ پڑا کیونکہ انہیں مدائن سے برابر تازہ دم کمک پہنچ رہی تھی۔ حضرت سعدؓ نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ آج لڑائی کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔ لیکن پہلے دن کی طرح آج بھی ایرانیوں کے جنگی ہاتھی بڑی تباہی مچا رہے تھے۔ جس طرف رُخ کرتے، صفیں ابتر ہو جاتی تھیں۔ اس طرح مسلمانوں کو فیصلہ کن ضرب لگانے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ حضرت سعدؓ نے کچھ نومسلم ایرانیوں کو بُلا کر پوچھا کہ ان ہاتھیوں سے کیسے نبٹا جائے؟ انہوں نے کہا کہ ان کی آنکھیں اور سونڈ بے کار ہو جائیں تو بھاگ کھڑے ہوں گے۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر تھے ایک سفید اور ایک چتکبرا۔ یہ دونوں سب سے بڑھ کر آفت ڈھا رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے حضرت قعقاعؓ اور حضرت عاصمؓ بن عمرو کو پیغام بھیجا کہ تم سفید ہاتھی کی آنکھیں اور سونڈ بے کار کر دو۔ ایسا ہی پیغام انہوں نے چتکبرے ہاتھی کے بارے میں بنو اسد کے جانبازوں حمال اور ربیل کو بھیجا۔ قعقاعؓ نے پہلے کچھ سوار اور پیادے بھیجے کہ ان ہاتھیوں کے گرد گھیرا ڈال دو۔ پھر خود برچھا ہاتھ میں لے کر سفید ہاتھی کی طرف بڑھے۔ عاصمؓ بھی ساتھ تھے دونوں نے ایک ساتھ اپنے نیزے سفید ہاتھی کی آنکھوں میں گھونپ دیئے۔ ہاتھی نے درد کے مارے چنگھاڑ ماری اور فیل بان کو نیچے گرا کر سونڈ پھرانے لگا۔ قعقاعؓ نے آگے بڑھ کر سونڈ

پر تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ مستک سے الگ ہو گئی۔ دوسری طرف جتنکبرے ہاتھی کا بھی حمال اور ربیل کے ہاتھوں یہی حشر ہوا۔ دونوں ہاتھی درد کی شدت سے چنگھاڑیں مارتے پیچھے کی طرف بھاگے تو دوسرے ہاتھی بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔ اس طرح مسلمانوں کو ہاتھیوں کی مصیبت سے نجات مل گئی۔ اب دونوں طرف کے بہادروں کو زور آزمائی کا موقع ملا۔ اس زور کا رن پڑا کہ نعروں کے شور سے زمین دہل دہل جاتی تھی۔ شام ہوئی تو حضرت سعدؓ نے اپنی فوج کو از سر نو مرتب کیا اور حکم دیا کہ جب میں تیسری بار تکبیر کہوں اسی وقت حملہ کرنا پہلی دو تکبیروں پر ہرگز جنبش نہ کرنا۔

حضرت سعدؓ نے یہ حکم دیا ہی تھا کہ ایرانیوں نے مسلمانوں پر بے تحاشا تیر برسانے شروع کر دیے۔ حضرت قعقاعؓ سے ضبط نہ ہو سکا اور اپنی رکاب کی فوج لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ فوجی نقطۂ نگاہ سے حضرت قعقاعؓ کا اس طرح حملہ کرنا ضابطہ کے خلاف تھا لیکن لڑائی کا انداز اور حضرت قعقاعؓ کا جوشِ ایمان دیکھ کر حضرت سعدؓ کے منہ سے بے اختیار نکلا:

"یا اللہ قعقاع کو معاف کر دے اور اس کی مدد فرما! ہر چند اس نے مجھ سے اجازت نہیں لی مگر اب اُسے میری طرف سے اجازت ہے۔"

اس کے بعد وہ پہلی تکبیر ہی کہنے پائے تھے کہ قعقاعؓ کے دیکھا دیکھی بنو اسد، بنو نخع، بنو بجیلہ اور بنو کندہ بھی ایرانیوں پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت سعدؓ ہر قبیلے کے حملے پر کہتے جاتے تھے "خدایا اس کو معاف کرنا اور اس کا مددگار رہنا۔" حضرت سعدؓ کی تیسری تکبیر پر باقی فوج بھی لڑائی کی آگ میں کود پڑی۔ آدھی رات تک خونریز جنگ ہوتی رہی اور میدان فریقین کے نعروں سے گونجتا رہا لیکن لڑائی نے کوئی فیصلہ کن صورت اختیار نہ کی۔ آخر حضرت قعقاعؓ نے اپنے قبیلے کو للکارا کہ ایرانیوں کے قلب لشکر پر ایک جان توڑ حملہ کرو اور ان کے سپہ سالار کو گرفتار کر لو۔ بنو تمیم نے قعقاعؓ کی آواز سن کر ان کے ساتھ ایرانیوں کے قلب لشکر کا رُخ کیا اور مارتے کاٹتے آگے

بڑھنے لگے۔ ان کو دیکھ کر عمرو بن معدی کرب اور قیسؓ بن اشعث نے جو اپنے اپنے قبیلہ کے سردار تھے، ساتھیوں کو للکارا کہ دیکھنا، قعقاعؓ اور اس کے ساتھی خدا کی راہ میں تم سے آگے نہ نکلنے پائیں۔ دوسرے سرداروں نے بھی جو نامی دلاور بھی تھے اور سحر البیان خطیب بھی، اپنے اپنے قبیلوں کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی پُر تاثیر تقریریں کیں کہ تمام مجاہدین کے دلوں میں شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ان کے گھوڑوں کے سامنے لوہے میں غرق ایرانی فوجیں دیوار کی طرح جمی کھڑی تھیں۔ اور کسی مسلمان سوار کو قلب لشکر کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھنے دیتی تھیں مسلمان شہسوار اب گھوڑوں سے کود پڑے، تیر و کمان پھینک کر تلواریں گھسیٹ لیں اور تمام فوج نہایت جوش و خروش کے ساتھ ایرانی صفوں کو الٹتی قلب لشکر کی طرف بڑھنے لگی یہاں تک کہ اس جگہ کے قریب پہنچ گئی جہاں رستم سنہری شامیانے کے نیچے تخت پر بیٹھا فوج کو لڑا رہا تھا اب وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے حفاظتی دستے کو لے کر مردانہ وار لڑنے لگا لیکن مسلمان سرفروشوں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ چلی حضرت قعقاعؓ، عاصمؓ، عمروؓ بن معدی کرب، قیسؓ بن اشعث اور ان کے ساتھی جانبازوں نے رستم کے آہن پوش حفاظتی دستے کے پرخچے اڑا دیئے اس وقت حضرت قعقاعؓ کی زبان پر یہ رجز جاری تھا۔

نحن قتلنا معشراً و زائدا　　اربعة و خمسة و واحدا

ہم نے گروہ کے گروہ بلکہ اس سے بھی زیادہ تلوار کے گھاٹ اتار دیئے
چار چار بھی، پانچ پانچ بھی ایک ایک بھی۔

نحسب فوق اللبد الا ساورا　　حتی اذا ماتوا دعوت جاهدا

ہم بڑی سے بڑی جمعیت پر بھاری سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے حریف
جب تک موت کی نیند نہ سو گئے میں انہیں برابر تیغ آزمائی کے لیے للکارتا رہا۔

الله ربي واحترزت عامدا

اللہ میرا رب ہے اور میں نے اسی کی قوی اور بادر آڑ پکڑی ہے

رستم نے اپنے حفاظتی دستے کو تباہ ہوتے دیکھا تو دوڑ کر ان خچروں کی طرف گیا جن پر خزانہ لاد کر لایا گیا تھا اور ایک خچر پر لدے ہوئے سامان کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ قعقاعؓ کی فوج کے سپاہی دریا کی طرف نکل گئے۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ خچروں پر دولت لدی ہوئی ہے اور رستم سامان کے پیچھے چھپا کھڑا ہے۔ ہلال بن علقمہ ایک مجاہد نے ایک خچر پر تلوار کا ہاتھ مارا جس سے اس سامان کا رسہ کٹ گیا جس کے پیچھے رستم کھڑا تھا۔ سارا بوجھ رستم پر گرا اور وہ شدید زخمی ہو گیا لیکن ہلال کو اس کا علم نہ تھا۔ رستم دوڑ کر دریا میں کود گیا۔ ہلال نے اسے دیکھا اور پہچان گئے۔ اس کے پیچھے وہ بھی پانی میں کود پڑے اور رستم کی ٹانگیں پکڑ کر باہر گھسیٹ لائے۔ پھر تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا اور اس کے تخت پر چڑھ کر زور سے پکارے:

"میں نے رستم کو قتل کر دیا ہے"

اس آواز کے سنتے ہی ایرانیوں میں بھاگڑ مچ گئی۔ مسلمانوں نے دور تک ان کا تعاقب کیا اور ہزاروں لاشیں میدان میں بچھا دیں۔ تعاقب کرنے والے جانبازوں میں حضرت قعقاعؓ بھی شامل تھے۔ جس رات کو قادسیہ کی خونیں جنگ اختتام کو پہنچی اسے لیلۃ الہریر کہا جاتا ہے۔ قادسیہ کی شکست سے تختِ کسریٰ کی بنیادیں ہل گئیں۔ ایرانیوں کا قومی پرچم "درفش کاویانی" بھی اس جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور مالِ غنیمت کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ حضرت قعقاعؓ نے اس لڑائی میں جو کارنامے انجام دیے ان کی بناء پر مؤرخین نے انہیں "جنگِ قادسیہ کا بطلِ خاص" قرار دیا ہے۔

۸

قادسیہ کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ نے بابل اور کوثیٰ تک ایرانیوں کا پیچھا کر کے آس پاس کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ایران کا دارالحکومت مدائن وہاں سے قریب ہی تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے حکم کے مطابق حضرت سعدؓ مدائن کی طرف بڑھے اور شہر کے مغربی حصے بُہر شیر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ دو یا تین مہینے تک جاری رہا۔ بالآخر ایرانی

قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے لیکن بُری طرح شکست کھائی اور دریائے دجلہ عبور کر کے مدائن خاص میں پناہ لی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے دریا کا پُل توڑ دیا۔ اور تمام کشتیاں بھی اپنے ساتھ دریا کے مشرقی کنارے کی طرف لے گئے۔ حضرت سعدؓ بہر شیر سے آگے بڑھے تو راستے میں دریائے دجلہ کو حائل پایا۔ اس سال بارشیں نہایت کثرت سے ہوئی تھیں جن کی وجہ سے دریا طغیانی پر تھا اور پانی کے پھیلاؤ اور زور شور کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُدھر دوسرے کنارے پر ایرانی تیر انداز پرّے باندھے منتظر تھے کہ مسلمان مدائن کا رُخ کریں تو انہیں اپنے تیروں پر رکھ لیں۔ ایسی خوفناک طغیانی میں گھوڑوں کا تیرنا بھی بہت مشکل تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر حضرت سعدؓ نے فوج کو جمع کیا اور اس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلمانو! میں نے تو پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ اللہ کے بھروسے پر گھوڑے کو دریا میں ڈال دوں، بولو کون مجاہد اس کام میں میرا ساتھ دے گا؟"

تمام مسلمانوں نے بیک آواز کہا "اے امیر ہم سب آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔"

حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ کچھ جانباز بڑے لشکر سے پہلے آگے بڑھیں اور دوسرے کنارے پر جا کر قابض ہو جائیں۔ حضرت عاصمؓ بن عمرو اور حضرت قعقاعؓ فوراً آگے بڑھے اور چھ چھ سو جانبازوں کے ساتھ یہ آیت پڑھتے ہوئے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آلِ عمران-۱۴۵)

(اور کوئی شخص مر نہیں سکتا جب تک کہ اللہ کا حکم نہ ہو، اس نے وقت مقررہ لکھ رکھا ہے)

دوسرے کنارے سے ایرانیوں نے مجاہدین پر بے پناہ تیر اندازی شروع کر دی ادھر سے مجاہدین نے بھی مردانہ وار جواب دیا اور تھوڑی دیر میں ایرانیوں کو کنارے سے دور ہٹا دیا۔ اب حضرت سعدؓ نے حکم دیا کہ تمام لشکر دریا میں داخل ہو جائے۔ مسلمانوں نے اپنے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور نستعین باللہ ونتوکل

علیہ حسبنا اللہ ونعم الوکیل واللہ لینصرن اللہ ولیہ ولیظہرن دینہ ولیہزمن عدوہ ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

(ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ وہ اچھا وکیل ہے۔ خدا کی قسم! اللہ اپنے دوست کو فتح دے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا اور سوائے رب بزرگ و برتر کے کسی میں طاقت نہیں۔)

پڑھتے ہوئے دجلہ کے دریائے زخار میں داخل ہو گئے۔ ہزارہا اسلامی شہسوار دجلہ کے پھنکارتے ہوئے پانی پر پوری ترتیب کے ساتھ اس طرح جا رہے تھے گویا صحن چمن میں گلگشت کر رہے ہوں۔ دو دو سوار ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ دوسرے کنارے پر ایرانیوں نے مسلمانوں کو اس شان سے آتے دیکھا تو ان پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ " دیواں آمدند دیواں آمدند " (دیو آگئے دیو آگئے) کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں کی قوت ایمانی کی بدولت اللہ تعالیٰ نے تمام لشکر کو صحیح سلامت دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مجاہد غرقدؓ دریا میں گر پڑے۔ حضرت قعقاعؓ ان کے پہلو میں تھے انہوں نے فوراً غرقدؓ کو پانی سے نکال لیا۔ ایک دوسرے مجاہد کا پیالہ دریا میں گر پڑا، دریا کی ایک لہر نے اس کو اچھال کر دوسرے کنارے پر ڈال دیا۔ مسلمانوں کی فاتحانہ یلغار نے یزدجرد کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ اپنا خزانہ اور حرم تو پہلے ہی حلوان بھیج چکا تھا اب مدائن کے در و دیوار پر حسرت سے نظر ڈالتا خود بھی شہر سے بھاگ نکلا۔

لشکر اسلام مدائن میں داخل ہوا تو ہر طرف عبرت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حضرت سعدؓ نے شاہی محل میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نماز شکرانہ ادا کی اور پھر عمروؓ بن مقرن کو مال غنیمت جمع کرنے پر مامور فرمایا۔ چند دن کے اندر اندر کروڑوں روپے کا مال غنیمت جمع ہو گیا جس میں کسریٰ کا لباس، زیور، جواہرات اور دوسری بے شمار نادر و نایاب چیزیں بھی شامل تھیں۔ حضرت سعدؓ نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ مدینہ منورہ

روانہ کر دیا اور باقی سب مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے حضرت قعقاعؓ کو بطور خاص بلا بھیجا کیونکہ انہوں نے جنگ قادسیہ اور دوسرے معرکوں میں سب سے بڑھ کر جانبازی دکھائی تھی۔ جب وہ آئے تو حضرت سعدؓ نے ان کے سامنے کسریٰ اور دوسرے بادشاہوں کی تلواریں رکھ دیں اور فرمایا کہ ان میں سے جو تلوار تمہیں پسند ہو، لے لو۔ حضرت قعقاعؓ نے ہرقل قیصر روم کی تلوار اٹھالی۔ پھر حضرت سعدؓ نے انھیں بہرام چوبین کی زرہ اپنی طرف سے عنایت کی۔ مدائن کی تسخیر کے بعد حضرت سعدؓ دوسرے مجاہدین کے ساتھ وہیں مقیم تھے کہ انھیں یزدجرد کی جنگی تیاریوں کی اطلاع ملی۔ یزدجرد اس وقت حلوان میں تھا اور اس کے حکم سے رستم کا بھائی خرزاد بن فرخ زاد اور مہران جلولاء میں لشکر جمع کر کے ایک بار پھر مسلمانوں سے پنجہ آزمائی کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ حضرت سعدؓ نے سارے حالات حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجے۔ وہاں سے حکم آیا کہ ہاشمؓ بن عتبہ کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ جلولاء بھیج دو اور ان کے ساتھ قعقاع بن عمرو تمیمی کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کر بھیجو۔ حضرت سعدؓ نے امیر المومنین کی ہدایت کے مطابق حضرت ہاشمؓ کو بارہ ہزار چیدہ جانبازوں کے ساتھ جلولاء روانہ کر دیا۔ یہ ۱۶ھ ۶۳۷ء کا واقعہ ہے۔

⑨

ایرانیوں کو جلولاء کی طرف مسلمانوں کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے بڑے زور شور سے جنگ کی تیاری کی۔ شہر کے گرد خندق تیار کرائی اور اس کے اردگرد گوکھرو بچھا دیئے۔ حضرت ہاشمؓ مدائن سے چل کر چوتھے دن جلولاء پہنچے تو ایرانیوں کو قلعہ بند ہو کر شہر کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگائے دیکھا۔ حضرت ہاشمؓ نے شہر کا محاصرہ کر لیا جو کئی مہینے جاری رہا۔ اس دوران میں ایرانی کئی مرتبہ قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے لیکن ہر بار منہ کی کھائی۔ محصورین کے پاس

خوراک اور سامانِ حرب کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور انہیں برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ اس لیے وہ بددل نہ ہوتے تھے۔ ایک دن ایرانی سپہ سالار مہران اپنی فوج کے ساتھ یکایک قلعہ سے نکلا اور بڑے جوش و خروش سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ مسلمانوں نے جم کر مقابلہ کیا اور بقول حافظ ابنِ کثیر "اتنی شدید جنگ ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی یہاں تک کہ طرفین کے تیر ختم ہو گئے، نیزے ٹوٹ گئے اور نوبت تلواروں اور کلہاڑوں تک پہنچ گئی۔ ظہر کے وقت ایرانیوں کو تازہ دم کمک پہنچ گئی۔ حضرت قعقاعؓ نے مسلمانوں سے کہا، مسلمانو! یہ دیکھ کر تم ڈر تو نہیں گئے؟ مسلمانوں نے جواب دیا، نہیں لیکن ہم تھکے ہوئے ہیں اور وہ تازہ دم ہیں —— حضرت قعقاعؓ نے للکار کر کہا، کچھ پروا نہیں، ہم ان پر حملہ کریں گے اور اس وقت تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک اللہ ان کے اور ہمارے درمیان کوئی فیصلہ نہ کر دے۔ یکجان ہو کر ان پر ٹوٹ پڑو اور ان کی صفوں میں گھس جاؤ۔" یہ کہہ کر تلوار چلاتے دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور اس مقام تک جا پہنچے جہاں خندق کے درمیان گزرنے کے لیے راستہ بنایا گیا تھا۔ اس وقت جھٹ پٹا ہو چکا تھا یا بروایتِ دیگر اتفاق سے اس زور کی آندھی چلی کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ قعقاعؓ نے دیکھا کہ اندھیرے کی وجہ سے لوگ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ان کے ایک جانباز ساتھی نے نعرہ لگایا:

"ادھر ادھر مسلمانو! یہ تمہارے امیر دشمن کی خندق کے راستے پر قابض ہوا چاہتے ہیں — پیچھے نہیں آگے بڑھو۔"

یہ للکار سن کر تمام مسلمان پلٹ پڑے اور اس زور کا حملہ کیا کہ ایرانی بدحواس ہو کر پیچھے ہٹے۔ حضرت قعقاعؓ نہایت دلیری سے لڑتے ہوئے قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ سپہ سالار ہاشمؓ پیچھے رہ گئے تھے اور فوج کا بڑا حصہ ان کی رکاب میں تھا۔ حضرت قعقاعؓ نے اپنے چند ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ "سپہ سالار آ پہنچے سپہ سالار آ پہنچے" کا غل مچائیں۔ اس غل سے مسلمانوں کی ہمت دوچند ہو گئی اور ایرانی سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگے لیکن جدھر کا رخ کرتے راستے میں گوکھرو حائل ہو جاتے تھے یا خندق۔

پھاٹک اور خندق کی گزرگاہ پر حضرت قعقاعؓ کا قبضہ تھا اس لیے شہر میں بھی داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ مسلمانوں نے گھیر کر بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔

ابن جریر طبریؒ کا بیان ہے کہ ایک لاکھ ایرانی مارے گئے اور تین کروڑ کا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ جو ایرانی بچ گئے انہوں نے حلوان کو راہِ فرار اختیار کی۔ ان میں نامور ایرانی سردار مہران اور فیروزان بھی تھے۔ حضرت قعقاعؓ نے ان بھگوڑوں کا تعاقب کر کے خانقین کے مقام پر انہیں جا لیا۔ مہران تو قعقاعؓ کے ہاتھ سے مارا گیا لیکن فیروزان بچ نکلا اور حلوان پہنچ کر یزدجرد کو جلولاء کی شکست سے آگاہ کیا۔ اس نے خسرو شنوم ایک معزز ایرانی سردار کو ایک مضبوط فوج کے ساتھ حلوان کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود بھاگ کر رے چلا گیا۔ حضرت سعدؓ کے حکم کے مطابق حضرت قعقاعؓ حلوان کی طرف بڑھے۔ ابھی وہ حلوان سے تین میل ادھر قصر شیریں کے مقام پر پہنچے تھے کہ خسرو شنوم حلوان سے نکل کر ان کے مقابل ہوا۔ حضرت قعقاعؓ نے شدید جنگ کے بعد اسے شکست دی۔ اور آگے بڑھ کر حلوان پر کسی مزاحمت کے بغیر قبضہ کر لیا۔ یہ فتح عراقِ عرب کی فتوحات کا خاتمہ تھی کیونکہ حلوان سے پرے عراق عجم یا فارس کی سرحد شروع ہو جاتی تھی اور حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سعدؓ کو یہ لکھ کر آگے بڑھنے سے روک دیا تھا کہ ہم نے ایرانیوں کو عرب کی حدود سے پیچھے دھکیل دیا ہے اب ہم ان کے ملک (فارس) پر بلاوجہ حملہ نہیں کریں گے۔

(۱۰)

عراقِ عرب کی تسخیر کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کو معلوم ہوا کہ مدائن کی آب و ہوا مسلمانوں کو راس نہیں آئی تو انہوں نے حضرت سعدؓ کو حکم بھیجا کہ عرب کی سرحد کے اندر کوئی مناسب جگہ تلاش کر کے ایک نیا شہر آباد کریں۔ حضرت سعدؓ نے متعدد اربابِ دانش سے مشورہ کر کے دریائے فرات سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر حیرہ کے قریب ایک سرسبز اور شاداب جگہ منتخب کی اور وہاں شہر کوفہ کی بنیاد

دکھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جن اصحاب کو حضرت سعدؓ نے مناسب جگہ کی تلاش پر مامور کیا تھا۔ حضرت قعقاعؓ بھی ان میں شامل تھے۔ اس مقصد کے لیے انہیں حلولاء سے روانہ کیا گیا تھا۔ کوفہ کا شہر آباد ہو گیا اور حضرت سعدؓ اس کے امیر مقرر ہوئے تو حضرت قعقاعؓ بھی ان کے ساتھ کوفہ چلے گئے۔

۱۷ھ ہجری میں قیصر روم نے حمص پر دوبارہ قبضہ کرنے کی پُر زور کوشش کی اور اہلِ جزیرہ کی تحریک پر ایک بڑی فوج حمص کی طرف روانہ کی۔ اہل جزیرہ بھی تین ہزار جنگجوؤں کے ساتھ حمص کی طرف بڑھے۔ امیرِ شام حضرت ابو عبیدہؓ نے اِدھر اُدھر سے فوجیں جمع کر کے حمص کی حفاظت کی تیاری کی اور ساتھ ہی حضرت عمر فاروقؓ کو رومیوں اور اہلِ جزیرہ کی ملی بھگت اور ان کے عزائم کی اطلاع دی۔ امیر المؤمنین نے یہ اطلاع ملتے ہی حضرت قعقاعؓ کو حکم بھیجا کہ فوراً کوفہ سے چار ہزار سوار لے کر حمص پہنچ جائیں۔ ساتھ ہی حضرت سہیلؓ بن عدی عبداللہ بن عتبانؓ اور ولیدؓ بن عقبہ کو اہلِ جزیرہ سے نبٹنے کے لیے مناسب ہدایات بھیجیں۔ ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ جزیرہ کو اپنے گھر کی فکر پڑ گئی اور وہ رومیوں کا ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے۔ اب حمص کے محاصرے پر صرف رومی اور ان کے مددگار چند عرب قبائل رہ گئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ ایک دن شہر سے باہر نکل کر ان کے مقابل ہوئے۔ اس وقت حضرت قعقاعؓ منزلوں پر منزلیں مارتے حمص کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ابھی شہر سے چند میل دور تھے کہ انہوں نے مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان لڑائی چھڑ جانے کی خبر سُنی۔ ان کے ساتھ اس وقت صرف سو سوار تھے اور فوج کا بڑا حصہ ابھی پیچھے تھا لیکن اس خبر نے حضرت قعقاعؓ کو ایسا بیتاب کر دیا کہ وہ باقی فوج کا انتظار کیے بغیر سو سواروں کے ساتھ ہی برق رفتاری سے حضرت ابو عبیدہؓ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی آمد سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور سب نے مل کر دشمن پر ایسا تند و تیز حملہ کیا کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ پہلے عرب قبائل بھاگے اور پھر رومی بدحواسی کے عالم میں میلوں بھاگتے چلے گئے۔ اس

شرمناک شکست کے بعد رومیوں کو پھر کبھی مسلمانوں کے خلاف پیش قدمی کی جرأت نہ ہوئی۔ اس مہم سے فارغ ہو کر حضرت قعقاعؓ واپس کوفہ چلے گئے۔

(۱۱)

۲۱ھ ہجری میں یزدجرد نے مرو (عراق عجم) میں ایک مرتبہ پھر زبردست فوجی تیاریاں کیں اور مسلمانوں کو عراق عرب سے نکالنے کے لیے تمام ایرانیوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ مختلف اطراف و جوانب سے ڈیڑھ لاکھ ایرانی جنگجوؤں کا ٹڈی دل قم میں اس عزم کے ساتھ جمع ہوا کہ مسلمانوں کو تہس نہس کر دے گا۔ یزدجرد نے ایک نامور ایرانی سردار فیروزان کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا اور مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے نہاوند کی طرف روانہ کیا۔ یہ لشکر قم سے چلا تو ہر طرف تہلکہ پڑھ گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ان حالات کی اطلاع ملی تو انہوں نے تمام فوجی مراکز کے امیروں کو حکم بھیجا کہ ایک ایک ثلث فوج ایرانیوں کے مقابلے کے لیے بلا تاخیر نہاوند روانہ کرو۔ کوفہ سے تیس ہزار فوج روانہ ہوئی جس میں نعمانؓ بن مقرن، قعقاعؓ، حذیفہؓ بن الیمان، جریرؓ بن عبداللہ البجلی، عبداللہ بن عمر، مغیرہؓ بن شعبہ، عمروؓ بن معدی کرب اور طلیحہؓ بن خویلد جیسے آزمودہ کار اور صاحب تدبیر شجاعان عرب شامل تھے۔ امیر المؤمنین نے اس مہم کا قائد حضرت نعمانؓ بن مقرن کو مقرر کیا اور ساتھ ہی ہدایت کی کہ اگر انہیں کوئی حادثہ پیش آجائے تو حذیفہؓ بن الیمان ان کی جگہ سپہ سالار ہوں گے۔

حضرت نعمانؓ نہاوند پہنچے تو دوسرے فوجی مراکز سے بھی امدادی فوجیں ان سے آملیں۔ فیروزان کی خواہش پر حضرت نعمانؓ نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو سفیر بنا کر اس کے پاس بھیجا لیکن یہ سفارت بے نتیجہ ثابت ہوئی اور فریقین میں جنگ ناگزیر ہو گئی۔ ایرانیوں کی تعداد اگرچہ مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی لیکن گزشتہ لڑائیوں کے تجربہ کی روشنی میں انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ قلعہ بند ہو کر جنگ کی

جائے۔ چنانچہ وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے، اور مسلمانوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ایرانیوں نے فصیلِ شہر کے چاروں طرف لوہے کے گوکھرو بچھا دیئے تھے اور صرف اتنی جگہ خالی رکھی تھی کہ جس وقت حملے کے لیے نکلنا چاہیں نکل سکیں۔ مسلمانوں کے گھوڑے ان گوکھروؤں کو پار نہ کر سکتے تھے اور ایرانی جب چاہتے شہر سے نکل کر حملہ آور ہوتے تھے۔ اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے حضرت نعمانؓ نے اہل الرائے اصحاب سے مشورہ کیا تو بالاتفاق یہ طے پایا کہ ایک دستے کے سوا ساری فوج شہر سے چھ سات میل دور چلی جائے۔ یہ دستہ شہر پر حملہ کرے اور ایرانیوں کو مشتعل کر کے شہر سے باہر لائے پھر ان کے سامنے پسپا ہونے لگے یہاں تک کہ ایرانی فوج بڑے اسلامی لشکر کی زد میں آ جائے۔ حضرت نعمانؓ نے اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کا کام حضرت قعقاعؓ کے سپرد کیا اور انہیں ایک دستے کے ساتھ شہر کے باہر چھوڑا پھر راتوں رات ساری فوج کو اپنے ساتھ لے کر شہر سے بہت دُور نکل گئے۔ دوسرے دن حضرت قعقاعؓ نے علی الصباح اپنے دستے کے ساتھ شہر پر ہلہ بولا۔ ایرانیوں نے سمجھا کہ مسلمان لشکر کا غالب حصہ بددل ہو کر بھاگ گیا ہے، اور یہ تھوڑی سی فوج پیچھے رہ گئی ہے۔ چنانچہ وہ بڑے جوش سے باہر نکلے۔ حضرت قعقاعؓ ان سے تھوڑی دیر لڑے اور پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ایرانی لشکر مسلمانوں کی بڑی فوج کی زد میں آ گیا۔ ایرانی ایک دفعہ تو اسلامی فوج کو دیکھ کر بوکھلا گئے لیکن پھر ان کی غیرت نے جوش مارا اور انہوں نے مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے۔ ان کے تیروں سے بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے۔ لیکن حضرت نعمانؓ نے دوپہر ڈھلنے کا انتظار کیا کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ دوپہر ڈھلنے کے بعد دشمن پر حملہ کیا کرتے تھے۔ جب سورج ڈھلنے کو ہوا تو حضرت نعمانؓ نے دستور کے مطابق تین تکبیریں بلند کیں اور حملے کا حکم دیا۔ مسلمان جو بے تابی سے سپہ سالار کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ برقِ بے اماں کی طرح لوٹ کر دشمن پر گرے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ ایرانیوں نے بھی جم کر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کے سامنے آہنی دیوار بن کر

کھڑے ہو گئے۔ لڑائی نے اتنی شدت پکڑی کہ اس سے پہلے کسی معرکے میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ میدان میں ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ حضرت نعمانؓ دشمن کے قلب کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ان کا گھوڑا پھسل کر گرا، ساتھ ہی وہ بھی گر پڑے اور جام شہادت پی کر روضۂ رضوان کو سدھارے۔ ان کے بھائی نعیمؓ بن مقرن نے بڑھ کر علم تھام لیا اور ان کی ٹوپی اور قبا پہن کر ان کے گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اس تدبیر سے نعمانؓ کی شہادت کا حال کسی کو معلوم نہ ہوا تا آنکہ حضرت حذیفہؓ بن الیمان نے فوج کی قیادت سنبھال لی۔

حضرت قعقاعؓ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس شان سے لڑ رہے تھے کہ شجاعت بھی آفرین پکار رہی تھی، ان کے ساتھ عمرؓو بن معدی کرب، طلیحہؓ بن خویلد، جریرؓ بن عبداللہ اور بہت سے دوسرے جانبازوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ راہِ حق کے ان دلاوروں کی سرفروشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام ڈھلتے ہی ایرانیوں کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایرانی سپہ سالار فیروزان بھی ایک گھوڑے پر سوار ہمدان کی طرف بھاگا۔ حضرت قعقاعؓ نے سواروں کا ایک دستہ لے کر اس کا تعاقب کیا اور ہمدان کی سرحد کے قریب جا لیا۔ اس وقت شہد سے لدے ہوئے گدھوں اور خچروں کا ایک قافلہ پہاڑ کی گھاٹی سے گزر رہا تھا جس سے راستہ رُک گیا تھا۔ فیروزان گھوڑے سے اتر کر پیدل چل پڑا، اتنے میں حضرت قعقاعؓ اس کے سر پر آ پہنچے اور تلوار کے ایک وار سے اسے ڈھیر کر دیا۔ اس پر یہ ضرب المثل مشہور ہو گئی کہ شہد کی مکھی خدائی فوج کا جزو ہے۔ حضرت قعقاعؓ اپنے ساتھیوں سمیت واپس ہوئے تو حضرت حذیفہؓ بن الیمان نے نہاوند میں داخل ہو کر اس پر مکمل تسلط جما لیا تھا۔ اہل عرب نے اس لڑائی کا نام فتح الفتوح رکھا کیونکہ اس معرکہ کے بعد ایرانی پھر کبھی اتنا بڑا لشکر مسلمانوں کے مقابلے پر نہ لا سکے۔

جنگِ نہاوند میں سرفروشانہ حصہ لینے کے بعد حضرت قعقاعؓ واپس کوفہ چلے گئے اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اپنے وقت کے اس عظیم دلاور صف شکن

کو خالقِ حقیقی کا بلاوا کب آیا؟ اس کے بارے میں تمام کتبِ سیر خاموش ہیں۔ البتہ ایک روایت سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دورِ خلافت میں حیات تھے اور جنگِ جمل (۳۶ھ / ۶۵۶ء) سے پہلے حضرت علیؓ نے انہیں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے گفتگو کرنے کے لیے بصرے بھیجا تھا۔

ازواج و اولاد کی تفصیل بھی کسی کتاب میں نہیں ملتی۔ صرف ایک بیٹی خولہ کا پتہ چلتا ہے جو جلیل القدر صحابی حضرت طلحہؓ صاحبِ اُحد (یکے از اصحابِ عشرہ مبشرہ) کے عقدِ نکاح میں تھیں۔

حضرت قعقاعؓ نے اپنی شجاعت و شہامت اور راہِ حق میں سرفروشی و جاں سپاری کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے وہ ملّتِ اسلامیہ کے لیے تا ابد نشانِ راہ بنے رہیں گے اور فرزندانِ توحید کے خون کو گرماتے رہیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت قباث رضؓ بن اشیم کنانی

①

ایک مرتبہ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کی ملاقات ایک کبیرالسن صاحب رسولؐ سے ہوئی تو اس نے ان سے پوچھا :-

"اے صاحب رسولؐ آپ نے خاصی بڑی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں ذرا یہ تو بتایئے کہ آپ بڑے تھے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟"

عبدالملک کا سوال سن کر ان صاحب رسولؐ کے دل میں ہوک سی اٹھی، اپنے آقا و مولاؐ کی یاد نے انہیں بے چین کر دیا اور وہ رندھی ہوئی آواز میں بولے :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے بڑے تھے بہت بڑے البتہ میری عمر حضورؐ سے زیادہ تھی۔"

یہ صاحب رسولؐ جن کو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قدر پاسِ ادب تھا کہ حضورؐ کے مقابلے میں اپنے سن کی زیادتی کو بھی بڑائی کہنا گوارا نہ تھا، حضرت قباث رضؓ بن اشیم تھے۔

②

حضرت قباث رضؓ بن اشیم کا شمار ان مجاہد صحابہؓ میں ہوتا ہے جن کا بڑھاپا بھی انہیں وطن سے سینکڑوں میل دور جا کر میدانِ جہاد میں حق کی خاطر جان کی بازی لگانے سے نہ روک سکا۔ ان کا تعلق بنو کنانہ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے :

قباثؓ بن اشیم بن عامر بن ملوح بن یعمر بن عوف بن کعب بن عامر بن لیث بن بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ۔

حضرت قباثؓ غزوۂ بدر (۲ سنہ ہجری) تک اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے اور قریش مکہ کے لشکر میں شریک ہو کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے آئے تھے۔ چونکہ وہ اپنے قبیلے کے نہایت بہادر اور جنگ آزما لوگوں میں سے تھے اس لیے قریش کے لشکر میں انہیں خاص اہمیت حاصل تھی۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد ان کے دل میں یکایک شمع ایمان روشن ہو گئی اور وہ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان تھی لیکن بڑے قوی اور توانا تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ انہوں نے عہدِ رسالت کے کئی غزوات میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں اپنی شجاعت و بسالت کا سکہ بٹھا دیا۔

(۳)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں شام پر فوج کشی ہوئی تو حضرت قباثؓ اپنے بڑھاپے کے باوجود بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لشکرِ اسلام میں شامل ہو گئے اور رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ اہلِ سیر نے یرموک کی خونریز جنگ میں ان کی شجاعت اور سرفروشی کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے۔ اس لڑائی میں وہ اسلامی لشکر کے میسرہ کے افسر تھے۔ ہنگامِ کارزار میں ایک موقع پر ایک رومی جرنیل ابن قناطیر نے اسلامی فوج کے میسرے پر اس زور کا حملہ کیا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اس نازک گھڑی میں حضرت قباثؓ بن اشیم کچھ دوسرے افسروں (حضرت سعیدؓ بن زید، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت شرحبیل بن حسنہؓ اور حضرت یزیدؓ بن ابوسفیانؓ) کے ساتھ میدانِ جنگ میں ڈٹ کر کھڑے ہو گئے اور رومیوں کے تند و تیز سیلاب کو روکنے

کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اس وقت حضرت قباثؓ یہ رجز پڑھ رہے تھے:۔

"اگر مسلمان مجھے کھوئیں گے تو ایک بہترین سپہ سالار اور پشت پناہ کو کھو دیں گے جو جنگ کی ہولناکیوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ جس کے دل میں کبھی خوف راہ نہیں پاتا۔ جو ایسا شمشیرزن اور ہیبت ناک حملہ آور ہے جس کی کوئی مدافعت نہیں کر سکتا۔"

اُن کے ہاتھ سے تلواریں اور نیزے لوٹ لوٹ کر گرتے جاتے تھے مگر خوف و ہراس ان کے نزدیک بھی نہ پھٹکتا تھا اور وہ یہ کہہ کر لوگوں سے دوسری تلواریں اور نیزے لیتے جارہے تھے کہ "کوئی ہے جو اس شخص کو ہتھیار دے جس نے اللہ سے اقرار کیا ہے کہ میدانِ جنگ سے ہٹے گا تو مر کر ہٹے گا۔" لوگ ان کے ہاتھ میں تلوار یا نیزہ لاکر دیتے تو وہ پھر شیر کی طرح جھپٹ کر رومیوں پر جا پڑتے۔ حضرت قباثؓ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی پامردی اور سرفروشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے اور انھوں نے رومیوں کو عبرتناک شکست دی۔

ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ جب شام پر مسلمانوں کا مکمل استیلا ہو گیا تو حضرت قباثؓ نے مستقل طور پر دمشق میں اقامت اختیار کر لی اور طویل عمر پاکر اسی شہر میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ان کا سال وفات کسی کتاب میں درج نہیں ہے۔ البتہ عبدالملک سے ان کی ملاقات کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے دورِ حکومت (۶۵ھ تا ۸۶ھ) میں حیات تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت نعمانؓ بن مُقرّنِ المزنی

①

یوں تو عرب کے بیشتر قبائل نے فتح مکّہ (رمضان ۸ھ) کے بعد ہی آستانۂ اسلام کے سامنے سر جھکایا اور اپنے اپنے وفد مدینہ منوّرہ بھیج کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا اظہار کیا لیکن بعض سعادت مند قبائل ایسے بھی تھے جن کو فتح مکّہ سے بہت پہلے دعوتِ توحید پر لبیک کہنے کا شرف حاصل ہو گیا اور انہوں نے برضا و رغبت اپنے وفد حضورؐ کی زیارت اور بیعت سے مشرّف ہونے کے لیے مدینہ منوّرہ بھیجے۔ ایسا ہی ایک وفد بنو مُزَینہ کا تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب مضر پر قریش کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔ اس قبیلہ کے سردار بلالؓ بن حارث مزنی چار سو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر رجب ۵ھ میں مدینہ منوّرہ آئے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر حضورؐ کے دستِ مبارک پر مشرّف بہ اسلام ہو گئے۔ نعمتِ اسلام سے بہرہ یاب ہونے کے بعد اراکینِ وفد نے حضورؐ سے ہجرت الی المدینہ کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا، تم لوگ فی الحال اپنے وطن واپس جاؤ اور وہیں قیام کرو، تمھیں بہر صورت مہاجرین ہی میں داخل سمجھا جائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ لوگ جب مدینہ منوّرہ سے چلنے لگے تو حضورؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کو حکم دیا کہ انہیں زادِ راہ دو۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ اس وقت میرے پاس کھجوروں کی ایک قلیل مقدار کے سوا اور کچھ نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، یہی دے دو۔

ارشادِ نبویؐ کی تعمیل میں حضرت عمر فاروقؓ تمام مزنیوں کو اپنے گھر لے گئے۔ سب نے حسب ضرورت کھجوریں لے لیں لیکن پھر بھی کچھ کھجوریں بچ رہیں۔ یہ سب حضورؐ کی دُعا کا

اعجاز تھا۔

اہلِ سِیَر کا بیان ہے کہ عرب کا یہ سب سے پہلا وفد تھا جو اپنی خوشی سے دور دراز کی مسافت طے کر کے بارگاہِ رسالت میں قبولِ اسلام کے لیے حاضر ہوا۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے "سیرۃ النبی" میں عراقی کی "سیرتِ منظوم" کا یہ شعر نقل کیا ہے:

اول وفد وفد المدینہ　　　سنۃ خمس وفد وا مزینہ

(سب سے پہلا وفد مدینہ میں آیا　　　وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ھ میں آیا)

بنو مزینہ "حاجب" نامی ایک بُت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ وطن واپس آ کر انہوں نے اس بُت کو توڑ ڈالا اور سختی سے احکامِ اسلام کی پابندی کرنے لگے۔ بنو مزینہ کے وفد میں مضبوط ہاتھ پاؤں کے ایک وجیہ جوان بھی تھے۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ اپنے قبیلے کے بہادر شہسواروں میں شمار ہوتے تھے لیکن سعادت اندوزِ ایمان ہونے کے بعد تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ دل میں ہر وقت حق کی خاطر مر مٹنے کی آرزو مچلتی رہتی تھی ۔ ان کا یہی جوشِ ایمان اور جذبۂ فدویت انہیں فتح مکّہ کے موقع پر بنو مزینہ کے دوسرے سرفروشوں کے ساتھ بارگاہِ نبوی میں لے گیا اور یوں وہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے والے ان دس ہزار قدسیوں میں شامل ہو گئے جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے کتابِ استثناء میں اس طرح پیشگوئی کی گئی تھی :۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں (آسمانی یا نورانی) شریعت اُن کے لیے تھی۔"

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مزینہ کے اس شہسوار کا جوشِ ایمان دیکھا تو آپؐ نے ان کے قبیلے کا جھنڈا انہیں مرحمت فرمایا اور وہ بڑی شان سے یہ جھنڈا لہراتے ہوئے حضورؐ کے ساتھ مکّہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ سید المرسلینؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ مزنی جاں نثار حضرت نعمانؓ بن عمرو بن مُقرّن بن عائذ تھے جو تاریخ میں نعمانؓ بن مُقرّن کے نام

سے مشہور ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق فتح مکہ کے موقع پر بنو مزینہ کے علمبردار حضرت بلال رضؓ بن حارث تھے تاہم اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت نعمان رضؓ بن مقرن غزوۂ فتح میں شریک تھے۔

(۲)

فتح مکہ کے بعد عہدِ رسالت میں جو غزوات پیش آئے۔ ان میں حضرت نعمان رضؓ بن مُقرن کی شمولیت کے بارے میں اہلِ سِیَر نے صراحت نہیں کی لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غزوۂ حُنَین اور غزوۂ تبوک میں ضرور شرکت کی ہوگی کیونکہ ان جیسے سرفروش کا ان غزوات سے پیچھے رہنے کا کوئی سبب نہ تھا حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعتہً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑک اٹھی۔ مستند روایات سے ثابت ہے کہ اس نازک موقع پر حضرت نعمان رضؓ بن مقرن مدینہ منوّرہ میں پہلے سے موجود تھے یا اپنے وطن سے مدینہ منوّرہ آگئے تھے۔ فتنۂ ارتداد کے مقابلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے جس محیّر العقول استقامت، عزم و ہمت اور غیرتِ ایمانی کا مظاہرہ کیا تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سارے عرب میں پھیلے ہوئے مرتدین کی ہولناک طاغوتی قوت کو وہ مطلق خاطر میں نہ لائے اور انہیں کسی قسم کی رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مکّہ معظمہ، مدینہ منوّرہ اور طائف کے باشندوں کے سوا عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جو کسی نہ کسی حد تک فتنۂ ردّہ سے متاثر نہ ہوا ہو لیکن سب سے زیادہ خطرہ نواحِ مدینہ کے قبائل سے تھا جو زکوٰۃ سے انکاری تھے اور مرکزِ خلافت، مدینہ منوّرہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ ان میں سے بنو اسد سمیرا میں، بنو فزارہ اور بنو غطفان مدینہ کے جنوب میں اور بنو ثعلبہ اور بنو عبس وغیرہ کا ایک بڑا حصہ ابرق میں اور دوسرا ذوالقصہ میں خیمہ زن ہوا۔ وہاں سے انہوں نے صدیق اکبر رضؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم سے نماز پڑھوا لیں لیکن زکوٰۃ معاف کر دیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اس بارے میں اکابر صحابہ رضؓ سے مشورہ کیا تو خطرات کے سیاہ بادل سر پر منڈلاتے دیکھ کر سب نے نرمی کا مشورہ دیا لیکن صدیق اکبر رضؓ خطرات کے اس بحرِ متلاطم میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے ہوگئے

اور فرمایا:

"وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، دین کمال کو پہنچ گیا، کیا میری زندگی میں اس کی قطع و برید کی جائے گی۔ خدا کی قسم منکرین زکوٰۃ مجھے رسی کا ایک ٹکڑا دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیا کرتے تھے تو میں ان کے خلاف جہاد کروں گا۔"

مرتدین کے ایلچی یہ جواب سن کر واپس چلے گئے اور صدیق اکبرؓ ہمہ تن مدینہ منورہ کے حفاظتی انتظامات میں مشغول ہو گئے۔ مدینہ منورہ میں مقیم تمام صحابۂ کرامؓ نے ان کا دل و جان سے ساتھ دیا ان میں حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی شامل تھے۔ قاصدوں کی واپسی کے تیسرے دن مرتدین نے مدینہ منورہ پر حملہ کیا۔ جب وہ شہر کے ناکوں پر پہنچے تو محافظ ہوشیار تھے۔ انہوں نے حملہ روک کر خلیفۂ رسولؐ کے پاس اطلاع بھیجی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہلا بھیجا کہ تم دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو میں ابھی تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اہل مدینہ کی جمعیت ساتھ لی اور اس کے میمنے اور میسرے پر آزمودہ کار افسر مقرر کیے۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ صدیق اکبرؓ نے حضرت نعمانؓ بن مقرن کو میمنہ کا افسر بنایا۔ حق کے یہ جانباز سپاہی صدیق اکبرؓ کی قیادت میں دشمن پر برق خاطف بن کر گرے اور اس کو "ذی حسیٰ" کے مقام تک بھگا کر واپس آئے۔ ان بھگوڑوں نے ذوالقصہ میں مقیم اپنے ساتھیوں سے مدد طلب کی وہ فوراً ان کی مدد کے لیے پہنچ گئے اور ذی حسیٰ میں ان کا ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی روز دوسرے حملے کی تیاری کی اور راتوں رات کوچ کر کے علی الصباح مرتدوں کے لشکر پر جا پڑے۔ مرتدین تاب مقاومت نہ لاسکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ذوالقصہ تک ان کا تعاقب کیا اور پھر وہاں حضرت نعمانؓ بن مقرن کو کچھ فوج کے ساتھ متعین کر کے مدینہ واپس آ گئے۔ اسی اثناء میں حضرت اسامہؓ بن زیدؓ سرحد شام کی مہم سے فارغ ہو کر اپنے جیش کے ساتھ مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں مدینہ منورہ کی حفاظت پر مامور فرمایا اور خود ایک لشکر مرتب کر کے منکرین زکوٰۃ

کے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت نعمانؓ بن مقرنؓ بھی اپنے دستۂ فوج کے ساتھ ان کے ہمرکاب ہو گئے۔ ربذہ کے قریب ابرق نامی مقام پر دشمن کا سامنا ہوا تو اہلِ ایمان نے آناً فاناً اس کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے۔ اب حضرت ابوبکر صدیقؓ دوسرے مرتد باغیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک سال کے اندر اندر انہیں کچل کر تمام عرب میں امن و امان قائم کر دیا۔

(۳)

فتنۂ ردّہ کے فرو ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو عراقِ عرب کی مہم پر روانہ کیا تو حضرت نعمانؓ بن مقرنؓ بھی ان کے لشکر میں شریک ہو گئے۔ محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب "عمر فاروق اعظمؓ" میں لکھا ہے کہ "حضرت نعمانؓ بن مقرن عراق کی تمام معرکہ آرائیوں میں حضرت خالدؓ بن ولید کے پہلو بہ پہلو دادِ شجاعت دیتے رہے اور حضرت خالدؓ کی طرح فتح و نصرت ان کی رکاب میں بھی چلتی رہی۔ اس کے بعد جب حضرت سعدؓ بن ابی وقاص عراقی فوج کے سپہ سالار مقرر کیے گئے تو نعمانؓ ان کے ساتھ بھی اسلامی لشکر کے ہراول میں رہے۔"

علامہ شبلیؒ نے "الفاروق" میں بیان کیا ہے کہ "حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے قادسیہ میں پڑاؤ ڈالا تو وہاں سے حضرت عمر فاروقؓ کو اطلاع بھیجی کہ یزدجرد شاہِ ایران نے رستم بن فرخ زاد کو ایرانی لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا ہے اور وہ مدائن سے چل کر ساباط میں ٹھہرا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سعدؓ کو حکم بھیجا کہ لڑائی سے پہلے کچھ لوگ سفیر بن کر جائیں اور ایرانیوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ حضرت سعدؓ نے سردارانِ قبائل میں سے چودہ نامور اشخاص منتخب کیے جو مختلف صفتوں کے لحاظ سے تمام عرب میں انتخاب تھے۔ ان میں حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی شامل تھے جو عقل و تدبیر اور حزم و سیاست میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ حضرت سعدؓ نے انہیں ہی اس سفارت کا قائد بنایا۔ یہ سفارت رستم کے پاس گئی یا یزدجرد کے پاس، اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں لیکن اکثر مؤرخین کے نزدیک یہ سفارت یزدجرد کے پاس مدائن

گئی تھی۔ قادسیہ سے مدائن تک تیس چالیس میل کی مسافت تھی۔ اسلام کے یہ سفیر گھوڑے اڑاتے ہوئے مدائن پہنچے تو ان کی وضع قطع دیکھ کر اہلِ مدائن پر حیرت طاری ہو گئی۔ سُتے ہوئے چہرے، کندھوں پر یمنی چادریں، پاؤں میں موزے، ہاتھوں میں کوڑے اور رانوں کے نیچے دبلے پتلے عربی گھوڑے جو بار بار زمین پر ٹاپیں مارتے تھے۔ یزدجرد نے اس وفد سے ملاقات کے لیے بڑے سر و سامان سے دربار سجایا۔ اہلِ وفد اپنی سادہ وضع میں بے باکانہ شاہی دربار میں داخل ہوئے۔ یزدجرد نے بڑے متکبرانہ لہجے میں ان سے پوچھا، تم اس ملک میں کیوں آئے ہو؟ کیا یہ جرأت تمہیں اس لیے ہوئی ہے کہ ہم آپس کے جھگڑوں میں مصروف ہیں؟

قائدِ وفد حضرت نعمانؓ بن مقرنؓ جواب دینے کے لیے آگے بڑھے اور نہایت بلیغ انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپؐ کی تعلیمات کا ذکر کر کے کسریٰ کو اسلام کی دعوت دی۔ اس کے بعد فرمایا، "اگر تم یہ دعوت قبول کر لو تو ہمارے بھائی ہو اور ہمارا تمہارے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں۔ اگر اس دعوت سے انکار ہے تو جزیہ دینا قبول کرو اور اگر اس سے بھی انکار ہے تو پھر ہمارے تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔"

حضرت نعمانؓ کی تقریر سن کر یزدجرد بھڑک اٹھا اور اس نے کہا:

"تم بھول گئے ہو کہ دنیا میں تم سے زیادہ بدبخت، ذلیل اور خستہ حال کوئی قوم نہ تھی۔ جب کبھی تم سرکشی کرتے تھے تو ہم سرحدی بستیوں کے رئیسوں کو حکم بھیج دیتے تھے اور وہ تمہارے کس بل نکال دیتے تھے۔ اگر تم قحط سالی اور افلاس کی وجہ سے یہاں آنے پر مجبور ہوئے ہو تو ہم خشک سالی دور ہونے تک تمہارے کھانے پینے کا انتظام کیے دیتے ہیں۔ ہم تمہارے سرداروں کی عزت کریں گے، تمہیں کپڑے پہنائیں گے۔ اور تم پر ایسا شخص حاکم مقرر کریں گے جو تمہارے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔"

سفارت میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ثقفی بھی شامل تھے۔ یزدجرد کی باتیں سن کر ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور کہا:

"اے بادشاہ یہ لوگ (اہلِ وفد) عرب کے شرفاء ہیں اور اپنے حلم و وقار کی وجہ سے بسیار گوئی سے اجتناب کرتے ہیں۔ انہوں نے کچھ باتیں نہیں کہی ہیں میں ان کو بیان کرتا ہوں، جو کچھ تم نے ہماری بابت کہا وہ سچ ہے ہم ایسے ہی تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک پیغمبر بھیجا جو حسب و نسب میں ہم سے ممتاز تھا اس نے ہمیں حکم دیا کہ دینِ اسلام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کرو جو لوگ اسے قبول کریں ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں جو اسلام قبول نہ کریں لیکن جزیہ پر راضی ہو جائیں وہ اسلام کی حفاظت میں ہوں گے اور جو دونوں باتیں قبول نہ کریں ان کے لیے تلوار ہے۔"

حضرت مغیرہؓ کی تقریر سُن کر یزدجرد غصہ سے بے تاب ہو گیا اور کہا، "اگر قاصدوں کا قتل خلافِ اصول نہ ہوتا تو میں تمہارے سر قلم کرا دیتا۔ جاؤ تمہارے لیے میرے پاس مٹی اور ڈھول کے سوا کچھ نہیں ——" پھر اس نے مٹی کا ایک ٹوکرا منگوایا اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ ان میں جو سب سے زیادہ معزز ہو یہ ٹوکرا اس کے سر پر رکھ دو اور ان سب کو یہاں سے چلتا کرو۔ ساتھ ہی اس نے ارکانِ وفد سے کہا:

"جاؤ اور اپنے سردار سے کہہ دو کہ میں تمہاری سرکوبی کے لیے رستم کو بھیج رہا ہوں وہ تم سب کو قادسیہ کی خندق میں دفن کر دے گا۔"

ارکینِ وفد یزدجرد کی دھمکی سے بالکل مرعوب نہ ہوئے البتہ حضرت عاصمؓ بن عمرو نے آگے بڑھ کر مٹی کا ٹوکرا خوشی خوشی اپنے سر پر رکھ لیا، پھر سب ارکینِ وفد گھوڑے اڑاتے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے پاس قادسیہ پہنچ گئے اور انہیں مبارک دی کہ دشمن نے خود اپنی زمین ہم کو دے دی۔

ادھر رستم کی فوجیں ساباط سے بڑھ کر قادسیہ میں اسلامی لشکر کے سامنے خیمہ زن ہوئیں۔ رستم کی خواہش پر حضرت سعدؓ نے اس سے گفت و شنید کے لیے دو تین سفارتیں بھیجیں لیکن صلح و آشتی کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ آخری سفارت کی واپسی کے تیسرے دن دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئیں اور پھر

تین دن اور ایک رات وہ گھمسان کا رن پڑا کہ الاماں والحفیظ۔ حضرت نعمانؓ بن مقرن اس ہولناک لڑائی میں شروع سے آخیر تک سرکف ہو کر لڑے اور اپنی بے خوفی اور شجاعت کی دھاک بٹھادی۔ بالآخر مسلمانوں کی قوتِ ایمانی نے ایرانیوں کی مہیب طاغوتی قوت کو کمر شکن شکست دی۔ رستم سمیت ان کے ہزارہا جنگجو میدانِ جنگ میں کھیت رہے اور تختِ کسریٰ کی بنیادیں ہل گئیں۔ قادسیہ کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ نے آگے بڑھ کر ایران کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ کر لیا اور پھر جلولاء اور حلوان کی تسخیر کے ساتھ عراق عرب کی فتوحات اپنے اختتام تک پہنچ گئیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے سنہ ۱۶ھ میں کوفہ آباد کیا تو حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی ان کے ساتھ کوفہ چلے گئے۔

(۴)

سنہ ۱۷ ہجری میں بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے خوزستان[1] پر لشکر کشی کی اور اہواز، مناذر، سوس اور رامہرمز کو مسخر کرتے ہوئے شوستر (تستر) کی طرف بڑھے جو خوزستان کا صدر مقام تھا حضرت ابو موسیٰؓ کو اطلاع ملی کہ ایرانیوں کے ایک بہت بڑے لشکر نے شوستر میں زبردست جنگی تیاریاں کر رکھی ہیں اور ان کی قیادت ایران کا ایک نامور سردار ہرمزان کر رہا ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس کچھ زیادہ جمعیت نہیں تھی اس لیے انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں خط بھیج کر مدد کی درخواست کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ خط ملتے ہی والیٔ کوفہ کے نام حکم بھیجا کہ نعمانؓ بن مقرن کو ایک ہزار مجاہدین کے ساتھ ابو موسیٰؓ کی مدد کے لیے بھیجیں۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق حضرت نعمانؓ بن مقرن ایک ہزار سواروں کے ساتھ حضرت ابو موسیٰؓ کے پاس پہنچ گئے اور شوستر

---

[1] خوزستان کا علاقہ عراق اور فارس کے درمیان واقع ہے۔ اس میں اہواز، مناذر، سوس، رامہرمز، ایذج اور شوستر بڑے بڑے شہر تھے۔ خوزستان پر فوج کشی کی محرک اہواز کے ایرانی حاکم کی بغاوت تھی اس نے اپنا عہد توڑ کر مسلمانوں کو مقررہ سالانہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

کی تسخیر میں ان کے پہلو بہ پہلو حصہ لیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ خوزستان کے شہر رامہرمز اور ایذج حضرت نعمانؓ بن مقرّن کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔

خوزستان پر مسلمانوں کے استیلا نے ایرانیوں کو سخت مشتعل کر دیا۔ یزدجرد نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے تمام وسائل بروئے کار لا کر عربوں کو اپنے ملک سے نکال دے گا۔ چنانچہ اس نے تمام صوبوں میں قاصد دوڑا دیئے اور وہاں کے گورنروں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی فوجیں اہلِ عرب کے مقابلہ کے لیے روانہ کریں۔ اس طرح طبرستان، جرجان، نہاوند، رے، اصفہان، ہمدان اور خراسان وغیرہ تمام صوبوں میں تلاطم برپا ہو گیا اور ڈیڑھ لاکھ ایرانی جنگجو قم میں آ کر جمع ہوئے۔ یزدجرد نے ایک آزمودہ کار ایرانی جرنیل فیروزان (بروایتِ دیگر مردان شاہ پسر ہرمز) کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ وہ بڑے کرّ و فر اور ساز و سامان کے ساتھ نہاوند پہنچا جو عراقِ عجم کا ایک بہت بڑا شہر تھا اور حلوان سے نوّے میل جانب شرق اور ہمدان سے تیس میل جانب غرب کوہِ الوند کے دامن میں واقع تھا۔ دفاعی لحاظ سے یہ شہر اپنی مثال آپ تھا۔ شہر کے اردگرد ایک مضبوط فصیل تھی اور وسطِ شہر میں ایک مستحکم قلعہ تھا جس کی بلند اور مضبوط فصیلیں شہر کی حفاظت کی ضامن تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کو ایرانیوں کے اس ٹڈی دل کے اجتماع کی خبر ملی تو انہوں نے مدینہ منوّرہ میں موجود تمام اکابر صحابہؓ کو جمع کیا اور تمام صورتِ حال ان کے سامنے بیان کر کے مشورہ طلب کیا۔ تمام اصحاب نے اپنی اپنی رائے دی ان میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ کوفہ، بصرہ، شام اور یمن وغیرہ کے گورنر اپنی اپنی فوجیں لے کر نہاوند پہنچ جائیں اور خود امیر المومنین مدینہ سے فوج لے کر روانہ ہوں لیکن حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے سب کے برعکس یہ رائے دی کہ نہ امیر المومنین مدینہ سے ہلیں اور نہ گورنر اپنی تمام فوجیں روانہ کریں بلکہ ان کا صرف ایک ایک ثلث روانہ کریں۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ اسلامی لشکر کا سپہ سالار کون ہو۔ لوگ ہر طرف خیال دوڑاتے تھے لیکن یہ فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ ایسی بڑی مہم کی قیادت کون کر سکتا ہے، جو اصحاب اس کے اہل تھے وہ دوسری اہم مہمات پر مامور

تھے۔ بالآخر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا:

"بخدا میں کل ایک ایسے شخص کو اس مہم کا سپہ سالار مقرر کروں گا جو دشمنوں کے نیزوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔" (الاخبار الطوال، ابو حنیفہ دینوری)

دوسرے دن حضرت عمر فاروقؓ نے اعلان کیا کہ میں نے نعمانؓ بن مُقرّن کو اس مہم کا قائد منتخب کیا ہے۔ سب لوگوں نے ان کی تائید کی اور کہا کہ یہ بالکل صحیح انتخاب ہے۔ بقول محمد حسین ہیکل عامۃ المسلمین کی یہ تائید اس بنا پر تھی کہ وہ نعمانؓ کو ایک ایسے بے جگرے شہسوار کی حیثیت سے جانتے تھے جو پس و پیش اور فرار کے نام سے ناآشنا محض تھا۔ وہ جنگ میں بڑے استقلال و تحمل سے کام لیتے تھے اور جب تک اچھی طرح موقع و محل نہ دیکھ لیتے تھے، جلد بازی کو مصلحتِ جنگ کے خلاف سمجھتے تھے۔ (عمر فاروق اعظمؓ)

جس وقت مدینہ منورہ میں یہ کارروائی ہو رہی تھی، حضرت نعمانؓ بن مقرن کہاں تھے۔ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ خوزستان میں کئی اہم فتوحات حاصل کر کے دم لے رہے تھے اور حلوان میں مقیم تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے انہیں کسکر کا عاملِ خراج مقرر کیا تھا اور وہ اس وقت اسی حیثیت میں کام کر رہے تھے لیکن یہ کام ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔ طبری کا بیان کہ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو ایک شکایتی خط لکھا کہ "میری اور اس منصب کی مثال ایسی ہے جیسی ایک نوجوان کے پہلو میں کوئی فاحشہ عورت ہو، میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے اس کام سے سبکدوش کر کے مسلمانوں کے کسی لشکر میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے بھیج دیں"۔ — اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کو خط لکھا کہ "نعمان نے مجھے لکھا ہے کہ تم نے اسے تحصیلِ خراج کا کام سونپا ہے جو اسے ناپسند ہے۔ اس کے دل میں جہاد کی تڑپ ہے لہٰذا تم اسے وقت کی سب سے اہم مہم نہاوند کا سپہ سالار بنا کر بھیجو۔"

لیکن خورشید احمد فارق نے اپنی کتاب "حضرت عمر فاروقؓ کے سرکاری خطوط" میں سیف بن عمر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت نعمانؓ خوزستان کی مہم پر جانے

سے پہلے کسکر کے محصل لگان تھے۔ وہاں سے وہ خوزستان کے جہاد پر گئے اور ابھی وہاں مقیم تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے انہیں نہاوند کی مہم کا سپہ سالار مقرر کیا۔

تیسری روایت یہ ہے کہ حضرت نعمانؓ اس وقت کوفہ میں مقیم تھے۔ بہرصورت حضرت عمر فاروقؓ نے ایک طرف تو کوفہ اور بصرہ کے گورنروں کو خط لکھے کہ آدھی آدھی فوج نعمان کی قیادت میں دے دو اور دوسری طرف حضرت نعمانؓ کو یہ مراسلہ بھیجا:۔

"اہل کوفہ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اہل فارس کا ایک بہت بڑا لشکر اسلام کا نورِ ہدایت بجھانے کے لیے نہاوند میں جمع ہوا ہے۔ مجھے اللہ کے فضل سے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کو فتح یاب کرے گا۔ میں نے اہل کفر و ضلالت کے لیے ایک لشکر بھیجنے کا ارادہ کیا ہے اور تمہیں اس لشکر کا سالار مقرر کرتا ہوں۔ یہ خط ملتے ہی جہاد پر جانے کے خواہشمند مسلمانوں کو ساتھ لے کر مدائن کا رُخ کرو اور وہاں قصرِ ابیض کے قریب پڑاؤ ڈالو تاکہ بصرہ اور کوفہ کی فوجیں تمہارے پاس پہنچ جائیں۔ جب سارا لشکر یکجا ہو جائے تو تم اللہ کی مدد اور نصرت پر بھروسہ کر کے نہاوند کی طرف چل پڑنا اور وہاں پہنچ کر جنگی کارروائی کا آغاز کر دینا۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ اللہ تمہاری مدد کرے گا اور دشمن کو ہزیمت ہو گی ــــ جب دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو تو تم پامردی سے ڈٹے رہنا اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا۔

(ابنِ اعثم کوفی و ناسخ التواریخ)

علامہ شبلیؒ نے "الفاروق" میں لکھا ہے کہ حضرت نعمانؓ بن مقرن تیس ہزار کی جمعیت لے کر کوفہ سے روانہ ہوئے لیکن ابنِ جریر طبری کے بیان کے مطابق حضرت نعمانؓ نے اہواز (خوزستان) سے نہاوند کی جانب پیشقدمی کی تھی اور کوفہ کی فوج ان سے ماہ یا طرز کے مقام پر آکر ملی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت نعمانؓ کو یہ بھی لکھا تھا کہ اگر ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو سالارِ اعلیٰ حذیفہؓ بن الیمان ہوں گے اور اگر حذیفہؓ قتل ہوں تو نعیمؓ بن مقرن ان کی جگہ لیں گے۔ (بلاذری نے نعیم بن مقرن

کے بجائے حضرت جریرؓ بن عبداللہ البجلی کا نام لکھا ہے)

حضرت نعمانؓ کی فوج میں عرب کے تین نامور بہادر عمرو بن معدیکرب، طُلَیحہ بن خویلد اسدی اور عمرو بن سلمی بھی شامل تھے۔ چونکہ ایک دفعہ یہ لوگ فتنۂ رِدّہ سے متاثر ہو گئے تھے اس لیے ان کے بارے میں حضرت عمرؓ نے بدیں الفاظ خاص ہدایات بھیجیں:

"تمہارے لشکر میں ایسے لوگ ہیں جو عہدِ جاہلیت میں بڑے دلاور اور مقتدر تھے۔ انہیں ایسے لوگوں پر ترجیح دو جو ان جیسی عسکری سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ ان سے مشورہ کرو اور ان کے مشورے پر عمل کرو۔ طلیحہ، عمرو بن معدیکرب اور عمرو بن سلمی سے جنگی امور میں ضرور صلاح لو لیکن انہیں کوئی عہدہ نہ دو۔" (طبری)

⑤

حضرت نعمانؓ بن مقرن اپنے مستقر سے منزل بہ منزل چلتے ہوئے کسی مزاحمت کے بغیر اسپدہان کے مقام پر پہنچ گئے جو نہاوند سے نو میل کے فاصلے پر واقع تھا[۱]۔ حضرت نعمانؓ نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس وقت ان کی کل فوج مل ملاکر تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس میں متعدد جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، حضرت جریر بن عبداللہ بجلی، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی وغیرہ۔

فیروزان کو بھی مسلمانوں کی پیشقدمی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ قادسیہ کی لڑائی میں موجود تھا اور مسلمانوں کی جرأت و شجاعت کا عینی شاہد تھا۔ لڑائی شروع کرنے سے پہلے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ مسلمانوں سے بات چیت کر لی جائے۔ چنانچہ اس نے اسلامی لشکر کو پیغام بھیجا کہ اپنا کوئی آدمی سفیر بنا کر بھیجو۔ حضرت نعمانؓ نے یہ خدمت حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے سپرد کی۔ حضرت مغیرہؓ فیروزان کے پاس پہنچے تو وہ طلائی تخت

---

[۱] ابوحنیفہ دینوری نے "اخبار الطوال" میں اس مقام کا نام "اسفیذبان" لکھا ہے جو اس کے بقول قُدیسجان نام کے ایک گاؤں کے قریب اور شہر نہاوند سے تین فرسخ کے فاصلے پر تھا۔

پر بڑے جاہ و جلال سے بیٹھا تھا اور اس کے دائیں بائیں بڑے بڑے امراء و رؤساء زرق برق لباس پہنے بیٹھے تھے۔ ہزاروں زرہ پوش پہرے دار ہاتھوں میں برچھیاں تیر کمان اور ننگی تلواریں پکڑے دور تک پرے جمائے کھڑے تھے۔ حضرت مغیرہؓ بے باکانہ فیروزان کے سامنے بیٹھ گئے۔ ان دونوں میں مترجم کے ذریعے جو گفتگو ہوئی وہ مدائن میں یزدجرد اور اسلامی وفد کی بات چیت سے ملتی جلتی تھی۔ آخر میں فیروزان نے کہا:

"یہ قدر انداز جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو ابھی تمہارا فیصلہ کر دیتے لیکن میں نہیں چاہتا کہ ان کے تیر تمہارے ناپاک خون میں آلودہ ہوں، اب بھی تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ تو میں تم سے درگزر کر سکتا ہوں۔"

حضرت مغیرہؓ نے فیروزان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"بلا شبہ زمانۂ جاہلیت میں ہم سے زیادہ بدبخت اور کوئی قوم نہ تھی لیکن جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں مبعوث ہوئے، اللہ تعالیٰ برابر ہمیں فتح و نصرت سے نواز رہا ہے۔ واللہ ہم اپنی پچھلی بدبختی کی طرف کبھی واپس نہ ہوں گے اب تو ہم تمہارے ملک پر قبضہ کر کے رہیں گے یا اس کو اپنی لاشوں سے پاٹ دیں گے۔"

غرض سفارت بے حاصل رہی اور فریقین لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ ایرانیوں نے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے قلعہ بند ہو کر لڑنا مناسب سمجھا۔ انہوں نے فصیلِ شہر کے چاروں طرف لوہے کے گوکھرو بچھا دیئے اور ان میں سے صرف دو تین راستے خالی رکھے تاکہ جس وقت حملے کے لیے نکلنا چاہیں، نکل سکیں۔ مسلمانوں کے گھوڑے ان گوکھروں کو پار نہ کر سکتے تھے اور ایرانی جب بھی موقع پاتے، شہر سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے۔ اس طرح لڑائی طول کھینچنے لگی تو حضرت نعمانؓ بہت فکرمند ہوئے۔ انہوں نے اہل الرائے اصحاب کو جمع کیا اور ان سے الگ الگ رائے لی۔ طلیحہ بن خویلد اسدی کی رائے یہ تھی کہ ایک دستۂ فوج کے سوا باقی سب لشکر شہر سے چھ سات میل دور چلا جائے۔ جو دستہ فوج پیچھے رہے وہ شہر پر حملہ آور ہو اور اس قدر تیر برسائے کہ ایرانی مشتعل ہو کر شہر سے باہر نکل آئیں۔ پھر یہ دستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دے۔ ایرانی بڑے اسلامی لشکر کو اپنے

سامنے والے مختصر سے دستۂ فوج کا ضرور تعاقب کریں گے۔ جب وہ ہماری زد میں آجائیں گے تو پھر وہ ہم سے اور ہم ان سے نبٹ لیں گے، اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق ان کے اور ہمارے درمیان فیصلہ کر دے گا۔

حضرت نعمانؓ کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور دوسرے اصحاب نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ دوسرے دن حضرت نعمانؓ ایک دستۂ فوج حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی کی قیادت میں پیچھے چھوڑ کر سارے لشکر کو چھ سات میل پیچھے لے گئے۔ حضرت قعقاعؓ نے حسب تجویز شہر پر حملہ کیا اور ایرانیوں کو اس قدر اشتعال دلایا کہ وہ غضبناک ہو کر شہر سے باہر نکلے اور مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ حضرت قعقاعؓ نے اپنے دستے کے ساتھ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ پُرجوش ایرانیوں نے ان کو تباہ کرنے کا تہیہ کر لیا اور ان کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ بڑے اسلامی لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے ایرانیوں پر حملہ کرنا چاہا لیکن حضرت نعمانؓ نے انہیں روک دیا اور فرمایا کہ ہم دن ڈھلنے سے پہلے ان پر حملہ نہیں کریں گے۔ اُدھر ایرانی تیروں کی بارش کر رہے تھے جس سے مسلمان زخمی ہو رہے تھے اور حملہ کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ حضرت نعمانؓ لڑائی چھیڑنے میں محض اس وجہ سے دیر کر رہے تھے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم دشمن پر ہمیشہ سورج ڈھلنے کے وقت حملہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب سورج ڈھلنے کو ہوا نعمانؓ اپنے ترکی گھوڑے پر سوار ہوئے سر پر سفید ٹوپی رکھی اور تمام صفوں میں گھوم پھر کر مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی اور جوش دلایا۔ پھر دستور کے مطابق تین تکبیریں کہیں۔ پہلی تکبیر پر مسلمانوں نے اپنی صفیں درست کر لیں۔ دوسری پر تلواریں سونت لیں اور نیزے تان لیے تیسری پر دشمن پر اس بے جگری سے حملہ کیا کہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ میدان میں اس قدر خون بہا کہ گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ حضرت نعمانؓ زخم پر زخم کھاتے دشمن کے قلب لشکر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ان کا گھوڑا پھسل کر گرا اور وہ بھی زمین پر آرہے۔ ان کے بھائی نعیمؓ بن مقرن قریب ہی تھے انہوں نے جھپٹ کر نعمانؓ کے ہاتھ سے علم تھام لیا اور ان کی سفید ٹوپی اپنے سر پر رکھ کر لڑائی جاری رکھی۔ ایک روایت میں ہے کہ نعیمؓ نے علم حضرت

حذیفہؓ بن الیمان کے ہاتھ میں دے دیا اور خود دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ حضرت نعمانؓ نے گرتے وقت اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا تھا کہ میں مر بھی جاؤں تو کوئی میری طرف متوجہ نہ ہو۔ مجاہدین نے ان کی وصیت پر عمل کیا اور پوری شدت سے لڑائی جاری رکھی یہاں تک کہ ایرانیوں کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ایک مجاہد حضرت نعمانؓ کے سرہانے گیا۔ انہوں نے نزع کے عالم میں پوچھا، لڑائی کا کیا انجام ہوا؟ اس نے کہا، اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ فرمایا اللہ کا شکر ہے، امیرالمومنین کو فوراً اپنی فتح کی اطلاع دو۔ یہ کہہ کر اسلام کے اس بطلِ جلیل نے آخری ہچکی لی اور تاجِ شہادت پہن کر خلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ اس طرح ان کی وہ دعا قبول ہو گئی جو انہوں نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے مانگی تھی کہ الٰہی مجھے رتبۂ شہادت پر سرفراز فرمائیو۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے مژدۂ فتح کے ساتھ حضرت نعمانؓ کی شہادت کی خبر حضرت عمر فاروقؓ کو بھیجی تو وہ بے اختیار رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔ "معرکۂ نہاوند" کو ایران کی اہم ترین لڑائیوں میں شمار کیا جاتا ہے! اس لڑائی نے ایرانیوں کی قسمت پر مہر لگا دی اور پھر کبھی وہ اتنا کثیر لشکر مسلمانوں کے مقابلے میں نہ لا سکے۔ اسی لیے عربوں نے اس لڑائی کا نام فتح الفتوح رکھا —— نہاوند کی تسخیر کے بعد ایران کے باقی تمام صوبے بھی دو سال کے اندر اندر مسخر ہو گئے اور سارے ایران پر مسلمانوں کا پرچم اقبال لہرانے لگا

حضرت نعمانؓ بن مقرن نے اپنی شجاعت و بسالت اور راہِ حق میں سرفروشی کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے وہ ابدالآباد تک ان کا نام قائم و دائم رکھیں گے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت کُرزؓ بن جابر فہری

①

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے محبوب وطن کو چھوڑ کر تین سو میل دور مدینہ منورہ تشریف لے گئے لیکن قریشِ مکہ کا دل اس سے بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ اہلِ حق کو مدینہ منورہ میں عافیت سے زندگی گزارتے دیکھ کر ان کی چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا تھا اور وہ ان کو ستانے کا کوئی نہ کوئی موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔
ربیع الاوّل سنہ ۲ ہجری میں مشرکینِ مکہ کے ایک جتھے نے اہلِ مدینہ کے مویشیوں پر چھاپہ مارا جو شہر سے تین میل دور کوہ جماء کے قریب چر رہے تھے ان لوگوں نے بہت سے اونٹ گلہ بانوں سے چھین لیے اور انہیں ہانک کر مکہ کا رُخ کیا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مدینہ کا حاکم بنایا اور خود ستر جاں نثاروں کے ہمراہ ان لٹیروں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ آپؐ وادی سفوان تک تشریف لے گئے لیکن مکی لٹیروں کو سامنے آنے کا حوصلہ نہ پڑا اور وہ نہایت تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے مکہ کی حدود میں پہنچ گئے۔ حضورؐ نے وادی سفوان سے آگے جانا مناسب نہ سمجھا، اور وہیں سے مدینہ منورہ کو مراجعت فرمائی۔

اہلِ سِیَر نے حضورؐ کی اس مہم کو غزوۂ بدر اولیٰ یا غزوۂ سفوان کا نام دیا ہے۔ قریشی لٹیرے اہلِ مدینہ کے مویشی تو لوٹ کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے لیکن خدا کی قدرت مکہ پہنچ کر ان لٹیروں کے سردار کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ اس کے دل میں دفعتہً شمعِ ایمان روشن ہو گئی اور اس کا ضمیر اس ڈاکہ زنی پر اس کو بار بار

ملامت کرنے لگا۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک دن وہ یکایک مکہ سے عازمِ مدینہ ہو گیا اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر سعادت اندوزِ اسلام ہو گیا۔ یہ قریشی سردار جن کو ایک قبیح حرکت کے بعد توبہ اور شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہونے کی توفیق نصیب ہوئی، حضرت کُرزؓ بن جابر الفہری تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔

کرزؓ بن جابر بن حسیل بن لاحب بن حبیب بن عمرو بن شیبان بن محارب بن فہر بن مالک بن نضر (قریش) بن کنانہ۔

حضرت کرزؓ کا سلسلۂ نسب آٹھویں پشت میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔ قبولِ اسلام کے بعد حضرت کرزؓ نے مدینہ منورہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اب وہ راہِ حق کے ایک جانباز مجاہد اور سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مخلص فدائی تھے۔

(۲)

سنہ ۶ ہجری (باختلافِ روایت شوال، جمادی الاول، جمادی الاخریٰ یا ذی الحجہ) میں بنو قضاعہ کی ایک شاخ بنو عُکل اور بنو بجیلہ کی ایک شاخ بنو عُرینہ کے آٹھ آدمی مدینہ منورہ آئے اور اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ یہاں کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی اور وہ بیمار ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ اپنے وطن ہی سے بیمار آئے تھے۔ ان کو کونسی بیماری لاحق ہوئی؟ اس کے بارے میں بھی مؤرخین میں اختلاف ہے۔ کسی نے لکھا ہے کہ ان کو طحال (تلی بڑھنے) کا عارضہ ہوا اور ان کے پیٹ پھول گئے۔ بعض کا بیان ہے کہ وہ استسقاء کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ حضورؐ کو ان کی بیماری کا علم ہوا تو آپؐ نے انہیں قباء کے قریب ایک مقام ذی الجدر (ذی الجدد) جانے کی ہدایت فرمائی۔ وہاں آپؐ کے اونٹ چرا کرتے تھے اور ان لوگوں کو وہاں بھیجنے سے حضورؐ کا مقصد یہ تھا کہ

ایک تو ان کی آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی اور دوسرے وہ اونٹنیوں کا دودھ پی کر توانا ہو جائیں گے۔ یہ لوگ وہاں پہنچے تو اونٹوں کے نگران حضرت یسار نوبی رضؓ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ یسارؓ نوبہ کے رہنے والے تھے اور قبول اسلام کے بعد انہوں نے حضورؐ کی غلامی اختیار کر لی تھی۔ وہ نماز کے تمام ارکان کو نہایت حسن وخوبی سے ادا کیا کرتے تھے۔ ایک دن حضورؐ نے انہیں نماز پڑھتے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور انہیں غلامی سے آزاد فرما کر اپنے مویشیوں کا نگران بنا دیا۔ آقائے دو جہاںؐ کے فیضِ صحبت نے حضرت یسارؓ کو ایک مثالی مردِ مومن بنا دیا تھا۔ انہوں نے نومسلم بدویوں کی بڑی خاطر مدارات کی اور انہیں خوب خوب دودھ پلایا یہاں تک کہ چند دنوں کے اندر اندر وہ خوب تندرست و توانا ہو گئے۔ یہ لوگ نہایت بدفطرت اور کمینے تھے۔ تندرست ہونے کے بعد وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اسلام ہی سے برگشتہ ہو گئے اور حضورؐ کے پندرہ اونٹ لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حضرت یسارؓ نے انہیں روکا تو بدبختوں نے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ ان کو پکڑ کر بڑی بے رحمی سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر ان کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھو دیئے۔ اس صدمہ سے حضرت یسارؓ شہید ہو گئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی شقاوت کی خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت کرزؓ بن جابر کو بیس سوار دے کر ان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اس اثناء میں وہ لوگ بہت دور نکل گئے تھے تاہم حضرت کرزؓ نے بھی ان کا کھوج لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ اپنے اندازہ سے گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک عورت ملی اس نے اونٹ کا شانہ اٹھا رکھا تھا۔ حضرت کرزؓ نے اسے روک کر پوچھا، تو نے یہ شانہ کہاں سے لیا۔ اس نے کہا میں ادھر آ رہی تھی کہ راستے میں مجھے چند آدمی ملے جو ایک اونٹ ذبح کر کے بیٹھے تھے۔ یہ شانہ انہوں نے ہی مجھے دیا ہے۔ شاید یہاں سے اگلی منزل پر یہ لوگ اب بھی موجود ہوں۔

حضرت کرزؓ اور ان کے ساتھی برق رفتاری سے عورت کی بتلائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے ۔ وہ آٹھوں غدار وہاں موجود تھے ۔ حضرت کرزؓ نے ان کی مشکیں باندھ لیں اور ان کو باقی چودہ اونٹوں سمیت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے ۔ حضورؐ اس وقت غابہ میں تشریف رکھتے تھے ۔ چونکہ ان بدبختوں نے نہایت گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا تھا اس لیے کسی رحم کے مستحق نہ تھے ۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ جس طرح ان ظالموں نے بے گناہ یسارؓ کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور اُن کی آنکھوں میں کانٹے چبھوئے اسی طرح ان کے بھی ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں اور ان کی آنکھوں میں سلائی پھیری جائے ۔ حضورؐ کے حکم کی تعمیل کی گئی اور ان کی لاشوں کو حرہ میں ڈال دیا گیا ۔

بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ۔

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا زمین پر سے نکال دیئے جائیں"

رمضان المبارک ۸ھ ہجری میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ پر پرچم اسلام بلند کرنے کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت کُرزؓ بن جابر کو بھی ان دس ہزار "قدوسیوں" میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے ۔ فوج کے جس دستے میں حضرت کرزؓ تھے اس کی قیادت حضرت خالدؓ بن ولید کر رہے تھے ۔ دوسرے تمام دستے تو کسی مزاحمت کے بغیر مکّہ معظمہ میں داخل ہو گئے لیکن بنو بکر، بنی حارث اور ہذیل وغیرہ کے کچھ جنگجوؤں نے خندمہ کے مقام پر حضرت خالدؓ بن ولید کو روکا ۔ مجبوراً انہیں بھی تلوار اٹھانی پڑی ۔ اس جھڑپ میں مشرکین کے ۲۴ یا ۲۸ آدمی مارے گئے اور مسلمانوں کی طرف سے حضرت کرزؓ بن جابر اور حضرت حبیش الاشعرؓ نے جام شہادت پیا ۔ عام مؤرخین نے یہ واقعہ اسی طریقہ سے بیان کیا ہے ۔ لیکن حافظ

ابن عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں اسے مختلف انداز سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت کرزؓ بن جابر اور حضرت جبیش الاشعرؓ[1] اتفاق سے حضرت خالدؓ بن ولید کے دستے سے بچھڑ گئے اور کسی دوسرے راستے پر جا پڑے وہاں کچھ مسلح مشرک مل گئے انہوں نے حضرت جبیشؓ کو شہید کر ڈالا۔ کرزؓ چاہتے تو بھاگ کر اپنی جان بچا سکتے تھے لیکن انہوں نے اسے جوانمردی سے بعید جانا اور جبیش کی لاش سامنے کر کے یہ رجز پڑھتے ہوئے مشرکین پر حملہ آور ہوئے۔

قد علمت صفراء من بنی فہر

نقیۃ الوجوہ نقیۃ الصدر

لاحنو بن الیوم عن ابی صخر

(بنی فہر کی زرد رنگ اور صاف چہرے اور سینے والی عورتیں جانتی ہیں کہ آج میں ابی صخر (جبیش) کی طرف سے لڑوں گا)

کرزؓ اکیلے تھے اور مشرکین بہت سے تھے۔ انہوں نے نرغہ کر کے اسلام کے اس غیور فرزند کو شہید کر ڈالا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---

[1] نام جبیش لقب اشعر اور کنیت ابوصخر تھی مشہور صحابیہ حضرت اُمّ معبد خزاعیہؓ کے بھائی تھے۔ یہ وہی اُمّ معبدؓ ہیں جن کے خیمے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت کے دوران میں کچھ دیر کے لیے قیام فرمایا تھا اور بعد میں انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے نہایت بلیغ انداز میں حضورؐ کا حلیۂ مبارک بیان کیا تھا۔

حضرت عثمانؓ بن طلحہ عبدری

①

فتح مکّہ (۲۰ر رمضان المبارک ۸ھ ہجری) کے دن چشم فلک نے ایک تحیّر خیز منظر دیکھا.
وہی مکّہ معظّمہ جس سے تقریباً آٹھ سال پیشتر سرورِ کائنات فخرِ موجودات سیّد الانام صلی اللہ علیہ وسلم صِرف دو رفیقوں (حضرت ابوبکر صدّیقؓ اور حضرت عامرؓ بن فُہیرہ) کی معیّت میں رات کی تاریکی میں رُخصت ہُوئے تھے. آج آپؐ اسی شہرِ جلال میں اس شان سے داخل ہو رہے تھے کہ دس ہزار مُسلّح جاں نثار اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الٰہ الّا اللہ کا ورد کرتے ہُوئے حضورؐ کے جلو میں تھے اور تمام جبابرۂ قریش لرزہ براندام اپنے گھروں میں دبکے ہُوئے تھے لیکن یہ کسی دنیاوی فاتح کی یلغار نہیں تھی. یہ تو سرزمینِ حرم میں رحمتِ حق کا نزول تھا. حضورؐ سیاہ عمامہ باندھے اپنی اونٹنی قصواء پر جلوہ افروز تھے. سرِ اقدس جُھکا ہُوا تھا. چشم مبارک سے آنسو رواں تھے اور زبانِ پاک پر سورۂ فتح کی آیات تھیں. جب تمام مجاہدین مکّہ معظّمہ میں داخل ہو چکے تو آپؐ نے سرِ اقدس کو بُلند فرمایا اور شکرِ خداوندی بجا لائے. کعبۃ اللہ کے دروازے پہ پہنچ کر حضورِ اقدسؐ نے نعرۂ تکبیر بُلند کیا اور بیت اللہ کا طواف کیا. پھر آپؐ نے خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہو کر اس کی تطہیر کا ارادہ ظاہر فرمایا لیکن خانۂ کعبہ کے دروازے پہ ایک بڑا قفل پڑا تھا. حضورؐ نے اپنے ہم رکاب ایک صاحب کو اشارہ فرمایا کہ اس کی کنجی لے آؤ. وہ صاحب دوڑے دوڑے گئے. اور تھوڑی دیر بعد کُنجی لا کر حضور کی خدمت میں پیش کر دی. آپؐ نے خانۂ کعبہ کا دروازہ کھولا اور کنجی لانے والے صاحب اور چند دوسرے جاں نثاروں کے ہمراہ اس کے اندر

جاکر دروازہ بند کر دیا۔ تطہیرِ کعبہ کے بعد آپؐ باہر تشریف لائے تو کُنجی لانے والے صاحب بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ حضورؐ نے اُن پر شفقت بھری نظر ڈالی، اور کُنجی اُن کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا۔" جو شخص یہ کُنجی تم سے چھینے گا وہ ظالم ہوگا۔"

یہ خوش بخت صاحب رسول جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانۂ کعبہ کی کلید برداری کا اہل اور حق دار ٹھہرایا، حضرت عثمانؓ بن طلحہ عبدری تھے۔

(۲)

حضرت عثمانؓ بن طلحہ کا تعلق قریش کی ایک معزز شاخ بنی عبدالدار سے تھا نسب نامہ یہ ہے۔

عثمانؓ بن طلحہ بن ابی طلحہ عبداللہ بن عبدالعزّیٰ بن عثمان بن عبدالدار بن قصیؓ بن کلاب بن مرّہ قصیؓ پر اِن کا نسب نامہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ سے مِل جاتا ہے۔

والدہ کا نام باختلافِ روایت سلامہ یا سلافہ تھا۔ وہ مدینہ کی رہنے والی تھیں اور اوس کے خاندان بنی عمرو عوف سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی شادی مکّہ کے رئیس طلحہ بن ابی طلحہ سے ہوئی اسی کے صلب سے حضرت عثمانؓ پیدا ہوئے۔

زمانۂ جاہلیت میں طلحہ بن ابی طلحہ خانۂ کعبہ کا کلید بردار تھا۔ اس لحاظ سے وہ اہلِ مکّہ میں بڑی عزّت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ افسوس کہ اس شخص کو قبولِ اسلام کی توفیق نصیب نہ ہوئی، جب تک جیا اپنے مشرکانہ عقائد پر سختی سے قائم رہا اور اپنی اولاد کو بھی اسلام کی طرف راغب نہ ہونے دیا۔ حضرت عثمانؓ طبعاً بڑے شریف النفس تھے۔ وہ زمانۂ جاہلیّت میں بھی اہلِ حق کے خلاف کسی کمینہ اور چھچھوری حرکت کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ۱۳ بعد بعثت میں اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ سلمہؓ کی ہجرت الی المدینہ کے موقع پر انہوں نے ایسی شرافت کا ثبوت دیا کہ تاریخ میں شاذ ہی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ ابنِ اسحاقؒ اور حافظ ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے کہ حضرت اُمِّ سلمہؓ اور اُن کے پہلے شوہر حضرت سلمہؓ دعوتِ حق کے آغاز ہی میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے تھے۔ کفّار کے مظالم سے تنگ آکر پہلے انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ کچھ عرصہ وہاں گزارنے کے بعد مکّہ واپس

آئے اور پھر حضورؐ کا ایما ء پاکر مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا قصد کیا اس وقت حضرت سلمہؓ کے پاس صرف ایک ہی اونٹ تھا۔ اس پہ انہوں نے حضرت اُمّ سلمہؓ اور اپنے ننھے بچے سلمہ کو سوار کرایا اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیادہ پا چل پڑے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ حضرت اُمِّ سلمہؓ کے خاندان بنو مغیرہ کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے اونٹ کو گھیر لیا اور حضرت ابو سلمہؓ سے کہا کہ ہماری لڑکی تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ یہ کہہ کر وہ حضرت اُمِّ سلمہؓ کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ اتنے میں حضرت ابو سلمہؓ کے خاندان کے لوگ بنو عبدالاسد آ پہنچے انہوں نے حضرت ابو سلمہؓ کے بچے سلمہ پر قبضہ کر لیا اور بنو مغیرہ سے کہا کہ اگر تم اپنی لڑکی کو ابو سلمہؓ کے ساتھ نہیں جانے دیتے تو ہم اپنے قبیلے کے بچے کو تمہارے پاس نہیں چھوڑیں گے۔ حضرت ابو سلمہؓ سے کہا، تو اکیلا جہاں جی چاہے جا سکتا ہے حضرت ابو سلمہؓ دل پر پتھر رکھ کر اکیلے ہی عازم مدینہ ہو گئے۔ حضرت اُمِّ سلمہؓ پر شوہر اور بچے کی جدائی نے قیامت ڈھا دی۔ وہ روزانہ علی الصباح گھر سے باہر نکلتیں اور ایک ٹیلے پر بیٹھ کر گریہ زاری کرتی رہتیں۔ پورا ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن بنو مغیرہ کے ایک صاحب اثر اور رحم دل آدمی نے انہیں اس حال میں دیکھا تو اس کا دل پسیج گیا۔ اُس نے اپنے قبیلے کو جمع کیا۔ اور کہا "یہ لڑکی ہمارا ہی خون ہے۔ ہم کب تک اس غریب کو اپنے شوہر اور بچے سے جدا رکھیں گے۔ اے بنو مغیرہ خدا کی قسم ہمارا قبیلہ بڑا شریف اور بہادر ہے جو ظلم کو دوست نہیں رکھتا" اس شخص کی تقریر سُن کر دوسرے لوگوں کو بھی رحم آ گیا اور انہوں نے حضرت اُمِّ سلمہؓ کو اجازت دے دی کہ وہ مدینہ جا سکتی ہیں۔ جب بنو عبدالاسد نے یہ واقعہ سُنا تو انہوں نے بھی ننھے سلمہ کو اپنی ماں کے پاس بھیج دیا۔ اب حضرت اُمِّ سلمہؓ نے بچے کو گود میں لیا اور اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ خود اُن سے روایت ہے کہ "جب میں اپنے بچے کے ساتھ مکّہ سے چلی تو میرے ساتھ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ جب میں تنعیم کے مقام پر پہنچی تو میں نے وہاں عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ عبدری کو دیکھا۔ انہوں نے کہا، اے ابو اُمیّہ کی بیٹی! تو کہاں جا رہی ہے؟ میں نے کہا، مدینہ اپنے شوہر کے پاس۔ انہوں نے کہا تیرے ساتھ کوئی نہیں ہے؟

میں نے کہا، سوائے اللہ کے اور میرے اس بیٹے کے اور کوئی نہیں۔ عثمانؓ نے کہا، خدا کی قسم میں تمہیں یوں تنہا نہ جانے دوں گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرے اونٹ کی نکیل پکڑی اور تیز تیز چلنے لگے، خدا کی قسم میں نے عرب میں عثمان سے بڑھ کر ساتھ دینے والا کوئی شریف آدمی نہیں دیکھا جب ہم کسی منزل پر پہنچتے تو عثمان میرے لیے اونٹنی کو بٹھا دیتے اور خود پیچھے ہٹ جاتے، جب میں اُتر جاتی اور اونٹ سے پرے ہٹ جاتی تو وہ اونٹ سے کجاوہ کھولتے، اسے درخت سے باندھ دیتے، پھر علیحدہ ہٹ کر کسی درخت کے نیچے آرام کرتے۔ جب چلنے کا وقت آتا تو وہ اونٹ کو میرے سامنے لاتے۔ کجاوہ کستے، پھر مجھ سے پیچھے ہٹ جاتے اور کہتے، سوار ہو جاؤ، جب میں ٹھیک سے اونٹ پر بیٹھ جاتی تو آتے اور اونٹ کی نکیل پکڑ کر چل پڑتے۔ اسی طرح قبا تک میرے ساتھ آئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مجھ سے کہا کہ تیرا شوہر اسی بستی میں ہے تو اب بستی کے اندر چلی جا۔ یہ کہہ کر اسی جگہ سے مکّہ معظمہ واپس چلے گئے۔ خدا کی قسم میں نے عثمانؓ بن طلحہ سے زیادہ شریف کسی کو نہیں دیکھا۔"

(۳)

حضرت عثمانؓ کے والد اور بھائی اسلام کے سخت دشمن تھے۔ چنانچہ ہجرتِ نبویؐ کے بعد ۳ھ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو اس میں طلحہ بن ابی طلحہ نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وہ قریش کا علمبردار تھا۔ عام لڑائی کے آغاز سے پہلے اُس نے مبارزت طلب کی تو حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ اس کے مقابل ہوئے اور چند لمحوں کے اندر اندر اس کو خاک و خون میں لوٹا دیا طلحہ کے قتل پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بآوازِ تکبیر اظہارِ مسرّت فرمایا اور تمام مسلمانوں نے بھی اس زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ میدانِ جنگ گونج اُٹھا۔

طلحہ کے قتل کے بعد اس کا بھائی ابو شیبہ عثمان اور تین بیٹے مسافع، جلاس، کلاب بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت عثمانؓ کو باپ، چچا اور بھائیوں کے قتل کا جو صدمہ ہوا وہ تو ہوا لیکن غزوۂ اُحد کے بعد اُن کا دل آہستہ آہستہ اسلام کی طرف مائل ہونے لگا حتّٰی کہ صلح

حدیبیہ (سنہ ۶ ہجری ذی قعد) کے بعد اور فتح مکّہ سے پہلے وہ کسی وقت بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوکر سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے فتح مکّہ سے سات ماہ قبل حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص کیساتھ اسلام قبول کیا اور پھر ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ چند ماہ بعد غزوۂ فتح پیش آیا تو حضرت عثمانؓ کو بھی ان دس ہزار قدسیوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہُوا جو اس موقع پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ حضورؐ نے مکّہ میں داخل ہوکر خانۂ کعبہ کو بتوں کی آلائش سے پاک کرنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت عثمانؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھر جا کر خانۂ کعبہ کی کنجی لے آئیں۔ یہ حکم اس بنا پر تھا کہ حضرت عثمانؓ کا باپ طلحہ کلید بردارِ کعبہ ہُوا کرتا تھا۔ اس کے قتل کے بعد کنجی اس کی اہلیہ (حضرت عثمانؓ کی والدہ) کی تحویل میں رہتی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے گھر جا کر ماں سے کنجی طلب کی تو انہوں نے دینے سے انکار کر دیا (اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوئی تھیں) مگر حضرت عثمانؓ نے زبردستی اُن سے کنجی لے لی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ماں کو دھمکی دی کہ ابھی کُنجی میرے حوالے کر دو ورنہ میں اپنی تلوار تمہاری پیٹھ میں اتار دُوں گا۔ صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو، حضرت عثمانؓ نے کنجی لا کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دی۔ تطہیرِ کعبہ کے بعد آپؐ نے کنجی حضرت عثمانؓ کو واپس کر دی اور انہیں کلید بردارِ کعبہ مقرر فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر حضرت عثمانؓ کی والدہ نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ ایک روایت کے مطابق چونکہ حضرت عثمانؓ کی والدہ نے کنجی دینے سے انکار کیا تھا اس لیے حضورؐ کو خیال آیا کہ کنجی عثمانؓ کو واپس نہ کی جائے (مبادا اُن کی والدہ پھر ضد کر بیٹھیں) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا۔

(پ ۵ - ع : ۵)

(بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تُم امانتیں اُن کے مستحقین کو واپس کر دو)

چنانچہ حضورؐ نے کنجی حضرت عثمانؓ کو واپس دے دی جس کا یہ اثر ہُوا کہ اُن کی والدہ سعادت

اندوزِ اسلام ہوگئیں۔

سرورِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین اور طائف کے معرکوں کے بعد مدینہ منورہ کو مراجعت فرمائی تو حضرت عثمانؓ بھی آپؐ کے ساتھ مدینہ واپس چلے گئے اور جب تک آفتابِ رسالتؐ اللہ تعالیٰ کی شفقِ رحمت میں غروب نہ ہُوا، وہیں مقیم رہے۔ اس دوران میں ان کی طرف سے کعبہ کی کلید برداری کے فرائض کوئی اور صاحب انجام دیتے رہے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد وہ مکہ آ گئے اور تاحیات کلید برداری کی خدمت انجام دیتے رہے۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں ان کا سالِ وفات ۴۲ھ ہجری لکھا ہے۔ غالباً اولادِ نرینہ کوئی نہیں تھی۔ اس لیے وفات سے پہلے انہوں نے خانۂ کعبہ کی کنجی اپنے چچازاد بھائی حضرت شیبہؓ بن عثمان بن ابی طلحہ کے سپرد کر دی۔ چنانچہ وہ اب تک حضرت شیبہؓ کی اولاد کی تحویل میں ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

حضرت عدّاس رضؓ

①

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سنِ مبارک پورے چالیس سال کا ہوا تو آپؐ کے نہاں خانۂ باطن میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگا جو اکثر سچے خوابوں یا الہاموں کی صورت میں نمودار ہوتا ——— اور پھر ماہِ رمضان سنہ ۴۰ عام الفیل میں ایک دن یکایک جبریلِ امین کے ذریعے رُو در رُو آپؐ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔ اس وقت آپؐ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے۔ اس وحی کے نزول کے بعد حضورؐ اپنے کاشانۂ اقدس کی طرف لوٹے تو یہ کیفیت تھی کہ جسدِ اطہر میں شدید ارتعاش تھا۔ آتے ہی آپؐ نے اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے فرمایا: "مجھے اڑھاؤ مجھے اڑھاؤ" انہوں نے آپؐ پر ایک کمبل ڈال دیا اور روئے انور پر سرد پانی کے چھینٹے دیئے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی طبیعت پُرسکون ہو گئی۔ اب آپؐ نے نزولِ وحی کا سارا واقعہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو سنایا اور آخر میں فرمایا:

لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ

(مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے)

اُمّ المؤمنینؓ نے یہ ماجرا سُن کر عرض کیا: "ہرگز نہیں، خدا کی قسم، اللہ آپ کو کبھی رنج میں مبتلا نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہیں، درماندوں کی دستگیری کرتے ہیں، مہمانوں کی تکریم و تواضع کرتے ہیں، تمام نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں اور آپ کے اخلاق کریمانہ ہیں۔"

اس کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے جبریلِ امین کے بارے میں تحقیق کا ارادہ

کیا اور سب سے پہلے بنو عبد شمس کے رئیس عتبہ بن ربیعہ کے ایک غریب الدیار غلام عدّاس کے پاس تشریف لے گئیں۔ عدّاس دینِ مسیحی کے پیرو تھے اور نہایت نیک خصلت آدمی تھے۔ وہ عراق کے شہر موصل کے ایک نواحی گاؤں کے رہنے والے تھے اور کچھ عرصہ سے مکّہ میں غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کو بعض لوگوں نے بتایا تھا کہ انہیں آسمانی صحائف توریت و انجیل پر عبور تھا اور یہی بات انہیں عدّاس کے پاس لے گئی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے عدّاس سے پوچھا:

"اے عدّاس میں تم کو اللہ کی قسم دیتی ہوں کہ اگر تم جبریل کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ۔"

عدّاس نے کہا: "اے خاتونِ قریش، بت پرستوں کی اس سرزمین سے جبریلؑ کا کیا واسطہ؟"

حضرت خدیجہؓ نے فرمایا: "تم یہ تو بتاؤ، جبریل کون ہے اور اس کا کام کیا ہے؟"

اب عدّاس سنبھل کر بیٹھ گئے اور بڑے نپے تلے لہجے میں یوں گویا ہوئے:۔

"اے سیدۂ نساء قریش آپ واقعی جبریلؑ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہیں تو جان لیجئے کہ وہ نبیوں اور رسولوں کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے امانت دار فرشتہ ہیں۔ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو وہی اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے۔"

اس کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ مزید تحقیق کے لیے اپنے کبیر السن چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اور توریت و انجیل کے عالم تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان کے سامنے نزولِ وحی کا سارا واقعہ بیان کیا اور پھر اس کی حقیقت کے بارے میں ورقہ سے استفسار کیا تو انہوں نے جہاں عدّاس کے بیان کی تصدیق کی وہاں حضرت خدیجہؓ کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس اُمّت کے رسول ہیں اور وہی احمد نبی ہیں جن کے مبعوث ہونے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام

نے بشارت دی تھی۔

یہ سُن کر حضرت خدیجہؓ مطمئن ہو گئیں اور نہایت مسرت وابتہاج کے عالم میں گھر کو مراجعت کی۔

یہ واقعہ جسے سلیمان تیمیؒ، موسیٰ بن عقبہؒ اور زرقانی نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، اس میں عدّاس کا نام صفحۂ تاریخ پر پہلی بار نمودار ہوتا ہے اور پھر گردشِ زمانہ اسے سالہا سال تک نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔

(۲)

بعثت کے بعد تین سال تک رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رازداری کے ساتھ تبلیغ حق کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ جب چوتھے سال کے آغاز میں یہ حکم خداوندی نازل ہوا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ

(احکامِ الٰہی برملا سنائیے اور مشرکین کی پروا نہ کیجیے)

تو حضورؐ نے اپنی دعوت کو آشکارا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مشرکین کے قہر و غضب کا آتش فشاں پوری قوت سے پھٹ پڑا اور انہوں نے اہلِ حق کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہاں تک کہ ۷ سنہ بعدِ بعثت میں انہوں نے بنو ہاشم اور بنو مُطّلب کو "شعبِ ابی طالب" میں محصور کر دیا اور ان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت بنو ہاشم و بنو مُطّلب کے تمام اہلِ حق اور ان کے بعض حامی مسلسل تین برس تک "شعبِ ابی طالب" میں لرزہ خیز مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ ۱۰ سنہ بعدِ بعثت میں یہ روح فرسا مقاطعہ ختم ہوا تو حضورؐ کے جاں نثار چچا ابو طالب اور انتہائی غمگسار و وفادار رفیقۂ حیات اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ تھوڑے ہی دنوں کے فصل سے وفات پا گئے۔ ان دونوں مونس و غمخوار ہستیوں کی جدائی سے حضورؐ کو شدید صدمہ پہنچا۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ اس سال

(سنہ ۱۰ بعد بعثت) کو "عام الحزن" (سالِ غم) سے تعبیر فرمایا کرتے تھے۔ جناب ابوطالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی زندگی میں مشرکین کو حضورؐ پر کھلم کھلا کبھی ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ پڑی تھی لیکن اب وہ آپؐ کو اذیتیں پہنچانے پر بہت جری ہو گئے۔ اور آپؐ کو ستانے کے لیے کسی اوچھی سے اوچھی اور ذلیل سے ذلیل حرکت سے بھی دریغ نہ کیا۔ آپؐ کے فرقِ اقدس پر مٹی پھینکنے، سجدے کی حالت میں آپؐ کے دوشِ مبارک (یا پشتِ مبارک) پر اونٹنی کی اوجھ رکھنے، آپؐ کو غلیظ گالیاں دینے اور اسی قبیل کی اور بیہودگیوں کے واقعات اسی زمانے کے ہیں۔ کفارِ قریش کی شدید معاندانہ روش کے باوجود ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ حق کا کام بدستور جاری رکھا لیکن جب آپؐ نے دیکھا کہ ان لوگوں کی ضد اور شقاوت انتہا کو پہنچ چکی ہے اور وہ کفر و عصیاں اور تمرّد کے راستے سے ہٹنے پر کسی طور آمادہ ہی نہیں ہوتے تو آپؐ نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ عرصہ کے لیے ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور طائف جا کر وہاں کے صاحبِ اثر اشراف و رؤسا کو حق کی دعوت دی جائے۔

طائف مکہ سے جنوب مشرق کی طرف تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر کوہِ سراۃ کی سطحِ مرتفع میں واقع ہے۔ یہ شہر اپنی سرسبزی، شادابی، پانی کی فراوانی اور خوشگوار آب و ہوا کی بدولت حجاز کی جنت کہلاتا ہے۔ یہاں سرسبز پہاڑوں کے دامن میں انگور، انجیر، بہی اور انار وغیرہ کے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے باغات عجیب و رج پرور منظر پیش کرتے ہیں۔ عہدِ رسالت میں بھی اس کی سرسبزی اور شادابی کی یہی کیفیت تھی۔ اسلامی تاریخ میں طائف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ صدیوں تک مکہ کا توام شہر رہا ہے۔ خود قرآنِ حکیم میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ سورۃ الزخرف میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ

(اور کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترا)

مفسرین کے نزدیک "قریتین" سے مراد مکہ معظمہ اور طائف ہی کے شہر ہیں۔

جس زمانے میں آفتاب رسالت فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا طائف پر بنو ثقیف کا تسلط تھا یہ لوگ بڑے آسودہ حال، ذی رسوخ اور جنگجو تھے اور ساتھ ہی اہلِ مکہ کی طرح گمراہی اور اخلاقی پستی کی دلدل میں گلے گلے تک دھنسے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی اہلِ مکہ کے ساتھ رشتہ داریاں بھی تھیں اور تجارتی روابط بھی۔ قریشِ مکہ کے بعد سارے عرب میں سب سے بڑھ کر اگر کسی کی ساکھ تھی تو وہ اہلِ طائف کی تھی۔ ان کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو براہِ راست دعوتِ توحید دینے کا قصد فرمایا۔

(۳)

شوال سنہ ۱۰ بعدِ بعثت کے آخر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے طائف کی طرف روانہ ہوئے۔ امام ابنِ اسحاقؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ تنہا تشریف لے گئے تھے لیکن ابنِ سعدؒ، ابنِ قتیبہؒ، بلاذریؒ اور بعض دوسرے اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ سفرِ طائف میں محبوبِ رسول حضرت زیدؓ بن حارثہ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ مکہ سے طائف تک حضورؐ نے تمام سفر پیادہ پا کیا۔ حضورؐ کے ورودِ طائف کے وقت بنو ثقیف کی زمامِ قیادت عمرو بن عمیر بن عوف ثقفی کے تین بیٹوں عبد یا لیل، مسعود اور حبیب کے ہاتھوں میں تھی۔ سر سبز باغات اور زرخیز زمینوں کی کثیر آمدنی نے ان تینوں بھائیوں کا دماغ آسمان پر چڑھا رکھا تھا اور وہ کسی دوسرے کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے۔ حضورؐ ان تینوں سے ملے، توحید کی دعوت دی اور اپنی آمد کی غرض بیان کی لیکن یہ تینوں دعوتِ حق پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے برہم ہو گئے اور سخت بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

عبد یا لیل نے تنک کر کہا: "اگر خدا نے تمہیں رسول بنایا ہے تو گویا اس نے کعبہ کا غلاف پرزے پرزے کر ڈالا ہے۔" (یا بروایتِ دیگر "تو میں کعبے کے پردے نوچ ڈالوں گا۔")

دوسرے بھائی مسعود نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا: "کیا خدا کو تمہارے سوا کوئی

نہ ملتا تھا کہ اسے رسول بناتا۔ تمہارے پاس تو چڑھنے کے لیے سواری تک نہیں۔"

تیسرا بھائی جیب منطقیانہ انداز میں یوں گویا ہوا: "میں تم سے مطلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تم واقعی خدا کے سچے رسول ہو تو تمہاری بات کو جھٹلانا سخت خطرناک اور خلافِ ادب ہے اور اگر تم جھوٹے ہو تو ایک دروغ گو سے بات کرنا میری شان کے خلاف ہے۔"

حضورؐ نے ان کے مایوس کن جوابات سن کر فرمایا کہ خیر میرے ساتھ جو سلوک تم نے کیا سو کیا اب کم از کم اتنا تو کرو کہ جو باتیں ہمارے درمیان ہوئیں ان کو اپنے تک ہی رکھو۔

حضورؐ کی یہ خواہش اس خیال کے پیشِ نظر تھی کہ اگر قریشِ مکّہ کو ان باتوں کا علم ہو گیا تو وہ اہلِ حق پر ظلم ڈھانے میں اور دلیر ہو جائیں گے۔ لیکن بنو ثقیف کے ان تینوں سرداروں نے حضورؐ کی اس خواہش کا جواب خندۂ استہزا سے دیا اور عرب کی روایتی مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے غلاموں، شہر کے لفنگوں، شہدوں اور شریر لونڈوں کو اشارہ کر دیا کہ وہ انسانیت کے محسنِ اعظمؐ کو خوب ستائیں یہاں تک کہ وہ طائف سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان بدبختوں کو ضیافتِ طبع کا ایک سامان ہاتھ آ گیا۔ حضورؐ ان کو نیکی اور بھلائی کی طرف بلاتے اور وہ اس کے جواب میں آپ کو گندی گالیاں دیتے، مذاق اڑاتے، تالیاں بجاتے اور پتھر مارتے تھے۔ آپؐ جدھر کا رخ کرتے یہ شیطان آپؐ کا تعاقب کرتے۔ انہوں نے شقاوت، خباثت اور غنڈہ پن کی انتہا کر دی اور مسلسل دس دن تک وہ طوفانِ بدتمیزی برپا کیے رکھا کہ زمین و آسمان تھرا اٹھے۔ حِبُّ النبی حضرت زیدؓ بن حارثہ حضورؐ کے دائیں بائیں آگے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے اور بدمعاشوں کے پتھروں کو اپنے ہاتھوں اور جسم پر روکتے تھے لیکن جب ہر طرف سے پتھروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو تو حضورؐ کا جسدِ اقدس ضرر سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ آپؐ لہولہان ہو جاتے تھے اور ٹخنوں، پنڈلیوں اور گھٹنوں سے خون کے دھارے بہہ نکلتے تھے۔ ایک دن (یعنی سردارانِ بنو ثقیف سے ملاقات کے

دسویں دن) شریروں نے اتنے پتھر برسائے کہ حضرت زیدؓ بھی زخموں سے چور چور ہو گئے (بقول ابن سعدؒ ان کا سر پھٹ گیا) اور آقائے دوجہاںؐ بھی مجروح و نزار ہو کر زمین پر گر پڑے۔ اس وقت جسم پاک کے ہر حصے سے خون رس رہا تھا۔ کمینہ صفت طائفیوں نے اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ بغلوں میں ہاتھ دے کر حضورؐ کو کھڑا کر دیا اور پھر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ آخر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثار ساتھی کے ہمراہ زخموں سے چور اور خون سے غلطیدہ، طائف سے نکلے اور کچھ دُور جا کر ایک باغ کے اندر انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ طائفی شیاطین بھی اب تھک ہار کر واپس چلے گئے۔ باغ میں ذرا اطمینان کی سانس لینی نصیب ہوئی تو حضرت زیدؓ نے اپنی چادر سے حضورؐ کے جسم اطہر سے خون صاف کیا۔ جوتوں میں خون اس طرح جم گیا تھا کہ حضورؐ بمشکل اپنے پاؤں باہر نکال سکے۔ قریب ہی پانی موجود تھا۔ حضورؐ اُٹھ کھڑے ہوئے اٹھے، وضو کیا اور بارگاہِ ربّ العزت میں وہ پُرسوز دعا کی جو تاریخ میں "دُعائے طائف" کے نام سے مشہور ہے۔ طبریؒ، ابن ہشامؒ، ابن قیمؒ اور حافظ ابن کثیرؒ نے معمولی لفظی تغیر کے ساتھ غربت اور مظلومیت کی فضا میں مانگی گئی اس دُعا کے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:

"الٰہی میں اپنے ضعف، بے سروسامانی اور لوگوں کے ہاتھوں اپنی تحقیر کی فریاد تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ ناتوانوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا ربّ بھی تو ہی ہے مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے کیا بیگانہ ترش رُو کے یا اس دشمن کے جو میرے نیک و بد کا مالک ہو گا۔ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دین و دنیا کے کام اس سے درست ہو جاتے ہیں تجھ سے اس بات کی پناہ چاہتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر وارد ہو یا تیری

ناراضامندی مجھ پر اترے۔ مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی مطلوب ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔"

جس باغ میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زیدؓ بن حارثہ نے پناہ لی تھی اس کے مالک مکہ کے رئیس عتبہ و شیبہ فرزندانِ ربیعہ تھے۔ وہ اتفاق سے اپنے غلام عدّاس کے ہمراہ طائف آئے ہوئے تھے اور اس وقت باغ میں موجود تھے۔ انہوں نے دور سے ان زخمی اور خستہ حال مسافروں کو دیکھا تو مشرک ہونے کے باوجود ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی کیونکہ حضورؐ ان کے ہم وطن بھی تھے اور قرشی و یک جدّی بھی۔ پھر ان میں عربی شرافت اور مہمان نوازی ابھی موجود تھی۔ انہوں نے اپنے غلام عدّاس کو حکم دیا کہ جاؤ انگوروں کا ایک خوشہ طباق میں رکھ کر مسافروں کو دے آؤ ——— یہ عدّاس وہی صاحب تھے جنھوں نے دس سال پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو روح الامینؑ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کیا تھا ——— انہوں نے جلدی جلدی کچھ پکے ہوئے انگور چنے اور ایک طباق میں رکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ حضورؐ نے بسم اللہ (بروایتِ دیگر بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ) کہہ کر انگوروں کی طرف دستِ مبارک بڑھایا تو عدّاس حیران رہ گئے انہوں نے کہا:

"خدا کی قسم اس سرزمین کے باشندوں سے تو میں نے کبھی ایسا کلمہ نہیں سنا۔"

حضورؐ نے پوچھا: "بھائی تمہارا آبائی وطن کونسا ہے اور تم کس دین کے پیرو ہو؟"

عدّاس نے جواب دیا: "میں ارضِ نینوا کا رہنے والا ہوں اور دینِ مسیحی کا پیرو ہوں۔"

حضورؐ نے فرمایا: "اچھا تو تم مردِ صالح یونسؑ بن متّٰی کے ہم وطن ہو۔"

فرطِ تحیّر سے عدّاس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بے اختیار ہو کر پوچھا:

"یونسؑ بن متّٰی، یونسؑ بن متّٰی کو آپ کیسے جانتے ہیں؟"

حضورؐ نے فرمایا: "یونس میرے بھائی ہیں وہ بھی خدا کے نبی تھے اور میں بھی خدا کا

نبی ہوں۔"

عداس کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم عطا کی تھی اور پھر وہ توریت و انجیل پر بھی عبور رکھتے تھے۔ لسانِ رسالت سے اعلانِ نبوّت سن کر ان کو یقین ہو گیا کہ مقدّس مسافر فی الحقیقت نویدِ مسیحا اور یوحنا کا "وہ نبی" ہے۔ اسی وقت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑے۔ اشک ہائے عقیدت سے انہیں تر کیا اور پھر والہانہ آپؐ کے سرِ اقدس اور ہاتھوں کو چومتے ہوئے عرض پیرا ہوئے

اشھد انک عبد اللّٰہ و رسولہ

(میں شہادت دیتا ہوں کہ بے شک آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)

عتبہ اور شیبہ دور سے عداسؓ کی یہ کیفیت دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے پاس لوٹ کر گئے تو انھوں نے کہا: "تجھے کیا ہو گیا تھا کہ تو اس مسافر کے ہاتھ پاؤں اور سر چومنے لگا تھا؟"

عداس نے جواب دیا: "صاحبو یہ مسافر ایک عالی مرتبہ ہستی ہے۔ آج روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی جو ایک نبی کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔"

دونوں بھائیوں نے عداس کو ڈانٹ پلائی کہ خبردار اپنا دین ترک نہ کرنا، تیرا دین اس مسافر کے دین سے بہتر ہے۔ لیکن عتبہ و شیبہ کی یہ ڈانٹ بیکار تھی۔ عداسؓ شرفِ ایمان سے سرفراز ہو چکے تھے، اب ان کا جسم تو عتبہ و شیبہ کا غلام تھا لیکن روح بادۂ توحید سے سرشار ہو کر مکّہ کے دُرِّ یتیم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی قبول کر چکی تھی۔

(۴)

صعوبت گاہِ طائف میں دس دن (بروایتِ دیگر ایک ماہ) قیام کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّہ معظمہ کو مراجعت فرمائی۔ حضورؐ مطعم بن عدی کی حمایت حاصل کر کے شہر میں داخل ہوئے اور پہلے سے دو چند جوش کے ساتھ فریضۂ تبلیغ ادا کرنے لگے۔

حضورؐ کی تبلیغی مساعی کے جواب میں مشرکینِ قریش کا طوفانِ معاندت پھر پوری شدت سے اُمڈ آیا اور انہوں نے اہلِ حق پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اسی دوران میں یثرب کے قبائل اوس و خزرج کو اللہ تعالیٰ نے قبولِ حق کی سعادت بخشی اور انہوں نے حضورؐ کو اس عہد کے ساتھ یثرب تشریف لانے کی دعوت دی کہ وہ اپنی جانوں، مالوں، اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی حمایت اور حفاظت کریں گے۔ دوسری طرف اشقیاءِ قریش کی حق دشمنی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ انہوں نے حضورؐ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ یہی حالات تھے کہ آپ ربیع الاوّل ۱۴ھ بعد بعثت میں مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی قریشِ مکّہ نے اپنی معاندانہ روش ترک نہ کی اور شمعِ توحید کو بجھانے کی کوششوں میں برابر مصروف رہے۔ غزوۂ بدر الکبریٰ (رمضان ۲ھ) سے پہلے مشرکینِ مکّہ نے بڑے زور شور سے جنگ کی تیاری کی۔ ان میں عتبہ اور شیبہ بھی شامل تھے۔ حضرت عدّاس کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے دونوں کی منّت کی کہ اللہ کے رسولؐ سے لڑنے کا ارادہ ترک کر دیں ورنہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ عتبہ اور شیبہ نے پہلے تو حضرت عدّاسؓ کی بات سُنی اَن سُنی کر دی لیکن جب انہوں نے بالحاح تمام ان کو لڑائی پر جانے سے روکا تو انہوں نے جاہلی طریقے کے مطابق تیروں پر پانسہ ڈال کر معلوم کرنا چاہا کہ وہاں جانا چاہیئے یا نہیں۔ اتفاق سے اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ اس پر انہوں نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ بھاگا بھاگا دونوں بھائیوں کے پاس پہنچا اور ان کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ پھر آمادۂ سفر ہو گئے۔ حضرت عدّاسؓ نے جب دیکھا کہ ابوجہل نے عتبہ و شیبہ کو پھر اپنے اڈے لگا لیا ہے تو وہ لشکر کی روانگی کے وقت ثنیۃ البیضاء میں جا کر بیٹھ گئے جب عتبہ و شیبہ ان کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے آگے بڑھ کر ان کے پاؤں پکڑ لیے اور بولے، خدا کی قسم جس شخص سے آپ لڑنے جا رہے ہیں، وہ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں،

آپ ان سے مقابلہ کر کے برباد ہو جائیں گے اس لیے میں از راہِ خیر خواہی آپ سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس سفر سے باز رہیں۔

عتبہ و شیبہ کے سر پر موت منڈلا رہی تھی اس لیے انہوں نے عداسؓ کی بات نہ مانی اور بدر کی جانب روانہ ہو گئے۔ حضرت عداسؓ ان کے انجام کا خیال کر کے بے اختیار رونے لگے۔ کچھ دیر بعد عاص بن شیبہ ادھر سے گزرا تو اس نے عداس سے پوچھا: "عداس تم رو کیوں رہے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا: "میرے دونوں آقا جو اس وادی کے سردار ہیں اللہ کے رسولؐ سے نبرد آزما ہونے گئے ہیں اور میرے منع کرنے کے باوجود مکہ میں نہیں رکے۔" —— عاص نے پوچھا: "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی خدا کے پیغمبر ہیں؟"

حضرت عداسؓ نے بڑے جوش سے کہا:

"خدا کی قسم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام مخلوق خدا کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں جو کوئی ان کی مخالفت کرے گا وہ خائب و خاسر ہو گا —— (اصابہ۔ ابن حجرؒ)

اس واقعہ کے بعد حضرت عداسؓ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے دھندلکوں میں مستور ہو گئے۔ ان کی زندگی کے مزید حالات کسی کتاب میں نہیں ملتے البتہ اہلِ سیر نے انہیں بالاتفاق اہلِ کتاب صحابہ میں شمار کیا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ ــــ بحرالجُود

(۱)

۸۰ھ ہجری کا ذکر ہے کہ ایک دن مدینہ منوّرہ میں کسی پکارنے والے نے پکار کر کہا: "لوگو آج بحرالجُود اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔"

اہلِ مدینہ کے کانوں میں اس آواز کا پڑنا تھا کہ ان میں حشر برپا ہوگیا، زن و مرد بچے بوڑھے، غریب امیر غلام اور آقا سبھی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ جنازہ اُٹھا تو لوگ ہر طرف سے کندھا دینے کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔ تابوت کے ساتھ دو لمبی لمبی لکڑیاں باندھ دی گئی تھیں لیکن اس قدر ہجوم تھا کہ ایک قدم چلنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح جنازہ جنّت البقیع پہنچایا گیا۔ والیٔ مدینہ ابان بن عثمانؓ نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور اپنے ہاتھوں سے میت کو آغوشِ لحد میں رکھا۔ پھر وہ قبر کے کنارے کھڑے ہو گئے اس وقت ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا اور زبان پر یہ الفاظ تھے:

"خدا کی قسم تم بہترین آدمی تھے۔ تم میں مطلق شر نہ تھا۔ تم شریف ابن شریف تھے۔ تم صلۂ رحمی کرتے تھے۔ تم لوگوں سے کسی غرض کے بغیر نیکی کرتے تھے، تم بدکاروں کے دشمن تھے، خدا تم پر رحمت نازل کرے، بنو ہاشم تو تمہاری وفات سے غمزدہ ہیں ہی، سارے قریش اور اہلِ مدینہ کے کلیجے بھی تمہاری جدائی پر شق ہیں۔ آہ اب تم جیسا غریبوں کا غمگسار، بامروّت دوست اور دلوں کی ڈھارس بندھانے والا مربّی کہیں نظر نہ آئے گا۔"

اللہ کے حضور پیش ہونے والے یہ صاحب، جن کی موت نے تمام اہلِ مدینہ کو رُلا دیا اور سیّدنا عثمان غنیؓ کے حاکمِ وقت صاحبزادے نے بھرے مجمع میں خدا کی قسم

قسم کھا کر جن کے اوصاف و محاسن کی گواہی دی، حضرت عبداللہ بن جعفرؓ تھے۔

(۲)

حضرت ابو جعفر عبداللہ بن جعفرؓ دودمانِ ہاشمی کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب تھے جو غزوۂ موتہ میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور "طیّار" اور "ذوالجناحین" کے القاب سے نوازے گئے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبداللہؓ بن جعفر طیّار (ذوالجناحینؓ) بن ابی طالب بن عبدالمطّلب بن ہاشم بن عبدمناف۔

والدہ کا نام اسماءؓ بنتِ عمیس تھا۔ ان کا شمار نہایت جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ کے والدین حضرت جعفرؓ اور حضرت اسماءؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب ایسا کرنا مشرکینِ مکّہ کو اپنے خون کا پیاسا بنانے کے مترادف تھا چنانچہ قبولِ اسلام کے بعد وہ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح کفّار کے ظلم و ستم کا ہدف بن گئے جب مشرکین کی ستم رانیاں حد سے بڑھ گئیں تو ۶ سنہ نبوت میں حضورؐ کے ایما پر حضرت جعفرؓ اور حضرت اسماءؓ ہجرت کر کے حبش چلے گئے جہاں وہ بارہ تیرہ برس تک غریب الوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ حضرت عبداللہؓ کی ولادت اسی غربت کدہ میں ہوئی۔ حضرت جعفرؓ غزوۂ خیبر (اواخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ) کے موقع پر اپنے اہل و عیال سمیت حبش سے مدینہ آئے تو حضورؐ کو بے انتہا مسرت ہوئی۔ آپؐ نے فرطِ محبّت سے حضرت جعفرؓ کی پیشانی چوم لی اور فرمایا "معلوم نہیں مجھے جعفرؓ کے آنے سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یا خیبر کی فتح سے۔" اس وقت حضرت عبداللہؓ کی عمر سات آٹھ برس کی تھی۔ حضرت جعفرؓ نے انہیں حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے ان کو گلے لگا لیا اور مسکراتے ہوئے ان سے بیعت لی۔

۸ سنہ ہجری میں غزوۂ موتہ پیش آیا۔ حضرت جعفرؓ نے اس میں مردانہ وار لڑتے ہوئے

ہوئے شہادت پائی حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ کو سخت صدمہ پہنچا اور آپؐ سخت غم و اندوہ کے عالم میں حضرت جعفرؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت اسماءؓ بچوں کو نہلا دھلا کر کپڑے پہنا رہی تھیں۔ حضورؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: "جعفرؓ کے بچوں کو میرے پاس لاؤ۔"

حضرت اسماءؓ نے بچوں کو خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ حضورؐ نے بچوں کو گلے سے لگایا اور ان کی پیشانیاں چومیں۔ حضرت اسماءؓ حضورؐ کے آبدیدہ ہونے سے پریشان ہو گئیں اور دریافت کیا:

"یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ غمگین کیوں ہیں۔ کیا جعفر کے بارے میں کوئی خبر آئی ہے؟"

حضورؐ نے فرمایا: "ہاں وہ شہید ہو گئے ہیں۔"

اس سانحہ جانگداز کی خبر سنتے ہی حضرت اسماءؓ کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کی گریہ زاری سن کر پاس پڑوس کی خواتین جمع ہو گئیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے اور ازواجِ مطہراتؓ کو ہدایت فرمائی کہ آلِ جعفرؓ کا خیال رکھنا۔ آج وہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ انہیں سینہ کوبی اور بین سے منع کرنا۔

مُسندِ احمدؒ بن حنبل میں ہے کہ حضورؐ نے اس موقع پر تین مرتبہ یہ دعا مانگی: "الٰہی تو جعفر کے اہل وعیال کی سرپرستی فرما اور عبداللہ کے داہنے ہاتھ کے کاروبار میں برکت دے۔"

حافظ ابنِ حجرؒ نے "الاصابہ" میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ کا ہاتھ پکڑ کر دعا کی: بارِ الٰہا اس کو جعفر کا صحیح جانشین بنا، اس کی بیعت میں برکت عطا فرما اور میں دنیا اور آخرت دونوں میں آلِ جعفر کا ولی ہوں۔"

ایک اور روایت میں خود حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے باپ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اور میرے بھائیوں کو لے کر مسجدِ نبوی میں تشریف لے گئے اور درد و غم بھری آواز میں مسلمانوں کو حضرت جعفرؓ کی شہادت کی خبر سنائی۔ پھر آپؐ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا تین دن تک ہم وہیں کھانا کھاتے رہے اور حضورؐ ہمارے گھر تشریف لاتے رہے۔

حضرت عبداللہؓ کی کم عمری اور یتیمی کی وجہ سے رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر

غیر معمولی شفقت فرماتے تھے۔ پھر وہ یوں بھی حضورؐ کے بھتیجے ہوتے تھے اور نہایت پسندیدہ عادات و خصائل کے مالک تھے۔ ظاہری حسن و جمال کے لحاظ سے بھی اپنی نظیر آپ تھے اسی لیے حضورؐ فرمایا کرتے تھے:

"عبداللہ خَلقاً اور خُلقاً مجھ سے مشابہ ہے۔"

ایک دن حضرت عبداللہ کسی جگہ بیٹھ کر مٹی کے کھلونے بنا رہے تھے اتفاقاً ادھر سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا۔ آپؐ نے پوچھا:

"عبداللہ کیا بناتے ہو؟"

عبداللہؓ: کھلونے بناتا ہوں۔"

رسولِ اکرمؐ: ان کا کیا کرو گے؟"

عبداللہؓ: بیچوں گا۔"

رسولِ اکرمؐ: "اور ان کے دام کس کام میں لاؤ گے؟"

عبداللہؓ: "خرمے خریدوں گا اور کھاؤں گا۔"

حضورؐ کو نو عمر عبداللہ کے یہ معصومانہ جواب پسند آئے اور آپؐ نے خوش ہو کر دعا کی:

"الٰہی اس بچے کے ہاتھ کے کام میں برکت دے۔"

"مستدرک حاکم" میں ہے کہ ایک دن حضرت عبداللہؓ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ آپؐ کی نظر عبداللہؓ پر پڑی تو انہیں اپنے پاس بلایا اور نہایت شفقت کے ساتھ اپنی سواری پر بٹھا لیا۔

(۳)

سنہ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو حضرت عبداللہؓ اپنے چچا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نگرانی و سرپرستی میں آ گئے۔ انہوں نے بھی نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ حضرت عبداللہؓ کی تربیت فرمائی۔ جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچے تو حضرت علیؓ نے اپنی لختِ جگر حضرت زینبؓ کا نکاح ان سے کر دیا۔ یہ واقعہ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کی ازدواجی زندگی انتہائی خوشگوار تھی

اور وہ فرمایا کرتے تھے: "زینبؓ بہترین گھر والی ہے۔"

حضرت عبداللہؓ نے عہدِ فاروقی ہی میں تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا یہ اثر تھا کہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتے تو وہ سونا بن جاتی تھی۔ اس طرح وہ نہایت تونگر اور آسودہ حال ہو گئے لیکن جس قدر ان کے پاس مال و دولت کی فراوانی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ کشادہ دست اور فیاض تھے۔ ناممکن تھا کہ کوئی سائل یا حاجت مند ان کے دروازے پر آئے اور خالی ہاتھ چلا جائے۔ ان کی جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ کئی غیر مستحق لوگ بھی ان کے دستِ کرم سے فائدہ اٹھا لیتے تھے ایک مرتبہ سیدنا حسینؓ بن علیؓ نے ان سے کہا:

"اے ابنِ عم، تمہارے جود و کرم سے غیر مستحق لوگ بھی تمہاری کمائی میں شریک ہو جاتے ہیں۔"

حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا:

"جانِ برادر کیا کروں، سائل کو دیکھ کر دل قابو میں نہیں رہتا۔ اللہ نے مجھے دولت اسی لیے دی ہے کہ اس کے بندوں میں بانٹوں۔"

اپنی بے مثل فیاضی اور سیر چشمی کی بدولت حضرت عبداللہؓ "بحر الجود" (سخاوت کا سمندر) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ تاریخ میں ان کی دریا دلی اور فیاضی کے بیشمار واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ انہیں پڑھ کر لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ فی الواقع "بحر الجود" کے لقب کے حقیقی معنوں میں مستحق تھے۔

(۴)

عام طور پر مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلفاءِ ثلاثہ کے عہد میں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ خاموشی سے اپنے کاروبار میں مشغول رہے لیکن بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ نے عہدِ فاروقی اور عہدِ عثمانی کے بعض معرکوں میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ کی حیثیت سے جانبازانہ حصہ لیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دورِ خلافت آیا تو حضرت عبداللہؓ ان کے پُرجوش دست و بازو ثابت ہوئے اور جنگِ صفین میں شامی فوج کے خلاف خوب دادِ شجاعت

دی۔ التوائے جنگ کا معاہدہ لکھا گیا، تو انہوں نے اس پر حضرت علیؓ کی جانب سے گواہی ثبت کی۔ ابو حنیفہ دینوری نے "اخبار الطوال" میں لکھا ہے کہ رمضان ۴۰ھ ہجری میں حضرت علی مرتضیٰؓ نے ابن ملجم کے ہاتھ سے شہادت پائی تو حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے بدبخت قاتل کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر شیرِ خدا کا بدلہ لیا۔

ذی الحجہ ۶۰ھ ہجری میں سیدنا حضرت حسینؓ نے اہلِ کوفہ کی دعوت پر اپنے اہل و عیال اور جاں نثاروں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکہ سے کوفہ کا عزم کیا تو حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے انھیں کوفہ جانے سے روکنے کی بہت کوشش کی اور عمرو بن سعید حاکمِ مکہ کا امان نامہ بھی ان کے لیے حاصل کر لیا لیکن سیدنا حسینؓ نے بوجوہ ان کا مشورہ قبول نہ کیا۔ حضرت عبداللہؓ کو اگرچہ سیدنا حسینؓ کے عزمِ کوفہ سے اختلاف تھا لیکن انھوں نے اپنی اہلیہ حضرت زینبؓ کو بھائی کے ساتھ جانے سے نہ روکا۔ دشتِ کربلا میں امام حسینؓ کی شہادت کے بعد حضرت زینبؓ ہی تھیں قافلۂ حسینی کے پسماندگان کی بڑے حوصلے اور جرأت کے ساتھ سرپرستی کی اور دمشق کے پُر صعوبت سفر کے بعد انہیں ساتھ لے کر مدینہ منورہ پہنچیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عبداللہؓ کے دو نوعمر صاحبزادے بھی ماں کے ساتھ قافلۂ حسینی میں شامل تھے۔ ان دونوں نونہالوں نے دشتِ کربلا میں جلیل القدر ماموں پر اپنی جانیں نثار کر دیں۔

حضرت عبداللہؓ بن جعفر کا سالِ وفات جمہور اہلِ سِیَر نے ۸۰ھ ہجری بیان کیا ہے لیکن بعض نے ۸۵ھ، ۸۷ھ اور ۹۰ھ بھی لکھا ہے۔ البتہ اس پر سبھی متفق ہیں کہ انھوں نے مدینہ منورہ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اہلِ مدینہ نے ان کی وفات کو نہایت شدت سے محسوس کیا کیونکہ ان کے خوانِ کرم سے بے شمار غریبوں، محتاجوں اور یتیموں کی پرورش ہوتی تھی۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ ان کی وفات کی خبر پھیلی تو اہلِ مدینہ میں کہرام مچ گیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہوئی ہو اور بعض لوگوں نے تو فرطِ غم میں اپنے گریبان چاک کر ڈالے۔

(۵)

حضرت عبداللہؓ اگرچہ عہدِ رسالت میں کم عمر تھے تاہم ان سے مروی چند احادیث کتابوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو متفق علیہ ہیں۔ ان کے راویوں میں عروہ بن زبیرؓ، ابنِ ابی ملیکہؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اربابِ سیر نے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے محاسنِ اخلاق کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور اخلاقی اعتبار سے انہیں بہت بلند پایہ شخصیت قرار دیا ہے۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن جعفرؓ نہایت سخی، حلیم الطبع، بردبار، فیاض، عفیف، پاک دامن، خوش مزاج اور کریم النفس تھے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن جعفرؓ کی سخاوت، حلم اور کرم و عطا کے واقعات اتنے کثیر ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں (الاصابہ) کہا جاتا ہے کہ زمانۂ اسلام میں عرب کے اندر دس اشخاص نے فیاضی میں شہرتِ عام حاصل کی۔ حضرت عبداللہؓ ان دس میں شامل ہی نہ تھے بلکہ امتیازی شان کے حامل تھے۔ ایک دفعہ ان کی اعتدال سے بڑھی ہوئی فیاضی اور جود و سخا پر کسی نے ٹوکا تو جواب دیا کہ "اللہ نے اسے میری عادت بنا دیا ہے اگر میں اسے چھوڑ دوں تو اندیشہ ہے کہ اللہ مجھے چھوڑ دے گا اس لیے کہ فیاضی درحقیقت مخلوق نوازی ہے اور مخلوق اللہ کا کنبہ ہے جو اس سے بہتر سلوک کرتا ہے اللہ بھی اس سے بہتر سلوک کرتا ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک تاجر تجارت کی غرض سے بہت سی شکر لے کر مدینہ منورہ آیا۔ اتفاق سے اس وقت بازار سرد تھا۔ گھاٹے کے خیال سے تاجر کا دل ڈوب گیا۔ مدینہ کے بعض لوگوں کے پاس جا کر رویا دھویا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ میاں اس طرح ہلکان ہونے سے کچھ فائدہ نہیں تم عبداللہ بن جعفرؓ کے پاس جاؤ اور ان کو اپنا قصۂ درد سناؤ۔ شاید وہ تمہاری مشکل کا کوئی حل نکال دیں۔ تاجر حضرت عبداللہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو افتاد اس پر آن پڑی تھی اس کا حال انہیں سنایا۔ حضرت عبداللہؓ نے اس کی کہانی سن کر فرمایا: "تم اپنی ساری شکر یہاں لے آؤ۔" وہ شکر لے آیا تو حضرت عبداللہؓ نے اپنے گھر کے سامنے ایک بڑا سا فرش بچھوا کر تاجر سے کہا کہ تمام

شکر اس پر ڈھیر کر دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب حضرت عبداللہؓ نے مدینہ میں اعلان کرا دیا کہ جس کو شکر کی ضرورت ہو وہ ہمارے یہاں سے بلا قیمت لے جائے۔ یہ اعلان سن کر لوگ شکر پر ٹوٹ پڑے اور تھوڑی ہی دیر میں ساری شکر لوٹ لی۔ خود اس تاجر نے بھی حضرت عبداللہؓ کا ایماء پاکر اس لوٹ میں حصہ لیا اور کچھ خالی بورے بھر لیے۔ جب یہ ہنگامہ ختم ہو چکا تو حضرت عبداللہؓ نے تاجر سے شکر کی قیمت پوچھی۔ اس نے چار ہزار درہم بتائی۔ حضرت عبداللہؓ نے نہایت خوشدلی سے اس کو یہ رقم ادا کر دی اور وہ ان کو دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

ایک مرتبہ ایک بدوی شاعر حضرت عبداللہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے یہ اشعار پڑھے:

"میں نے خواب میں دیکھا کہ ابوجعفر (حضرت عبداللہؓ کی کنیت) نے مجھے حریر کی قبا پہنائی ہے۔ جب بہت سے دن گزر گئے اور اس خواب کی تعبیر ظاہر نہ ہوئی تو میں نے ایک دوست کے سامنے اپنا خواب بیان کیا۔ اس نے کہا کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ یہ خواب حقیقت کا جامہ نہ پہنے کیونکہ ابوجعفر جن کو تو نے خواب میں دیکھا، ان کا ابر کرم تو سارے زمانے پر برس رہا ہے خود فیاضی کو انہوں نے حکم دے رکھا ہے کہ خبردار مجھ سے آگے نہ بڑھنا۔"

حضرت عبداللہؓ نے بدوی کے اشعار سنے تو اس کا منشاء سمجھ گئے۔ اسی وقت اپنے خادم کو حکم دیا کہ اندر سے ان کی حریر کی قبا لاکر بدوی شاعر کو پہنا دے۔ بدوی قبا پہن کر چلنے لگا تو مسکرا کر اس سے فرمایا: "مگر بھائی تم نے خواب میں میری وہ زربفت کی قبا کیوں نہ دیکھی جو میں نے تین سو دینار میں خریدی تھی اور اس حریر کی قبا سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔"

بدوی شاعر بھی بڑا حاضر جواب تھا اس نے ہنستے ہوئے کہا:

"اسے حفاظت سے رکھیئے گا۔ انشاءاللہ آئندہ اسی کو خواب میں دیکھوں گا۔"

ایک مرتبہ ایک بوڑھے حبشی شاعر نے حضرت عبداللہؓ سے کچھ وصول کرنے کے لیے ان کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔ انہوں نے اس کے صلے میں اس کو بہت سے گھوڑے، اونٹ، کپڑے اور درہم و دینار عطا فرمائے۔ کسی نے کہا کہ یہ معمولی حبشی تو اتنے انعام کا مستحق نہ تھا۔

حضرت عبداللہؓ نے فرمایا:

"یہ تو ضرور ہے کہ یہ ایک سیاہ فام شخص ہے، لیکن اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ اس سے بھی زیادہ کا مستحق ہے سچ تو یہ ہے کہ میں نے اسے جو کچھ دیا ہے وہ تھوڑی مدت میں ختم ہو جائے گا لیکن اس نے جو اشعار کہے ہیں وہ ہمیشہ باقی رہیں گے اور ان کی شادابی کم نہ ہوگی۔"

"مستدرک حاکم" میں ہے کہ ایک عراقی شاعر زیاد بن اعجم کو پانچ مرتبہ خون بہا (دیت) دینے کا اتفاق پیش آیا۔ اس میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ خود خون بہا ادا کر سکتا، اس لیے پانچوں مرتبہ حضرت عبداللہؓ سے امداد کا خواستگار ہوا۔ انھوں نے ہر دفعہ خندہ پیشانی سے اس کی طرف سے خون بہا کی خطیر رقم ادا کر دی۔ زیاد نے اپنی منت پذیری کا اظہار ان اشعار میں کیا:

سألناه الجزيل فما تلكا ... واعطى فوق منيتنا وزاده

واحسن ثم احسن ثم عدنا ... فاحسن ثم عدت له فعاد

(ہم نے ان سے کثیر مال کا سوال کیا، انہوں نے تامّل نہ کیا اور ہماری امید سے زیادہ دیا اور انھوں نے بار بار بھلائی کی اور جب بھی ہم ان کے پاس گئے انھوں نے بھلائی کا اعادہ کیا۔)

ایک دفعہ ایک غریب بدوی نے حضرت عبداللہؓ کے پاس اونٹ بیچا۔ ان کو ضرورت تو نہیں تھی لیکن بدوی کی کفالت کے خیال سے خرید لیا۔ بدوی بھی ان کے مزاج سے واقف تھا۔ اس نے وقفہ وقفہ سے تین بار اونٹ کی قیمت وصول کی، وہ سب کچھ جاننے کے باوجود ازراہ مروت ہر دفعہ قیمت دے دیتے، تاہم جب وہ تیسری بار قیمت وصول کر کے جانے لگا تو مسکرا کر فرمایا:

"بھائی تم تین مرتبہ اپنے اونٹ کی قیمت وصول کر چکے ہو۔"

بدوی کو اب چوتھی مرتبہ اس مقصد کے لیے ان کے پاس آنے کی ہمت نہ پڑی۔

(۶)

امام حاکم نیشاپوریؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ اگرچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے بھتیجے اور داماد تھے اور جنگِ صفّین میں شامی فوجوں کے خلاف لڑ چکے تھے۔ لیکن امیر معاویہؓ ان کو بہت مانتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ کبھی کبھار شام جاتے تھے تو امیر معاویہؓ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے اور بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ یہ رقم لاکھوں کی تعداد میں ہوتی تھی۔ حضرت عبداللہؓ یہ سب کچھ اپنی فیاضیوں میں صَرف کر دیتے تھے۔

علامہ ابن عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کبھی کبھار گانا سن لینے میں مضائقہ نہ سمجھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو تلاوتِ قرآن پاک سے بھی بے حد شغف تھا۔ ایک دفعہ وہ دمشق میں امیر معاویہؓ کے مہمان تھے اور عشاء کے بعد ایک خوش گلو مغنی سے گانا سن رہے تھے۔ امیر معاویہؓ کی اہلیہ فاختہ کو حضرت عبداللہؓ سے امیر کا لگاؤ پسند نہیں تھا۔ اس نے امیر معاویہؓ سے جا کر کہا کہ آپ جس شخص کا اعزاز و اکرام کرتے ہیں ذرا چل کر دیکھیں کہ وہ کس شغل میں مصروف ہے۔ امیر معاویہؓ گئے اور حضرت عبداللہؓ کو گانا سنتے دیکھ کر واپس آ گئے۔ رات کے پچھلے پہر حضرت عبداللہؓ بڑے سوز و گداز سے تلاوتِ قرآن میں مشغول ہو گئے۔ امیر معاویہؓ کے کان میں ان کی تلاوت کی آواز پڑی تو اہلیہ کے پاس جا کر کہا کہ تم نے ہمیں جو سنوایا تھا اب چل کر اس کا جواب سن لو۔

حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ یزید بن معاویہؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک بہت بڑی رقم حضرت عبداللہؓ کی خدمت میں مدینہ منورہ بھیجی۔ حضرت عبداللہؓ نے اس رقم کو ہاتھ تک نہ لگایا اور کھڑے کھڑے ایک ایک پائی اہلِ مدینہ میں لٹا دی۔

ایک دفعہ ایک غریب اعرابی حاکمِ مدینہ مروان بن الحکم کے پاس جا کر امداد کا سائل ہوا اس نے صاف جواب دے دیا۔ اعرابی وہاں سے حضرت عبداللہؓ کے دروازے پر پہنچا

اس وقت وہ حج کے لیے مکہ معظمہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ بہت سا سامان اونٹوں پر لاد کر پہلے روانہ کر چکے تھے اور اب صرف ان کی ذاتی سواری کا اونٹ دروازے پر لدا پھندا کھڑا تھا۔ اس پر جو سامان تھا اس میں اہلِ مکہ کو دینے کے لیے ایک خطیر رقم بھی تھی اور سامان کے دائیں جانب ایک قیمتی تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ حضرت عبداللہؓ اونٹ پر سوار ہونے کے لیے گھر سے نکلے تو اعرابی سامنے آگیا اور یہ اشعار پڑھنے لگا:

"آپ خاندانِ رسالت کے دُرِّ بے بہا ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عزیز ہیں۔ آپ سخی ہیں اور میں ایک قلاش اعرابی ہوں۔ امیرِ شہر مروان نے مجھے دھتکار دیا۔ مایوس ہوں لیکن اس امید پر آپ کے دروازے پر آیا ہوں کہ حکومت اپنے خزانے کے دروازے تو بند کر سکتی ہے لیکن آپ کے خزانے کے دروازے پر اس کا زور نہیں چل سکتا۔"

اعرابی کے اشعار سن کر حضرت عبداللہؓ نے سر جھکا لیا اور بولے:

"بھائی میرا سامان تو لد کر جا چکا اب صرف یہ اونٹ باقی رہ گیا ہے اسے تمام ساز و سامان اور مال و اسباب سمیت قبول کر۔ ہاں یہ خیال رہے کہ اس کی دائیں جانب جو تلوار لٹکی ہوئی ہے اس کو کسی غلط جگہ استعمال نہ کرنا۔ میں نے اسے ایک ہزار دینار میں خریدا تھا۔"

اعرابی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اونٹ کی مہار تھام کر دعائیں دیتا رخصت ہوا۔

ابن ابی الدنیاؒ اور حافظ ابنِ حجرؒ نے محمد بن سیرینؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بے حد مستغنی المزاج تھے اور لامحدود اخراجات کے باوجود ناجائز مال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ ایک بڑے زمیندار نے اپنے کسی معاملہ میں انہیں امیر المومنین سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ انہوں نے ایسے مدلل طریقے سے بات کی کہ اس زمیندار کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ اس نے شکرانے کے طور پر انہیں چالیس ہزار کی رقم بھیجی۔ حضرت عبداللہؓ نے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسے واپس کرتے ہوئے فرمایا،

"ہم اپنے احسان کو بیچا نہیں کرتے۔"

حضرت عبداللہؓ اگرچہ ایک کامیاب تاجر تھے اور ان کی آمدنی نہایت کثیر تھی لیکن

اُن کی جود و سخا اور داد و دہش کی بھی کوئی نہایت نہیں تھی۔ اسی وجہ سے کئی بار قرض لینے کی نوبت آجاتی تھی۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت زبیرؓ بن العوام نے شہادت پائی تو اُن کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے عبداللہ بن جعفرؓ سے کہا کہ والد کی یادداشتوں میں دس لاکھ کا قرض آپ کی طرف نکلتا ہے۔ انہوں نے جواب دیا، "بے شک زبیرؓ کا دس لاکھ میرے ذمہ ہے تم جب چاہو یہ رقم مجھ سے وصول کرلو۔"

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ تمام عمر اپنی فیاضی اور سخاوت کو کمال وضعداری سے نباہتے رہے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آخری عمر میں جب حضرت عبداللہؓ کے قویٰ مضمحل ہو گئے تو ان کا کاروبار ماند پڑ گیا۔ دوسری طرف عبدالملک بن مروان نے ان کا وظیفہ بند کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مالی حالت پتلی ہو گئی۔ انہیں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی تو کوئی فکر نہ تھی، البتہ مخلوقِ خدا کی دل کھول کر خدمت نہ کر سکنے کا بڑا قلق تھا۔ دل شکستگی کے عالم میں ایک جمعہ کو نماز کے بعد بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی کہ:

"الٰہی تو نے مجھے ایک ایسی عادت ڈال دی جو مجھ سے کبھی ترک نہ ہو سکی۔ اب اس کی مقدرت نہیں رہی تو مجھے دنیا میں ذلیل کرنے کے بجائے اپنے پاس بُلا لے۔"

عمقِ قلب سے نکلی ہوئی یہ دعا فوراً درِ اجابت پر پہنچی اور اگلے جمعہ کو اہلِ مدینہ نے ان کی وفات کی ولدوز خبر سن لی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہؓ بن شہاب زُہری

تاریخ میں عبداللہ الاصغر کے نام سے مشہور ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے :

عبداللہؓ بن شہاب بن حارث بن زہرہ بن کلاب۔

فقیہ الاُمّت حضرت عبداللہؓ بن مسعود ان کے ماموں تھے اور مشہور محدّث امام شعبیؒ ان کے نواسے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ ننھیال کی طرف سے امام زُہری کے بھی جَدّ تھے۔

حضرت عبداللہؓ بن شہاب نے بعثتِ نبویؐ کے ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کیا اور سابقون الاوّلون کی مقدس جماعت میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ جب مشرکینِ مکّہ نے اہلِ حق کو اپنے جور و تعدّی کا نشانہ بنایا تو حضرت عبداللہؓ بھی ان کے دستِ ستم سے محفوظ نہ رہ سکے۔ جب مشرکین کا ظلم و ستم انتہا پر پہنچ گیا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن شہاب بھی ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے حبشہ کے غربت کدہ ہی میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور اسی سرزمین کو اپنا مدفن بننے کا شرف بخشا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سعیدؓ بن یربوع مخزومی

(۱)

ایک مرتبہ ایک ضعیف العمر صاحبِ رسولؐ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہُوئے تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا۔

"مجھ میں اور آپ میں کون بڑا ہے؟"

حضورؐ کی مُراد یہ تھی کہ عمر میں کون بڑا ہے۔ ان صاحبِ رسولؐ کی عمر حضورؐ کی عمر مبارک سے بہت زیادہ تھی لیکن ان کو کسی لحاظ سے بھی حضورؐ سے بڑا کہلانا پسند نہیں تھا۔ فوراً عرض کیا۔

"یارسولؐ اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، آپؐ مجھ سے بہت بڑے اور بہتر ہیں، البتہ میں آپؐ سے پہلے پیدا ہُوا تھا۔"

یہ کبیر السن صاحبِ رسولؐ جن کو حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قدر ادب ملحوظ تھا، حضرت سعیدؓ بن یربوع تھے۔

(۲)

سیّدنا حضرت ابوہود سعیدؓ بن یربوع قریش کے خاندانِ مخزومؓ کے چشم و چراغ تھے۔

سلسلۂ نسب یہ ہے۔

سعیدؓ بن یربوع بن عنکثہ بن عامر بن مخزوم

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مدینہ منوّرہ کی طرف ہجرت فرمائی، سعیدؓ ستّر برس کے پیٹے میں تھے اور کفر و شرک کی بھُول بھلیّوں میں بھٹک رہے تھے۔ فتح مکّہ سے کچھ عرصہ پہلے ان کے سینے میں یکایک شمعِ ہدایت ضوفگن ہوئی اور وہ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر

ہو کر شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو گئے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کا نام صرم تھا۔ قبولِ اسلام کے وقت جب انہوں نے حضورؐ کو اپنا نام بتایا تو آپؐ نے فرمایا۔ صرم نہیں بلکہ آج سے تم سعیدؓ ہو" چنانچہ انہوں نے تاریخ میں "سعیدؓ" ہی کے نام سے شہرت پائی اور اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اس نام کا اہل ثابت کیا۔ مشرّف بہ اسلام ہونے کے بعد انہوں نے مدینہ منورہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعیدؓ ان دس ہزار نفوسِ قدسی میں شامل تھے جن کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہُوا۔ غزوہ حنین کے وقت ان کی عمر ۷۸ برس کی تھی لیکن انہوں نے بڑے جوش و خروش سے بنو ہوازن کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ امام حاکمؒ نے "مُستدرک" میں لکھا ہے کہ حضورؐ نے حنین کے مالِ غنیمت میں سے انہیں پچاس اونٹ مرحمت فرمائے۔

(۳)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت سعیدؓ قریب قریب گوشہ نشین ہو گئے اور اپنا بیشتر وقت عبادتِ الٰہی میں صرف کرنے لگے۔ کیونکہ بڑھاپے کے باعث قواء مضمحل ہو گئے تھے اور کسی لڑائی میں عملاً شریک نہیں ہو سکتے تھے حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں وہ آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہُوا تو وہ بہ نفسِ نفیس حضرت سعیدؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اظہارِ ہمدردی کیا اور پھر فرمایا "میں جانتا ہوں کہ اس حالت میں آپ کے لیے مسجد تک جانا بہت مشکل ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ جیسا شخص مسجدِ نبویؐ میں جمعہ اور نماز باجماعت سے محروم نہ ہو۔

حضرت سعیدؓ نے کہا، کسی کی راہنمائی کے بغیر مسجدِ نبویؐ تک پہنچنا میرے لیے ممکن نہیں، اور راہنما میرے پاس کوئی نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا "آپ کو راہنما مل جائے گا،" چنانچہ امیر المومنینؓ نے انہیں ایک راہنما دے دیا۔ وہ اس کی مدد سے باقاعدہ مسجد پہنچتے تھے اور جماعت اور جمعہ کبھی ترک نہ کرتے تھے۔

حضرت سعیدؓ نے امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت ۵۴ھ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ایک سو چوبیس برس کی تھی۔ ان سے چند احادیث بھی مروی ہیں۔

حضرت سعیدؓ بن یربوع نے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ حالتِ کفر میں گزارا، لیکن قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے اپنے حُسنِ عمل سے گزشتہ زندگی کی تلافی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ شوقِ جہاد، ادبِ رسولؐ اور شغفِ عبادت ان کے صحیفہ حیات کے زرّیں ابواب ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ہاشم رضؓ بن عُتبہ زُہری

(۱)

عُتبہ بن ابی وقاصؓ مالک وہی شخص تھا جس نے غزوۂ اُحد (شوال ۳ھ) میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر مار کر شدید زخمی کر دیا تھا اور جس کی بابت اس کے چھوٹے بھائی حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ نے فرمایا تھا کہ عتبہ کی اس حرکت کی وجہ سے میں اس کا جس قدر جانی دشمن ہو گیا تھا کسی کا نہ ہوا تھا —— اللہ کی شان دیکھئے کہ اسی عتبہ کے فرزند کو فتح مکہ (رمضان المبارک ۸ھ) کے موقع پر قبولِ اسلام کی سعادت نصیب ہوئی اور اس نے صفحۂ تاریخ پر اپنی شجاعت اور سرفروشی کے ایسے نقوش ثبت کیے کہ ان کو دیکھ کر عروقِ مردہ میں زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے —— اواخرِ عہدِ رسالت میں اسلام کے قوی دست و بازو بننے والے یہ نوجوان حضرت ہاشمؓ بن عتبہ تھے۔

حضرت ہاشم رضؓ بن عتبہ کا تعلق قریش کے خاندان بنو زہرہ سے تھا۔ وہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فاتحِ عراقِ عرب کے حقیقی بھتیجے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

ہاشمؓ بن عتبہ بن ابی وقاص مالک بن اہیب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لوئی۔

ان کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت میں کلاب پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ سے مل جاتا ہے۔ ان کے دادا ابی وقاص مالک حضورؐ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنتِ وہیب بن عبد مناف کے چچا زاد بھائی تھے اس نسبت سے عتبہ بن ابی وقاص حضورؐ کا ماموں زاد بھائی اور ہاشمؓ حضورؐ کے بھتیجے تھے۔

(۲)

حضرت ہاشمؓ بن عتبہ فطری طور پر بڑے جی دار اور نڈر تھے اور ہنوز بہرہ کے نامور بہادروں میں شمار ہوتے تھے۔ چونکہ وہ اواخرِ عہدِ رسالت میں سعادت اندوزِ اسلام ہوئے تھے اس لیے حضورؐ کے سامنے کوئی خاص کارنامہ انجام دینے کا موقع نہ ملا۔ راہ حق میں ان کے سرفروشانہ کارناموں کا آغاز اس وقت ہوا جب خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں ایک دستہ فوج کا سپہ سالار بناکر حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کی مدد کے لیے شام روانہ کیا۔ یہ ۱۳ھ ہجری کا واقعہ ہے۔ خلیفۃ الرسولؐ کے حکم پر حضرت ابوعبیدہؓ شام کی مہم پر تشریف لے گئے تو وہاں سے انہوں نے ہرقل کی زبردست جنگی تیاریوں کا حال دربارِ خلافت کو لکھ بھیجا اور ساتھ ہی امداد کی درخواست کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جن اصحاب کو کمک دے کر شام بھیجا ان میں سے ایک ہاشمؓ بن عتبہ تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بلاوے پر وہ بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے تو صدیقِ اکبرؓ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

> "ہاشم یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جن کی مشرکوں سے جہاد کرنے کے لیے مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جن کی شجاعت، تدبیر، فراست اعلیٰ اخلاق اور خیر خواہی پر مسلمانوں کو دلی اعتماد ہے۔ مجاہدینِ شام نے مجھ سے مدد مانگی ہے اس لیے تم کمک لے کر روانہ ہو جاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ ابوعبیدہؓ کے پاس جاؤ یا یزیدؓ بن ابوسفیانؓ کے پاس۔"

حضرت ہاشمؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کے پاس جانا پسند کیا

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فضائلِ جہاد پر ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا۔ ان کی تقریر سن کر لوگ حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کی قیامگاہ پر جمع ہونے شروع ہوئے جب ایک ہزار مجاہدین جمع ہو گئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کو ہدایت فرمائی کہ وہ ان مجاہدین کو ساتھ لے کر فوراً شام روانہ ہو جائیں۔ اس موقع پر

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی موجود تھے انہوں نے حضرت ہاشمؓ سے فرمایا :

"برادر زادے اس بات کا خیال رکھنا کہ تیری تلوار کی ہر ضرب اور تیرے نیزے کا ہر وار اللہ جل شانہٗ کی رضامندی کے لیے ہو۔ یاد رکھ تو دنیا سے جانے والا ہے اور جلد اللہ کے حضور پیش ہونے والا ہے۔ تیرے عمل کے سوا کچھ ساتھ نہ جائے گا۔ اس لیے تیرا ہر عمل نیک ہونا چاہیے۔"

حضرت ہاشمؓ نے عرض کیا :۔

"چچا جان! آپ فکر نہ کیجئے اگر میں راہِ راست پر نہ چلا تو خود میری بربادی ہے۔ میرا چلنا اور ٹھہرنا، بیٹھنا اور اٹھنا، میری تیغ زنی اور نیزہ بازی اگر ریاکاری کے خیال سے ہوئی تو میری ہلاکت یقینی ہے۔"

اس کے بعد حضرت ہاشمؓ نے کمک لی اور شام پہنچ کر حضرت ابوعبیدہ کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

(۳)

حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کی آمد سے شام میں اسلامی لشکر کو بڑی تقویت ملی کیونکہ وہ ایک آزمودہ کار مردِ میدان تھے۔ رومیوں کے خلاف متعدد معرکوں میں وہ حضرت خالدؓ بن ولید سیف اللہ کے دوش بدوش اس بے جگری سے لڑے کہ ہر طرف ان کی شجاعت شہامت کی دھاک بیٹھ گئی۔ مؤرخین نے فحل اور یرموک کے مشہور معرکوں میں ان کی جانبازی اور پامردی کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ جنگ فحل (ذیقعدہ ۱۴ھ) میں حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت ہاشمؓ کو میسرہ کا افسر بنایا۔ ایک موقع پر رومیوں نے مسلمانوں کے میسرہ پر اس زور کا حملہ کیا کہ حضرت ہاشمؓ کو مسلمانوں کے قدم اکھڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت رومیوں کا قلب لشکر بالکل محفوظ تھا اور ڈر تھا کہ اگر اس نے بھی اسلامی لشکر پر دھاوا بول دیا تو صورتِ حال سخت مخدوش ہو جائے گی۔ اس نازک گھڑی میں حضرت ہاشمؓ نے اپنے علم کو جنبش دی اور للکار کر کہا :

"خدا کی قسم جب تک میں اس کو رومیوں کے قلب میں پہنچ کر نہ گاڑ دوں گا،

واپس نہ آؤں گا، تم میں سے جس کی ہمت ہے میرا ساتھ دے ورنہ علیحدہ ہو جائے۔"

یہ کہہ کر گھوڑے سے کود پڑے اور ہاتھ میں سپر لے کر دشمن کی صفوں میں مردانہ وار گھس گئے، ان کی تقریر نے مسلمانوں کو شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ رومیوں کے قلب کی طرف بڑھے۔ رومیوں نے ان پر تیروں کا مینہ برسا دیا۔ مسلمان ان کی زد سے بچنے کے لیے جھک جاتے تھے اور سپر سے آڑ کر لیتے تھے۔ اس وقت حضرت ہاشمؓ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"مسلمانو! میری جان تم پر قربان ہو، کیا دیکھتے ہو، دونوں جہان کی نعمت تمہارے سامنے ہے۔"

غرض اسی طرح لڑتے بھڑتے وہ رومی قلب کے اس قدر قریب پہنچ گئے کہ نوبت تیر و خدنگ سے گزر کر تیغ و شمشیر تک پہنچی۔ ایک رومی نے تاک کر حضرت ہاشمؓ پر بھرپور وار کیا وہ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گئے اور پھر اپنی تلوار کی ایک ہی ضرب سے اس کو ڈھیر کر دیا۔ اسی اثناء میں حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابو عبیدہؓ بھی اپنے دستوں کے ساتھ ان کی مدد کو پہنچ گئے اور سب مل کر بلائے ناگہانی کی طرح رومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ایک گھنٹہ کی خونریز جنگ کے بعد رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ نہایت بدحواسی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح حضرت ہاشمؓ بن عتبہ اور دوسرے مجاہدین کی جانبازی کی بدولت مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی۔

جنگِ یرموک (رجب ۱۵ھ) کا شمار شام کی فیصلہ کن لڑائیوں میں ہوتا ہے اس جنگ میں حضرت ہاشمؓ بن عتبہ پیدل فوج کے افسر تھے۔ یہ ہولناک لڑائی کئی دن تک جاری رہی۔ اس دوران میں رومیوں سے کئی معرکے ہوئے۔ ان سب میں حضرت ہاشمؓ سر بکف ہو کر لڑے اور سرفروشی کا حق ادا کر دیا۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے "الاستیعاب" میں بیان کیا ہے کہ "جنگِ یرموک میں حضرت ہاشمؓ کی ایک آنکھ شہید ہو گئی"۔ لیکن جب ہم یرموک کے بعد پیش آنے والی لڑائیوں میں حضرت ہاشمؓ کو پہلے کے سے جوش ا

جذبے کے ساتھ دشمن سے نبرد آزما ہوتے دیکھتے ہیں تو یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آنکھ کی شہادت نے ان کے جوشِ ایمان پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور زخم مندمل ہوتے ہی وہ دلولۂ تازہ کے ساتھ پھر میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔

(۴)

عہدِ صدیقی و فاروقی میں شام اور ایران سے مسلمانوں کی جو معرکہ آرائیاں ہوئیں ان کے سالِ وقوع کے بارے میں مؤرخین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے جنگِ یرموک کا سالِ وقوع ۱۳ھ اور بعض نے ۱۵ھ لکھا ہے۔ اسی طرح بعض نے عراقِ عرب کی فیصلہ کُن لڑائی "جنگِ قادسیہ" کا سالِ وقوع ۱۴ھ اور بعض نے ۱۶ھ بیان کیا ہے تاہم جمہور مؤرخین کے نزدیک جنگِ قادسیہ، جنگِ یرموک کے بعد پیش آئی۔ حضرت ہاشمؓ ان دونوں جنگوں میں شریک ہوئے اور دونوں میں اپنی شجاعت و بسالت کا سکہ بٹھا دیا۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں انہیں جنگِ قادسیہ کا بطلِ خاص ٹھہرایا ہے۔ جنگِ قادسیہ اس لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مسلمانوں کی فتح نے عراقِ عرب سے کسروی سطوت و اقتدار کا جنازہ نکال دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے عراقِ عرب کی مہم کا قائد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو مقرر کیا تھا۔ جب وہ عراقِ عرب میں داخل ہوئے تو یزدجرد شاہِ ایران نے ایک نامور ایرانی سردار رستم بن فرخ زاد کو ایک جرار لشکر اور بڑے ساز و سامان کے ساتھ مسلمانوں سے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ حضرت سعدؓ نے ایرانیوں کی ہولناک جنگی تیاریوں کی اطلاع حضرت عمر فاروقؓ کو دی تو انہوں نے حضرت ابو عبیدہؓ کو فرمان بھیجا کہ سعدؓ کی مدد کے لیے فی الفور شام سے کمک بھیجو۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ فرمان ملتے ہی حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کو چھ ہزار سوار دے کر عراقِ عرب کی طرف روانہ کر دیا۔ حضرت ہاشمؓ نے حضرت قعقاعؓ بن عمرو تمیمی کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنایا اور ایک ہزار سوار ان کی ماتحتی میں دے کر آگے روانہ کیا۔ ان کے پیچھے وہ خود بھی باقی فوج کے ساتھ بسرعت تمام عراقِ عرب کے

میدانِ جہاد کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی یہ امدادی فوج راستے ہی میں تھی کہ قادسیہ کے مقام پر ایرانیوں اور مسلمانوں کے درمیان خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت ہاشمؓ کی فوج کا ہراول عین اس وقت میدانِ جنگ میں پہنچا جب ایرانی مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس کمکی فوج کی آمد مسلمانوں کے لیے تائیدِ غیبی سے کم نہ تھی۔ ہراول کے افسر حضرت قعقاعؓ عرب کے نامی بہادر تھے اور اکیلے ہزار سواروں کے برابر مانے جاتے تھے وہ اگرچہ طویل سفر کے بعد قادسیہ پہنچے تھے لیکن انہوں نے ایک لمحہ بھی دم نہ لیا اور قہرِ خداوندی بن کر ایرانیوں پر ٹوٹ پڑے۔ نامور ایرانی سردار بہمن جادویہ اور کئی دوسرے ایرانی جنگجو ان کے ہاتھ سے مارے گئے لیکن دشمن کے جنگی ہاتھی مسلمانوں کے راستے میں بُری طرح حائل ہو گئے کیونکہ مسلمانوں کے گھوڑے ان کو دیکھ کر بدک بدک جاتے تھے۔ حضرت قعقاعؓ نے اس مصیبت کا تدارک یوں کیا کہ اونٹوں پر بڑی بڑی جھولیں ڈال کر انہیں بھی ہاتھیوں کی طرح مہیب بنا دیا۔ ایرانیوں کے گھوڑے انہیں دیکھ کر بدکتے اور مسلمان ان کے سواروں کو اپنے نیزوں پر رکھ لیتے۔ ایرانی سپہ سالار رستم نے اب پیدل فوجوں کو سواروں کی مدد کے لیے آگے بڑھایا۔ یہ فوجیں آندھی اور طوفان کی طرح مسلمانوں پر حملہ آور ہوئیں۔ مسلمانوں نے بڑی ہمت سے اس طوفانی حملے کو روکا۔ اس زور کا رن پڑا کہ دور دور تک زمین خون سے رنگین ہو گئی۔ دوسری طرف مدائن سے ایرانی فوجوں کو برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ حضرت قعقاعؓ، عمرو بن معدی کرب اور اشعث بن قیس اپنے اپنے دستوں کی معیت میں اس جوش اور وارفتگی سے لڑے کہ ایرانیوں کا منہ پھیر کر رکھ دیا حضرت قعقاعؓ دشمن کی لاشوں پر لاشیں گراتے کبھی میدانِ جنگ کے اس کنارے پر ہوتے اور کبھی دوسرے کنارے پر۔ جس طرف رخ کرتے، صفوں پر صفیں الٹ دیتے۔ شام تک میدانِ رزم گرم رہا۔ جب ظلمتِ شب اپنے سائے چاروں طرف پھیلانے لگی تو دونوں فوجیں اپنی قیام گاہوں کو لوٹیں۔ اس دن دس ہزار ایرانی مارے گئے اور دو ہزار مسلمانوں نے جامِ شہادت پیا۔

اگلے دن علی الصباح حضرت ہاشمؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ میدانِ جنگ کے

قریب آ پہنچے۔ انہوں نے بھی حضرت قعقاعؓ کے مشورے کے مطابق اپنی فوج کے کئی دستے بنا دیئے جو وقفہ وقفہ کے بعد تکبیر کے نعرے لگاتے میدان میں داخل ہوئے۔ آخری دستے میں سات سو جانباز تھے جن کی قیادت خود ہاشمؓ کر رہے تھے۔ وہ تیر برساتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھستے چلے گئے یہاں تک کہ دریا تک پہنچے۔ وہاں سے پلٹے اور پھر چھپلے طلیکن کسی کو انہیں روکنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ حضرت ہاشمؓ حضرت قعقاعؓ اور دوسرے سرفروشوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج لڑائی کا فیصلہ کر کے رہیں گے۔ رات گئے تک دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ ایرانی جان توڑ کر لڑے لیکن مسلمانوں کے پرجوش حملوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ مسلمان لڑتے لڑتے رستم کی نشست گاہ تک پہنچ گئے۔ اب وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے حفاظتی دستے کو ساتھ لے کر مردانہ وار لڑا لیکن مسلمان سرفروشوں، ہاشمؓ، قعقاعؓ، عمروؓ بن معدی کربؓ، قیسؓ بن اشعث اور ان کے ساتھیوں نے اس کے آہن پوش حفاظتی دستے کے پرخچے اڑا دیئے اور وہ خود شدید زخمی ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہلالؓ بن علقمہ نامی ایک مجاہد نے تعاقب کیا۔ رستم نے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ ہلالؓ نے ٹانگ پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا اور سر کاٹ کر لاش خچروں کے پاؤں میں ڈال دی، پھر وہ رستم کے تخت پر چڑھ گئے اور زور سے پکارے: "میں نے رستم کا کام تمام کر دیا ہے۔"

اس آواز کے سنتے ہی ایرانیوں کے ہوش و حواس بالکل جاتے رہے اور انہیں ایسی عبرت ناک شکست ہوئی کہ تخت کسریٰ کی بنیادیں ہل گئیں۔

۵

قادسیہ کی فتح کے بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اپنے لشکر کے ساتھ وہیں ٹھہر گئے تاکہ مجاہدین کی تکان دور ہو جائے اور دربارِ خلافت سے بھی تازہ ہدایات موصول ہو جائیں۔ دو ماہ میں مسلمان تازہ دم ہو گئے اور دربارِ خلافت سے بھی ایران کے دارالسلطنت مدائن کی طرف پیشقدمی کرنے کا حکم موصول ہو گیا۔ اسی اثناء میں حضرت سعدؓ کو اطلاع

ملی کہ ایرانی بابل میں جمع ہو کر جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ اطلاع ملتے ہی خواتین، بچوں، اور معذوروں کو تو قادسیہ ہی میں چھوڑا اور ان کی حفاظت کے لیے چند فوجی دستے متعین کر کے باقی لشکر کے ساتھ بابل کا رُخ کیا۔ مقدمتہ الجیش کے افسر زہرہؓ بن حیوۃ تھے۔ وہ حضرت سعدؓ کے حکم کے مطابق پہلے روانہ ہو گئے۔ راستے میں بُرس کے مقام پر ایک ایرانی سردار بصیری ان کے مقابل ہوا۔ زہرہ نے اسے شکست فاش دی اور وہ بابل کی طرف بھاگ گیا۔ بُرس کے شہریوں نے صلح کر لی اور بابل تک دریائے دجلہ اور اس کی نہروں اور ندیوں کے تباہ شدہ پل دوبارہ تیار کرنے میں مسلمانوں کو بڑی مدد دی۔

اس طرح اسلامی افواج بڑی تیزی سے بابل کے قریب جا پہنچیں۔ بابل میں مقیم ایرانی فوج مسلمانوں کی یلغار کی تاب نہ لاسکی اور بہت جلد ہتھیار پھینک کر شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ حضرت سعدؓ نے بابل میں قیام کیا اور زہرہؓ بن حیوۃ کو حضرت ہاشمؓ کے ساتھ مدائن کی طرف پیشقدمی کرنے کا حکم دیا۔ زہرہ برق رفتاری سے آگے بڑھے اور کوثیٰ کو مسخّر کرتے ہوئے مدائن کے قریب پہنچ گئے۔ یہ عظیم الشان شہر دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد تھا۔ مشرقی کنارے کی آبادی کو مدائنِ قصویٰ کہتے تھے اور شاہی محل و دفاترِ حکومت یہیں تھے۔ مغربی کنارے کی آبادی کو بہرشیر یا مدائنِ دنیا کہتے تھے۔ بہرشیر کو بعض مؤرخین نے ایک الگ شہر لکھا ہے لیکن فی الحقیقت وہ مدائنِ خاص کے متعلقات میں تھا اس کے قریب ساباط کی چھاؤنی تھی جس میں چیدہ ایرانی جانبازوں پر مشتمل ایک شاہی رسالہ رہتا تھا۔ اس رسالہ کے جانباز ہر روز صبح اٹھ کر حلف اٹھاتے تھے کہ جب تک ہمارے دم میں دم ہے ہم سلطنتِ ایران کی حفاظت کریں گے۔ یزدجرد شاہِ ایران نے اپنا ایک پالتو شیر بھی اس رسالہ کے سپرد کر رکھا تھا کہ ضرورت پڑے تو اسے دشمن پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ رسالہ ساباط کے قلعے سے باہر نکل کر بڑے جوش و خروش سے مسلمانوں کے مقابل ہوا۔ کسریٰ کا شیر اس کے آگے آگے تھا وہ غرّا کر مسلمانوں پر جھپٹا۔ حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کو جوش آگیا انہوں نے آگے بڑھ کر اس صفائی سے تلوار کا ہاتھ مارا کہ شیر دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ اس کے

بعد مجاہدین نے ایرانیوں کو اپنی تلواروں پر رکھ لیا۔ بہت سے مارے گئے اور باقی نے بھاگ کر قلعہ بُہر شیر میں پناہ لی۔ اسی اثناء میں حضرت سعدؓ بھی اپنی فوج کے ساتھ ساباط پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کی شیر افگنی کا حال سنا تو فرطِ مسرت سے ان کی پیشانی چوم لی اور ان کی جوانمردی کو بہت سراہا۔ اس کے بعد حضرت سعدؓ نے بُہر شیر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کتنے عرصہ جاری رہا؟ اس کے بارے میں مؤرخین میں سخت اختلاف ہے۔ بہرصورت چند ماہ کے محاصرے کے بعد بُہر شیر مسخر ہو گیا۔ کچھ عرصہ بُہر شیر میں قیام کے بعد حضرت سعدؓ نے دریائے دجلہ عبور کر کے مدائنِ خاص (قصوی) پر بھی قبضہ کر لیا اور یزدجرد شہر سے فرار ہو کر حلوان چلا گیا۔

علامہ بلاذری نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے کہ فتح قادسیہ کے بعد حضرت سعدؓ نے حضرت ہاشمؓ بن عتبہ کو سوادِ دجلہ کے علاقوں کی تسخیر پر مامور کیا۔ انہوں نے یہ مہم بڑی کامیابی سے سرانجام دی۔ اس کے بعد وہ اشعث بن قیس کی معیت میں دقوقا، خانیجار اور باجرمی کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھے اور سن بار کو عبور کر کے شہر زور کی سرحد تک پہنچ گئے۔ ادھر یزدجرد حلوان پہنچ کر پھر مسلمانوں کے خلاف بخت و پز میں مشغول ہو گیا۔ اس کے حکم سے رستم کے بھائی خرزاد بن فرخ زاد نے جلولاء کے مقام پر ایک بہت بڑا لشکر مرتب کیا اور بڑے زور شور سے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کی تیاری کی۔ حضرت سعدؓ کو اطلاع ملی تو انہوں نے سارے حالات حضرت عمر فاروقؓ کو لکھ بھیجے۔ وہاں سے حکم آیا کہ ہاشمؓ بن عتبہ کو بارہ ہزار فوج کے ساتھ جلولاء بھیج دو اور ان کے ساتھ قعقاع بن عمرو کو مقدمۃ الجیش کا افسر بنا کر بھیجو۔ حضرت سعدؓ نے امیر المؤمنین کی ہدایت کے مطابق حضرت ہاشمؓ کو بارہ ہزار جاں بازوں کے ہمراہ جلولاء روانہ کیا۔ ایرانیوں کو مسلمانوں کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے مدافعت کی خوب تیاری کی۔ شہر کے گرد خندق کھود کر اس کے آس پاس گوکھرو بچھا دیئے اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت ہاشمؓ نے شہر کا محاصرہ کر لیا جو کئی ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں ایرانی کئی دفعہ قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے لیکن ہر بار منہ کی کھائی۔ عرب مؤرخین ایسے

معرکوں کی تعداد اسّی بتلاتے ہیں۔ شہر میں خوراک اور سامانِ حرب کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور مسلمانوں کی تعداد سے کئی گنا مسلح جنگجو شہر کی حفاظت کر رہے تھے اس لیے ایرانیوں کے حوصلے بلند تھے۔ ایک دن وہ بڑے زور شور کے ساتھ قلعہ سے نکلے اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ اتفاق سے اس وقت ایسی سیاہ آندھی اٹھی کہ اس نے زمین و آسمان کو ڈھانپ لیا۔ ایرانی افراتفری کے عالم میں پیچھے ہٹے تو قعقاعؓ فوج کے چند دستوں کے ساتھ قلعہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہاں اس زور کا رن پڑا کہ نوبت تیروں، نیزوں اور تلواروں سے گزر کر خنجروں تک پہنچی۔ دفعتہً غل ہوا کہ سپہ سالار ہاشمؓ بھی ساری فوج کے ساتھ آ پہنچے ہیں۔ اب قعقاعؓ اور ان کے ساتھیوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایرانیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں ہاشمؓ بھی آ پہنچے اور مسلمانوں نے بھاگتے ہوئے ایرانیوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔ طبری کا بیان ہے کہ اس معرکے میں ایک لاکھ ایرانی مارے گئے اور تین کروڑ کا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ یزدجرد نے سقوطِ جلولاء کی خبر سنی تو حلوان سے رے بھاگ گیا۔ حضرت ہاشمؓ نے قعقاعؓ کو بھیج کر حلوان پر بھی قبضہ کر لیا۔ مؤرخین نے قادسیہ کے بعد جلولاء کے معرکے کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کی فتح تمام تر حضرت ہاشمؓ کی کوششوں کی مرہونِ منت تھی۔

(۶)

حضرت ہاشمؓ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی شہادت کے بعد وہ ان کو سب سے بڑھ کر خلافت کا اہل اور مستحق سمجھتے تھے۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کی المناک خبر سنی تو فوراً جلیل القدر صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اب ہمیں اس اُمّت کے بہترین انسان کے ہاتھ پر بیعت کر لینی چاہیئے۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا، ابھی جلدی کی کیا ضرورت ہے، لیکن حضرت ہاشمؓ کو ایک لمحہ کی تاخیر بھی گوارا نہ تھی۔ اس وقت حضرت علیؓ مدینہ منورہ میں تھے اور حضرت ہاشمؓ کوفہ میں۔ انہوں نے اسی جگہ (عازمِ مدینہ ہونے سے پہلے ہی)

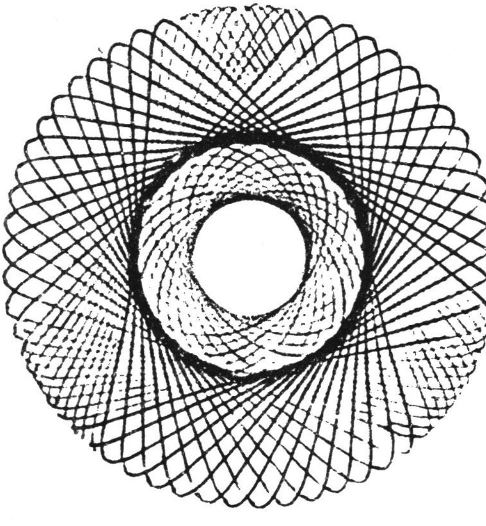
اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ یہ علیؓ کا ہاتھ ہے اور یہ میرا میں بیعت کرتا ہوں۔
اس کے بعد وہ بسرعت تمام مدینہ منورہ پہنچے اور حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔ حضرت علیؓ کو بھی ان پر بے حد اعتماد تھا۔ انہوں نے جنگ جمل کی تیاری شروع کی تو حضرت ہاشمؓ کو حضرت حسنؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کے ساتھ کوفہ بھیجا کہ اہل کوفہ کو اپنی حمایت پر آمادہ کریں۔ یہ اصحاب جس وقت کوفہ پہنچے وہاں کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ مسجد میں لوگوں کو لڑائی سے بچنے اور گوشہ نشین ہو جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ انہوں نے حضرت ابو موسیٰؓ سے کہا کہ اس قسم کا وعظ کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ آپ اس مسجد کو چھوڑ دیں اور جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ وہ خاموشی سے مسجد سے نکل گئے اور شام کے کسی گاؤں میں جا کر عزلت گزیں ہو گئے۔ جمل کی افسوسناک لڑائی شروع ہوئی تو حضرت ہاشمؓ شروع سے اخیر تک حضرت علیؓ کے دست و بازو بنے رہے۔ جنگ جمل کے بعد انہوں نے امیر معاویہؓ کے مقابلے میں حضرت علیؓ کی پرجوش حمایت کی اور صفین کے معرکوں میں شامی فوجوں کے خلاف سرکف رہے۔ جنگ کے آخری دور میں ایک دن حضرت علیؓ نے فوج کا شہ نشان (سب سے بڑا علم) حضرت ہاشمؓ کو مرحمت فرمایا۔ وہ شاہ نشان ہاتھ میں لے کر دن بھر لڑتے رہے۔ جب شام ڈھل گئی تو ان کے ساتھی منتشر ہو گئے لیکن وہ چند جانبازوں کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے۔ دشمن کے ایک سپاہی نے ان کے پاؤں پر وار کیا جس سے ایک پاؤں کٹ کر الگ ہو گیا لیکن اللہ رے شجاعت کہ اس کٹے ہوئے پاؤں کو زمین پر ٹیک ٹیک لڑتے رہے۔ ایک شامی حارث بن منذر تنوخی نے موقع پا کر نیزے کا وار کیا جس سے پیٹ چاک ہو گیا لیکن انہوں نے پھر بھی لڑائی سے ہاتھ نہ کھینچا۔ اسی اثناء میں حضرت علیؓ کا قاصد پیغام لایا کہ اپنا دستہ آگے بڑھاؤ۔ حضرت ہاشمؓ نے قاصد سے کہا: "ذرا میری حالت دیکھتے جاؤ"۔ قاصد نے ان کے پیٹ پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ جگہ جگہ سے چاک تھا۔ قاصد کے پلٹتے ہی زمین پر گر پڑے اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

ان کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے ان کے فرزند عبداللہ کو علمبردار بنایا۔ وہ

بھی شجاعت وشہامت میں اپنے باپ کی مثال تھے۔ جب تک جنگ ختم نہ ہوئی پوری شان کے ساتھ علمبرداری کا حق نباہتے رہے۔

حضرت ہاشمؓ بن عتبہ علم وفضل کے اعتبار سے بھی اونچا مرتبہ رکھتے تھے، لیکن ان کے نقوشِ سیرت پر شجاعت وبسالت کا پہلو اس قدر غالب آگیا کہ دوسرے اوصاف ومحاسن نمایاں نہ ہو سکے۔ علامہ ابن اثیرؒ نے "اُسدُ الغابہ" میں لکھا ہے کہ ہاشمؓ بڑے نامور بہادروں اور بلند مرتبہ فضلاء صحابہؓ میں سے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ



حضرت ابنِ ابی اَوفیٰ رضؓ

(۱)

ایک صاحبِ رسولؐ اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اس کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ قضائے الٰہی سے یہ بیٹی فوت ہو گئیں۔ باپ کو سخت صدمہ ہوا لیکن وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ ان کے گھر کی عورتیں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور رو رو کر بَین کرنے لگیں۔ ان صاحبِ رسولؐ نے فوراً اٹھ کر نہایت سختی سے عورتوں کو ایسا کرنے سے روکا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین کرنے سے منع فرمایا ہے ہاں تم اپنے غم کا اظہار آنسو بہا کر کر سکتی ہو۔ اس کے بعد مسنون طریقہ سے اپنی لختِ جگر کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور لوگوں سے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طریقہ سے نمازِ جنازہ پڑھایا کرتے تھے اس کے علاوہ کچھ کیا جائے تو یہ سُنّتِ نبوی کے مطابق نہ ہوگا۔

یہ صاحبِ رسولؐ جو اس قدر صابر تھے اور نازک سے نازک موقع پر بھی سُنّتِ رسولؐ سے سرِ مُو انحراف نہیں کرتے تھے حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ تھے۔

(۲)

حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ اصل نام باختلافِ روایت عبداللہ یا علقمہ تھا اور کنیت ابو معاویہ۔ لیکن وہ تاریخ میں ابنِ ابی اوفیٰؓ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق بنو اسلم بن افصیٰ سے تھا سلسلۂ نسب یہ ہے:

عبداللہ (یا علقمہ) بن ابی اوفیٰ خالدؓ بن حارث بن ابی اسید بن رفاعہ بن ثعلبہ بن ہوازن بن اسلم بن افصیٰ۔

والد حضرت ابی اوفیٰ خالدؓ بن حارث کو بھی قبولِ اسلام اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔ مسندِ احمد بن حنبل کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت مخلص صحابی تھے اور اکثر راہِ خدا میں اپنا مال صرف کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ صدقہ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے دُعا فرمائی۔

"الٰہی آلِ ابی اوفیٰ پر رحمت کر۔"

حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ ہجرتِ نبوی کے تقریباً پانچ سال بعد شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔ اہلِ سیر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ صلح حدیبیہ سے پہلے مسلمان ہوئے قیاس یہ ہے کہ انہوں نے ۵ھ یا ۶ھ میں کسی وقت قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا، وہ ان چودہ سو صحابہ کرامؓ میں شامل تھے جن کو صلح حدیبیہ (ذیقعدہ ۶ھ) کے موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی اور بیعتِ رضوان کی سعادت نصیب ہوئی۔ گویا وہ ان خوش بخت صحابہ میں سے ایک ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔ بیعتِ رضوان کے بعد وہ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے اور اپنی تلوار کے جوہر دکھائے۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ خیبر میں ایک دن ہم بھوک سے نڈھال ہو گئے۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے ہم نے گدھا ذبح کیا اور اس کا گوشت ہانڈیوں میں ڈال کر پکانے لگے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منادی کرادی کہ ہانڈیوں کو الٹ دو اور گدھے کا گوشت نہ کھاؤ۔

رمضان ۸ھ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ کو حضورؐ کے ہمرکاب ان دس ہزار نفوسِ قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جن کے بارے میں سینکڑوں سال پہلے کتاب استثناء میں یوں پیشین گوئی کی گئی تھی۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا وہ فاران سے دس ہزار

قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک آتشیں (نورانی) شریعت تھی۔"

فتح مکہ کے بعد حضرت ابن ابی اوفیٰؓ نے غزوۂ حنین میں دادِ شجاعت دی۔ علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں ان کا ہاتھ شدید زخمی ہو گیا۔ اس زخم کا نشان اس ہاتھ پر مدتوں باقی رہا۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ نے خود اس واقعہ کا ذکر کیا ہے ــــ دوسرے جن غزوات میں حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ نے شرکت کی اہلِ سِیَر نے ان کی صراحت نہیں کی البتہ خود حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سات غزووں میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ مسندِ احمد بن حنبل اور بعض دوسری کتبِ حدیث میں ان سے روایت ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سات غزووں میں شریک ہوئے اور ہم کو ان میں سے اکثر غزووں میں سدِ رمق کے لیے جراد (ٹڈی) کھا کر گزارہ کرنا پڑا۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ایک غزوہ کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں سے مقابلے کے لیے نکلے تو آپؐ نے (لڑائی کا آغاز کرنے یا دشمن پر حملہ کرنے کے لیے) زوال کے وقت تک انتظار کیا اور صحابہ میں کھڑے ہو کر فرمایا کہ اے لوگو دشمن سے لڑنے کی خواہش نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے امن و عافیت مانگو اور جب جنگ چھڑ جائے تو پھر صبر اور استقلال سے کام لو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔ پھر آپؐ نے یہ دُعا کی، اے اللہ کتاب اتارنے والے! بادلوں کے چلانے اور برسانے والے اور لشکرِ کفّار کو شکست دینے والے، ان کو شکست دے اور ہماری مدد کر۔"

سنہ ۱۰ھ میں حضرت ابنِ ابی اوفیٰؓ نے حجۃ الوداع میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

(۴)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال (۱۱ھ) کے بعد حضرت ابن ابی اوفیؓ چار پانچ سال تک مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں کوفہ آباد ہوا تو وہ کوفہ چلے گئے اور اپنے قبیلہ اسلم کے محلے میں گھر بنا کر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت ابن ابی اوفیؓ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گوشہ عزلت میں گزارا، البتہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں جب خوارج نے شورش برپا کی تو وہ ان کے مقابلے کے لیے گوشۂ عزلت سے نکل آئے اور نہ صرف خود ان کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی ان کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دی اور اس سلسلہ میں ان کو حضورؐ کی وہ حدیث یاد دلائی جس میں آپؐ نے جنگ کی خواہش نہ کرنے اور جنگ چھڑ جائے تو ثابت قدم رہنے کی تلقین فرمائی تھی۔

حضرت ابن ابی اوفیؓ نے طویل زندگی پائی اور ۸۶ھ اور ۸۸ھ کے درمیان کسی وقت سفرِ آخرت اختیار کیا۔ آخری عمر میں بصارت نے جواب دے دیا تھا۔ امام حاکمؒ نے اپنی "مستدرک" میں لکھا ہے کہ حضرت ابن ابی اوفیؓ کی وفات سے پہلے کوفہ میں آباد ہونے والے دوسرے تمام صحابہؓ اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد کوفہ میں کوئی ایسی ہستی باقی نہ رہی جس نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا سے آنکھیں روشن کی ہوں۔

حضرت ابن ابی اوفیؓ کا شمار فضلاء صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ ان سے ۹۵ احادیث مروی ہیں جن میں سے دس متفق علیہ ہیں اور ۵ میں بخاری اور ایک میں مسلم منفرد ہیں۔ ان کے رواۃ میں حضرت عمروؓ بن مرہ، عدی بن ثابتؒ اور اعمشؒ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت ابن ابی اوفیؓ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بڑے لطف و انبساط سے لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ ارشادات موقع اور محل

سے خاص مناسبت رکھتے تھے۔ انہوں نے جو دعائیں حضورؐ سے سنی تھیں وہ بھی لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔ مسندِ ابوداؤد میں ان سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں قرآن میں سے کوئی چیز یاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے مجھ کو ایسی چیز سکھا دیجئے جو میرے لیے کافی ہو۔ آپؐ نے فرمایا، تو یہ پڑھ لیا کر

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

(یعنی پاک ہے اللہ اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ بہت بڑا ہے اور سوائے اللہ کی مدد کے کوئی قوت نہیں ہے)

اس شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ یہ تو اللہ کے لیے ہے میرے لیے کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا (اپنے لیے تو یہ کہہ)

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاھْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ

(یعنی اے اللہ مجھ پر رحم کر اور مجھ کو عافیت سے رکھ، مجھ کو ہدایت کر اور مجھ کو روزی دے)

پس اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس طرح اشارہ کیا اور ہاتھوں کو بند کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس شخص نے اپنے ہاتھوں کو بھلائی سے بھر لیا۔

ایک اور حدیث میں جو ترمذی شریف میں ان سے روایت کی گئی ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کوئی حاجت خدا سے رکھتا ہو یا کسی آدمی سے کوئی دینی یا دنیاوی حاجت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعت نماز پڑھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ثنا کرے پھر نبیؐ پر درود بھیجے اور پھر یہ دعا کرے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًى اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

(یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ایسا معبود جو بردبار اور بخشش کرنے والا ہے۔ پاک ہے اللہ مالک ہے عرش عظیم کا اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو دونوں جہان کا پروردگار ہے۔ اے اللہ میں تجھ سے ایسا عمل کرنا چاہتا ہوں جس سے تیری رحمت کے نزول کا مستحق قرار پاؤں اور چاہتا ہوں وہ عمل جو موجب ہو تیری بخشش کا اور چاہتا ہوں فائدہ پانا ہر نیکی سے اور سلامتی ہر گناہ سے میرے کسی گناہ کو بخشش سے نہ چھوڑ اور نہ میری کسی مشکل کو باقی رکھ اور میری کوئی حاجت نہ روک جو تیرے نزدیک پسندیدہ ہو اے رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے۔)

حضرت ابن ابی اوفیؓ اپنے علم وفضل کی بنا پر مرجع خلائق بن گئے تھے اور لوگ شرعی مسائل پوچھنے کے لیے اکثر ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بعض اصحاب نے ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی پیداوار کس طرح صرف فرمایا کرتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی تقسیم کا کوئی خاص طریقہ نہیں تھا بلکہ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے حصہ لے لیا کرتا تھا۔

ایک دفعہ حضرت ابو بردہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن ابی شداد میں بیع سلم[1] کے بارے میں اختلاف رائے ہو گیا۔ دونوں نے فیصلہ کے لیے ان کی طرف رجوع

---

[1] بیع سلم سے مراد وہ سودا ہے جس میں ایک فریق کسی جنس یا مال کے بدلے پیشگی رقم وصول کرتا ہے اور ایک خاص مدت کے بعد مال وصول کرتا ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں اس کو بیع سلف بھی کہتے ہیں۔

کیا تو انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی اور ان کو مطمئن کر دیا۔ صحیح بخاری میں ان سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانوں میں بھی گیہوں، جو، منقّیٰ اور کھجور میں بیع سَلَم کیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری ہی کی ایک اور روایت میں وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ اہل شام کے کاشتکاروں سے گندم، جو، اور انگور (منقّیٰ) میں مدت معیّنہ تک کے لیے مقررہ ناپ اور وزن میں سلم کیا کرتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا، کیا ان لوگوں سے جن کے پاس اصل مال موجود ہوتا۔ فرمایا، ہم ان سے اس کے متعلق نہیں پوچھتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ،

حضرت مالکؓ بن التیہّان انصاری

(۱)

حضرت مالکؓ بن التیہان جو تاریخ میں اپنی کنیت "ابوالہیثم" سے مشہور ہیں، مدینہ منورّہ کے ان چند سعید الفطرت انسانوں میں سے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں بھی توحید کے قائل تھے اور بت پرستی کو برا جانتے تھے۔ ان کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:-

ابوالہیثم مالک بن تیہان بن مالک بن عتیک بن عمرو بن عبدالاعلم بن عامر بن زعوراء بن جشم بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔

بعض اہل سیر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ خاندان بَلّی سے تعلق رکھتے تھے اور اوس کے خاندان عبدالاشہل کے حلیف تھے لیکن جمہور اربابِ سیر کی یہی رائے ہے کہ وہ خود انصاری الاوسی ہیں۔

سلہ نبوت میں حضرت اسعدؓ بن زُرارہ نجاری اپنے پانچ مدنی دوستوں کے ساتھ حج کے لیے مکہ گئے۔ حسنِ اتفاق سے منیٰ میں ان کی ملاقات سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گئی۔ حضور نے ان کو دعوتِ توحید دی تو ان سب نے بلا تامل اس پر لبیک کہا۔ دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو کر مدینہ واپس آئے تو حضرت اسعدؓ بن زُرارہ سب سے پہلے حضرت ابوالہیثمؓ سے ملے جو ان کے دوست تھے۔ حضرت اسعدؓ نے ان کے سامنے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات اور اپنے سعادت اندوزِ ایمان ہونے کا حال بیان کیا۔ وہ پہلے ہی دینِ حق کی تلاش میں تھے فوراً بولے، میں بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں۔

اگلے سال ۱۲؁ نبوت کے موسم حج میں مدینہ منورہ سے بارہ مسلمان سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے مکہ پہنچے۔ حضرت ابو الہیثمؓ بھی ان میں شامل تھے۔ حضورؐ کو ان اصحاب کے آنے کی اطلاع ملی تو آپؐ رات کو منیٰ میں (عقبہ کی گھاٹی میں جہاں اب ایک مسجد بنا دی گئی ہے) تشریف لے گئے۔ یثربی مسلمان وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ انہوں نے بڑھ کر حضورؐ کے قدم لیے اور ان چھ باتوں پر آپؐ کی بیعت سے مشرف ہوئے:

(۱)۔ ہم شرک نہ کریں گے
(۲) ہم چوری نہ کریں گے
(۳) ہم زنا نہ کریں گے
(۴) ہم کسی کی چغلی نہ کریں گے اور نہ کسی پر جھوٹی تہمت لگائیں گے۔
(۵) ہم اپنی لڑکیوں کو قتل نہ کریں گے۔
(۶) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اچھی باتوں میں اطاعت کریں گے۔

بیعت لینے کے بعد حضورؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر تم نے ان باتوں پر عمل کیا تو جنت کے حقدار بن جاؤ گے اور اگر نقضِ عہد کے مرتکب ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ وہ تمہیں عذاب دے یا معاف کر دے۔

واپسی کے وقت (یا بروایت دیگر واپسی کے بعد مدینہ سے خط لکھ کر) ان حضرات نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں قرآن پاک پڑھانے اور دین کی باتیں سکھانے کے لیے ایک معلم عطا فرمائیں۔ حضورؐ نے یہ خدمت حضرت مصعبؓ بن عمیر کے سپرد کی اور انہیں ضروری ہدایات دے کر مدینہ منورہ روانہ کیا۔

۲

حضرت مصعبؓ بن عمیر کی تبلیغی مساعی سے مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا پھیل گیا۔ ۱۳؁ نبوت کے موسم حج میں مدینہ سے پانچ سو آدمیوں کا ایک قافلہ

حج کے لیے مکہ روانہ ہونے لگا تو اس قافلے میں اوس و خزرج کے پچھتر[۷۵] ایسے نفوسِ قدسی بھی شامل ہو گئے جو دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو چکے تھے۔ ان میں حضرت ابوالہیثم بن تیہان بھی شامل تھے۔ مدینہ کے ان پچھتر فدائیانِ توحید کا مکہ آنا تاریخِ اسلام میں بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے مکہ میں ہر قسم کے خطرات کے علی الرغم جو شجاعانہ اور بے باکانہ اقدام کیا اس نے تاریخ کا رُخ پھیر دیا۔

حج سے فارغ ہونے کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات مقرر کی اور مدینہ کے اہلِ حق رات کی تاریکی میں نہایت رازداری کے ساتھ عقبہ کی گھاٹی میں جمع ہوئے۔ حضورؐ بھی اپنے چچا حضرت عباسؓ کے ساتھ وہاں تشریف لائے۔ یہاں آنے سے پہلے حضرت عباسؓ کو یہ اطلاع دی تھی کہ مدینہ کے یہ اہلِ حق ان کے بھتیجے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب تشریف لے چلنے کی دعوت دینے آئے ہیں۔ انہوں نے ان پچھتر اہلِ ایمان سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے برادرانِ یثرب! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان میں معزز و محترم ہیں۔ عامۃ القریش ان کے جانی دشمن ہیں۔ تاہم ہم نے ہمیشہ دشمنوں سے ان کی حفاظت کی ہے اور آئندہ بھی اپنی استطاعت کے مطابق کریں گے۔ اگر تم اپنے وعدوں کو پورا کر سکتے ہو تو کوئی بات کرنا۔ خوب سمجھ لو کہ محمدؐ سے کوئی عہد و پیمان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم ہولناک مصائب اور خونریز جنگوں کو دعوت دے رہے ہو اس لیے سب کچھ سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ورنہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

حضرت عباسؓ کی تقریر سُن کر رئیسِ خزرج حضرت براءؓ بن معرور جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا:

"اے عباس! ہم نے آپ کی بات سُنی تو ہماری بھی سُن لیں کہ ہم نامرد نہیں ہیں، ہم نے تلواروں کی گود میں پرورش پائی ہے.........."

دوسرے انصار نے ان کی بات کاٹ کر کہا، یا رسول اللہ آپ بھی کچھ فرمائیے

حضورؐ نے قرآنِ حکیم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی اور اہلِ یثرب کو اسلام پر قائم رہنے کی تلقین کی اور پھر فرمایا: "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اپنی جانوں اور اہل وعیال کی مانند میری حفاظت کرو گے اور دین کی اشاعت میں میری پوری پوری مدد کرو گے۔

حضرت براءؓ بن معرور نے آپ کا دستِ مبارک پکڑ لیا اور کہا:

"یا رسول اللہ! خدائے بزرگ و برتر کی قسم ہم اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ آپ کی حفاظت و اعانت کریں گے۔"

حضرت ابوالہیثم بن التیّہان نے ان کی بات کاٹ کر کہا:

"یا رسول اللہ! اس وقت ہمارے اور یہود کے مابین معاہدات ہیں جو بیعت کے بعد فسخ ہو جائیں گے ایسا نہ ہو کہ آپ اقتدار اور قوت پا کر ہمیں چھوڑ دیں۔"

حضورؐ نے متبسم ہو کر فرمایا:

"بلکہ میرا خون تمہارا خون اور میرا ذمہ تمہارا ذمہ ہے۔ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ تم جس سے لڑو گے میں بھی لڑوں گا اور جس سے تم صلح کرو گے میں بھی اس سے صلح کروں گا۔"

اس کے بعد کچھ اور سوال و جواب ہوئے اور پھر سب یثربی اہلِ ایمان یکے بعد دیگرے حضورؐ کی بیعت سے مشرف ہو گئے۔

اس موقع پر کس خوش بخت کو سب سے پہلے بیعت کرنے کا شرف حاصل ہوا؟ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں بعض روایتوں میں حضرت اسعدؓ بن زرارہ کا نام آتا ہے اور بعض میں حضرت ابوالہیثمؓ بن التیّہان کا۔ کچھ روایتوں میں حضرت کعبؓ بن مالک اور حضرت براءؓ بن معرور کا نام بھی آتا ہے۔ بہرصورت یہ سبھی اصحاب یکساں عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ انہوں نے محض رضائے الٰہی کی خاطر اس وقت اپنی جانوں مالوں اور اولادوں کو ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں لا ڈالا جب

سرزمین عرب کا ذرّہ ذرّہ اہلِ حق کے خون کا پیاسا تھا اور کسی قبیلے کی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ مکّہ کے دُرِّ یتیم صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دینے کی ہامی بھرے۔ یہ بیعت — جو تاریخ اسلام میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، بیعت لیلۃ العقبہ، بیعت عقبہ ثانیہ اور بیعت عقبہ کبیرہ کے ناموں سے مشہور ہے۔

بیعت کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مدینہ سے فرمایا:۔

"موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے بارہ نقیب منتخب کیے تھے تم بھی دینی امور کی حفاظت کے لیے اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کر لو۔"

چنانچہ مؤمنینِ مدینہ نے بارہ نقباء اتفاقِ رائے سے منتخب کر لیے ان میں سے نو قبیلہ خزرج کے اور تین قبیلہ اوس کے چشم و چراغ تھے۔ اوس کے تین نقیبوں میں ایک حضرت ابوالہیثمؓ بن التیہّان تھے۔ دوسرے دو حضرت اُسیدؓ بن حُضیر اور حضرت سعدؓ بن خیثمہؓ تھے۔ ایک روایت میں حضرت ابوالہیثمؓ کے بجائے حضرت رفاعہؓ بن عبدالمنذر کا نام آیا ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ اوس کے نقیبوں میں حضرت اسیدؓ بن حضیر اور حضرت سعدؓ بن خیثمہ کے ساتھ حضرت ابوالہیثمؓ ہی منتخب کیے گئے۔ حضرت کعبؓ بن مالک انصاری نے اپنی ایک نظم میں تمام نقباء کے نام بیان کیے ہیں ان میں رفاعہؓ بن عبدالمنذر کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے بجائے حضرت ابوالہیثمؓ بن التیہّان کا نام ہے۔ حضرت کعبؓ خود اس بیعت میں شریک تھے اور اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں اس لیے ان سے بڑھ کر کسی کی شہادت معتبر نہیں ہو سکتی۔ (سیرت ابن ہشام)

(۳)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو حضرت ابوالہیثمؓ نے دوسرے انصار کے ساتھ والہانہ جوش و خروش سے آپؐ کا استقبال کیا۔ چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو حضرت ابوالہیثمؓ کو جلیل القدر مہاجر صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون جمحیؓ کا دینی بھائی بنایا۔

رمضان ۲ھ میں حضرت ابوالہیثمؓ کو اصحاب بدر میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ حق و باطل کے اس معرکۂ اوّل میں ان کے بھائی حضرت عبیدؓ بن تیہان بھی شریک تھے۔ دونوں بھائی سر بکف ہو کر لڑے اور شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ غزوۂ بدر کے بعد حضرت ابوالہیثمؓ نے غزوۂ اُحد، غزوۂ احزاب اور عہد رسالت کے دوسرے تمام غزوات میں بھی شریک ہونے کا شرف حاصل کیا۔ فتح مکہ اور حجۃ الوداع میں بھی حضورؐ کے ہمرکاب تھے۔

حضرت ابوالہیثمؓ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ حضورؐ بھی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے اور کبھی کبھی ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دن آپؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی معیت میں حضرت ابوالہیثمؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ کھجور کے دو تین باغات اور بکریوں کے ایک ریوڑ کے مالک تھے لیکن کوئی غلام یا خادم نہ تھا اور گھر کا سارا کام خود انجام دیا کرتے تھے۔ حضورؐ نے مکان پر پہنچ کر آواز دی تو ان کی اہلیہ نے عرض کیا کہ ابوالہیثمؓ پانی بھرنے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ مشک لیے آپہنچے۔ حضورؐ کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے بیخود ہو گئے۔ حضورؐ سے لپٹ کر بار بار کہتے تھے، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ نے اس غلام کے غریب خانہ میں قدم رنجہ فرمایا ہے۔ پھر حضورؐ اور آپؐ کے رفقاء کو اپنے باغ میں لے گئے۔ بیٹھنے کے لیے کوئی چیز بچھادی اور خود کھجوروں کی ایک شاخ کاٹ لائے۔ حضورؐ نے فرمایا، پکی کھجوریں لائے ہوتے۔ انہوں نے عرض کیا، پکی گدر ہر قسم کی ہیں جو مرغوب ہوں نوش فرمائیں۔ کھجوریں کھلانے کے بعد نہایت صاف اور شیریں پانی پلایا۔ حضورؐ نے فرمایا، دیکھو اللہ تعالیٰ نے کتنی نعمتیں عطا کی ہیں، سایہ، عمدہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی، خدا کی قسم قیامت کے دن ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اس کے بعد حضرت ابوالہیثمؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ آپ کچھ دیر یہیں تشریف رکھیں میں گھر جا کر کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، دودھ دینے والی بکری ذبح نہ کرنا۔ انہوں نے بکری کا ایک

بچہ ذبح کرایا اور اس کو بھون کر حضورؐ کی خدمت میں لائے۔ حضورؐ نے کھانے سے فارغ ہو کر ان سے پوچھا، تمہارے پاس کوئی غلام ہے؟

انہوں نے عرض کیا، نہیں یا رسول اللہ۔

آپؐ نے فرمایا، جب میرے پاس (جنگی) قیدی آئیں تو آنا۔

اسی اثناء میں دو قیدی آپؐ کے سامنے پیش کیے گئے۔ حضورؐ نے حضرت ابو الہیثمؓ سے فرمایا، ان میں سے ایک قیدی اپنی خدمت کے لیے پسند کر لو۔

انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ جو آپ دینا چاہیں مجھ کو منظور ہے۔ حضورؐ نے ایک قیدی انہیں عطا فرمایا اور ہدایت کی کہ اس سے اچھا برتاؤ کرنا۔ وہ غلام کو لے کر گھر آئے اور بیوی کو سارا واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا، اگر حضورؐ کے ارشاد کی تعمیل منظور ہے تو اس کو آزاد کر دو۔ انہوں نے اسی وقت اس کو آزاد کر دیا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپؐ بہت خوش ہوئے اور دونوں میاں بیوی کی تحسین فرمائی۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو الہیثم مدینہ منورہ سے بہت کم باہر نکلے۔ امام حاکمؒ نے اپنی "مستدرک" میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت (سنہ ۲۰ ہجری) میں وفات پائی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ انہوں نے جنگ صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ جنگ صفین میں شہادت پانے والے ان کے بھائی حضرت عبیدؓ بن تیہان تھے۔ بعض کتبِ حدیث میں کچھ روایتیں حضرت ابو الہیثمؓ سے منسوب ہیں لیکن حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "الاصابہ" میں لکھا ہے کہ یہ سب روایتیں مشکوک ہیں اور ان میں سے کوئی بھی مستند نہیں کیونکہ حضرت ابو الہیثمؓ بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمروؓ بن معاذ اشہلی انصاری

اَوس کے خاندان عبدالاشہل کے چشم و چراغ اور سیدالاوس حضرت سعدؓ بن مُعاذ کے چھوٹے بھائی تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

عمروؓ بن مُعاذ بن نعمان بن امرءالقیس بن زید بن عبدالاشہل بن جشم بن حارث بن خزرج بن نبیت بن مالک بن اوس۔

ہجرتِ نبویؐ سے پہلے سعادت اندوزِ اسلام ہوئے، حضورؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو دوسرے اہل ایمان کے ساتھ انہوں نے آپؐ کا والہانہ استقبال کیا۔

اپنے برادرِ بزرگ حضرت سعدؓ بن مُعاذ کی طرح وہ بھی ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دل وجان سے شیدائی تھے۔ سب سے پہلے ان کی تلوار بدر کے میدان میں چمکی اور پرستارانِ باطل کے سر پر برق خاطف بن کر گری۔ اس کے بعد غزوۂ اُحُد میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے اور کمالِ ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔ ضرار بن الخطاب نے (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) تاک کر اس زور سے ان کو نیزہ مارا کہ جسم کے پار ہو گیا اور وہ شہید ہو کر فرشِ خاک پر گر گئے۔ اس وقت ان کی عمر بتیس ۳۲ برس کی تھی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت کلثومؓ بن ھِدم انصاری
صاحب رحلِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کُلثُوم نام اور صاحب رحلِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لقب تھا۔ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

کلثوم بن ھِدم بن امراء القیس بن حارث بن زید بن عبید بن زید مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن عوف۔

بنو عمرو بن عوف قباء میں آباد تھے اور حضرت کلثومؓ کا مکان بھی وہیں تھا۔ وہ عمرو بن عوف کی شاخ بنو عبید کے سردار تھے۔ جب آفتاب اسلام فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا حضرت کلثومؓ کا عالمِ پیری تھا۔ اہلِ سیر نے ان کی عمر کی تصریح نہیں کی صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ بہت معمر یا سن رسیدہ تھے۔ اس عمر میں انسان کے خیالات اور عقائد بہت پختہ ہو جاتے ہیں اور ان کو بدلنا سخت محال ہوتا ہے لیکن حضرت کلثومؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سلیم سے نوازا تھا ہجرت نبویؐ سے کچھ پہلے انھوں نے دعوتِ توحید کا حال سنا تو فوراً اس پر لبیک کہا۔ ہجرتِ نبوی کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قباء میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت کلثومؓ بن ھدم کو آپؐ کی میزبانی کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ جب تک قباء میں ٹھہرے آپؐ کا قیام تو حضرت کلثومؓ کے ہاں تھا لیکن آپؐ لوگوں سے ملاقات کے لیے حضرت سعدؓ بن خثیمہؓ کی فرودگاہ پر تشریف لے آتے تھے کیونکہ وہ مجرّد تھے اور ان کا پورا گھر مردوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عامرؓ بن فہیرہ بھی حضرت کلثومؓ کے گھر پر فروکش ہوئے تھے تینوں حضرات رات کو وہیں آرام فرماتے تھے اور دن کے اوقات حضرت سعدؓ بن خثیمہؓ کے ہاں گزارتے تھے۔ طبری کے قول کے مطابق حضرت علیؓ ہجرت کر کے قباء تشریف لائے تو وہ

بھی حضرت کلثومؓ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ ہجرتِ نبوی کے تھوڑی مدت بعد حضرت کلثومؓ بن ہدم نے وفات پائی، اس وقت مسجدِ نبوی اور ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں کی تعمیر شروع تھی۔ حضرت کلثومؓ بن ہدم پہلے صاحبِ رسولؐ تھے جنھوں نے ہجرتِ نبوی کے بعد سفرِ آخرت اختیار کیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ثابتؓ بن جذع انصاری

خزرج کے خاندانِ سلمہ سے ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے:

ثابت بن جذع بن زید بن حارث بن حرام بن کعب بن غنم بن سلمہ بن سعد بن علی بن اسد بن سارده بن یزید بن جشم بن خزرج۔

ہجرتِ نبویؐ سے پہلے سعادت اندوزِ اسلام ہوئے اور ۱۳ ؁ بعدِ بعثت میں بیعتِ عقبۂ کبیرہ کا شرف حاصل کیا۔ بڑے بہادر آدمی تھے اور راہِ حق میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

عقبہ کے بعد انہیں اصحابِ بدر میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے اُحُد اور دوسرے مشاہد میں جوہرِ مردانگی دکھلائے۔ فتح مکّہ کے بعد ۸ ؁ ہجری میں غزوۂ طائف میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب گئے، اسی غزوہ میں خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن عبداللہ انصاری رضؓ

①

باپ کا نام بھی عبداللہ تھا اور بیٹے کا نام بھی عبداللہ۔ لیکن کلکِ قدرت نے باپ عبداللہ کے مقدر میں ابدی رُوسیاہی لکھ دی تھی اور بیٹے عبداللہؓ کے مقدر میں دین اور دنیا کی سعادتیں ودیعت کی تھیں۔ باپ نے اسلام دشمنی اور منافقت کی ایسی مثال قائم کی کہ "راس المنافقین" (منافقوں کا سردار) کا لقب رہتی دنیا تک اس کے گلے کا طوق بن گیا۔ دوسری طرف بیٹے نے حق پرستی، راست بازی، جوشِ ایمان اور اخلاص و فدویت کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ فرشتوں نے بھی اس پر تحسین کے پھول برسائے اور اس کے نام نے سیّدالمرسلین رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص ترین جاں نثاروں کی فہرست میں جگہ پائی۔

باپ —— ابوحباب عبداللہ بن اُبَیّ کا تعلق قبیلہ خزرج کی ایک نہایت معزز شاخ بنو حُبلی سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:-

عبداللہ بن اُبَیّ بن ابی حارث بن عبید بن مالک بن سالم (حُبلی) بن غنم بن عوف بن خزرج۔

اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ سالم بن غنم کی بہت بڑی توند تھی اس لیے وہ حُبلی کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا اور اسی بناء پر اس کی اولاد کو بنو حبلی کہا جاتا تھا۔

اسی طرح عبداللہ بن اُبَیّ اپنی دادی سلُولؔ کے نام کی نسبت سے عبداللہ بن اُبَیّ بن سلُول کے نام سے مشہور تھا۔ سلُول بنو خزاعہ کی ایک عورت تھی جس سے ابنِ اُبَیّ کے دادا نے شادی کی تھی۔

ابوحباب عبداللہ بن اُبَی یثرب کے سرکردہ رؤسا میں شمار ہوتا تھا وہ بڑے ڈیل ڈول کا ایک بلند و بالا، خوش رو اور چرب زبان آدمی تھا اور اہلِ یثرب میں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یثرب میں نزولِ اجلال فرمانے سے پہلے اوس و خزرج کے لوگ متفق ہو کر اس کو اپنا بادشاہ بنانے پر تیار ہو گئے تھے حالانکہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اسی بات سے عبداللہ بن اُبَی کے اثر و رسوخ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابنِ اُبَی کے خزرجی ہونے کے باوجود قبیلہ اوس کے لوگ بھی اس کی رعیت بننے پر بخوشی آمادہ ہو گئے تھے۔ دراصل آئے دن کی باہمی خانہ جنگیوں سے تنگ آئے ہوئے ان لوگوں نے ابنِ اُبَی کی بادشاہت پر متفق ہونے ہی میں اپنی عافیت دیکھی تھی۔ چنانچہ ان سب نے مل کر اس کے لیے ایک شاندار تاج بنوایا اور اس کو تخت نشین کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اسی زمانے میں افقِ مکہ سے طلوع ہونے والے آفتابِ اسلام کی کرنیں یثرب کے در و دیوار پر بھی پڑنے لگیں، یہاں تک کہ یثرب کے اہلِ ایمان کی دعوت پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں تشریف لے آئے اور یہ شہر مدینۃ النبیؐ بن گیا۔

حضورؐ کی تشریف آوری سے عبداللہ بن اُبَی کو بادشاہ بنانے کا منصوبہ برباد ہو گیا۔ اور مدینہ منورہ کے در و دیوار انوارِ رسالت سے جگمگانے لگے۔ ابنِ اُبَی نے اوس و خزرج کے اہلِ ایمان کے دباؤ سے مجبور ہو کر بظاہر اسلام قبول کر لیا لیکن بادشاہت سے محرومی کا صدمہ اس کے دل کی پھانس بن گیا اور وہ زندگی بھر اہلِ حق سے خار کھاتا رہا۔ ابنِ ہشام کا بیان ہے کہ اس شخص کی ظاہری حالت یہ تھی کہ جمعہ کے دن حضورؐ خطبہ ارشاد فرمانے لگتے تو وہ اٹھ کر لوگوں سے یوں خطاب کیا کرتا تھا:

"لوگو! یہ اللہ کے رسول تمہارے درمیان تشریف فرما ہیں۔ ان کی ذات سے اللہ نے تمہیں عزت اور بزرگی دی ہے اس لیے تم ان کی تائید کرو اور جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسے غور سے سنو اور ان کی اطاعت کرو۔"

لیکن درپردہ اس شخص کو جب بھی موقع ملتا وہ دینِ حق اور داعیٔ حق صلی اللہ علیہ وسلم کو

زک پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا۔ غزوۂ اُحُد میں اس نے مسلمانوں کی پشت میں یوں خنجر گھونپا کہ اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ جنگ سے ہٹ گیا۔ حضور ؐ نے یہود بنو قینقاع کو جلا وطن کرنا چاہا تو اس نے ان (یہود) کی پُرزور حمایت کی غزوۂ بنو نضیر میں اس یہودیوں کے ساتھ ساز باز کی ـــــ غرض اس کی منافقت ہر موقع پر نئے نئے رنگ دکھاتی رہتی۔ اسی بناء پر اس نے راس المنافقین کے لقب سے شہرت پائی۔ اسی راس المنافقین کے گھر وہ فرزندِ سعید پیدا ہوا جس کی عظمتِ کردار سے فلک الافلاک کی رفعتوں کو چھولیا۔ ابنِ اُبی نے بیٹے کا نام اپنے نام پر عبداللہ رکھا اور بڑے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی وہ خود پڑھا لکھا آدمی تھا اس لیے بیٹے کو بھی دولتِ علم سے محروم نہ رکھا۔ اسے پڑھنا لکھنا بھی سکھا دیا اور فنونِ سپہ گری میں بھی طاق کر دیا

(۲)

حضرت عبداللہ رضؓ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ریاست و دولت کو اپنے گھر کی لونڈی پایا۔ باپ کی عزت، اثر و رسوخ اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ خزرج اور اوس دونوں قبیلوں کے لوگ اس کو اپنا بزرگ مانتے تھے۔ یہاں تک کہ یہودِ مدینہ بھی اس کا احترام کرتے تھے۔ یہ سارے عوامل عبداللہ رضؓ کو ایک "بگڑا ہوا رئیس زادہ" بنانے کے لیے کافی تھے لیکن مبدءِ فیض نے انہیں فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ شروع ہی سے نہایت زیرک اور بردبار تھے۔ ہجرتِ نبوی سے دو تین سال پہلے مدینہ میں اسلام کا چرچا پھیلا اور خزرج و اوس دونوں قبیلوں کی سعادت مند روحیں آہستہ آہستہ دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہونے لگیں تو حضرت عبداللہ رضؓ تک بھی اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔ ان کا باپ تو مدینہ کی بادشاہت کے خواب دیکھنے میں مست تھا لیکن نوجوان عبداللہ رضؓ کے دل و دماغ نے گواہی دی کہ مکّہ کے دُرِّ یتیم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیغامِ حق سنایا ہے وہ سچا ہے اور اسی کے قبول کرنے میں دین اور دنیا کی کامیابی مضمر ہے۔ چنانچہ انہوں نے بلا تامل اس پیغام پر لبیک کہا اور انصار کے سابقین اوّلین کی صف میں داخل ہو گئے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا تو آپ کا والہانہ استقبال کرنے والوں میں حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ بھی شامل تھے۔ ابنِ اُبَی دل ہی دل میں بیٹے کے قبولِ اسلام پر کڑھتا تھا لیکن بے بس تھا کیونکہ اوس اور خزرج کے بیشتر لوگ سعادت اندوزِ ایمان ہو چکے تھے مجبوراً وہ بھی ہجرت نبویؐ کے بعد زبان سے اسلام کا دم بھرنے لگا لیکن اس کے دل میں حسد و منافست کی جو آگ بھڑک رہی تھی وہ کسی طرح بجھائے نہ بجھتی تھی۔

رمضان ۲ھ ہجری میں حق و باطل کا معرکۂ اول بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لڑائی میں شریک ہوئے اور مشرکین کے مقابلے میں دادِ شجاعت دی۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا، ان کے ستّر یا اس سے کچھ زائد آدمی میدانِ جنگ میں کام آئے اور اسی قدر مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گئے۔ اسیرانِ جنگ میں حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطّلب بھی شامل تھے۔ حضورؐ نے قیدیوں کو کپڑے عنایت فرمائے تو حضرت عباسؓ کو عطا کیے جانے والا کرتہ انہیں پورا نہ آیا کیونکہ وہ بہت طویل القامت تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے ابنِ اُبَی نے حضرت عباسؓ کے لیے اپنا کرتا پیش کیا۔ چونکہ ابنِ اُبَی بھی بڑا قد آور آدمی تھا اس کا کرتہ حضرت عباسؓ کے جسم پر پورا آ گیا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ اُبَی کے اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی منافقانہ حرکتوں کے باوجود اس کے اس احسان کو کبھی نہ بھولے۔

شوال ۳ھ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو حضرت عبداللہؓ اس میں بھی جانبازانہ شریک ہوئے۔ لڑائی میں کسی مشرک کے وار سے ان کے اگلے دو دانت شہید ہو گئے۔ لڑائی کے بعد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا، تم سونے کا دانت بنوا لو۔ انہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔

حضرت عبداللہؓ صدق و اخلاص میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے اپنی جان راہِ حق

میں وقف کر رکھی تھی۔ اُحُد کے بعد دوسرے غزوات میں بھی ملتزمِ رکابِ نبویؐ رہے اور ہر معرکے میں سر بکف ہو کر لڑے۔

(۴)

غزوۂ بنی المصطلق (شعبان ۶ ہجری) کے موقع پر حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ نے ایسے جوشِ ایمان اور صدق و اخلاص کا مظاہرہ کیا کہ وہ شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نہایت بلند مقام پر فائز ہو گئے۔ اہلِ سیر نے یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

غزوۂ احزاب (۵ھ) کے چند ماہ بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ بنو مُصطلِق نے بغاوت پر کمر باندھی ہے اور مدینہ منورہ پر دھاوا بولنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ شعبان ۶ھ کے آغاز میں صحابہؓ کی ایک معقول جمعیت کے ہمراہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور بنو مُصطلَق کے علاقے میں پہنچ کر مُریسیع نامی ایک کنوئیں (یا چشمے) پر پڑاؤ ڈالا۔ حضورؐ نے بنو مصطلق کو دعوتِ اسلام دی اور شر انگیزی سے باز رہنے کی تلقین فرمائی لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا اور اپنی طاقت کے زعم میں خواہ مخواہ مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔ مسلمانوں نے تو اپنی جانیں راہِ خدا میں بیچ رکھی تھیں اور پھر خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے وہ بنو مصطلق کو کیا خاطر میں لاتے، آناً فاناً ان کے کس بل نکال کر رکھ دیئے اور وہ بدبخت اپنے دس آدمی مروا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بنو مُصطلِق کی شکست کے بعد حضورؐ چند دن مُریسیع سے مُتصل بستی میں چند روز کے لیے ٹھہر گئے۔ وہاں کے اثنائے قیام میں ایک دن پانی کی تقسیم پر دو صاحبوں میں تلخ کلامی ہو گئی۔ ان میں سے ایک مہاجر تھے اور ایک انصاری۔ ابنِ ہشامؒ کی روایت کے مطابق مہاجر کا نام جہجاہؓ بن مسعود غفاری تھا، وہ حضرت عمر فاروقؓ کے ملازم تھے اور ان کا گھوڑا سنبھالا کرتے تھے۔ دوسرے صاحب کا نام سنانؓ بن دبر الجُہنی تھا وہ خزرج کی ایک شاخ کے حلیف تھے اس لیے انصار میں داخل تھے۔ دونوں میں جھگڑا اتنا بڑھا کہ

ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ اس کشمکش میں حضرت جہجاہؓ نے حضرت سنانؓ کے ایک لات رسید کر دی۔ انصار کے نزدیک کسی سے لات کی ضرب کھانا سخت ننگ کی بات تھی۔ چنانچہ سنانؓ نے اپنی مدد کے لیے انصار کو پکارنا شروع کر دیا۔ جہجاہؓ نے اپنے آپ کو خطرے میں دیکھا تو انہوں نے مہاجرین کو آواز دی کہ میری مدد کے لیے پہنچو انصار مجھے مارے ڈالتے ہیں۔ ابنِ اُبی بھی اس موقع پر موجود تھا اس کو مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ اس نے انصار کو سخت اشتعال دلایا اور سنانؓ کی مدد کے لیے ابھارا۔ دوسری طرف سے کچھ مہاجرین بھی تلواریں سونت کر نکل آئے۔ قریب تھا کہ مہاجرین اور انصار آپس میں لڑ پڑتے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک تک ان اصحاب کے شور و غل کی آواز پہنچ گئی آپؐ فوراً اپنے خیمۂ مبارک سے باہر تشریف لائے۔ لوگ حضورؐ کو دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"یہ جاہلیت کی دہائی کیسی؟ تم لوگوں کا جاہلیت کی اس دہائی سے کیا واسطہ۔ اسے چھوڑ دو یہ بہت گندی چیز ہے۔"

حضورؐ کا ارشاد سُن کر دونوں طرف کے کچھ اصحاب آگے بڑھے اور سنانؓ اور جہجاہؓ کو گلے ملوا دیا۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن ابنِ اُبی اور اس کے ساتھی منافقین کو اس معاملے کا اس طرح دب جانا پسند نہ آیا وہ آپس میں سر جوڑ کر بیٹھے تو ابنِ اُبی نے اپنے دل کے جلے پھپھولے یوں پھوڑے:

"یہ سب کچھ تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔ تم لوگوں نے خود انہیں اپنے ہاں لا کر بسایا، ان پر اپنے مال تقسیم کیے یہاں تک کہ وہ پر پرزے نکال کر اب ہمارے ہی منہ آنے لگے ہیں۔ ہماری اور ان کنگلوں (مہاجرین) کی مثال تو ایسی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کر تاکہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ اگر تم لوگ مہاجرین کی امداد اور اعانت سے دستکش ہو جاؤ تو وہ خود ہی مدینہ چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم مدینے واپس جا کر ہم میں سے جو عزت

والا ہے وہ ذلیل کو شہر سے نکال باہر کرے گا۔"

اس مجلس میں ایک کم عمر صحابی حضرت زید بن ارقم انصاریؓ بھی موجود تھے۔ انہیں عبداللہ بن اُبَی کی باتیں سن کر سخت غصہ آیا۔ انہوں نے بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہو کر حضورؐ کو ابن اُبَی کی بکواس سے آگاہ کر دیا۔ حضورؐ نے ابن اُبَی کو بُلا کر پوچھا کہ کیا تم نے یہ باتیں کہی ہیں۔ وہ صاف مُکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کہیں، یہ لڑکا جھوٹ بولتا ہے۔

انصار کو جن میں حضرت زیدؓ بن ارقم کے چچا حضرت عبداللہؓ بن رواحہ بھی شامل تھے، ابن اُبَی کی قسموں پر یقین آ گیا اور وہ سب حضرت زیدؓ پر ناراض ہوئے کہ تم نے خواہ مخواہ حضورؐ سے ایسی بے بنیاد شکایت کی۔ حضرت زیدؓ دل گرفتگی کے عالم میں اپنی قیام گاہ پر جا کر سو رہے۔ اُدھر رحمتِ الٰہی کو جوش آ گیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ اَلْمُنٰفِقُوْن نازل ہوئی جس میں حضرت زیدؓ کی تصدیق کی گئی تھی اور منافقین کا کچا چٹھا کھول کر بیان کر دیا گیا تھا [1]۔

---

[1] اس آیت میں عبداللہ بن اُبَی کی بکواس کی طرف واضح اشارہ ہے:

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ (اَلْمُنٰفِقُوْن آیت: ۸)

ترجمہ: یہ (منافقین) کہتے ہیں کہ ہم مدینے واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔

سورۃ اَلْمُنٰفِقُوْن کے محلِ نزول کے بارے میں مختلف روائتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ سورۃ مُریسیع کے پڑاؤ میں نازل ہوئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مراجعت مدینہ کے سفر کے دوران میں نازل ہوئی اور تیسری روایت یہ ہے کہ حضورؐ کے مدینہ پہنچنے کے فوراً بعد نازل ہوئی۔

حضورؐ نے اسی وقت حضرت زیدؓ بن ارقم کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کے سامنے سورۃ المنافقون کی آیات پڑھیں اور پھر ہنستے ہوئے ان کا کان پکڑ کر فرمایا: "یہ لڑکے کا کان سچا تھا، اللہ نے خود اس کی تصدیق فرما دی۔"

حضرت عمر فاروقؓ کو ابنِ اُبی کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

"یا رسول اللہ آپ اجازت دیں تو میں اس منافق کا سر اڑا دوں اور اگر آپ یہ مناسب نہ سمجھیں تو انصار میں سے معاذؓ بن جبل، عبادؓ بن بشر، محمدؓ بن مسلمہ یا کسی اور کو حکم دیں کہ وہ اس کا کام تمام کر دیں۔"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— "نہیں ایسا مت کرو۔ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں ہی کو قتل کرا رہا ہے۔"

علامہ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے بعد ابنِ اُبی کے فرزند حضرت عبداللہؓ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ میرے باپ نے آپ کو ذلیل کہا۔ خدا کی قسم وہ خود ذلیل ہے۔ اگرچہ تمام خزرج میں مجھ سے بڑھ کر کوئی اپنے باپ کا اطاعت گزار نہیں لیکن آپ حکم دیں تو میں ابھی جا کر اس کا سر قلم کیے دیتا ہوں۔ کوئی دوسرا اسے قتل کرے گا تو شاید میرے دل میں انتقام کا جذبہ بیدار ہو جائے اور میری آخرت برباد ہو جائے۔"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی وہی جواب دیا جو حضرت عمر فاروقؓ کو دیا تھا لیکن ان کے دل میں باپ کے خلاف کھٹک پیدا ہو گئی۔ ادھر ابنِ اُبی کی ڈھٹائی کی یہ کیفیت تھی کہ جب انصار نے اس سے کہا کہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی مانگو تو اس نے جھلا کر جواب دیا ——— "تم نے کہا محمدؐ پر ایمان لاؤ، میں نے تمہاری بات مان لی، تم نے کہا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو، میں نے زکوٰۃ بھی دے دی کیا اب تم یہ چاہتے ہو کہ محمدؐ کو سجدہ کروں۔"

ابنِ اُبَی کے جواب سے انصار میں اس کے خلاف عام ناراضی پھیل گئی۔ ناراض اصحاب میں اس کے فرزند حضرت عبداللہؓ پیش پیش تھے۔ واپسی سفر کے اختتام پر جب لشکرِ اسلام مدینہ منوّرہ میں داخل ہونے لگا تو حضرت عبداللہؓ نے تلوار سونت لی اور باپ کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے پھر اس سے مخاطب ہوکر کہا:

"تم نے کہا تھا کہ مدینہ پہنچ کر عزّت والا ذلیل کو نکال دے گا۔ اب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ عزّت تمہاری ہے یا اللہ اور اس کے رسول کی۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر میں تمہیں مدینہ میں ہرگز داخل نہ ہونے دوں گا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقع پر حضرت عبداللہؓ نے ابنِ اُبَی سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ تم اپنے ذلیل ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ہونے کا اقرار کرو۔ اس پر ابنِ اُبَی چیخنے چلانے لگا کہ اے اہلِ خزرج دیکھو میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔" حضورؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت عبداللہؓ کو کہلا بھیجا کہ اپنے باپ کو گھر آنے دو۔ حضرت عبداللہؓ نے ارشادِ نبوی کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا اور یہ کہہ کر باپ کے راستے سے ہٹ گئے "رسول اللہ کا حکم ہے تو اب تم شہر میں داخل ہوسکتے ہو۔"

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ جس وقت حضرت عبداللہؓ نے باپ کا راستہ روکا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے تشریف لا رہے تھے۔ آپؐ نے باپ بیٹے کی گفتگو سُنی تو حضرت عبداللہؓ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

"ان کو چھوڑ دو۔ خدا کی قسم جب تک یہ ہمارے درمیان موجود ہیں ہم ان سے اچھا سلوک کریں گے۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقع پر پیش آیا لیکن جمہور اہلِ سیر و مغازی نے اسے غزوۂ بنی المصطلق کا واقعہ بیان کیا ہے۔

(۴)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک (رجب ۹ھ ہجری) سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ واپس تشریف لائے تو دو تین ماہ بعد ابن اُبی سخت بیمار ہوگیا۔ حضرت عبداللہؓ نے باپ کے علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن وہ بیس دن بیمار رہ کر ذیقعدہ ۹ھ ہجری میں فوت ہوگیا۔ یہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت تھی یا کوئی اور حکمت کہ آپؐ نے اس موقع پر ابنِ اُبی سے کمال درجے کی ملاطفت کا برتاؤ فرمایا۔ حضرت عبداللہؓ کی دلجوئی فرمائی اور ابنِ اُبی کو کفنانے کے لیے اپنی قمیص مبارک عنایت فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ خود حضرت عبداللہؓ نے اس کے لیے درخواست فرمائی تھی۔ اس وقت حضورؐ کے زیبِ تن دو کرتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے نیچے کے کرتے کا سوال کیا کیونکہ اس میں حضورؐ کا پسینہ جذب ہوتا تھا۔ آپؐ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور قمیص عنایت کرتے ہوئے فرمایا کہ جب جنازہ تیار ہو تو مجھے اطلاع دینا میں خود نمازِ جنازہ پڑھاؤں گا۔

ایک روایت میں ہے کہ اپنی قمیص مبارک عطا کرنے سے حضورؐ کو جہاں حضرت عبداللہؓ کی دلجوئی مقصود تھی وہاں اس احسان کا بدلہ اُتارنا بھی آپؐ کے پیشِ نظر تھا جو ابنِ اُبی نے غزوۂ بدر کے بعد اپنی قمیص عمِ رسولؐ حضرت عباسؓ کو دے کر کیا تھا۔

جنازہ تیار ہوا اور قبرستان میں پہنچایا گیا تو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپؐ نے ابنِ اُبی کی میت کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر اپنی قمیص پہنائی اور اپنا لعابِ دہن اس کے منہ پر ملا، اس کے بعد نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ آپ اس شخص کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے جس کے بارے میں آپ نے فلاں دن یہ ارشاد فرمایا تھا۔"

ایک اور روایت میں حضرت عمرؓ سے یہ الفاظ منسوب ہیں: "یا رسول اللہ یہ وہی خبیث ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسی ایسی منافقانہ حرکات کی تھیں اور

ہمیشہ کفر و نفاق کا علمبردار رہا۔ کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ "تو ان کے لیے بخشش مانگ یا نہ مانگ اگر ان کے لیے ستر بار بخشش مانگے تو بھی اللہ ان کو ہرگز نہ بخشے گا۔" (سورۂ توبہ)

حضورؐ نے مسکرا کر فرمایا: "جاؤ اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔" جب انہوں نے اپنی بات کا اعادہ کیا تو آپؐ نے فرمایا:

"اے عمر مجھ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا بلکہ اختیار دیا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں یہ اللہ کا کام ہے کہ ان کو معاف نہ کرے۔ اگر ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو سکتی تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا۔"

حضورؐ نماز جنازہ پڑھ چکے تو بارگاہِ خداوندی سے یہ حکم نازل ہوا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ (سورۂ توبہ آیت ۸۴)

ترجمہ: (اور نماز نہ پڑھ ان میں سے کسی پر جو مر جائے کبھی اور نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر۔)

اس کے بعد آپؐ نے کبھی کسی منافق کی نماز پڑھی اور نہ اس کی قبر پر گئے۔ ۱۱ھ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعتہً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس موقع پر صدیقِ اکبرؓ نے بے مثال قوتِ ایمانی اور استقامت کا مظاہرہ کیا اور مرتدین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مرتدین کی سرکوبی کے لیے گیارہ لشکر مرتب کیے جنھیں مختلف اطراف و جوانب میں بھیجا۔ ان میں سے ایک لشکر حضرت خالدؓ بن ولید کی سرگردگی میں مسیلمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ حضرت عبداللہؓ بھی اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ یمامہ کے میدان میں مسیلمہ کے خلاف فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ حضرت عبداللہؓ اسی لڑائی میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

حضرت عبداللہؓ کا شمار اخیار و فضلاء صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ان سے حدیث روایت کی ہے حضرت عبداللہؓ کو کئی بار کتابتِ وحی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت ابو ضیاحؓ انصاری

ان کا نام بہ اختلافِ روایت نعمان یا عمیر تھا۔ اپنی کنیت ابو ضیاح سے مشہور ہیں۔ انصار کے قبیلہ اوس سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

نعمان (عمیر) بن ثابت بن نعمان بن اُمیّہ بن امرء القیس۔

ہجرتِ نبوی کے قریبی زمانے میں شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہوئے اور راہِ حق کے جانباز سپاہی بن گئے۔

سب سے پہلے غزوۂ بدر میں دادِ شجاعت دی۔ اس کے بعد اُحُد اور خندق میں اپنی سرفروشی کے جوہر دکھائے۔ سنہ ۶ ہجری میں بیعتِ رضوان کا عظیم شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے اور اسی غزوہ میں جامِ شہادت پی کر روضۂ رضوان کو سدھارے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت محمدؓ بن مسلمہ انصاری

(۱)

ہجرت نبوی سے مدتوں پہلے یہود مدینہ اوس اور خزرج کے لوگوں کو نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر دیا کرتے تھے لیکن ان لوگوں کی حرماں نصیبی دیکھئے کہ جب نبی آخرالزماں نے ارض مکہ کو الوداع کہہ کر مدینہ میں نزول اجلال فرمایا تو معدودے چند سعید الفطرت علماء یہود کے سوا باقی سب نے آپؐ کی تصدیق کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے انکار رسالت کے باوجود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بقائے باہمی کی بنیاد پر معاہدہ صلح کر لیا، کیونکہ آپؐ کا مطمح نظر تمام اہل مدینہ میں صلح و آشتی کی روح پیدا کرنا اور خلق خدا کو امن و سکون کی زندگی سے متمتع کرنا تھا ــــ یہود مدینہ نے بظاہر تو معاہدہ صلح پر دستخط کر دیئے، لیکن بباطن انہوں نے اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو اپنا شعار بنا لیا۔ کینہ اور حسد ان بدبختوں کی گھٹی میں پڑا تھا اس لیے اہل حق کے خلاف نت نئی سازشوں اور فتنہ انگیزیوں میں مشغول رہتے۔ ان سب میں پیش پیش ان کا اشعر الشعراء کعب بن اشرف تھا۔ کعب کا باپ اشرف باختلاف روایت قبیلہ طے یا بنو نبہان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے سالہا سال پہلے اپنے وطن سے مدینہ آکر یہود بنو نضیر سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے اور ان میں اتنا اثر و رسوخ پیدا کیا کہ بنو نضیر کے سردار اور حجاز کے تاجر اعظم ابو رافع بن ابی الحقیق نے اس سے اپنی لڑکی کی شادی کر دی۔ اسی لڑکی کے بطن سے کعب پیدا ہوا۔ بقول علامہ شبلیؒ

"اس دوطرفہ رشتہ داری کی بنا پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا۔"
وہ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر تھا اور شاعری کی وجہ سے قوم پر بڑا اثر رکھتا تھا۔ بلکہ جاہ و ثروت کے لحاظ سے بھی یہودِ مدینہ میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پہنتا، عمدہ سے عمدہ خوشبوئیں استعمال کرتا اور اپنی دولت یہودیت کی ترویج و ترقی پر بے تحاشا خرچ کرتا رہتا۔ اس نے اپنی سکونت کے لیے ایک عظیم الشان قصر تعمیر کرایا تھا، یہ قصر کیا تھا ایک وسیع و عریض بلند و بالا مستحکم قلعہ تھا جس میں آسائش کے تمام اسباب مہیا تھے۔ اس قصر کے کھنڈر آج بھی مدینہ منورہ کے جنوب میں نشانِ عبرت کی صورت میں موجود ہیں۔ کعب اسلام سے طبعی بغض رکھتا تھا اور اہلِ حق کو مطلق خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جس دن سے آفتابِ رسالت نے اُفقِ مدینہ سے طلوع کیا تھا وہ انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور اپنے خبثِ باطن کا اظہار وہ اشعار کے ذریعے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مسلسل زہر اُگل کر کرتا رہتا۔ اس بدبخت نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ ایک موقع پر حضورؐ کو شہید کرنے کی ناپاک سازش کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ (فتح الباری ابنِ حجر۔ تاریخ یعقوبی)

اربابِ سِیَر کا بیان ہے کہ کعب بن اشرف نے یہودی علماء کی ماہوار تنخواہیں باندھ رکھی تھیں۔ حضورؐ کے ورودِ مدینہ کے بعد یہ علماء اس سے اپنی تنخواہیں وصول کرنے آئے تو اس نے پہلے ان سے اسلام اور ہادیٔ برحق ؐ کی سر توڑ مخالفت کرنے کا عہد لیا اور پھر ان کو تنخواہیں ادا کیں۔

غزوۂ بدر (۲ھ) میں کفارِ مکہ کو شرمناک شکست ہوئی اور ان کے بڑے بڑے سردار مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تو کعب کو سخت صدمہ ہوا اور بے اختیار اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

"اب زمین کا پیٹ اس کی پیٹھ سے اچھا ہے۔"

اس نے مقتولینِ بدر کے نہایت پُر درد مرثیے کہے اور پھر قریش سے تعزیت

کے لیے مکے گیا۔ وہاں وہ کئی دن تک مقیم رہا اس دوران میں اس کا معمول یہ تھا کہ روزانہ لوگوں کو جمع کر لیتا اور ان کے سامنے بڑے سوز و گداز سے مرثیے پڑھتا۔ یہ مرثیے اس قدر پُر اثر تھے کہ مشرکین انہیں سن کر بے اختیار روتے اور سینہ کوبی کرتے۔ ابنِ ہشام ؒ نے اس کے مرثیوں کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ دو شعر دیکھئے:

طحنت رحی بدر لمهلك اهله | ولمثل بدر تستهل وتدمع

کم قد اصیب به من ابیض ماجد | ذی بهجة تاوی الیه الضیع

"جنگِ بدر کی چکی نے اہلِ بدر کو پیس ڈالا۔ بدر جیسے سانحوں کے لیے ماتم کرنا چاہیے۔ کتنے شریف سپید اور بارونق چہرے جن کے پاس اہلِ حاجت پناہ لیتے تھے موت کے گھاٹ اتر گئے۔"

قریش پہلے ہی مسلمانوں سے خار کھائے بیٹھے تھے، کعب کے مرثیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ مدینہ منوّرہ پر یلغار کرنے کے لیے زور شور سے تیاریاں کرنے لگے۔

"تاریخ خمیس" میں ہے کہ کعب اپنے ساتھ چالیس آدمی لے کر مکّے گیا تھا وہاں وہ اور اس کے ساتھی سردارانِ قریش سے ملے اور ان کو بدر کے انتقام پر ابھارا۔ پھر یہ سب لوگ ابوسفیان کی قیادت میں حرم کعبہ میں آئے اور سب نے کعبہ کا پردہ تھام کر حلف اٹھایا کہ بدر کا بدلہ لے کر رہیں گے۔

کعب بن اشرف کی شورہ پشتی اور دیدہ دلیری دیکھئے کہ مدینہ واپس آکر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا بلکہ پہلے سے زیادہ زور شور سے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہنے لگا اور ساتھ ہی لوگوں کو طرح طرح سے اہلِ حق کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صبر و تحمل کے انتہائی بلند مقام پر فائز تھے۔ آپؐ مدت تک کعب کی شرارتوں اور دسیسہ کاریوں کو برداشت کرتے رہے، لیکن جب پانی سر سے گزر گیا اور کعب کی سرگرمیاں مدینہ منوّرہ کی نوزائیدہ شہری مملکت

کے لیے مستقل خطرہ بن گئیں تو ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"کعب بن اشرف سے کون نبٹے گا۔ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو بہت اذیت پہنچائی ہے۔"

اس موقع پر موجود شمعِ رسالت کے پروانوں میں گندمی رنگ اور دوہرے بدن کے ایک دراز قامت جوانِ رعنا حضورؐ کا ارشاد سن کر جوشِ غضب سے بیقرار ہو گئے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! کیا حضور کا منشائے مبارک یہ ہے کہ کعب کے ناپاک وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔"

ارشاد ہوا: "ہاں!"

ان صاحب نے عرض کیا: "میرے ماں باپ آپ پر قربان، اس کام کے لیے میں حاضر ہوں۔"

کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ نہ صرف خود ایک قوی ہیکل اور جنگجو آدمی تھا بلکہ اپنی حفاظت کے لیے اس نے بہت سے آزمودہ کار جنگجو ملازم رکھے ہوئے تھے۔ پھر اس کا قصر بھی ایک ناقابلِ تسخیر قلعے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن بادۂ توحید سے سرشار ان صاحب نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ اس شخص کو ضرور کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچائی ہے۔ چنانچہ انھوں نے رات کے وقت چار جانباز اپنے ساتھ لیے اور قصرِ کعب میں داخل ہو کر کمال درجے کی ہوشیاری اور مستعدی سے کام لے کر کعب کو زنان خانہ سے باہر بلا لیا۔ کچھ دیر اس سے بات چیت کرتے رہے۔ پھر دفعتہً حملہ کر کے اس کا سر کاٹ لیا اور اسے لا کر حضورؐ کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہ جوانِ رعنا جنھوں نے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو راضی کرنے کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دی اور اسلام کے ایک بدترین دشمن کا قلع قمع کر دیا ——— حضرت

محمدؓ بن مسلمہ انصاری تھے۔

(۲)

حضرت ابو عبدالرحمٰن محمدؓ بن مسلمہ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق انصار کے قبیلۂ اوس سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

محمدؓ بن مسلمہ بن سلمہ بن خالد بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔

ہجرتِ نبوی سے تقریباً پینتیس ۳۵ سال پہلے پیدا ہوئے۔ والدین نے محمد نام رکھا۔ اس طرح حسنِ اتفاق سے انہیں رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمنام ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔

محمدؓ سنِ شعور کو پہنچے تو انہوں نے جملہ فنونِ سپہگری میں پوری دسترس حاصل کر لی۔ بڑے نڈر اور جی دار تھے، اس لیے انصار کے بہادر نوجوانوں میں شمار ہونے لگے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اوس کے بازوئے شمشیر زن بنو عبدالاشہل سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سلیم عطا کی تھی چنانچہ ہجرت سے ایک سال قبل جب مدینے میں اسلام کے داعیٔ اوّل حضرت مُصعبؓ بن عُمیرؓ کے ذریعے ان کے کانوں میں توحید کی آواز پڑی تو انہوں نے اس پر بلا تامل لبیک کہا۔ اس طرح وہ انصار کے سابقین اوّلین میں شامل ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس وقت حضرت محمدؓ بن مسلمہ سعادت اندوزِ ایمان ہوئے اس وقت اوس کے قریباً سبھی مرد و زن کفر و شرک کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے۔ یہاں تک کہ سید الاوس حضرت سعدؓ بن معاذ بھی اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے، اس طرح ابنِ مسلمہؓ کو قبیلہ اوس کے سابقین اوّلین میں بھی امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت

محمدؓ بن مسلمہ نے دوسرے انصار کے ساتھ والہانہ جوش و خروش سے آپؐ کا استقبال کیا۔ ہجرت کے چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو ایک روایت کے مطابق حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو امین الامۃ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کا اسلامی بھائی بنایا، لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کے اسلامی بھائی حضرت ابوطلحہ زیدؓ بن سہل انصاری بنائے گئے۔ (صحیح مسلم) اس لیے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کے مواخاتی بھائی کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

رمضان ۲ھ میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو ان تین سو تیرہ نفوسِ قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جو میدانِ بدر میں اپنی بے سروسامانی کے باوجود محض اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خوشنودی کی خاطر کفر کی مہیب طاغوتی قوت سے بھڑ گئے اور اس کو خاکِ نامرادی چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے یہودِ بنو قینقاع کو آتش زیرپا کر دیا۔ یہ بڑے جنگجو لوگ تھے اور انھوں نے اپنے قلعوں میں بھاری مقدار میں اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو فتح کی خوشی مناتے دیکھ کر ان کی چھاتی پر سانپ لوٹ گیا اور انھوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ قریش لڑنا کیا جانیں، اگر محمدؐ کو ہم سے سابقہ پڑتا تو اسے پتہ چل جاتا کہ جوانمردی کیا شے ہے۔ حضورؐ نے پہلے تو ان کی ہفوات کو نظر انداز کر دیا لیکن شوال ۳ھ میں ایک اتفاقی واقعے نے صورتِ حال کو سنگین بنا دیا۔ ہوا یہ کہ ایک مسلمان خاتون بنو قینقاع کے محلے میں کسی کام سے ایک یہودی کی دوکان میں گئی۔ یہودی نے اس کی بے حرمتی کی۔ یہ دیکھ کر ایک مسلمان غیرت سے بے تاب ہو گیا اور اس یہودی کو قتل کر ڈالا۔ جواب میں یہودی نے اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ حضورؐ کو ان حالات کی خبر ہوئی تو آپؐ بنو قینقاع کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو سمجھایا کہ خدا سے ڈرو کہیں تم بھی مشرکینِ بدر کی طرح عذاب کی لپیٹ میں نہ آجاؤ، لیکن بنو قینقاع کو اپنے ہتھیاروں اور قلعوں پر اتنا ناز تھا کہ انھوں

نے حضورؐ کی نصیحت قبول کرنے کے بجائے نہایت گستاخانہ جواب دیا اور اس طرح مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ عملاً توڑ ڈالا۔ اب سرورِ عالمؐ نے مجبور ہو کر ان کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے میں حضرت محمدؓ بن مَسلَمہ بھی حضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ پندرہ دن کے محاصرے میں بنو قینقاع کے سب کس بل نکل گئے اور وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے وہ ان کو منظور ہو گا۔ یوں تو وہ اپنی عہد شکنی اور غداری کی پاداش میں واجب القتل تھے لیکن حضورؐ نے ازراہِ ترحم ان کو جلاوطنی کی سزا دی۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے یہودِ بنو قینقاع سے مال وصول کرنے کا فرض حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو سونپا۔ انہوں نے یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

ربیع الاول ۳ھ میں حضرت محمدؓ بن مَسلَمہ نے مدینے میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگانے کا خطرناک کام انجام دیا۔ اس مہم میں ان کی کامیابی پر حضورؐ نے مسرت کا اظہار فرمایا اور انہیں دُعائے خیر سے نوازا۔

شوال ۳ھ میں غزوۂ اُحد پیش آیا تو حضورؐ نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو اسلامی لشکر کی حفاظت پر مامور فرمایا، چنانچہ وہ پچاس مجاہدین کو ساتھ لے کر رات بھر گشت لگاتے رہے۔

۴ھ ہجری میں یہود بنو نضیر نے غداری پر کمر باندھی۔ انہوں نے قریشِ مکہ سے ساز باز شروع کر دی اور جب حضورؐ انہیں سمجھانے ان کے محلے میں تشریف لے گئے تو آپؐ کو شہید کرنے کا منصوبہ بھی بنایا۔ حضورؐ کو اس منصوبے کا بروقت علم ہو گیا اور آپؐ واپس تشریف لے آئے۔ یہاں سے آپؐ نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو بنو نضیر کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم نے اہلِ حق کے ساتھ جو دھوکا اور فریب کیا ہے اس کا مداوا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم مدینے سے نکل کر کسی دوسرے شہر چلے جاؤ اگر دس روز تک یہاں سے نہ نکلے تو پھر تمہیں اس سے

بدترسزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ بنو نضیر نے اس حکم کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور مقابلے پر تُل گئے۔ حضورؐ نے ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا، آخر وہ اس شرط پر مدینے سے نکلنے پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال و اسباب اونٹوں پر لے جا سکیں، لے جائیں۔ حضورؐ نے ان کی یہ شرط مان لی اور حضرت محمدؓ بن مَسلمہ کو ہدایت کی کہ وہ ان کو اپنی نگرانی میں مدینے سے جلاوطن کر دیں۔ حضرت محمدؓ نے یہ خدمت بڑے احسن طریقے سے انجام دی۔

۵ھ میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ بڑے جوش و خروش اور جذبے کے ساتھ غزوۂ احزاب میں شریک ہوئے اور اس کے فوراً بعد غزوہ بنو قریظہ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے بنو قُریظہ کے مارِ آستین یہودیوں کو مغلوب کرنے کے بعد موت کی سزا سنائی تو حضرت محمدؓ بن مَسلمہ کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ باغی مردوں کو عورتوں اور بچوں سے الگ کر کے ان کے ہاتھ باندھ دیں۔ حضرت محمدؓ نے یہ کام نہایت مستعدی سے انجام دیا۔

(۳)

قُرطاء نجد کے ایک قبیلے عامر بن صعصعہ کی ایک شاخ تھی جو مدینہ کے مشرق میں سات دن کی مسافت پر آباد تھی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے پیش بندی کے طور پر محرم ۶ھ میں حضرت محمدؓ بن مَسلمہ کو تیس سوار دے کر ان کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت محمدؓ نے اس مہم میں بڑی احتیاط اور دانشمندی سے کام لیا۔ وہ دن کو اپنے ساتھیوں سمیت پہاڑوں میں چھپ جاتے اور رات کو سفر کرتے۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے انھوں نے دشمن کے گاؤں کو اچانک جا گھیرا۔ جن لوگوں نے مقابلہ کیا وہ قتل ہوئے،

باقی فرار ہو کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ دشمن کے ۱۵۰ اونٹ اور تین ہزار بکریاں لے کر انیس دن کے بعد مظفر و منصور مدینہ واپس آئے۔
ایک روایت میں ہے کہ اسی مہم میں مشہور نجدی سردار ثمامہؓ بن اثال مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ جب انہیں مدینے لایا گیا تو وہ حضورؐ کا خلق عظیم دیکھ کر مسلمان ہو گئے اور اس کے بعد اسلام کے قوی دست و بازو ثابت ہوئے۔
ربیع الآخر ۶ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت محمدؓ بن مَسلَمہ کو دس آدمیوں کے ہمراہ ذی القصّہ روانہ فرمایا۔ یہ مقام مدینہ منوّرہ سے ۲۴ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مہم کا کیا مقصد تھا؟ مؤرخین کا اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے ان اصحاب کو تبلیغ و ہدایت کے لیے بھیجا تھا اور بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انہیں بنو ثعلبہ کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا گیا جو مدینے پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ قرینے سے پہلی روایت درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ کسی باغی قبیلے کی سرکوبی کے لیے دس گیارہ آدمیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بہرصورت جب یہ اصحاب ذی القصہ پہنچے تو بنو ثعلبہ نے سنو آدمی جمع کر کے ان پر پہلے تیر برسائے اور پھر نیزے لے کر ٹوٹ پڑے یہاں تک حضرت محمدؓ بن مَسلَمہ کے سوا سب کو شہید کر ڈالا۔ حضرت محمدؓ صرف اس وجہ سے بچ سکے کہ ان کے ٹخنے پر شدید چوٹ آگئی جس کے صدمے سے بے ہوش ہو گئے۔ دشمن نے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس واقعے کے بعد اتفاق سے ایک مسلمان ادھر سے گزرا۔ اس نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو اس حال میں دیکھا تو اس کی غیرتِ ایمانی نے گوارا نہ کیا کہ اپنے ایک مجروح مسلمان بھائی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ اس نے حضرت محمدؓ بن مَسلَمہ کو کندھوں پر اٹھا لیا اور طویل فاصلہ طے کر کے مدینہ منوّرہ پہنچا دیا۔ اس سانحے کی خبر سن کر حضورؐ کو سخت صدمہ ہوا اور آپؐ نے شہدائے ذی القصّہ کا انتقام لینے کے لیے حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو چالیس سواروں کے ہمراہ روانہ فرمایا، لیکن بنو ثعلبہ

کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی اور وہ پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے۔

ذیقعدہ ۶ھ میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کی عظیم سعادت نصیب ہوئی۔

محرم ۷ہجری میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر لشکر کشی کی تو حضرت محمدؓ بن مسلمہ اور ان کے بھائی محمودؓ بن مسلمہ بھی حضورؐ کے ہمرکاب تھے۔ اس لڑائی میں دونوں بھائی سر بکف ہو کر لڑے اور دشمن پر اپنی شجاعت و شہامت کا سکہ بٹھا دیا۔ ابنِ اسحاقؒ، موسیٰؒ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ یہودِ خیبر کے نامور سردار مرحب کو حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے قتل کیا لیکن جمہور مورخین نے مرحب کا قاتل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بتایا ہے۔ حضرت محمدؓ مرحب کے قاتل ہوں یا نہ ہوں اتنا ضرور ثابت ہے کہ انہوں نے غزوۂ خیبر میں غیر معمولی جرأت و بسالت کا مظاہرہ کیا۔ اس لڑائی میں انہیں ایک دلدوز صدمے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ہوا یوں کہ اثنائے جنگ میں ایک دن ان کے بھائی محمودؓ بن مسلمہ لڑائی کی شدت اور ہتھیاروں کے بوجھ سے تھک گئے اور قلعہ ناعم کی دیوار کے سائے میں ستانے بیٹھ گئے۔ کسی یہودی نے ایک بھاری پتھر ان کے سر پر دے مارا، اس سے شدید زخمی ہو گئے اور پیشانی کی کھال منہ پر اتر آئی۔ لوگ اٹھا کر حضورؐ کی خدمت میں لے گئے۔ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے کھال کو اس کی جگہ پر لا کر کپڑے کی پٹی باندھ دی۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ ان کی حالت دیکھ کر سخت مغموم تھے۔ حضورؐ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا، انشاء اللہ! تیرے بھائی پر پتھر گرانے والا کل اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جائے گا۔ لسانِ رسالت سے نکلے ہوئے الفاظ یوں پورے ہوئے کہ حضرت محمودؓ پر پتھر گرانے والا یہودی دوسرے دن مارا گیا۔ حضرت محمودؓ بھی زخمی ہونے کے تین دن بعد عازمِ خلدِ بریں ہوئے۔ حضرت محمدؓ نے یہ صدمۂ جانکاہ بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کیا اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھ کر راضی برضا

ہو گئے۔

ذیقعدہ ۷ھ ہجری میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو عمرۃ القضا میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ "طبقات ابن سعد" میں ہے کہ حضورؐ ذوالحلیفہ پہنچے تو آپؐ نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ گھوڑے لے کر ہراول کے طور پر آگے بڑھیں۔ وہ گھوڑوں کے ساتھ مرانظہران پہنچے تو قریش کے چند لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے بڑے فخر و انبساط سے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرے کے لیے تشریف لا رہے ہیں، اللہ نے چاہا تو آپؐ کل یہاں پہنچ جائیں گے۔ حضورؐ تشریف لائے تو حضرت محمدؓ بن مسلمہ اور دوسرے مسلمانوں نے آپؐ کے ساتھ مکے میں داخل ہو کر بڑے ذوق و شوق سے عمرہ ادا کیا۔

رجب ۹ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے۔ آپؐ کا معمول تھا کہ جب مدینہ منورہ سے کہیں باہر تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر کر جاتے۔ اس موقع پر آپؐ نے کس کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اس سلسلے میں مختلف روایات میں چار اصحاب کے نام آتے ہیں:

(۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

(۲) حضرت محمدؓ بن مسلمہ

(۳) حضرت سباعؓ بن عرفطہ

(۴) حضرت ابن اُمِّ مکتومؓ

جمہور اہل سیر کے نزدیک راجح قول یہی ہے کہ آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اپنا جانشین بنایا۔ ان روایات کی تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ قائم مقام امیر تو حضورؐ نے حضرت علیؓ ہی کو بنایا، البتہ دوسرے حضرات کو کاروبارِ خلافت میں ان کی نیابت اور مدد کے لیے مدینے میں چھوڑ دیا۔

(۴)

سنہ ۱۱ھ میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رض سوا دو سال تک مسند نشینِ خلافت رہے۔ اس عرصے میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ کی کسی سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ سنہ ۱۳ ہجری میں حضرت عمر فاروق رض سریر آرائے خلافت ہوئے تو انہوں نے ملکی عہدے داروں کے انتخاب میں ایسی جوہر شناسی کا ثبوت دیا کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ علامہ شبلیؒ نے "الفاروق" میں لکھا ہے کہ "حضرت عمر رض کی طبیعت شروع ہی سے جوہر شناس واقع ہوئی تھی۔ جس شخص میں جس قسم کی قابلیت ہوتی وہ اس کی تہہ کو پہنچ جاتے۔ اس کے ساتھ انہوں نے ملک کے تمام قابل آدمیوں سے واقفیت بہم پہنچائی تھی یہی بات تھی کہ انہوں نے جس شخص کو جو کام دیا اس کے انجام دینے میں اس سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔" حضرت عمر رض نے اپنے عمّال کے احتساب اور تحقیق کے لیے ایک خاص عہدہ قائم کیا تو اس کا افسر اعلیٰ حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو مقرر کیا، گویا وہ اسلامی حکومت کے سب سے پہلے محتسب اعلیٰ تھے۔ اور انہیں حکومت کے بڑے سے بڑے عہدیدار کے خلاف کسی بھی قسم کی شکایت کی تحقیق و تفتیش کا اختیار حاصل تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ عرصے حکومت کی طرف سے قبیلہ جہینہ کے صدقات بھی وصول کرتے رہے۔ حضرت محمد رض بن مسلمہ نے محتسب اعلیٰ یا نگرانِ عمّال کی حیثیت سے اپنے فرائض نہایت حسن و خوبی اور دیانت و حکمت سے انجام دیئے۔ اس ضمن میں اہلِ سیر نے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

ایک مرتبہ حضرت عمر رض بازار میں گشت لگا رہے تھے کہ ایک شخص نے آواز دی، عمر! کیا عاملوں کے لیے چند قواعد مقرر کر دینے سے تم عذاب الٰہی سے بچ جاؤ گے؟ تمہارا عامل مصر عیاض رض بن غنم باریک کپڑے پہنتا ہے اور اس نے

اپنے دروازے پر دربان مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو بلایا اور حکم دیا کہ مصر جا کر عیاضؓ کو جس حالت میں پاؤ اپنے ساتھ لے کر مدینے آؤ۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے مصر پہنچ کر دیکھا کہ عیاضؓ واقعی باریک کپڑے کا کرتہ پہنے ہوئے تھے اور ان کے دروازے پر دربان کھڑا تھا۔ حضرت محمدؓ نے عیاضؓ سے ملتے ہی کہا چلو تمہیں امیر المومنین نے بلا بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا ذرا ٹھہرو میں قبا پہن لوں۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے جواب دیا ہرگز نہیں تمہیں اسی ہیئت میں چلنا ہوگا۔ چنانچہ ان کو اسی باریک لباس کے ساتھ دربارِ خلافت میں پیش کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عیاضؓ کا باریک کرتہ اتروا کر بالوں کا کرتہ پہنوایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں لے جا کر چراؤ۔ عیاضؓ کو انکار کی مجال نہ تھی لیکن بار بار کہتے تھے اس بے عزتی سے تو مر جانا بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تمہیں اس کام سے شرم کیوں آتی ہے۔ تمہارے باپ کا نام غنم اس وجہ سے مشہور ہوا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ حضرت عیاضؓ نے دل سے توبہ کی اور پھر جب تک زندہ رہے کبھی باریک لباس پہنا اور نہ دروازے پر دربان رکھا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو شکایت پہنچی کہ امیر کوفہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے ایک محل بنوایا ہے جس کے سامنے ڈیوڑھی بھی بنوائی ہے، اہل حاجت اس ڈیوڑھی کے پھاٹک سے گزر کر بلا روک ٹوک امیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو حضرت سعدؓ کے نام ایک خط دے کر کوفے روانہ کیا اور ہدایت کی کہ سعدؓ کی قیامگاہ کی ڈیوڑھی کو آگ لگا دیں اور جب وہ جل کر راکھ ہو جائے تو واپس چلے آئیں۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے کوفے پہنچ کر امیر المومنین کا حکم حضرت سعدؓ کو سنایا اور پھر "قصرِ سعد" کی ڈیوڑھی کو نذرِ آتش کر دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ محمدؓ بن مسلمہ کوفے پہنچے تو حضرت سعدؓ نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی اور ان کے سامنے کھانا پیش کیا۔ حضرت محمدؓ نے کھانا قبول کرنے میں عذر کیا اور

حضرت سعدؓ کو امیر المؤمنین کا خط دیا۔ انہوں نے یہ خط کھولا تو اس میں لکھا تھا:

"مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے اپنے قیام کے لیے ایک محل تعمیر کرایا ہے جو قصرِ سعد کہلاتا ہے اس کے سامنے تم نے ایک ڈیوڑھی تعمیر کرائی ہے اور اس میں پھاٹک لگوایا ہے جو لوگوں کو تم تک پہنچنے میں سدِ راہ ہوتا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہے تو تم نے ہلاکت کا محل بنایا ہے۔ اس ڈیوڑھی اور اس کے پھاٹک کو فوراً گرا دو۔"

حضرت سعدؓ نے خط پڑھ کر قسم کھائی کہ ڈیوڑھی میں نے محض شور و شغب سے بچنے کے لیے بنوائی ہے۔ میری قیام گاہ کے دروازے اہلِ حاجت کے لیے ہر وقت کھلے ہیں میں نے ان پر کوئی دربان مقرر نہیں کیا۔ لوگوں نے میری اقامت گاہ کو غلط طور پر "قصرِ سعد" کے نام سے مشہور کر دیا ہے۔

حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے حضرت سعدؓ کا عذر قبول کر لیا اور مدینے واپس جا کر تمام حالات امیر المؤمنین کے گوش گزار کیے۔ انہوں نے بھی حضرت سعدؓ کا عذر قبول کر لیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمروؓ بن العاص والئی مصر کے خلاف شکایت موصول ہوئی کہ ان کے مال و دولت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو ان کے نام یہ فرمان دے کر بھیجا کہ اپنا سارا مال محمدؓ بن مسلمہ کے سامنے رکھ دو وہ اس کا جائزہ لے کر جو کارروائی مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔

محمدؓ بن مسلمہ مصر پہنچے تو حضرت عمروؓ بن العاص نے انہیں کوئی ہدیہ پیش کیا۔ انہوں نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کو ان کا انکار ناگوار گزرا اور انہوں نے فرمایا — تم نے ہدیہ واپس کر دیا حالانکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرما لیتے تھے۔ حضرت محمدؓ نے جواب دیا کہ حضورؐ کو پیش کیے جانے والے ہدیے اور آپ کے ہدیے میں فرق ہے۔ میرا منصب مجھے اس کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے خشم آلود لہجے کہا: خدا اس دن کا

برا کرے جب میں عمر بن خطاب کا والی بنا۔ جس زمانے میں میرا باپ عاص کمخواب کی قبا پہنا کرتا تھا، خطاب گدھے پر لکڑیاں لاد کر پھرا کرتا تھا۔ آج اسی خطاب کا بیٹا مجھ پر حکومت جتا رہا ہے۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے بے دھڑک کہا:

عاص اور خطاب دونوں جہنم کے کندے ہیں، لیکن عمرؓ آپ سے ضرور بہتر ہیں۔ اس کے بعد کچھ تلخ گفتگو ہوئی یہاں تک کہ حضرت عمروؓ بن العاص نے سارا مال لا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے جتنی رقم مناسب سمجھی، اس میں سے لے لی اور مدینے آ کر بیت المال میں جمع کرا دی۔

۲۱ سنہ ہجری میں کوفے کے کچھ متفتنی لوگوں نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے خلاف شکایات پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے تحقیق کے لیے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو بھیجا۔ انہوں نے کوفے کی ایک مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کے بیانات لیے اور پھر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ساتھ لے کر مدینے آئے یہاں خود امیر المومنین نے ان کا بیان لیا۔

مختصر یہ کہ حضرت محمدؓ بن مسلمہ احتساب یا تحقیق کرتے وقت مطلق کسی کی رو رعایت نہ کرتے تھے اور نہ کسی سے خم کھاتے۔ اسی بے خوفی اور دیانت کی بناء پر حضرت عمر فاروقؓ کی نگاہِ جوہر شناس نے انہیں اس اہم ترین عہدے کے لیے منتخب کیا تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد حضرت محمدؓ بن مسلمہ اپنے عہدہ سے دستکش ہو گئے اور مدینے کی سکونت ترک کر کے ربذہ جا بسے۔ وہاں انہوں نے عزلت گزینی کی زندگی اختیار کر لی۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دورِ خلافت میں طرح طرح کے فتنوں نے زور باندھا اور مسلمان خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے، لیکن حضرت محمدؓ بن مسلمہ ان تمام فتنوں اور باہمی آویزشوں سے یکسر کنارہ کش رہے۔

ابنِ اثیرؒ نے "اسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت

میں کچھ لوگ رندہ گئے اور انہوں نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ سے گوشہ نشینی کا سبب پوچھا۔ انہوں نے فرمایا "جب تک فتنے فرو نہیں ہو جاتے ہمیں ان میں ملوث ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"مسندِ احمد بن حنبل" میں ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو بلا بھیجا اور ان سے پوچھا، آپ نے میری حمایت میں تلوار کیوں نہ اٹھائی؟ انہوں نے جواب دیا: امیر المؤمنین! آپ کے برادرِ گرامی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے دستِ مبارک سے مجھے تلوار عنایت فرمائی تھی اور ساتھ ہی مجھے وصیت فرمائی تھی کہ اس تلوار سے مشرکین کے خلاف خوب لڑنا، لیکن جب تو دیکھے کہ مسلمان ایک دوسرے کے خلاف رزم آرا ہیں تو اسے کوہِ اُحد پر مار کر توڑ دینا اور اپنے گھر میں خلوت نشین ہو جانا۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی کیا۔

دوسری طرف امیر معاویہؓ کے حامیوں کو یہ گلہ تھا کہ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے امیر معاویہؓ کی طرف سے تلوار کیوں نہ اٹھائی۔ چنانچہ ایک بدبخت شامی نے اسی رنجش کی بنا پر انہیں صفر ۴۶ھ میں شہید کر ڈالا۔ اس وقت وہ تقریباً اسّی برس کے پیٹے میں تھے اور مدینہ منورہ میں اپنے گھر کے اندر مصروفِ عبادت تھے۔

مروان بن الحکم حاکمِ مدینہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر ہزاروں اہلِ مدینہ نے بادیدۂ گریاں علم و فضل اور رشد و ہدایت کے اس خورشیدِ جہانتاب کو آغوشِ لحد میں اتار دیا۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے اپنے پیچھے دس لڑکے اور چھ لڑکیاں چھوڑیں۔ لڑکوں میں سے پانچ کو شرفِ صحابیت حاصل تھا۔

حضرت محمدؓ بن مسلمہ کا شمار فضلاء صحابہؓ میں ہوتا ہے تاہم ان سے مروی صرف چھ احادیث کتابوں میں ملتی ہیں، شاید اس کی وجہ روایتِ حدیث میں ان کی غایت درجہ احتیاط ہو۔ ان کے صحیفۂ اخلاق، سبقت فی الاسلام، حبِ رسولؐ، شوقِ جہاد، شجاعت و بسالت

فتنوں سے کنارہ کشی، دیانت اور بے خوفی سب سے نمایاں الواب ہیں۔ عہدِ رسالت میں کوئی شرف ایسا نہ تھا جو انھیں حاصل نہ ہوا ہو۔ اسی بناء پر تمام اہلِ سیَر نے انہیں صحابہ کبارؓ کی مقدس جماعت کا ایک معزز رکن قرار دیا ہے

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت رفاعہؓ بن عمرو انصاری

خزرج کے خاندان " عوف بن خزرج " میں سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:
رفاعہؓ بن عمرو بن زید بن عمرو بن ثعلبہ بن مالک بن سالم (حُبلیٰ) بن غنم عوف بن خزرج۔

ان کی کنیت ابوالولید ہے۔ اور عرف ابن ابی ولید ہے۔ اس لیے کہ ان کے دادا زید بن عمرو کی کنیت بھی ابوالولید تھی۔ حضرت رفاعہؓ کے خاندان کو " بنو حُبلیٰ " بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے مورثِ اعلیٰ سالم بن غنم کا پیٹ بہت بڑا تھا اس لیے وہ حبلی کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ یہ خزرج کی نہایت معزز شاخ تھی اور رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔

حضرت رفاعہؓ کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ وہ ہجرتِ نبوی سے قبل سعادت اندوزِ ایمان ہوئے اور پھر ۱۳ بعد بعثت میں مکہ جا کر لیلۃ العقبہ میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد ۲ ہجری میں غزوۂ بدر میں حضورؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ غزوۂ اُحد میں بھی بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان قربان کر دی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت طفیل رض بن مالک انصاری

انصار کے قبیلہ خزرج سے تھے۔ نسب نامہ یہ ہے:

طفیلؓ بن مالک بن خنساء بن سنان بن عبید بن عدی۔ بن غنم بن کعب۔

ہجرتِ نبوی سے پہلے ۱۳ سنہ بعدِ بعثت میں مکہ گئے اور بیعت عقبہ کبیرہ میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کی۔

رمضان ۲ سنہ ہجری میں غزوۂ بدر میں دادِ شجاعت دی۔ ۳ سنہ ہجری میں غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لڑے۔ اس لڑائی میں انہوں نے باختلافِ روایت تیرہ یا اکتیس زخم کھائے۔ تاہم جان بچ گئی اور زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو گئے۔ ۵ سنہ ہجری میں غزوۂ خندق میں پُرجوش حصہ لیا۔ اور اسی لڑائی میں (بقول ابنِ ابی حاتم) وحشی بن حرب کے ہاتھ سے جامِ شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عقربتہ الجُہَنیّ رض

ان کا تعلق بنو جُہَینہ سے تھا۔ غزوۂ اُحد میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور نہایت بہادری سے لڑ کر رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

ایک روایت میں ہے کہ ان کے کم سن فرزند نے باپ کی شہادت کی خبر سُنی تو رونے لگے۔ حضورؐ نے انہیں دلاسا دیا اور فرمایا:

"کیا تو اس بات پر خوش نہیں ہے کہ میں تیرا باپ اور عائشہؓ تیری ماں ہو۔"

انہوں نے عرض کیا: "ہاں یا رسول اللہ، میں راضی ہوں۔"

حضرت عقربہؓ کے صاحبزادے کا نام باختلافِ روایت بشرؓ یا بشیرؓ تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سلیمؓ بن عمرو انصاری

خزرج کے خاندان بنو سلمہ میں سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

سلیمؓ بن عمرو بن حدیدہ بن عمرو بن سواد بن غنم بن کعب بن سلمہ بن سعد بن علی اسعد بن ساردہ بن یزید بن جشم بن خزرج۔

ہجرتِ نبوی سے پہلے سعادت اندوزِ اسلام ہوئے۔ اور ۱۳ بعدِ بعثت میں مکہ جاکر لیلۃ العقبہ میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔

ہجرتِ نبوی کے بعد ۲ھ میں انہیں اصحابِ بدر میں شامل ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد غزوۂ اُحد میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے اور نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ بعض نے اُن کا نام سلیمان بن عمرو بن حدیدہ لکھا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عنترہؓ

حضرت سُلیمؓ کے غلام عنترہؓ بھی راہِ حق کے ایک جانباز سپاہی تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے غزوۂ بدر میں حضورؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد غزوۂ اُحد میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے نوفل بن معاویہ دیلی کے ہاتھ سے جامِ شہادت پیا۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمؓ نے انھیں آزاد کر دیا تھا۔ اور بقول ابنِ ہشام وہ بنی تمیم بن کعب بن سلمہ کے حلیف تھے۔ بہر صورت اُن کا شمار خزرجی سلمی انصار میں ہوتا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت رافعؓ بن خدِیج انصاری

①

غزوۂ اُحد (شوال ۳ ہجری) میں تین ہزار بپھرے ہوئے مشرکین مکّہ کے مقابلے میں صرف سات سو پرستارانِ حق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔ ان سب کے دلوں میں شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک رہے تھے اور کفّار کی کثرتِ تعداد اُن کے نزدیک پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی تھی۔ ان سرفروشوں میں پندرہ برس کے ایک سبزہ آغاز نوجوان بھی تھے۔ لڑائی کا آغاز ہوا تو وہ مردانہ وار صفِ جنگاہ میں گھس گئے اور شجاعت وبسالت کا حق ادا کر دیا عین اُس وقت جب لڑائی کی آگ پوری شدّت سے بھڑک رہی تھی، کسی مُشرک نے تاک کر اس نوجوان کو تیر مارا۔ یہ تیر اُن کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ لوگوں نے ان کو سہارا دے کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا حضورؐ نے فرمایا، اس کے سینے سے تیر کھینچ کر نکالو ——— تیر ہڈیوں کو توڑ کر بدن کے اندر اس طرح گھُس گیا تھا کہ کسی طرح نکلتا ہی نہ تھا۔ جب پورے زور سے کھینچا گیا تو نوک اندر رہ گئی جس کے نکالنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ حضورؐ نے نوجوان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور فرمایا:-

" قیامت کے دن میں تمہارے جذبۂ ایمان و فدویت کی شہادت دوں گا۔ "

حضورِ پُرنورؐ کا ارشادِ گرامی سُن کر زخمی نوجوان اپنی تکلیف بھول گئے اور فرطِ مُسرّت سے بے خود ہو گئے۔

یہ خوش بخت نوجوان جن کی نسبت سیدالمرسلین فخرِ موجودات رحمتِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم

نے قیامت کے دن شہادت دینے کا وعدہ فرمایا، حضرت رافع رضؓ بن خَدِیج انصاری تھے۔

(۲)

سیّدنا ابو عبداللہ رافع بن خَدِیج کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ انصار کے سابقین اوّلین میں سے ہیں۔ اُن کا تعلق قبیلہ اوس کی شاخ بنو حارثہ سے تھا۔

نسب نامہ یہ ہے:-

رافع رضؓ بن خَدِیج بن رافع بن عدی بن زید بن جشم بن حارثہ بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔

حضرت رافع رضؓ کے باپ دادا اپنے قبیلے (بنو حارثہ) کے رئیس اور سردار تھے۔ اس لیے حضرت رافع رضؓ نے تموّل اور آسودہ حالی کے ماحول میں ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ اس ماحول میں پرورش پانے والے بچے بالعموم بڑے مغرور اور سرکش ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت رافع رضؓ کو نہایت پاکیزہ فطرت سے نوازا تھا۔ ہجرتِ نبویؐ سے کچھ عرصہ پہلے حضرت مُصعَب رضؓ بن عُمیر کی تبلیغی مساعی سے مدینہ منوّرہ میں اسلام کا چرچا پھیلا تو اُس زمانے میں حضرت رافع رضؓ کی عمر صرف دس گیارہ برس کی تھی۔ ان کے کانوں میں توحید کی آواز پڑی تو انہوں نے اس پر لبّیک کہنے میں ایک لمحہ بھی تامّل نہ کیا۔ غالباً اس وقت وہ سایۂ پدری سے محروم ہو چکے تھے۔ اور ان کے چچا ظُہیر و مُظہِر خاندان کے سربراہ تھے۔ وہ دونوں بھی نیک فطرت آدمی تھے۔ سیّد الاوس حضرت سعد رضؓ بن مُعاذ سعادت اندوزِ اسلام ہوئے اور اپنے قبیلے کی تمام شاخوں کو دعوتِ اسلام دی تو ظُہیر رضؓ اور مُظہِر رضؓ بھی شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو انصار نے والہانہ ذوق وشوق سے حضورؐ کا استقبال کیا۔ حضرت رافع رضؓ اور اُن کے دونوں چچا بھی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے والوں میں شامل تھے۔

رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں حق و باطل کا پہلا معرکہ بدر کے میدان میں پیش آیا تو

چودہ سالہ رافعؓ بڑے ذوق سے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ سے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت چاہی، چونکہ حضورؐ نے لڑائی میں شامل ہونے کے لیے عمر کی کم از کم حد پندرہ برس مقرر فرمائی تھی۔ اس لیے حضرت رافعؓ کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہ ملی اور وہ بادلِ ناخواستہ گھر واپس آگئے۔ البتہ (صحیح بخاری کی ایک روایت کے مطابق) ان کے دونوں چچا حضرت ظُہیرؓ اور حضرت مُظہرؓ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور مقدور بھر دادِ شجاعت دی۔

(۳)

غزوۂ اُحد (شوال ۳ھ ہجری) کے وقت حضرت رافعؓ کی عمر پندرہ برس کی تھی اس لیے انہیں لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ انصار کے ایک لڑکے سمرہؓ بن جندب کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت نہ دی کیونکہ اُن کی عمر پندرہ برس سے کم تھی۔ انہوں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا، یا رسول اللہ! آپؐ نے رافع کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی ہے اور مجھے چھوڑ دیا ہے حالانکہ میں اس سے طاقتور ہوں اور اگر حضورؐ کو یقین نہ ہو تو میری رافعؓ سے کشتی کرا لیجئے۔ حضورؐ ان کے جذبۂ ایمانی سے بہت متاثر ہوئے اور دونوں کو کُشتی لڑنے کا حکم دیا۔ حضرت سمرہؓ بن جندب قد کاٹھ اور عمر میں حضرت رافعؓ سے چھوٹے تھے لیکن طاقت میں اُن سے زیادہ تھے۔ چنانچہ جب دونوں کا مقابلہ ہُوا تو حضرت سمرہؓ نے حضرت رافعؓ کو پچھاڑ دیا۔ حضورؐ نے یہ دیکھ کر حضرت سمرہؓ کو بھی لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ اسی غزوے میں حضرت رافعؓ دشمن کے تیر سے زخمی ہو گئے۔ تاہم چند دن میں زخم مندمل ہو گیا اگرچہ تیر کی نوک جسم کے اندر ہی رہ گئی۔

حضرت رافعؓ کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت و محبت تھی۔ اور وہ ہر وقت اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اہلِ سیَر نے لکھا ہے کہ انہوں نے غزوۂ اُحد، غزوۂ احزاب اور عہدِ رسالت کے اکثر دوسرے

غزوات میں حضورؐ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ شوقِ جہاد کے علاوہ اُن کو تحصیلِ علم کا شوق بھی تھا۔ لسانِ رسالت سے جو کچھ سُنتے تھے اُسے جُزوِ ایمان سمجھتے تھے۔ صحیح مُسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ اُن کے چچا حضرت ظُہیرؓ بن رافع نے بارگاہِ رسالت سے گھر آکر کہا کہ آج رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں کام سے منع فرمایا ہے حالانکہ اس کام میں ہم لوگوں کو کچھ سہولت تھی۔

حضرت رافعؓ نے چچا کی بات سُنی تو بے تاب ہو گئے اور فوراً کہا کہ چچا جان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں وہی حق ہے اور اسی میں ہماری بہتری ہے۔ چچا بھی مخلص صحابی تھے، بولے "بے شک حضورؐ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔"

ایک مرتبہ حضرت رافعؓ بیوی کے پاس خلوت میں تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے گھر کے باہر تشریف لائے اور انہیں آواز دی۔ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور تیزی کیساتھ غسل کر کے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

(۴)

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت رافعؓ بن خَدِیجؓ کے مشاغل اور سرگرمیوں کی کچھ زیادہ تفصیل کتبِ سِیَر میں نہیں ملتی۔ قیاس غالب یہ ہے کہ انہوں نے باقی زندگی کا بیشتر حصہ وعظ و ہدایت اور درس و تدریس میں گزارا۔ اُن کا نام نمایاں طور پر دوبارہ اس وقت منظرِ عام پر آیا جب انہوں نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ اور حضرت امیر معاویہؓ کے باہمی اختلافات میں کُھل کر حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور اُن کی حمایت میں کُھل کر عملی طور پر جنگِ صفّین میں شریک ہوئے تاہم حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہؓ نے اُن سے کچھ تعرّض نہ کیا۔ وہ اور حاکمِ مدینہ مروان بن الحکم اُن کے ساتھ ہمیشہ احترام سے پیش آتے رہے۔

امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت کے آخر میں یا عبدالملک بن مروان کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں حضرت رافعؓ شدید علیل ہو گئے۔ اس کا سبب تیر کی وہ نوک تھی جو غزوۂ اُحد میں اُن کے جسم

کے اندر رہ گئی تھی اسی نے زخم پیدا کر دیا جس کا زہر سارے جسم میں پھیل گیا اور اسی صدمے سے انہوں نے وفات پائی. اس وقت اُن کی عمر اسّی برس سے اُوپر تھی. اپنے پیچھے چھ لڑکے چھوڑے جن کے نام عبداللہ، رفاعہ، عبدالرحمٰن، عبیداللہ، سہل اور عبید تھے۔

حضرت رافعؓ اپنے والد اور چچا کی وفات کے بعد بنو حارثہ کے سردار ہو گئے تھے. اس لیے ہمیشہ مرفہ الحال رہے. مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ انہوں نے ترکہ میں کافی زمین، اونٹ اور لونڈی غلام چھوڑے۔

(۵)

حضرت رافعؓ بن خَدِیج کا شمار فضلاء صحابہ میں ہوتا ہے. اُن سے اٹھہتر ۷۸ احادیث مروی ہیں. اُن کے راویوں میں متعدّد جلیل القدر صحابہ اور تابعین شامل ہیں. اطاعتِ رسولؐ، اور شوقِ جہاد کے علاوہ امر بالمعروف حضرت رافعؓ کی زندگی کا ایک تابناک پہلو تھا۔ اربابِ سِیَر نے اس سلسلہ میں متعدّد واقعات بیان کیے ہیں، جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں ایک مرتبہ ایک غلام کسی شخص کے باغ سے کھجور کا پودا چُرا لایا اور اسے اپنے آقا کے باغ میں لگا دیا۔ اس زمانے میں مروان بن الحکم مدینہ منوّرہ کا گورنر تھا. باغ کے مالک نے اس کی عدالت میں غلام پر مقدمہ دائر کر دیا. مروان نے غلام کو قید کر دیا اور اُس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا. غلام کا آقا حضرت رافعؓ بن خَدِیج کی خدمت میں حاضر ہُوا اور یہ واقعہ اُن کے سامنے بیان کیا. حضرت رافعؓ نے فرمایا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھل کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا" غلام کے آقا نے ان سے درخواست کی کہ مروان کو بھی اس حدیث کی خبر کر دیجیے. وہ گئے اور مروان کے سامنے یہ حدیث بیان کی تو اُس نے غلام کو رہا کر دیا۔

(مسند ابو داؤد)

ایک مرتبہ مروان بن الحکم نے اپنے خطبہ میں بار بار کہا کہ مکّہ حرم ہے. حاضرین میں حضرت رافعؓ بھی موجود تھے انہوں نے باآوازِ بلند کہا کہ اگر مکّہ حرم ہے تو مدینہ بھی حرم ہے اور اس کو رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے حرم قرار دیا ہے۔ میرے پاس حدیث لکھی ہوئی موجود ہے چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔
مروان نے برملا ان کی بات تسلیم کرلی اور کہا کہ ہاں میں نے بھی یہ حدیث سُنی ہے۔ (مُسندِ احمدؒ)
جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمین کرایہ پر اُٹھایا کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں کسی نے انہیں بتایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرایہ پر اُٹھانے کی ممانعت فرمائی تھی۔ اور یہ حدیث رافعؓ بن خَدیج کے پاس ہے۔ وہ نافعؒ کو ساتھ لے کر حضرت رافعؓ کے پاس گئے اور اس حدیث کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے حدیث سُنائی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس کے بعد زمین کا کرایہ لینا چھوڑ دیا۔ (صحیح مسلم)
ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت رافعؓ بن خَدیج کا پایۂ علم وفضل کتنا بُلند تھا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ۔

حضرت انیس رضؓ بن قتادہ انصاری

انصار کے قبیلہ اوس سے تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

انیسؓ بن قتادہ بن ربیعہ بن خالد بن حارث بن عبید بن زید بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔

بعض نے ان کا نام انس لکھا ہے۔

ہجرتِ نبوی کے قریبی زمانہ میں سعادت اندوزِ ایمان ہوئے۔ نہایت مخلص اور پُرجوش مسلمان تھے۔ رمضان المبارک ۲ سنہ ہجری میں حق کے ان ۳۱۳ علمبرداروں میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا جو اصحابِ بدر کے لقب سے مشہور ہوئے اور جن کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے گئے۔ غزوۂ بدر کے بعد انھوں نے غزوۂ اُحُد میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور اسی غزوہ میں نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان نثار کر دی۔

مشہور صحابیہ حضرت خنساءؓ بنتِ حرام الاسدیہ حضرت انیسؓ ہی کی اہلیہ تھیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت رفاعہؓ بن وقش انصاری

اوس کے خاندان بنو عبدالاشہل کے ضعیف العمر بزرگوں میں سے تھے نسب نامہ یہ ہے:

رفاعہؓ بن وقش بن زغبہ بن زعورا ابن عبدالاشہل

اُحد کے دن حضورؐ نے انہیں ایک دوسرے بزرگ حضرت ابو حذیفہ حسیل الیمانؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کے ایک بلند ٹیلے پر (یا قلعے میں) عورتوں اور بچوں کے ساتھ بٹھا دیا کیونکہ وہ بہت بوڑھے تھے۔ جب ہنگامۂ کارزار گرم ہوا تو دونوں کے دل میں آرزوئے شہادت چٹکیاں لینے لگی۔ ایک نے دوسرے سے کہا "لا اب لك (کلمۂ غیرت یعنی تیرا باپ مرے یا معلوم نہیں تیرا باپ کون ہے) دوسرے لوگ تو راہِ خدا میں اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں اور ہم جو چراغِ سحری ہیں یہاں بیٹھے ہیں"۔ یہ کہہ کر دونوں تلواریں سونت کر میدانِ جنگ میں پہنچ گئے اور دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے۔ حضرت رفاعہؓ نے تو مشرکوں کے ہاتھ سے جامِ شہادت پیا اور جب ایک اتفاقی غلطی سے مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت حسیل الیمانؓ غلط فہمی کی بناء پر مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہم

حضرت مسعودؓ بن ربیع القاری

اُن کا تعلق بنی الھون بن خُزیمہ کے قبیلہ قارہ سے تھا اسی لیے انہیں قاری کہا جاتا ہے۔

ابو عمر کُنیت تھی۔ والد کا نام بعض روایتوں میں ربیعہ بھی آیا ہے۔ نسب نامہ یہ ہے:۔

مسعود بن ربیع (یا ربیعہ) بن عمرو بن سعد بن عبد العزّیٰ۔ حضرت مسعودؓ بن ربیع کا شمار ان جلیل القدر (غیر قریش) اصحاب میں ہوتا ہے۔ جو دعوتِ توحید کے بالکل ابتدائی دور میں سعادت اندوزِ ایمان ہوئے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دارِ ارقم میں تشریف نہیں لے گئے تھے حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو ہجرت الی المدینہ کا اذن دیا تو وہ بھی دوسرے صحابہؓ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین عقدِ مواخاۃ قائم کرایا تو ان کو حضرت عبیدؓ بن التیہان انصاری کا دینی بھائی بنایا۔

حضرت مسعودؓ سیّد المرسلینؐ کے نہایت مخلص جاں نثاروں میں سے تھے اور راہِ حق میں ہر وقت سر بکف رہتے تھے۔ علامہ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے بدر، اُحد، خندق اور عہدِ رسالت کے دوسرے تمام غزوات میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور ہر معرکے میں سرفروشی کے جوہر دکھائے۔

حافظ ابنِ عبدالبرؒ کے قول کے مطابق حضرت مسعودؓ بن ربیع نے ۳۰ھ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اُوپر تھی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سمرہؓ بن جندب

①

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ آپؐ بالعموم پندرہ برس سے کم عمر کے کسی لڑکے کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت نہیں فرماتے تھے۔ شوال ۳ھ ہجری میں حضورؐ نے غزوۂ اُحُد کی تیاری کی تو بڑی عمر کے صحابہ کے علاوہ انصار کے تمام لڑکے بھی آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور پرستارانِ باطل کے خلاف معرکہ آرا ہونے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے ان تمام لڑکوں کو جن کی عمر کم از کم پندرہ سال کی تھی، لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی اور اس سے کم عمر کے لڑکوں کو واپس جانے کا حکم دیا۔ ان میں سے چودہ برس کی عمر کے ایک نونہال جن کا چہرہ جوشِ ایمان سے تمتما رہا تھا، اپنے آقا و مولاؐ کا حکم سُن کر بجھ سے گئے تاہم انہوں نے ہمت سے کام لیا اور بارگاہِ رسالتؐ میں عرض کیا:

"یا رسول اللہ آپؐ نے میرے ہمجولی رافع بن خدیج کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت دے دی ہے حالانکہ میں اس سے طاقتور ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو رافع سے میری کشتی کرا کر دیکھ لیں۔"

رافعؓ بن خدیج پندرہ برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اسی لیے انہیں لڑائی میں شریک ہونے کے قابل ٹھہرایا گیا تھا۔ اب جو حضورؐ نے اس چودہ سالہ لڑکے کو راہِ حق میں لڑنے کے لیے اس قدر بے تاب پایا تو آپؐ بہت متاثر ہوئے اور انہیں رافعؓ سے کشتی لڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے آناً فاناً رافعؓ کو پچھاڑ دیا۔ حضورؐ نے یہ دیکھ کر انہیں بھی غزوہ میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ اسلام کے یہ نوخیز فرزند جن کے دل

میں جہاد فی سبیل اللہ کی اتنی تڑپ تھی کہ ہر صورت میں کفار کی طاغوتی قوت سے بھڑ جانا چاہتے تھے، حضرت سمُرہ بن جُندب تھے۔

(۲)

حضرت ابو عبدالرحمان سَمُرَہؓ بن جُندُب کا شمار فضلاءِ صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ وہ حلفائے انصار میں سے تھے اس لیے انصار ہی میں داخل ہیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

سمرہؓ بن جُندُب بن ہلال بن حریج بن مراہ بن حزان بن جابر بن ذوالریاستین خشین بن لای بن عصیم بن شمخ بن فزارہ بن ذبیان بن لبغیض بن ریث۔ بن غطفان۔

حضرت سَمُرَہؓ ابھی کم سِن ہی تھے کہ ان کے والد جُندُب بن ہلال کا انتقال ہو گیا۔ ان کی سکونت مدینہ کے ایک نواحی علاقے میں تھی۔ حضرت سَمُرَہؓ کی والدہ خاوند کے انتقال کے بعد بچے کو ساتھ لے کر مدینہ آ گئیں اور وہاں مری بن شیبان بن ثعلبہ سے اس شرط پر نکاحِ ثانی کر لیا کہ وہ ان کے ساتھ سَمُرَہؓ کی بھی کفالت کریں گے۔ چنانچہ حضرت سَمُرَہؓ نے مری بن شیبان ہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ وہ بچپن ہی سے نہایت سلیم الطبع تھے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو وہ فوراً شرفِ ایمان سے بہرہ ور ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً بارہ برس کی تھی۔

رمضان ۲ ہجری میں حضورؐ غزوۂ بدر کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت سَمُرَہؓ محض اپنی کمسنی کی بنا پر آپؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ غزوۂ اُحُد میں بھی ان کی عمر پندرہ برس سے کم تھی لیکن جوشِ ایمان کا یہ عالم تھا کہ اپنے سے بڑی عمر کے ایک ہمجولی کو کُشتی میں پچھاڑ کر حضورؐ سے لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت حاصل کر لی۔ غزوۂ اُحُد کے بعد عہدِ نبوی کے دوسرے تمام غزوات میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ انہیں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت عقیدت اور محبت تھی۔ جب بھی موقع ملتا بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو جاتے اور فیضانِ نبوی

سے خوب بہرہ یاب ہوتے۔ وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بڑے غور سے سنتے اور انہیں یاد رکھتے تھے۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے تھے۔ مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں دو جگہ قدرے سکوت فرماتے تھے، ایک تکبیر کے بعد جب سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھتے دوسرے وَلَا الضَّالِّین کے بعد جب آمین کہتے۔ حضرت سَمُرَہؓ بھی اپنی نماز میں بعینہٖ اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ حضورؐ کے وصال کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمرانؓ بن حُصَینؓ نے انہیں اس طرح نماز پڑھاتے دیکھا تو ان سے اختلاف کیا۔ چونکہ وہ عمر میں حضرت سَمُرَہؓ سے بڑے تھے اس لیے حضرت سَمُرَہؓ نے حضرت عمرانؓ سے بحث و تکرار کرنا مناسب نہ سمجھا اور صرف اتنا کہا کہ آپ اُبَیؓ بن کعب سے دریافت کرلیں۔ چنانچہ فقیہ انصار حضرت اُبَیؓ بن کعب کو مدینہ خط لکھ کر اس مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب بھیجا کہ سَمُرَہؓ ٹھیک سُنّتِ نبوی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

حضرت سَمُرَہؓ کبھی علیل ہوتے تو اپنے مرض کا علاج بعض اوقات پچھنے لگوا کر کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھنے لگواتے دیکھا ہے۔

ایک مرتبہ انہوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خاص قسم کی تلوار "حنیفیہ" دیکھی تو خود بھی اسی قسم کی تلوار بنوائی اور ہمیشہ اپنے پاس رکھی۔

(۳)

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو حضرت سمرہؓ مدینہ منورہ سے بصرہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ۵۰ھ میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ والیٔ کوفہ نے وفات پائی تو حضرت امیر معاویہؓ نے زیاد بن سمیہ والیٔ بصرہ کو حکم دیا کہ وہ کوفہ کی ولایت بھی سنبھال لے۔ اس نے دونوں صوبوں کا نظم و نسق بطریق احسن چلانے کے لیے حضرت سَمُرَہؓ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ وہ خود بصرہ میں ہوتا

تو حضرت سمُرہؓ کوفہ جا کر اس کی نیابت کے فرائض انجام دیتے ۔ وہ کوفہ آتا تو حضرت سمُرہؓ بصرہ چلے جاتے ۔ یہ اَدَل بَدَل ہر چھ ماہ کے بعد ہوتا رہتا تھا ۔

خوارج جن کا ظہور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں ہوا تھا سخت فتنہ پرداز تھے ۔ اگرچہ حضرت علیؓ نے جنگِ نہروان میں ان پر کاری ضرب لگائی تھی لیکن پھر بھی وہ آئے دن کوئی نہ کوئی نیا فتنہ برپا کرتے رہتے تھے ۔ امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں بھی ان کی روش باغیانہ رہی ۔ جب بھی موقع پاتے شورش برپا کر دیتے ۔ بصرہ اور کوفہ ان کے بڑے مرکز تھے ۔ زیاد اور حضرت سمُرہؓ نے ان کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور ان کا استیصال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ علامہ ابن اثیرؒ نے "اُسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ حضرت سمُرہؓ کے سامنے کوئی خارجی پیش کیا جاتا تو وہ اُس کو موت کی سزا دیتے اور فرماتے کہ آسمان کے نیچے یہ سب سے بدتر مخلوق ہیں کیونکہ یہ مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں اور (ناحق) خونریزی کرتے ہیں ۔

حضرت سمُرہؓ کی اس سخت روش کے باعث خوارج ان کے سخت دشمن تھے اور برملا ان کو بُرا کہتے تھے ! ان کے جواب میں حضرت حسن بصریؒ ، ابنِ سیرینؒ اور بصرہ کے دوسرے اکابر علماء و صلحاء ان کی تعریف کرتے تھے اور خوارج کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے ۔

سنہ ۵۳ ہجری میں زیاد کی وفات کے بعد بصرہ اور کوفہ دو جداگانہ صوبے قرار پائے اور دونوں کو الگ الگ گورنروں کے ماتحت کر دیا گیا ۔ حضرت سمُرہؓ بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے لیکن تقریباً ایک سال بعد سنہ ۵۴ھ میں امیر معاویہؓ نے انہیں اس عہدے سے سبکدوش کر دیا ۔ اسی سال وہ سخت علیل ہو گئے ۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کے جسم میں سردی سما گئی تھی جو کسی طرح دُور نہ ہوتی تھی ۔ ایک دن سردی کی شدت ناقابلِ برداشت ہو گئی تو اپنے چاروں طرف آتش دانوں میں آگ جلوائی لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا ۔ پھر سخت بے چینی کے عالم میں کھولتے ہوئے پانی کی دیگ پر بیٹھے ۔ چکر جو آیا تو دیگ کے اندر گرم پانی میں گر گئے اور اسی صدمہ سے وفات پائی ۔ اس

وقت ان کی عمر تقریباً چھیاسٹھ برس کی تھی۔ اولاد میں صرف دو لڑکوں سلیمان اور سعد کے نام معلوم ہیں۔

(۴)

حضرت سمُرہؓ بن جُندُب سے ایک سو تیئس احادیث مروی ہیں۔ انہیں حضرت سمُرہؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح سے روایت کیا ہے۔ حضرت سمُرہؓ کے رواۃ میں حضرت عمران بن حصینؓ، امام شعبیؒ، خواجہ حسن بصریؒ، ابنِ ابی لیلیٰؒ، ابنِ سیرینؒ، عبداللہؒ بن بریدہؓ، ابو رجاءؒ، زید بن عقبہؒ اور ثعلبہ بن عبادؒ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سمُرہؓ کو زبردست قوتِ حافظہ عطا کی تھی اور انہیں سینکڑوں احادیث یاد تھیں لیکن اکابر صحابہ کے ادب کی بنا پر ان کو روایت کرنے میں بہت محتاط تھے۔ مُسندِ احمد میں خود انہوں نے اپنی قلتِ روایت کی توجیہ اس طرح کی ہے:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کچھ سُنا ہے لیکن اس کو اکابر صحابہ کے ادب کی وجہ سے بیان نہیں کرتا۔ یہ اصحاب عمر میں مجھ سے بڑے ہیں۔ میں عہدِ رسالت میں کم عمر (لڑکا) تھا تاہم حضورؐ سے جو کچھ سُنتا تھا، یاد رکھتا تھا۔"

حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ ان کی مرویات کا ایک بڑا مجموعہ ان کے بیٹے کے پاس تھا۔ (تہذیب التہذیب)

ابنِ اثیرؒ نے ابنِ سیرینؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مذکورہ مجموعۂ احادیث علم کے بہت بڑے حصہ پر مشتمل تھا۔ (اُسد الغابہ)

حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے "الاستیعاب" میں لکھا ہے کہ حضرت سمُرہؓ بن جُندُب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بکثرت روایت کرنے والے حُفّاظِ حدیث صحابہ میں سے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے خطبہ میں ایک حدیث بیان کی۔ حضرت ثعلبہ بن عبادؒ بھی سامعین میں موجود تھے ان کا بیان ہے کہ حضرت سمُرہؓ نے یہ حدیث دوبارہ بیان کی تو الفاظ

میں مطلق کوئی فرق نہیں تھا۔

حضرت سمرہؓ کبھی کوئی حدیث روایت کرتے اور کوئی شخص کسی شبہ کا اظہار کرتا تو وہ بڑی نرمی سے اس کا جواب دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپؐ کے سامنے ایک پیالہ پیش کیا گیا جس میں ثرید تھا۔ حضورؐ نے اس میں سے کچھ کھایا اور وہاں پر موجود لوگوں نے بھی کھایا۔ پھر اور لوگ بھی اس میں سے ظہر تک کھاتے رہے، ایک جماعت آتی اور کھا کر چلی جاتی پھر دوسری جماعت آتی اور اسی طرح کھا کر چلی جاتی —— یہ حدیث سن کر ایک شخص نے حضرت سمرہؓ سے پوچھا، کیا اس کھانے میں اضافہ کیا جاتا تھا؟ انہوں نے فرمایا، زمین سے تو کوئی اضافہ نہیں کیا جاتا تھا البتہ آسمان سے اس میں اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ کیا اس کھانے میں اور کھانا ڈالا جاتا تھا؟ انہوں نے فرمایا —— تو پھر تعجب کی کیا بات ہوئی؟ پھر آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا اس میں تو اضافہ وہاں سے ہوتا تھا۔

(مسند احمدؒ ـ البدایہ والنہایہ لابن کثیرؒ)

حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ حضرت سمرہؓ بن جندب نہایت راست باز، امین اور اسلام کے خیر خواہ تھے —— (الاستیعاب)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سعدؓ بن مالکؓ خدری انصاری

①

غزوۂ اُحد (۳ ہجری) میں ایک انصاری صاحب رسولؐ نے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہادت پائی تو ان کے اہل خانہ پر پیغمبری وقت آپڑا کیونکہ شہید انصاری نے اپنے پیچھے کوئی جائداد نہیں چھوڑی تھی۔ جب نوبت فاقہ کشی تک پہنچی تو شہید انصاری کی بیوہ نے اپنے بارہ تیرہ سالہ فرزند سے کہا، بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی خدمت میں جاؤ، آپؐ نے فلاں شخص کو آج کچھ مرحمت فرمایا ہے تمہیں بھی ضرور کچھ نہ کچھ عطا فرمائیں گے۔ صاحبزادے ماں کے حکم کی تعمیل میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضورؐ خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ کے دوران میں آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص تنگدستی میں صبر کرے گا اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو غنی کر دے گا۔ صاحبزادے نے حضورؐ کا ارشاد سنا تو دل میں خیال کیا کہ میرے پاس ایک اونٹنی موجود ہے پھر دستِ سوال دراز کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اسی پر اکتفا کروں گا۔ یہ سوچ کر بغیر کچھ مانگے گھر واپس آگئے۔ خدا کی قدرت، لسانِ رسالت سے جو کچھ نکلا تھا وہ ـــ یوں پورا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے شہید راہِ حق انصاری کے یتیم فرزند پر بابِ رزق کھول دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ اس قدر آسودہ حال ہو گئے کہ انصار کے بہت کم لوگ ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ یہ سعادت مند انصاری نونہال جن کا سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مقدسہ پر اس قدر پختہ ایمان تھا کہ انھوں نے سائل بننے کے بجائے صابر بننے کو ترجیح دی، حضرت سعدؓ بن مالکؓ تھے جو تاریخ میں اپنی کنیت اور خاندان کی نسبت سے ابو سعید خدریؓ مشہور ہیں۔

(۲)

سیدنا حضرت ابوسعید سعد بن مالک خُدریؓ کا شمار بڑے عظیم المرتبت صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق خزرج کے خاندان خُدرہ سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

ابوسعید سعدؓ بن مالکؓ بن سنان بن عبید بن ثعلبہ بن الجبر (خدرہ) بن عوف بن حارث بن خزرج۔

مالکؓ بن سنان نے ہجرتِ نبوی سے کافی عرصہ پہلے خاندان عدی بن نجّار کی ایک بیوہ انیسہؓ بنت ابی حارثہ سے نکاح کیا تھا، حضرت ابوسعیدؓ اسی خاتون کے بطن سے مدینہ منوّرہ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے دس سال قبل پیدا ہوئے۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ و ثانیہ کے بعد مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا پھیل گیا۔ مالکؓ بن سنان اور انیسہؓ بنتِ ابی حارثہ دونوں میاں بیوی کو اللہ تعالیٰ نے فطرت سعید سے نوازا تھا۔ ان کے کان جونہی صدائے توحید سے آشنا ہوئے انہوں نے کسی تامّل کے بغیر اس پر لبّیک کہا۔ فرزندِ سعادت مند نے بھی ماں باپ کی پیروی کی۔ چنانچہ مدینہ منوّرہ میں حضورؐ کے نزولِ اجلال کے وقت یہ پورا خاندان نہ صرف دولتِ ایمان سے بہرہ یاب تھا بلکہ ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری عقیدت اور محبت کے جذبے سے بھی سرشار تھا۔ ہجرت کے پہلے سال مسجدِ نبوی کی تعمیر کا آغاز ہوا تو حضرت ابوسعیدؓ نے اپنے والدِ گرامی کے ساتھ تعمیر سے متعلق تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

غزوۂ اُحد (۳ھ) کے موقع پر حضرت مالکؓ بن سنان اور حضرت ابوسعیدؓ بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لڑائی میں شریک ہونے کے لیے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ عام طور پر حضورؐ پندرہ برس سے کم عمر کے کسی لڑکے کو لڑائی میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ چونکہ حضرت ابوسعیدؓ کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی اس لیے آپؐ نے انہیں واپس جانے کا حکم

دیا۔ حضرت مالکؓ نے فرزندِ دلبند کے ہاتھ پکڑ کر حضورؐ کو دکھائے اور عرض کی:
"یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، ابوسعید کے ہاتھ تو پورے مرد کے ہیں۔" تاہم حضورؐ نے انھیں جنگ میں شرکت کرنے کی اجازت نہ دی اور وہ ارشادِ نبوی کی تعمیل میں میدانِ جنگ سے واپس چلے گئے۔ حضرت مالکؓ بن سنان سر بکف ہو کر لڑے اور شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ لڑائی کے دوران میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے انور زخمی ہوا تو حضرت مالکؓ بے تاب ہو گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر چہرۂ اقدس سے ٹپکنے والا خون اپنے ہاتھوں پر لیا اور ادب کے خیال سے اسے زمین پر پھینکنے کے بجائے پی گئے۔ حضورؐ نے ان کی اس ادائے عاشقانہ کو دیکھا تو فرمایا، جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جس کے خون میں میرے خون کی آمیزش ہو تو وہ مالکؓ بن سنان کو دیکھے۔

اس کے بعد حضرت مالکؓ تلوار چلاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت ابوسعیدؓ اور ان کی والدہ کو سخت عسرت کا سامنا کرنا پڑا لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے حالات بدل دیئے اور وہ آسودہ حال ہو گئے۔

(۳)

حضرت ابوسعید خدریؓ، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و جان سے شیدائی تھے۔ اکثر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے اور براہِ راست فیضانِ نبوی سے بہرہ یاب ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت اچھا حافظہ عطا کیا تھا۔ لسانِ رسالت سے جو کچھ سنتے اسے دماغ میں محفوظ کر لیتے تھے اس کے علاوہ وہ علمائے انصار و مہاجرین سے بھی بڑے ذوق و شوق سے علم حاصل کرتے تھے اس طرح آہستہ آہستہ حدیث و فقہ کے بہت بڑے عالم بن گئے۔
شوقِ علم کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا بھی بہت شوق تھا۔ کوشش کرتے تھے کہ کسی غزوے میں پیچھے نہ رہیں۔ شعبان ۵ھ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

غزوۂ بنو مصطلق کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت ابو سعیدؓ نے بھی آپؐ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ اس کے بعد غزوۂ احزاب میں سرفروشانہ حصہ لیا۔ اس غزوہ میں سید الاوس حضرت سعدؓ بن معاذ کو شدید زخم آیا۔ اس زخم کی وجہ سے انہوں نے چند دن بعد وفات پائی تو ان کی قبر کھودنے کی خدمت حضرت ابو سعیدؓ نے انجام دی۔ ان کا بیان ہے کہ جب میں سعدؓ بن معاذ کی قبر کھود رہا تھا تو واللہ مجھے اس میں سے مشک کی خوشبو آرہی تھی۔

ذوالقعدہ ۶ھ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت ابو سعید خدریؓ کو ان چودہ سو سرفروشوں میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جنھوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر موت کی بیعت کی اور جن کی یہ ادائے سرفروشی اللہ تعالیٰ کو ایسی پسند آئی کہ اس نے کھُلے لفظوں میں ان سب کو اپنی خوشنودی کی بشارت دی۔

حدیبیہ کے بعد حضرت ابو سعیدؓ نے غزوۂ خیبر میں حضورؐ کی ہمرکابی کی سعادت حاصل کی اور لڑائی میں اپنی جانبازی کے جوہر دکھائے۔

صفر ۸ھ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت غالبؓ بن عبداللہ اللیثی کو دو سو مجاہدین دے کر بنو مُصاب کی سرکوبی کے لیے فدک کی طرف بھیجا۔ ان مجاہدین میں حضرت ابو سعیدؓ بھی شامل تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے تمام مجاہدین کو تاکید کی کہ خبردار متفرق نہ ہونا اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تمام مجاہدین میں رشتۂ مواخاۃ قائم کرا دیا۔ حضرت حویصہؓ بن مسعود انصاری، حضرت ابو سعیدؓ کے بھائی بنائے گئے۔ مجاہدین نے بنو مصاب کو عبرتناک شکست دی اور بہت سا مالِ غنیمت لے کر واپس آئے۔

رمضان ۸ھ میں حضرت ابو سعیدؓ دس ہزار جانبازوں پر مشتمل اس فوجِ الٰہی میں شریک ہوئے جو فتح مکہ کے موقع پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھی۔ اس کے بعد انہوں نے حُنین اور اوطاس کے معرکوں میں دادِ شجاعت دی اور پھر غزوۂ تبوک (۹ھ) کے پُر صعوبت سفر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ تبوک سے پہلے حضرت ابو سعیدؓ ربیع الآخر ۹ھ میں سریۂ علقمہؓ بن مجزز المدلجی میں بھی شریک ہوئے۔ اس سریہ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علقمہؓ کو تین سو آدمی دے کر حبشہ کے ان بحری ڈکیتوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا جو ساحلِ جدہ پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ حبشی ڈکیتوں کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی اور وہ اسلامی لشکر کو دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس سریہ کے امیر حضرت عبداللہؓ بن حذافہ سہمی تھے۔ (ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ قائدِ مہم حضرت علقمہؓ نے لشکر کے ایک حصے پر حضرت عبداللہؓ بن حذافہ کو امیر مقرر کیا تھا) حضرت عبداللہؓ نے ازراہِ مذاق یا کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے ساتھیوں کو آگ میں کودنے کا حکم دیا۔ بعض مجاہدین اس پر تیار ہو گئے اور بعض نے یہ حکم ماننے میں تامل کیا۔ تاہم حضرت عبداللہؓ نے جلد ہی اپنا حکم واپس لے لیا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس واقعہ کا ذکر آیا تو آپؐ نے فرمایا:

"تم لوگ اگر آگ میں داخل ہو جاتے تو کبھی نہ نکلتے۔ امیر کی اطاعت تو "اچھی بات" میں ہوتی ہے۔"

اسی زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس آدمیوں کو ایک مہم پر روانہ کیا ان میں حضرت ابو سعید خدریؓ بھی شامل تھے (بقول امام دارقطنیؒ حضرت ابو سعید خدریؓ اس مہم کے امیر تھے) مجاہدین نے راستے میں ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا اور قریب کی ایک بستی کے لوگوں کو پیغام بھیجا کہ ہم تمہارے مہمان ہیں۔ ان لوگوں نے کسی بناء پر میزبان بننے میں عذر کیا۔ اتفاق سے اسی دن بستی کے سردار کو ایک زہریلے بچھو نے کاٹ لیا۔ لوگوں نے دوا دارو کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور اس کی تکلیف بڑھتی ہی گئی ناچار وہ مجاہدین کے پڑاؤ میں پہنچے اور دریافت کیا کہ کسی کو بچھو کاٹے کا علاج معلوم ہے؟ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا، میں اس کا علاج جانتا ہوں لیکن تمہیں اس کے عوض تیس بکریاں دینی ہوں گی۔ انہوں نے منظور کر لیا۔ حضرت ابو سعیدؓ بستی میں گئے اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر مریض پر

دم کیا اور پھر اس کے زخم پر تھوک دیا۔ وہ شخص بالکل چنگا بھلا ہو گیا۔ ان لوگوں نے اپنے عہد کے مطابق تیس بکریاں پیش کر دیں۔ مہم سے مدینہ منورہ واپس آکر بعض صحابہ کرامؓ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا اور دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ اس طرح بکریاں لینا ہمارے لیے جائز ہے؟" حضورؐ نے متبسم ہو کر فرمایا "تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ کی برکت سے ایسی تکلیف رفع ہو جاتی ہے۔" پھر فرمایا، جو کچھ تم نے کیا، ٹھیک ہے۔ اب ان بکریوں کو آپس میں تقسیم کر لو اور میرا بھی حصہ لگانا۔

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے عہدِ رسالت کے بارہ غزوات میں شریک ہونے کا شرف حاصل کیا۔ حجۃ الوداع میں بھی حضورؐ کے ہمرکاب تھے۔

(۴)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابو سعید خدریؓ نے اپنی ساری زندگی مدینہ منورہ ہی میں گزاری اور کسی خاص ضرورت کے سوا کبھی مدینہ منورہ سے باہر نہیں گئے۔ مُسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ حضرت ابو سعید خُدریؓ نے مدینہ منورہ میں ایک حلقۂ درس قائم کر رکھا تھا جو ہر وقت شائقینِ علم سے معمور رہتا تھا اگر کوئی شخص کسی خاص مسئلہ پر تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا تو اس کو کافی دیر تک انتظار کرنا پڑتا۔

حضرت ابو سعیدؓ پورے دس برس تک نبوت کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہوئے تھے اس لیے وہ معدنِ فضل و کمال بن گئے تھے۔ خلفائے راشدینؓ بھی ان کے کمالِ علمی کے معترف تھے۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں حضرت ابو سعیدؓ فتویٰ دیا کرتے تھے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خُدریؓ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، تمہارے اندر ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جن کے اعمال کے مقابلے میں تم لوگ اپنی نماز اور روزے حقیر سمجھنے لگو گے لیکن وہ لوگ قرآن کی تلاوت تو کیا کریں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ دین و ایمان سے وہ لوگ اس طرح بے بہرہ

ہوں گے جیسے تیر شکار میں سے نکل جاتا ہے۔ تیر مارنے والا تیر کو لوہے کو تانت کو دیکھتا ہے۔ پھر اس کو تانت میں شک ہونے لگتا ہے کہ شاید اس میں کچھ خون لگ گیا ہو"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہدِ خلافت میں خوارج نے سر اٹھایا تو حضرت ابوسعید خدریؓ نے برملا اس حدیثِ مبارک کا اطلاق خوارج پر کیا اور جنگِ نہروان میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ خوارج کے خلاف لڑے۔

امام جلال الدین سیوطیؒ نے "تاریخ الخلفاء" میں لکھا ہے کہ سنہ ۶۰ھ میں یزید نے سیدنا حضرت حسینؓ سے اپنی بیعت کا مطالبہ کیا تو انہوں نے حجاز کا قیام ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس موقع پر حضرت ابوسعید خدریؓ اور بعض دوسرے صحابہ نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ ارضِ حجاز ہی میں مقیم رہیں لیکن انہوں نے بوجوہ یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ شعبان سنہ ۶۰ھ میں اہل وعیال سمیت مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ چلے گئے اور پھر کچھ عرصہ بعد وہاں سے عازمِ عراق ہوئے جہاں ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ کو کربلا کا واقعہ ہائلہ پیش آیا۔

سانحۂ کربلا کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ معظمہ میں علمِ خلافت بلند کیا۔ حجاز کے اکثر لوگوں نے بلا تامل ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی کیونکہ وہ نہایت ہی نیک سیرت بزرگ تھے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔

سنہ ۶۳ھ میں حرہ کا دلدوز واقعہ پیش آیا اس کا سبب یہ ہوا کہ اہلِ مدینہ نے یزید کی بیعت فسخ کر دی اور اس کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ فہری کو بارہ ہزار فوج دے کر اہل مدینہ کو مطیع کرنے کے لیے بھیجا۔ اہل مدینہ نے حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ انصاری غسیل الملائکہ کی قیادت میں شامی لشکر کا پُرزور مقابلہ کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت عبداللہؓ اور ان کے بیسیوں رفقاء مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ شامی فوج نے مدینہ منورہ میں داخل ہو کر تین دن تک لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ حضرت ابوسعیدؓ نے دارو گیر سے بچنے کے لیے قریبی پہاڑ کے ایک غار میں پناہ لی۔ ایک شامی سپاہی تعاقب کرتا ہوا وہاں بھی پہنچ گیا اور ان کو قتل کرنے کے لیے تلوار سونت لی۔ حضرت ابوسعیدؓ نے مقابلہ کے لیے تلوار نیام

سے نکالی لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے زمین پر ڈال دیا اور یہ آیت پڑھی :

لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ (سورہ المائدہ آیت ۲۸)

(اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھ کو قتل کرنے کے لیے تجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ مجھے تو اللہ رب العلمین سے ڈر لگتا ہے)

شامی سپاہی یہ آیت سن کر پیچھے ہٹ گیا اور کہا، خدا کے لیے بتائیے آپ کون ہیں ؟

جواب دیا، "ابوسعید خدری" بولا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ؟ فرمایا، "ہاں" —— یہ سن کر چپکے سے چلا گیا۔

حضرت ابوسعیدؓ غار سے نکل کر شہر آئے تو شامیوں نے پکڑ لیا اور اپنے امیر کے پاس لے گئے اس نے زبردستی یزید کی خلافت پر بیعت لی۔

اس واقعہ کے گیارہ برس بعد ۷۴ھ میں حضرت ابوسعید خدریؓ نے پیک اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۸۶ برس کی تھی۔ انہوں نے اپنے پیچھے دو بیویاں اور تین لڑکے چھوڑے۔ بیویوں کے نام زینب بنت کعبؓ بن عجرہ اور اُمِّ عبداللہ تھے۔ بیٹوں کے نام عبدالرحمٰن، حمزہ اور سعید تھے۔

۵

حضرت ابوسعید خدریؓ کا شمار فقہائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ ان سے ۱۱۷۰ احادیث مروی ہیں۔ ان سے سماعِ حدیث کرنے والوں میں متعدد جلیل القدر صحابہ اور تابعین شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ کے اسماء گرامی یہ ہیں :

حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ
حضرت انسؓ بن مالک، حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت ابوقتادہؓ،
حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابوالطفیلؓ، حضرت سعید بن مسیبؒ،

حضرت طارق بن شہابؓ، مجاہد بن جبیرؒ، عطاء بن ابی رباحؒ وغیرہم ۔۔
حدیث بیان کرنے میں بے حد محتاط تھے اور کوشش کیا کرتے تھے کہ حدیث ہو بہو انہی الفاظ میں بیان کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنے تھے ۔ اگر الفاظ میں شک ہوتا تو ان کو حضورؐ سے منسوب نہیں کرتے تھے اور حدیث کا مفہوم بیان کر دیا کرتے تھے ۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کے صحیفۂ اخلاق میں حق گوئی، بردباری، تحمل، سادگی، انکسار اور اتباعِ رسول کے ابواب بڑے روشن ہیں۔ حق بات کہنے میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے ۔ مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ امیر معاویہؓ کے عہد میں بعض ایسی باتیں پیدا ہو گئی تھیں جو حضرت ابو سعیدؓ کے نزدیک دینی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ نہیں تھیں۔ وہ مدینہ منورہ سے طویل سفر کر کے دمشق گئے اور ان تمام باتوں سے امیر معاویہؓ کو آگاہ کیا۔

ایک مرتبہ مروان بن الحکم کے سامنے فضیلت صحابہؓ کے بارے میں ایک حدیث بیان کی، اس نے انہیں جھٹلایا۔ اتفاق سے حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت رافعؓ بن خدیج بھی وہاں تشریف رکھتے تھے ۔ حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا، تم ان سے پوچھ سکتے ہو کہ یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا تمہاری موجودگی میں وہ میری تصدیق کریں گے ۔ مروان کو ان کی یہ بات ناگوار گزری اور اس نے مارنے کو دُرّہ اٹھایا۔ اس وقت دونوں بزرگوں نے حضرت ابو سعیدؓ کی تصدیق کی ۔

ایک مرتبہ ایک جنازے کے ساتھ جا رہے تھے راستے میں ایک جگہ مروان بیٹھا ہوا تھا۔ جنازہ اس کے سامنے سے گزرا تو وہ اپنی نشست سے نہ اٹھا۔ حضرت ابو سعیدؓ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا، اے امیر جنازہ کے لیے اٹھ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنازے کے لیے اٹھتے دیکھا ہے ۔ یہ سن کر وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ مروان کے عہدِ حکومت میں ایک دن عید کی نماز پڑھنے گئے تو دیکھا کہ مروان نے منبر نکلوایا اور نماز سے پہلے خطبہ پڑھا۔ ایک شخص نے اٹھ کر ٹوکا کہ یہ دونوں باتیں سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہیں۔ مروان نے کہا، اگلا طریقہ متروک ہو چکا ہے ۔ حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا، خواہ تم سُنت پر عمل کرو یا نہیں اس شخص نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کوئی خلافِ شرع کام یا بُری بات دیکھے تو اس کو ہاتھ سے دفع کرے اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو کم از کم دل سے

ضرور برا سمجھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ کی غیر حاضری میں ان کی مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد بعض لوگوں نے ان کے طریقۂ نماز پر اعتراض کیا۔ انہوں نے منبر کے پاس کھڑے ہوکر فرمایا، میں نے اسی طرح نماز پڑھائی ہے جس طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھاتے دیکھا ہے۔ تم لوگ اگر اس پر اعتراض کرتے ہو تو کرتے رہو مجھے اس کی بالکل پروا نہیں۔

ایک مرتبہ پاؤں میں شدید درد ہوا۔ تکلیف کی وجہ سے پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹ گئے۔ ان کے بھائی نے انہیں اس حالت میں دیکھا تو اسی پاؤں پر زور سے ہاتھ مارا جس میں درد تھا۔ اس سے انہیں بہت تکلیف ہوئی لیکن غصے میں آنے کے بجائے بڑی نرمی سے کہا، تمہیں معلوم بھی تھا کہ میرے پاؤں میں درد ہے پھر بھی تم نے اس پر ہاتھ مار کر مجھے تکلیف پہنچائی۔ انہوں نے کہا، شاید آپ کو یاد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح (پاؤں پر پاؤں رکھ کر) لیٹنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر بالکل خاموش ہو گئے۔

ایک دفعہ ان کے ایک شاگرد حضرت ابوسلمہؒ بن عبدالرحمنؒ نے آکر کہا کہ ذرا میرے ساتھ باغ تک چلیئے آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔ اپنی جلالتِ قدر کے باوجود وہ حضرت ابوسلمہؒ کے ساتھ ہو لیے۔

مسند احمد میں ہے کہ یتیموں پر بے حد شفیق تھے اور جو کچھ بھی بس میں ہوتا ان کی اعانت کے لیے ضرور کرتے۔ بعض یتیم بچوں کی پرورش کی اور ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔

اپنے ہر قول اور فعل میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے دستِ مبارک میں کھجور کی پتلی چھڑی دیکھی تھی چنانچہ وہ بھی اپنے ہاتھ میں ایسی ہی چھڑی لے کر چلا کرتے تھے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

حضرت عقبہ رضؓ بن عامر انصاری

عامر بن نابی بن زید حرام کے فرزند تھے اور خزرج کے خاندان بنی حرام بن کعب میں سے تھے۔ انصار کے ان چھ قدیم الاسلام بزرگوں میں سے ہیں جو سب سے پہلے ۱۱ھ بعد بعثت میں مکہ جا کر شرف اسلام اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت عقبہؓ نے ۱۳ھ بعد بعثت میں دوبارہ مکہ جا کر حضورؐ پر نور کی بیعت کا شرف حاصل کیا۔

بڑے جری اور بہادر تھے اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت مخلص شیدائی تھے سب سے پہلے غزوۂ بدر میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ پھر غزوۂ اُحد میں اس شان سے شریک ہوئے کہ آہنی خود پر سبز عمامہ سجا رکھا تھا اور دور سے نمایاں معلوم ہوتے تھے۔

اُحد کے بعد احزاب اور دوسرے مشاہد نبوی میں بالالتزام حاضر رہے۔ اور ہر معرکے میں سر بکف ہو کر لڑے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں فتنۂ ردّہ کو فرو کرنے میں پُرجوش حصہ لیا۔ اور اسی سلسلہ میں مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کی خونریز جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہادت پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت فضالہؓ بن عبید انصاری

①

۵۳ سنہ ہجری میں ایک صاحبِ رسولؐ نے دمشق میں وفات پائی تو خلیفہ وقت حضرت امیر معاویہؓ فرطِ غم سے نڈھال ہو گئے۔ با دیدۂ گریاں فوت ہونے والے صاحبِ رسولؐ کے گھر تشریف لے گئے۔ خود جنازہ اٹھایا اور اُن کے صاحبزادے سے فرمایا:

"بیٹے میری مدد کرو کیونکہ اب کسی ایسی عظیم ہستی کا جنازہ اٹھانے کا موقع کبھی نہیں ملے گا۔"

یہ صاحبِ رسولؐ جن کی وفات پر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی، عرب کے مدبرِ اعظم اور دنیائے اسلام کے فرمانروا نے اس قدر غم کا اظہار کیا اور ان کی جلالتِ قدر کا برملا اعتراف کیا، حضرت فضالہؓ بن عبید انصاری تھے۔

②

حضرت ابو محمد فضالہؓ بن عبید کا تعلق قبیلہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے:

فضالہؓ بن عبید بن نافذ بن قیس بن صہیب بن اصرم بن حجبی بن کلفہ بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس۔

والدہ کا نام عقبہؓ بنت محمد بن عقبہ بن الجلاج تھا۔ انہیں بھی قبولِ اسلام اور صحابیت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت فضالہؓ کے والد عبید بن نافذ اپنے قبیلے کے رؤسا میں سے تھے۔ وہ بڑے شہ زور اور بہادر آدمی تھے۔ ایک پتھر دوسرے پر اس زور سے مارتے کہ چنگاریاں نکلنے لگتیں۔ شہسواری کا یہ عالم تھا کہ گھڑ دوڑ میں سب سے آگے نکل جاتے تھے۔ اوس اور خزرج کی باہمی لڑائیوں میں ہمیشہ نمایاں رہتے۔ صاحبِ سیف ہونے کے ساتھ صاحب ذوق بھی تھے اور نہایت اچھے شعر کہہ لیتے تھے۔ انھوں نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا اور ہجرتِ نبوی سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ بیعت عقبۂ اولیٰ (۱۱ نبوی) کے بعد مدینہ منورہ میں اسلام کا چرچا پھیلا تو نوجوان فضالہؓ اور ان کی والدہ نے بلا تامل دعوت توحید پر لبیک کہا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت فضالہؓ نے دوسرے انصار کے ہمراہ والہانہ ذوق و شوق سے آپؐ کا استقبال کیا لیکن حق و باطل کے معرکۂ اوّل "غزوۂ بدر" میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ سب سے اوّل غزوۂ اُحد میں اپنی تلوار کے جوہر دکھلائے۔ اس کے بعد عہدِ رسالت کے دوسرے تمام غزوات میں بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ ذیقعدہ ۶ھ میں انھیں بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کی سعادتِ عظیم بھی حاصل ہوئی۔

۱۱ھ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں شام کی معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا تو حضرت فضالہؓ بھی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اسلامی لشکر میں شامل ہو کر شام پہنچ گئے اور رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں پورے شام پر مسلمانوں کا استیلا ہو گیا تو امیر المؤمنین نے حضرت عمروؓ بن العاص کو مصر کی طرف پیشقدمی کرنے کا حکم دیا۔ حضرت فضالہؓ مصر جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ اور وہاں کی فتوحات میں شروع سے اخیر تک بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ مصر کی تسخیر کے بعد حضرت فضالہؓ واپس شام آ گئے اور دمشق میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ مسندِ احمد بن حنبل میں ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے ایک مکان بنوا کر ان کی نذر کیا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ مکان انہوں نے خود بنوایا۔ بہر صورت وہ دمشق میں اقامت اختیار کرنے کے بعد ہمہ تن درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

(۳)

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہدِ خلافت میں دمشق کے عہدۂ قضا پر حضرت ابو الدرداء انصاریؓ فائز تھے۔ ۳۲ھ ہجری میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو والیٔ شام حضرت امیر معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ کا جانشین کسے بنایا جائے؟ انہوں نے فرمایا، فضالہؓ بن عبید کو۔ چنانچہ حضرت ابو الدرداءؓ کی وفات کے بعد امیر معاویہؓ نے حضرت فضالہؓ کو دمشق کا قاضی مقرر کر دیا۔

حضرت امیر معاویہؓ کے نزدیک حضرت فضالہؓ بڑی قدر و قیمت کے حامل تھے اور وہ ان کو بہت مانتے تھے۔ ۳۷ھ میں جنگ صفین کے لیے دمشق سے روانہ ہوئے تو حضرت فضالہؓ کو اپنا جانشین بنایا۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ اس موقع پر امیر معاویہؓ نے حضرت فضالہؓ کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے:

"میں نے آپ کو اپنا جانشین نہیں بلکہ جہنم کے مقابلہ میں سپر بنایا ہے۔"

امیر معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں رومیوں سے معرکہ آرائیوں کا آغاز ہوا تو ۴۹ھ میں حضرت فضالہؓ نے بھی ایک اسلامی لشکر کی قیادت کی اور جربہ فتح کر کے بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا، ان میں بہت سے رومی قیدی بھی شامل تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے بیان کے مطابق روم کے خلاف ایک مہم میں امیر معاویہؓ نے حضرت فضالہؓ بن عبید کو اسلامی لشکر کا سپہ سالار بنایا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے جزیرہ قبرص (CYPRUS) پر بھی حملہ کیا۔ مسندِ احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ غزوۂ روم کے دوران میں ایک مجاہد نے وفات پائی تو حضرت فضالہؓ نے حکم دیا کہ ان کی قبر زمین کے برابر بنائی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو اسی طرح قبر بنانے کا حکم دیتے تھے۔ میدانِ کارزار میں جن مسلمانوں نے جامِ شہادت

پیا حضرت فضالہؓ نے ان سب کی قبریں بھی اسی طرح بنوائیں۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کے جانے کے بعد رومی ان قبروں کی بے حرمتی نہ کریں۔

اس مہم سے واپسی کے بعد امیر معاویہؓ نے انہیں طرسوس اور بلادِ روم کے مابین علاقہ درب کا عامل مقرر کیا جہاں انہوں نے کچھ عرصہ تک اپنے فرائض نہایت احسن و خوبی سے انجام دیئے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فضالہؓ نے کچھ عرصہ مصر میں بھی امارت کے فرائض انجام دیئے لیکن ان روایتوں میں ان کے امارتِ مصر کے زمانہ کی تصریح نہیں کی گئی البتہ یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ لوگ سماعتِ حدیث کے لیے دور دراز سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کی زندگی نہایت سادہ اور ہر قسم کے تکلف اور نمود و نمائش سے پاک تھی۔ تن آسانی ان کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ کبھی کبھی ننگے پاؤں ہی گھر سے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ دین اور دنیا کے ہر کام میں ہمیشہ اسوۂ نبوی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کبھی کبھی ننگے پیر رہنے کا حکم بھی دیا ہے۔ اسی لیے میں وقتاً فوقتاً برہنہ پا ہو جاتا ہوں۔

۵۳ھ میں دمشق میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ قبر اب بھی دمشق میں موجود ہے۔ اولاد میں صرف ایک بیٹے عبداللہ کا نام معلوم ہے۔

حضرت فضالہؓ سے پچاس حدیثیں مروی ہیں، جو انہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت کی ہیں۔ ان کے راویوں میں حنش صنعانیؒ، عبدالرحمٰن بن جبیرؒ، علی بن رباحؒ، محمد بن کعب القرظیؒ، عبداللہ بن عامرؒ، میسرہؒ اور ابویزید خولانیؒ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت مخیریق رضؓ

یہودِ مدینہ اوس اور خزرج کو نبی آخر الزمانؐ کی آمد کی خبر دیتے رہتے تھے لیکن جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منوّرہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو اوس وخزرج نے تو سعادت اندوزِ ایمان ہو کر حضورؐ کے لیے دیدہ ودل فرشِ راہ کر دیئے اور یہود کی شقاوتِ قلبی نے ان کو اس شرف سے محروم رکھا۔ تاہم ان میں کچھ سعید الفطرت لوگ بھی تھے وہ لپک کر آگے بڑھے اور ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامنِ اقدس تھام لیا۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک یہودی عالم مخیریقؓ تھے جن کا تعلق بنو نضیر سے تھا۔ غزوۂ اُحد کے دن وہ اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ موعود ہیں اس لیے تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے۔ یہود نے کہا آج یوم السبت (سنیچر) ہے۔ ہم لڑائی میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں؟ حضرت مخیریقؓ بولے۔ اللہ کے راستے میں سبت وغیرہ کیا چیز ہے؟ یہ کہا اور مسلح ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ لڑائی شروع ہوئی تو مشرکین کے خلاف سرفروشانہ لڑے یہاں تک کہ زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے۔ دمِ واپسیں وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے سارے باغات کے مالک ہوں گے۔ اس وصیت کے بعد جاں بحق ہو گئے۔ اس موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مخیریق سائق یہود"۔ یعنی مخیریق یہود (اہلِ ایمان) میں سب سے آگے جانے والے ہوں گے۔"

حضرت مخیریقؓ نے جو باغات حضورؐ کی ملکیت میں دیئے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) المبشر (۲) الصائفہ (۳) المعوال (۴) الدلال (۵) حسن (۶) جرفہ (۷) مشربہ ام ابراہیم۔ (اصابہ لابن حجر عسقلانیؒ)

ابن اثیرؒ نے "اُسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی باغات کی آمدنی سے حاجت مند مسلمانوں کی مدد اور صدقات وغیرہ کیا کرتے تھے۔

جلد ۔ ۱۱ ۔ ۱۱ ۱۱ عنہ

حضرت زیدؓ بن سعنہ

حضرت زیدؓ بن سعنہ مدینہ منورہ کے متبحر علمائے یہود میں شمار ہوتے تھے۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت زیدؓ نے دیکھا کہ توریت میں نبیٔ آخر الزمان کی جتنی نشانیاں مذکور ہیں وہ سب آپؐ کے روئے انور پر موجود ہیں تاہم آپؐ پر ایمان لانے سے پہلے انھوں نے یہ تحقیق کرنا ضروری سمجھا کہ آپؐ کے اخلاق و اطوار بھی توریت میں درج علامات سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ جب تحقیق کے بعد پورا اطمینان یا انشراحِ قلب ہو گیا تو انہوں نے حضور پُر نورؐ کا دامنِ اقدس تھامنے میں ایک لمحہ بھی تامّل نہ کیا۔

"مستدرکِ حاکم" میں ان کے قبولِ اسلام کا واقعہ خود ان کی زبانی اس طرح مذکور ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو میں نے آپؐ کے روئے انور پر وہ تمام علامات موجود پائیں جو نبی آخر الزماں کے بارے میں توریت میں مذکور ہیں لیکن ابھی مجھے دو باتوں کا تجربہ کرنا تھا پہلی یہ کہ ان (نبی آخر الزماں) کا حلم ان کے غصہ پر غالب رہتا ہے اور دوسری یہ کہ وہ جاہلانہ حرکتوں کا جواب نہایت تحمل سے دیتے ہیں (یا یہ کہ جاہلانہ حرکتیں ان کے حلم و تحمل میں اضافہ کر دیتی ہیں) چنانچہ میں نے آپؐ سے ملنا جلنا شروع کر دیا کہ ان باتوں کی آزمائش کروں۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی معیت میں اپنے کاشانۂ اقدس سے باہر تشریف لائے۔ اس وقت ایک بدوی (دیہاتی) سوار آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا، اے اللہ کے رسول فلاں گاؤں کے لوگوں نے (میری تبلیغ سے) اسلام قبول کر لیا۔ میں ہمیشہ ان سے یہ کہتا تھا کہ اسلام قبول کر لو تو تمہارے رزق میں برکت ہو گی لیکن خدا کی قدرت کہ اس سال بارش بالکل نہیں ہوئی اور

سخت قحط پڑ گیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ افلاس اور تنگی کے سبب کہیں وہ اسلام نہ چھوڑ نہ دیں۔ اگر آپؐ ان کی مدد کے لیے کچھ بھیج سکیں تو بہت بہتر ہوگا۔

بدوی کی باتیں سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کچھ پوچھا، انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ اس میں سے تو کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی۔ اب میں آپ کے قریب گیا اور کہا کہ آپ فلاں باغ کی کھجوریں کچھ مہلت کے ساتھ میرے ہاتھ فروخت کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا، میں کچھ کھجوریں فروخت تو ضرور کرنا چاہتا ہوں مگر کسی باغ کی تخصیص نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا، اچھی بات ہے۔ پھر میں نے اپنی سونا رکھنے کی تھیلی کھولی اور اسّی مثقال سونا کھجوروں کی ایک خاص مقدار کے لیے ایک متعین مدت کے لیے دے دیا۔ (آپؐ نے یہ سونا اس اعرابی کے حوالے کر دیا۔) ابھی مقررہ مدت ختم ہونے میں دو تین دن باقی تھے کہ میں آپؐ کے پاس گیا۔ (ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ ایک انصاری کے جنازے پر تشریف لائے تھے اور یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپؐ نماز جنازہ سے فارغ ہو چکے۔) میں نے آپ کی قمیص کا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور خشم آلود نگاہوں سے آپؐ کو گھورتے ہوئے کہا، محمدؐ! تم نے اب تک میرا قرض ادا نہیں کیا، خدا کی قسم عبدالمطلب کی اولاد ہمیشہ کی نادہند ہے، مجھے پہلے بھی تجربہ ہو چکا ہے۔

حضرت عمرؓ بھی وہاں موجود تھے وہ میرا رویہ دیکھ کر غصہ سے بے تاب ہو گئے اور تلوار پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے، او دشمن خدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں گستاخی کر رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، اے عمر مجھے تو تم سے یہ توقع تھی کہ اس کو نرمی سے کام لینے کی تلقین کرتے اور مجھ سے اس کا قرض ادا کرنے کے لیے کہتے۔ اب جاؤ اور اس کا قرض ادا کر کے بیس صاع کھجوریں زیادہ دو۔ میں نے پوچھا، یہ زیادہ کھجوریں کس بات کی ہیں؟ انہوں نے کہا، یہ اس درشت کلامی کا کفارہ ہے جو میں نے تمہارے ساتھ کی۔ پھر میں

نے کہا، اے عمرؓ! تم نے مجھے پہچانا، انہوں نے کہا، نہیں۔ میں نے کہا، میں زید بن سعنہ ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا، وہ زید جو الحبر (عالمِ اجلّ) مشہور ہے۔ میں نے کہا، ہاں۔ انہوں نے کہا کہ ایسا عالم ہوتے ہوئے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسا رویّہ کیوں اختیار کیا؟ میں نے کہا، نبوّت کی اور تمام علامات تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر موجود تھیں، صرف ان دو باتوں کا تجربہ کرنا تھا کہ ان کا حلم ان کے غیظ پر غالب ہوتا ہے، اور جاہلانہ حرکتیں ان کے حلم و تحمل کو بڑھا دیتی ہیں — ان باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اس لیے اب میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوتا ہوں۔"

اس واقعہ کے بعد وہ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور خوشی خوشی سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے۔ امام حاکمؒ نے "مستدرک" میں لکھا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت زیدؓ بن سعنہ نے اپنا نصف مال راہِ خدا میں صدقہ کر دیا۔

اہلِ سیر نے حضرت زیدؓ بن سعنہ کے قبولِ اسلام کے زمانے کی تصریح نہیں کی البتہ یہ لکھا ہے کہ اسلام لانے کے بعد وہ تمام غزواتِ نبویؐ میں شریک ہوئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے غزوۂ تبوک کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ حافظ ابنِ حجرؒ اور امام حاکمؒ نے لکھا ہے کہ وہ اس غزوہ میں بڑی بہادری سے لڑے اور اسی غزوے سے مدینہ واپس ہوتے ہوئے راستے میں شہادت پائی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

☆

اصحابِ صُفّہؓ

(۱)

جب مرکزِ رسالت مکہ سے مدینہ منوّرہ کو منتقل ہوا تو نہ صرف عرب کے گوشہ گوشہ سے بلکہ عرب سے متصل دوسرے علاقوں سے بھی سعید الفطرت لوگ حق کی تلاش میں مدینہ منوّرہ پہنچنے لگے۔ یہ لوگ راہِ حق میں بیوی بچوں اور مال و دولت سے منہ موڑ لیتے تھے اور اپنا وطنِ عزیز ترک کر کے اپنی جانوں کو خدمتِ اسلام کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ سفر کی صعوبتیں اور غریب الوطنی کی تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ فقر و فاقہ اور عسرت و افلاس کی زندگی کو انہوں نے محض رضائے الٰہی کی خاطر اختیار کیا تھا۔ حالتِ امن میں وہ خدا کے مسکین ترین بندے تھے اور میدانِ جہاد میں شیرانِ نر سے بڑھ کر تھے۔ جب ان غریب الدیار درویشانِ اسلام کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مستقل رہائش کے لیے مسجدِ نبوی سے جانبِ شرق ایک مسقّف چبوترہ بنوایا۔ عربی میں سائبان یا مسقّف دالان کو صُفّہ کہتے ہیں اس لیے یہ مردانِ حق آگاہ بھی اصحابِ صُفّہ کہلانے لگے۔ ان میں مدینہ منوّرہ کے مسکین صحابہ بھی شامل ہو گئے۔ ان سب اصحاب کو اضیاف الاسلام (اسلام کے مہمان) یا اضیاف اللہ (اللہ کے مہمان) بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی تعداد کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق ان مسکین صحابۂ کرامؓ کی کم از کم تعداد اسّی تھی جو بعض اوقات بڑھ کر چار سو تک پہنچ جاتی تھی۔ ان بزرگوں میں سے جو شخص شادی کر لیتا تھا اور اہل و عیال کے حقوق و فرائض پورا کرنے کا پابند ہو جاتا تھا وہ ان کے حلقے سے خود بخود نکل جاتا تھا۔

اصحابِ صُفّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے پچاس بہت مشہور ہیں ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: ______

(۱) حضرت ابوہریرہؓ (۲) حضرت حنظلہؓ بن ابی عامر انصاری (۳) حضرت عبداللہؓ بن خالد غفاری (۴) حضرت براءؓ بن مالک (۵) حضرت ابوثعلبہ انصاریؓ (۶) حضرت حبیبؓ بن زید بن عاصم انصاری (۷) حضرت خالدؓ بن زید بن حارثہ انصاری (۸) حضرت ربیعہؓ بن کعب اسلمی (۹) حضرت ثابتؓ بن ضحاک خزرجی (۱۰) حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتومؓ (۱۱) حضرت عبیدؓ مولیٰ رسولِ کریمؐ (۱۲) حضرت ابوکبشہؓ مولیٰ رسول اکرمؐ (۱۳) حضرت یسار راعیؓ مولیٰ رسولِ کریمؐ (۱۴) حضرت معاویہؓ بن حکم سلمی (۱۵) حضرت عکاشہؓ بن محصن اسدی (۱۶) حضرت ابوسعید خدریؓ (۱۷) حضرت سفینہؓ مولیٰ رسول کریمؐ (۱۸) حضرت شقران مولیٰ رسولِ کریمؐ (۱۹) حضرت عمروؓ بن ثعلبہ انصاری (۲۰) حضرت حُذیفہؓ بن اسید غفاری (۲۱) حضرت خُبیبؓ بن اساف انصاری (۲۲) حضرت ابوریحانہ مولیٰ رسولِ کریمؐ (۲۳) حضرت سعدؓ بن مالک خزرجی (۲۴) حضرت سالمؓ بن عمیر (۲۵) حضرت سائبؓ بن خلاد (۲۶) حضرت صفوانؓ بن بیضا فہری (۲۷) حضرت قرہؓ بن ایاس (۲۸) حضرت مسطحؓ بن اثاثہ (۲۹) حضرت ابو فراس ربیعہؓ بن کعب سلمی (۳۰) حضرت ابو موہبہ مزنی مولیٰ رسولِ کریمؐ (۳۱) حضرت اوسؓ بن اوس ثقفی (۳۲) حضرت ہلال مولیٰ مغیرہؓ بن شعبہ (۳۳) حضرت مسعودؓ بن ربیع (۳۴) حضرت عبادہؓ بن قرص لیثی (۳۵) حضرت عویمؓ بن ساعدہ بدری (۳۶) حضرت شدادؓ بن اسید سلمی (۳۷) حضرت سالمؓ بن عبید اشجعی (۳۸) حضرت ابوبشر بشیرؓ بن معبد اسلمی (۳۹) حضرت عبداللہؓ بن بدر جہنی (۴۰) حضرت طلحہؓ بن عمرو نضری (۴۱) حضرت عبداللہ بن انیس جہنی (۴۲) حضرت عیاضؓ بن حمار مجاشعی (۴۳) حضرت حرملہؓ بن ایاس عنبری (۴۴) حضرت ابوسعیدؓ ثابت بن ودیعہ اوسی (۴۵) حضرت عبداللہ بن حبشی خثعمی (۴۶) حضرت حارثہ بن خمیر اشجعی (۴۷) حضرت عبداللہ بن اسود سدوسی (۴۸) حضرت ابو محمد فضالہ بن عبید اوسیؓ (۴۹) حضرت واثلہ بن اسقع کنانیؓ (۵۰) حضرت وابصہ بن معبد اسدیؓ۔

(۲)

اصحاب صُفّہؓ کے فقر و استغنا کا عجیب عالم تھا۔ ان پر کئی کئی وقت کے فاقے گزر جاتے تھے لیکن زبان پر حرفِ شکایت نہ آتا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ان میں سے بعض نحیف الجثہ اصحاب ضعف اور گرسنگی سے عین حالتِ نماز میں گر پڑتے اور بیہوش ہو جاتے۔ حضورؐ نماز سے فارغ ہو کر انہیں اٹھاتے اور فرماتے ـــــ "اے صعالیک المہاجرین اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ بارگاہِ الٰہی میں تمہارا کیا درجہ ہے تو خدا کی قسم اس فقر و فاقہ کو تم اور بھی زیادہ محبوب رکھو۔ اور پھر صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرماتے:

"بھوکا پیٹ ستر عقلمند عابدوں سے بھی اللہ کو پیارا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو اسی مقدس گروہ کے ساتھ عبادت کرنے کے لیے ارشاد فرمایا:

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم (الخ)

حضورؐ ان درویشانِ راہِ حق کو بیحد محبوب رکھتے اور ہر معاملہ میں ان کا خاص خیال رکھتے۔ جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو حضورؐ یہ تمام کھانا اصحابِ صُفّہ کو بھیج دیتے۔ کبھی انہیں مہاجرین اور انصار پر تقسیم فرما دیتے۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق ان میں سے ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جاتا اور کھانا کھلاتا۔ اگر کوئی صحابی حضورؐ کو کھانے کی دعوت دیتا تو آپؐ اصحاب صُفّہؓ کو اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ اللہ تعالیٰ تھوڑے کھانے میں بھی برکت دیتا تھا۔ حضورؐ کو اصحاب صُفّہؓ کا جتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ کی جگر گوشہ حضرت سیّدہ فاطمۃ الزہراؓ نے یہ کہہ کر ایک کنیز کے لیے درخواست کی کہ ابا جان چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے ہیں اور شدید محنت و مشقت نے مجھے نحیف و نزار کر دیا ہے۔

حضورؐ نے ان کی بات سُن کر فرمایا، "بیٹی سب سے پہلے مجھے اصحابِ صُفّہؓ

کی خورد و نوش کا انتظام کرتا ہے۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اصحاب صفہؓ تو بھوک سے مر رہے ہوں اور میں اپنی بیٹی کے آرام کے لیے اسے کنیز دوں۔ بیٹی صبر و شکر سے اپنا وقت گزارو۔"

حضورؐ کو اصحابِ صُفہؓ کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص خیال تھا۔ خود بھی انہیں نہایت محبت سے تعلیم دیتے اور معلم سے بھی دلاتے جو خاص طور پر ان کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ حضورؐ کی شفقت و عنایت سے ان بزرگوں کو حدیث، قرآن اور قرأت میں خوب مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ حفظِ قرآن سے بھی انہیں خاص شغف تھا اور انہی اوصاف کی بدولت وہ "قراء" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ غزوۂ بیر معونہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیم کے لیے جو ستّر اصحاب بھیجے تھے ان میں بیشتر تعداد اصحابِ صُفہؓ کی تھی۔ جب مشرکین نے ان سے دھوکا کیا تو وہ سب نہایت بہادری سے لڑ کر شہید ہو گئے۔

(۳)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اصحابِ صُفہؓ کے زہد و فقر کو دیکھ کر فرمایا:

"اے درویشانِ راہِ حق جو کوئی میری اُمّت میں اس طرح عمر گزارے جس طرح تم گزار رہے ہو تو قیامت کے دن وہ میرے رفیقوں میں ہوگا۔"

سید الخزرج حضرت سعدؓ بن عبادہ انصاری کو اکثر یہ سعادت نصیب ہوتی کہ وہ تمام اصحابِ صُفہؓ کو کھانا کھلاتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دولتِ دنیا سے سرفراز کیا تھا۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی خوشنودی کے لیے وہ اس دولت کو بے محابا اصحابِ صُفہؓ پر صرف کرتے رہتے تھے۔

اصحابِ صُفہؓ کی زندگی راہبانہ نہ تھی اور محض محتاج ہو کر بیٹھ رہنا انہیں گوارا نہ تھا۔ چنانچہ وہ صبح کو جنگل جا کر گری پڑی لکڑیاں چن لیتے اور انہیں فروخت کر کے گزر اوقات کرتے جس دن کچھ نہ ملتا صبر شکر کر کے پڑ رہتے۔ مدینہ کے قیام اور

سفر و حضر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت و اطاعت اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ تحصیلِ علم ہی ان کا مقصدِ وحید نہیں تھا۔ جب جہاد کا موقع آتا تو یہی مسکین طبع اصحاب مجاہدین اولو العزم بن جاتے اور شمشیر بکف ہو کر اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگا دیتے تھے۔

(۴)

اصحابِ صُفّہؓ کے لباس کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے پاس تہبند اور چادر دونوں چیزیں ہوں۔ ایک چادر یا گلیم کے سوا ان کے پاس کوئی کپڑا نہ ہوتا تھا وہ اس چادر کو اپنے گلے میں اس طرح باندھ لیتے تھے کہ بعض کے نصف ساق تک لٹک آتی تھی اور بعض کے ٹخنوں تک پہنچ جاتی تھی۔ جب نماز پڑھتے ہوئے وہ سجدوں میں جاتے تو اپنی چادروں کو سمیٹ لیتے تاکہ ستر کی جگہ نہ کھلے۔

حضورؐ کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مستقبل میں یہی بزرگ جن کا لباس پھٹے پرانے چیتھڑے ہوتا تھا اور جنہیں روٹی کا ایک ٹکڑا بھی مشکل سے میسّر ہوتا تھا دنیائے اسلام میں بڑی نامور شخصیتوں کے مالک بنے۔ ایک وقت تھا کہ اہلِ یثرب بھی ان کے ناموں سے آشنا نہ تھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ بڑے بڑے وسیع اور عریض صوبے ان کے زیرِ نگین تھے جن پر انہوں نے نہایت لیاقت اور دیانت سے حکومت کی۔ آقائے دو جہاںؐ کے فیضِ صحبت نے انہیں کچھ کا کچھ بنا دیا۔ ان میں سے بہترین عالم، بہترین سیاست دان، بہترین متکلم، بہترین سپہ سالار، بہترین حکمران، بہترین مدبر اور بہترین تاجر پیدا ہوئے۔ یہ لوگ صبر واستقامت کے اس بلند مقام پر تھے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ ان کی بلاکشی نے شجرِ اسلام کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ تھوڑے ہی عرصہ میں بڑھ کر ایک تناور درخت بن گیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہم

حضرت خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ

خیر التابعین

①

خیر التابعین حضرت خواجہ اویس قرنیؒ تاریخ اسلام کی ایک پر اسرار شخصیت ہیں ایک طرف تو بعض اکابرِ اُمت ان کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کے فضائل و مناقب سے تاریخ و سِیَر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ جن اصحاب نے ان کے وجود سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے ان میں امام مالکؒ، امام بخاریؒ، عمرو بن مرۃؒ، ابو اسحٰق سبیعیؒ اور سمعانیؒ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اس کے برعکس محدثین، مشائخ و علماء کا ایک کثیر طبقہ خواجہ اویس قرنیؒ کے وجود کا دل سے قائل ہے اور انہوں نے آپ کے وجود کے حق میں ناقابلِ تردید دلائل پیش کیے ہیں۔ صحیح مسلم میں ان کے مستقل فضائل ملتے ہیں اور مُسندِ احمدؒ بن حنبل، مُسندِ ابو یعلیٰ، دلائلِ بیہقی، مستدرک حاکم، تہذیب التہذیب، اُسدُ الغابہ، طبقات ابنِ سعد اور اصابہ وغیرہ میں خواجہ اویس قرنیؒ کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر آپ کے وجود میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

خواجہ اویس قرنیؒ کو مستور الحال رہنا پسند تھا۔ تمام عمر انہوں نے نمود و نمائش سے احتراز کیا اس لیے اگر بعض اکابر امت ان کے وجود سے لاعلم رہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اویس قرنیؒ نام کی کوئی شخصیت ہی نہیں تھی۔ خواجہ اویس قرنیؒ طبقۂ مشائخ اور گروہ محدثین میں شہرۂ آفاق ہیں۔ بےشمار مستند اور متواتر روایتوں کی موجودگی میں ان کے وجود سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ ان کی شخصیت کو تسلیم کر لینے کے بعد دوسرا سوال

جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ خواجہ اویس قرنیؒ صحابی تھے یا تابعی۔

امام عبدالوہاب شعرانیؒ کا بیان ہے کہ آپ صحابی تھے اور غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے تھے لیکن یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ دوسرے تمام مشائخِ کبار اور علمائے اُمّت بالاتفاق آپ کو تابعی تسلیم کرتے ہیں۔ بلاشبہ خواجہ اویس قرنیؒ سرورِ کونینؐ کے زمانۂ مبارک میں موجود تھے۔ اسلام کے نام لیوا اور حضورؐ کے عاشقِ صادق تھے، لیکن بوجوہ بارگاہِ نبوت میں حاضر نہ ہو سکے اور اس طرح شرفِ صحابیت سے محروم رہے تاہم تابعین میں ان کا درجہ سب سے بڑا ہے۔ آقائے دوجہاںؐ نے خود اپنی زبان مبارک سے ان کو "خیر التابعین" کا لقب عطا فرمایا۔ اس سے بڑھ کر خواجہ اویس قرنیؒ کے تابعی ہونے کی کوئی اور شہادت نہیں ہو سکتی۔

(۲)

بیہقیؒ اور ابو نعیمؒ وغیرہ نے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یاتی علیک اویس کان بہ مرض فبرء منہ الا موضع درھم لہ والدۃ ھو بھا برلو اقسم علی اللہ لابرہ فان استطعت ان یستغفر لک فافعل"

"یعنی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر یمن کی طرف سے ایک شخص آئیگا جس کا نام اویس ہوگا، اس کے جسم پر برص (پھلبہری) کے داغ تھے مگر اب مٹ چکے ہیں فقط ایک داغ درہم کے برابر ہوگا اس کی ماں بھی ہے جس کا وہ بجید خدمت گزار ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو اس کو ضرور پورا کرتا ہے۔ اے عمر اگر تمہیں موقع ملے کہ اس سے اپنے لیے دعائے مغفرت چاہو تو ضرور ایسا کرنا۔"

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو بھی خواجہ اویس قرنیؒ کی نسبت بشارت دی۔ بعض دوسری روایات میں حضورؐ سے یہ

الفاظ بھی منسوب کیے گئے ہیں کہ اویس تابعین میں سب سے بہتر شخص ہو گا گویا خیر التابعین ہو گا۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا کہ مجھے یمن کی طرف سے بوئے محبت آتی ہے۔ مولانا رومؒ اور امام غزالیؒ کا بیان ہے کہ حضورؐ کا اشارہ خواجہ اویس قرنیؒ کی طرف تھا۔ جس مبارک ہستی کی بشارت خود سید البشر خیر الرسلؐ دیں اس کے علو مرتبت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امام یافعیؒ خواجہ اویس قرنیؒ کی جلالتِ شان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

شَهِيرٌ يَمَانِيٌّ ذُو الْمَجْدِ وَالْعُلَى
لَنَا فِيهِ عَالِي الْفَخْرِ عِنْدَ التَّفَاخُرِ

یعنی وہ (اویسؒ) یمنی کے نام سے مشہور ہیں جن کی عظمت اور جلالتِ شان کا سکہ ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور فخر کرنے کے لیے ان کی ذات بڑی قابلِ فخر ہے۔

مشائخ کبار نے خواجہ اویس قرنیؒ کو سہیل یمنی۔ نفس رحمان۔ سادات التابعین۔ افضل التابعین۔ قبلہ تابعین اور قدوۃ اربعین وغیرہ کے معزز القاب سے یاد کیا ہے۔

(۳)

حضرت اویس قرنیؒ نواحِ یمن میں پیدا ہوئے۔ بعض روایتوں میں ان کی جائے پیدائش کا نام "قرن" لکھا ہے جو نواحِ یمن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن کچھ دوسری روایتوں کے مطابق حضرت اویسؒ جس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اس کا نام "مراد" تھا تاہم اسے "قرن" بھی کہتے تھے۔ اور اسی نسبت سے حضرت اویسؒ کو قرنی کہا جاتا ہے۔ "قرن" اور "مراد" دونوں حضرت اویسؒ کے اجداد سے تھے۔ علمائے انساب نے حضرت اویسؒ کا سلسلۂ نسب دو طریقوں سے لکھا ہے:

(۱) اویسؒ بن عامر بن جزء بن مالک بن عمرو بن مسعدہ بن عمرو بن

سعد بن عصوان بن قرن بن رومان بن ناجیہ بن مراد المرادی القرنی۔

(۲) اویسؒ بن عامر بن جزء بن مالک بن عمرو بن سعد بن عصوان بن قرن بن رومان بن ناجیہ بن مراد بن مالک مذحج بن زید (یا ادد) الخ

یہ خاندان یعرب بن قحطان تک جاکر ختم ہو جاتا ہے۔ قحطانی النسل عربوں کو "عرب العاربہ" یا ٹھیٹ عرب کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت اویسؒ ایک ٹھیٹ عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "قبیلہ مراد" نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا اور دین سلیمانی کا پیرو ہو گیا تھا حضرت سلیمان علیہ السلام بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت سلیمانؑ بھی دین اسلام کے داعی تھے اس لحاظ سے حضرت اویس قرنیؒ ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے۔ باقی رہا یہ سوال کہ وہ خاتم النبیین جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کب ایمان لائے تو اس کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ اس کا صحیح زمانہ متعین کرنا ممکن نہیں۔ تاہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور فیض و برکت کا غلغلہ بلند ہوا تو عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح یمن کے لوگ بھی حضورؐ کے اسم گرامی سے آگاہ ہو گئے۔ حضرت اویسؒ کو اللہ تعالیٰ نے طبع سلیم اور فطرت صالح عطا کی تھی۔ ان کے کان جب رحمۃ للعالمینؐ کے ذکر پاک سے آشنا ہوئے تو ان کے دل نے گواہی دی کہ حضورؐ خدا کے سچے رسول ہیں گویا ان کو غائبانہ تصدیق قلبی حاصل ہو گئی اور بات صرف تصدیق اور ایمان بالرسالت تک ختم نہیں ہو گئی بلکہ ان کو سرور کونینؐ سے والہانہ عشق ہو گیا۔ ایسا عشق کہ جس نے ان کو حیات جاوداں بخش دی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

حضرت اویس قرنیؒ نے اپنے آپ کو فنا فی الرسول کر دیا۔ ہر وقت سرور کائناتؐ

کے احوال کی جستجو کرتے رہتے اور قدم بہ قدم حضورؐ کے اسوۂ حسنہ اور اتباعِ رسولؐ کی انھوں نے ایسی مثال قائم کی کہ آج تک صلحائے اُمّت کے لیے باعثِ رشک ہے۔ یہاں ایک قاری کے دل میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواجہ اویس قرنیؒ سرورِ کونینؐ کی خدمتِ اقدس میں کیوں حاضر نہ ہوئے حالانکہ وہ حضورؐ کے عاشقِ صادق تھے اور عہدِ رسالت میں موجود تھے۔ مختلف روایتوں کے مطابق اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خواجہ اویسؒ کی والدہ ضعیف العمر، نابینا اور چلنے پھرنے سے معذور تھیں۔ حضرت اویسؒ ہر وقت ان کی خدمتگذاری میں مصروف رہتے تھے اور ان کو تنہا چھوڑ کر کسی لمبے سفر پر نہیں جاسکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حقیقتِ محمدیہ کا باطنی آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا تھا۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ خواجہ اویس قرنیؒ ایک دفعہ حضورؐ کی زیارت کے لیے مدینہ منوّرہ آئے لیکن حضورؐ خانۂ اقدس سے باہر تھے۔ حضرت اویسؒ نے والدہ کی ہدایت کے مطابق انتظار نہ کیا اور فوراً ہی واپس چلے گئے۔ واللہ اعلم بالصواب والدہ کی وفات کے بعد حضرت اویس قرنیؒ حج کے لیے مکّہ معظّمہ تشریف لے گئے۔ اس وقت سرورِ کائناتؐ کا وصال ہوچکا تھا۔ مکّہ معظّمہ میں وہ اجلّ صحابہؓ کی ملاقات سے مشرف ہوئے اور حج بیت اللہ کے بعد کوفہ یا اس کے نواح میں سکونت پذیر ہوگئے۔

(۴)

حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کی زندگی عجیب شان کی تھی۔ اونٹ کے بالوں کا ایک کمبل اور ایک پاجامہ ان کا لباس ہوتا تھا۔ اور علائقِ دنیوی سے یکسر بے نیاز تھے۔ کبھی کبھار اللہ کا کوئی نیک بندہ جسم کی عریانی ڈھانپنے کے لیے چادر اوڑھا دیتا تھا۔ ہر وقت حالتِ وارفتگی و شورگی طاری رہتی تھی۔ لوگ انہیں دیوانہ سمجھتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ بچے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے تھے۔ آپ فرماتے چھوٹے چھوٹے پتھر مارو تاکہ میرے جسم سے خون نہ بہہ نکلے اس سے میرا وضو جاتا

رہیگا۔ وارفتگی اور شورگی کے باوجود غیرت اور خودداری کی یہ کیفیت تھی کہ کسی پر اپنا بوجھ ڈالنا گوارانہ تھا۔ اپنے قبیلہ کے اونٹ چراکر یا کھجور کی گٹھلیاں بیچ کر معاش کا سامان پیدا کرتے تھے۔ رات کو کھانے کے بعد کوئی چیز بچتی تو اسے راہِ خدا میں صدقہ کر دیتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ لباس اور غذا (جو میرے پیٹ میں ہے) اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

جس مکان میں رہتے تھے وہ نہایت بوسیدہ اور خستہ حال تھا۔ عبادت و ریاضت سے شغف کا یہ عالم تھا کہ ساری ساری رات بیدار رہ کر یادِ الہٰی میں مصروف رہتے۔ اکثر سارا دن بھی عبادت میں گزر جاتا۔ فرمایا کرتے تھے کاش ازل سے ابد تک ایک ہی طویل رات ہوتی اور میں ایک ہی رکوع اور ایک ہی سجدے میں رات گزار دیتا۔ روزے نہایت کثرت سے رکھتے تھے۔ بعض اوقات تین تین دن کا فاقہ آجاتا تھا۔

نام ونمود اور شہرت سے سخت اجتناب تھا۔ چونکہ دنیا سے دل برداشتہ تھے اس لیے لوگوں سے ملنے جلنے سے بہت گھبراتے تھے۔ مستور الحالی کے باوجود ان کے کمالات روحانی ایسے نہیں تھے جو لوگوں سے مخفی رہ سکیں۔ اہل دل ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہو کر ملاقات کے خواہاں ہوتے۔ آپ فرماتے کہ میں ایک ضعیف انسان ہوں آپ لوگ کیوں میرے پیچھے آتے ہیں۔ اگر کسی کو مجھ سے کوئی ضرورت ہو تو وہ عشاء کی نماز کے بعد مجھ سے مل لیا کرے۔ باوجود عزلت گزینی کے وہ اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رہتے تھے۔ لوگوں کو بُرے کاموں سے روکتے اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کی تلقین کرتے تھے۔ ان کی حق گوئی اور بے باکی نے کئی لوگوں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا لیکن وہ فرماتے تھے کہ خدا کی قسم ان لوگوں کی دشمنی مجھ کو حق گوئی سے کبھی نہیں روک سکتی۔

حضرت اویسؒ نے اکابر صحابہؓ سے سرورِ کونینؐ کی احادیث سنیں لیکن ان کو محدث اور عالم مشہور ہونا پسند نہیں تھا اس لیے کسی حدیث کی روایت کرنے سے ہمیشہ محترز رہے۔ سرورِ کونینؐ نے "نفسِ امارہ" کے خلاف لڑائی کو جہادِ اکبر قرار دیا ہے۔

خواجہ اویس قرنیؒ اس جہادِ اکبر میں تو ساری عمر مصروف رہے لیکن اس کے علاوہ راہِ حق میں وہ جہاد بالسیف کے ثوابِ عظیم سے بھی محروم نہیں رہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آذر بائیجان پر جب اسلامی لشکر حملہ آور ہوا تو مجاہدین میں حضرت اویس قرنیؒ بھی شامل تھے، اسی موقع پر حضرت عمر فاروقؓ سے ان کی ملاقات ہوئی۔

۵

حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات حضرت اویس قرنیؒ کی زندگی کا اہم واقعہ ہے۔ کتب سیر و تاریخ میں اس ملاقات کا حال مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے صحیح مسلم کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے کہ سرورِ دو عالمؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے ایک موقعہ پر حضرت اویس قرنیؒ کی کچھ نشانیاں بیان فرمائی تھیں۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ ہمیشہ حضرت اویس قرنیؒ کی جستجو میں رہتے تھے آپؓ کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ یمن سے مجاہدین کی ایک جماعت مدینہ منورہ پہنچی کہ مرکزِ خلافت کی ہدایات لے کر افواجِ اسلام میں شامل ہو جائیں جو عراق عجم، ایران، شام وغیرہ میں مصروفِ جہاد تھیں۔ امیر المومنینؓ کو یمنی مجاہدین کی آمد کی اطلاع ملی تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور اویسؒ کا پتہ پوچھنے لگے۔ لوگوں نے بتایا تو آپ سیدھے ان کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا کیا تم اویس بن عامر ہو۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو دریافت کیا "کیا تمہاری والدہ ہیں؟" حضرت اویسؒ نے کہا۔ "ہاں" ——— اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے جو کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت اویسؒ کی نسبت سنا تھا بیان کیا۔ سب نشانیاں ان میں موجود تھیں پھر حضرت عمر فاروقؓ ان سے دُعائے مغفرت کے طالب ہوئے۔ حضرت اویسؒ نے ان کے حق میں دُعائے مغفرت کی۔ پھر امیر المؤمنین نے ان سے پوچھا کہ اس کے بعد آپ کا ارادہ کہاں قیام کرنے کا ہے۔ حضرت اویسؒ نے جواب دیا کہ کوفہ جاؤں گا۔ امیر المؤمنین نے فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ کوفہ کے عامل کو آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کر دوں تاکہ وہ آپ کے حسب مرتبہ سلوک کرے۔"

حضرت اویسؒ نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں اے امیرالمؤمنین، میں جس حال میں ہوں اسی میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ خواص کی بجائے عوام ہی میرے ساتھی ہیں اور میں انہیں میں رہنا چاہتا ہوں۔"

دوسرے سال حج کے موقع پر کوفہ کا ایک معزز شخص مکہ معظمہ آیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس سے خواجہ اویس قرنیؒ کا حال پوچھا اس نے بتایا کہ وہ ایک بوسیدہ اور خستہ حال مکان میں رہتے ہیں اور نہایت عسرت کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اس شخص کو حضرت اویسؒ کی رفعتِ شان سے آگاہ کیا اور ان کی نسبت رسولِ اکرمؐ کے ارشادات سنائے۔ وہ کوفہ جا کر حضرت اویسؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے حق میں دعا کا خواستگار ہوا۔ حضرت اویسؒ نے فرمایا: "تم حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر واپس آئے ہو اس لیے مجھے تمہاری دعا کی ضرورت ہے۔"

پھر پوچھا: "کیا تمہاری امیرالمؤمنین عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد حضرت اویسؒ نے اس شخص کے لیے دعائے مغفرت کی۔

(۶)

حضرت ہرمؒ بن حیان عبدی ایک مشہور تابعی گزرے ہیں۔ علماء و مشائخ نے ان کو بزرگانِ طریقت میں شمار کیا ہے۔ نہایت عابد و زاہد تھے۔ مدتوں صحابہ کرامؓ کا فیضِ صحبت اٹھایا اور زمرۂ اولیاء میں شمار ہوئے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے ان سے روایت بھی کی ہے۔ حضرت ہرمؒ، خواجہ اویس قرنیؒ کے ہم مشرب تھے۔ علامہ ابنِ سعدؒ نے شیخ فریدالدین عطارؒ اور امام غزالیؒ کی خواجہ اویس قرنیؒ سے ان کی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر خواجہ اویسؒ کے مقامِ بلند کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جن دنوں حضرت اویس قرنیؒ کوفہ میں مقیم تھے۔ حضرت ہرمؒ بن حیان نے ان کے حالات سنے تو دل میں ملاقات کی آرزو پیدا ہوئی۔ سیدھے کوفہ پہنچے۔

لوگوں سے حضرت اویسؒ کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ دریائے فرات کے کنارے کہیں ملیں گے۔ ہرمؒ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت اویسؒ لب دریا وضو کر رہے ہیں۔ جسم نہایت نحیف و نزار تھا اور پیشانی نورِ ایمان سے چمک رہی تھی۔ حضرت ہرمؓ کا بیان ہے کہ میں نے اویسؒ کو سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ حضرت اویسؒ نے سلام کا جواب تو دیا لیکن مصافحہ کرنے کی بجائے فرمایا "خدا تم کو زندہ رکھے۔" ان کی ضعیفی اور نقاہت دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور میں رونے لگا۔ حضرت اویسؒ پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اویسؒ نے فرمایا "ہرم بن حیان خدا تم پر رحم کرے۔ میرے بھائی تمہارا کیا حال ہے۔ تم نے میرا پتہ کیسے معلوم کیا؟" میں نے کہا "امیر المؤمنین عمر فاروقؓ نے۔ لیکن اے اویسؒ آپ کو میرا اور میرے باپ کا نام کیسے معلوم ہوا۔ حالانکہ اس سے پہلے ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔"

حضرت اویسؒ نے جواب دیا "نبانی العلیم الخبیر" (خدائے علیم وخبیر نے مجھے یہ بتایا ہے۔) مومن خواہ ایک دوسرے کے شناسا نہ ہوں لیکن ان کی روحیں ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔"

میں نے درخواست کی کہ اے اویسؒ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنائیے۔ حضرت اویسؒ نے فرمایا "افسوس کہ آقائے دوجہان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت سے میں محروم رہا۔ حضورؐ کے صحابہ کرام سے میں نے بیشک حدیثیں سنی ہیں لیکن اس طرح تو تم نے بھی سُنی ہیں۔ میں محدث اور راوی بننا پسند نہیں کرتا۔ مجھے اپنے نفس کے بہت سے کام ہیں

پھر میں نے عرض کیا کہ اپنی زبانِ مبارک سے مجھے کلام الٰہی سنائیے۔ یہ سن کر

ؔلہ یہ روایت تذکرۃ الاولیاء اور احیاء العلوم کی ہے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اس موقع پر حضرت ہرمؓ نے فرمایا "خدا نے" اس پر حضرت اویسؒ نے فرمایا:

"لا اللہ سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا حین سمانی"

میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا اور " اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم" پڑھ کر بے اختیار رونے لگے اور فرمایا، اللہ تعالیٰ کا ذکر بلند ہے اس کا قول سب سے حق اور سب سے سچا ہے اور اس کا کلام سب سے اچھا کلام ہے پھر ما خلقنا السموات والارض سے ھو العزیز الرحیم تک تلاوت کی اور شدتِ گریہ سے بیہوش سے ہو گئے۔ اس کے بعد فرمایا " اے ہرم تیرا باپ مر گیا۔ اب قریب ہے کہ تم بھی مر جاؤ گے۔ معلوم نہیں دوزخ میں جانا ہے یا جنت میں۔ جب تمام انبیاء اور صلحاء کو سفرِ آخرت اختیار کرنا پڑا تو ہمارا تمہارا شمار بھی مُردوں ہی میں ہے پھر انہوں نے زور سے " وا عمراہ " کا نعرہ لگایا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی میں نے کہا " اے اویس حضرت عمر فاروق تو ابھی زندہ ہیں " فرمایا "خدائے علیم و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔"

اس کے بعد حضرت اویسؓ نے درود شریف پڑھا اور کچھ دعائیں پڑھ کر فرمایا:

" اے ہرم میری وصیت یہ ہے کہ کتاب اللہ اور اہل اللہ کی موافقت کرنا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ درود و سلام بھیجتے رہنا کسی حالت میں بھی موت کو فراموش نہ کرنا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی غافل نہ ہونا۔ خبردار جماعت اور سُنّت کی موافقت کبھی ترک نہ کرنا ورنہ قیامت کے دن آتشِ دوزخ کا سامنا کرنا پڑیگا۔"

اس کے بعد انہوں نے میرے لیے دعا کی اور فرمایا کہ " اب جاؤ اور میرے لیے دُعا کرتے رہنا میں بھی تمھیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا۔ آئندہ نہ میں تجھے دیکھوں گا نہ تم مجھے دیکھ سکو گے۔ اب مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔"

ہرمؒ کہتے ہیں کہ پھر حضرت اویسؒ روتے ہوئے مجھ سے جُدا ہو گئے اور پھر میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔

(۷)

حضرت اویس قرنیؒ کب اور کیسے فوت ہوئے اس کے متعلق مختلف

روایتیں ہیں۔ عام روایت یہ ہے کہ انہوں نے جنگ صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے لڑکر شہادت پائی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انہوں نے معرکہ آذربائیجان میں جام شہادت پیا۔ ایک اور روایت کے مطابق حضرت اویس قرنیؒ نے اسہال کے عارضہ سے وفات پائی۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

دنیا میں سات مختلف مقامات پر آپ کا مزار بیان کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ حقیقی مزار کونسا ہے۔

آپ کا حلیہ مختلف کتابوں میں دو طرح سے مذکور ہے۔

ا۔ فربہ اندام۔ گندمی رنگ۔ گھنی داڑھی اور بدن بالوں سے ڈھکا ہوا۔

ب۔ لاغر بدن۔ گندمی رنگ۔ میانہ قد۔ گھنی داڑھی۔ سینہ عریض۔ آنکھیں سیاہ نیلگوں۔ چہرہ سے ہیبت ٹپکتی تھی۔

۸

دنیائے تصوف و روحانیت میں حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ اور صوفیائے کرام کے بہت سے سلسلے حضرت اویسؒ تک منتہی ہوتے ہیں۔ بعض مشائخ کی رائے میں تو تمام سلاسلِ طریقت کا کسی نہ کسی صورت میں حضرت اویسؒ سے ضرور تعلق ہے۔ لیکن ایک اور طبقۂ فکر کی رائے میں خواجہ اویس قرنیؒ کا سلسلہ دوسرے تمام سلاسل سے الگ ہے اور اسے "سلسلۂ اویسیہ" کہا جاتا ہے۔

اصطلاحِ صوفیہ "اویسی" عام طور اس شخص کو کہتے ہیں جو۔ اتباع رسولؐ ۔ کی بدولت براہِ راست بارگاہِ خداوندی سے فیضیاب ہوا ہو یا کسی مرشدِ کامل سے فیضیاب ہوا ہو جسے درمیانی واسطوں کے بغیر ہی ولایت مل گئی ہو۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے قول کے مطابق سلسلۂ اویسیہ کے سات بنیادی اصول ہیں یعنی (۱) اتباعِ رسول (۲) دنیا میں رہ کر دنیا میں دل نہ لگانا (۳) مطلب کے بغیر اور حق کے خلاف کوئی بات زبان سے نہ نکالنا (۴) یادِ الٰہی

سے کسی وقت غافل نہ ہونا۔ (۵) ہر وقت اور ہمہ وقت خداوند کریم کو حاضر ناظر جاننا۔ (۶) ہر حال میں راضی برضا رہنا۔ صبر و قناعت اختیار کرنا اور غصہ کو پی جانا۔ (۷) مخلوقِ خدا کی عیب جوئی اور عیب چینی سے پرہیز کرنا۔

حضرت اویس قرنیؒ سے کئی دعائیں اور نمازیں بھی منسوب ہیں ان کی تفصیل کتبِ تصوف میں دیکھی جاسکتی ہے۔

⑨

حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کے ملفوظاتِ طیبات سے کچھ بطور تبرک نیچے درج کیے جاتے ہیں:

(۱) ــــــ "طلبت النسب فوجدت فی التقویٰ"

"میں نے نسب چاہا تو وہ تقویٰ میں پایا" یعنی انسان کی بڑائی اس کے حسب نسب میں نہیں ہے بلکہ تقویٰ (پرہیزگاری) میں ہے۔

(۲) ــــــ "طلبت الشرف فوجدت فی القناعۃ"

یعنی "میں نے (آخرت کی) بزرگی چاہی تو وہ قناعت میں پائی۔"

(۳) ــــــ "طلبت الفخر فوجدت فی الفقر"

(میں نے فخر کو چاہا۔ تو وہ مجھے فقر میں ملا۔)

(۴) ــــــ "طلبت المروۃ فوجدت فی الصدق

(میں نے مروت طلب کی تو وہ مجھے صدق میں ملی)

(۵) ــــــ "طلبت الریاسۃ فوجدت فی نصیحۃ الخلق"

(میں نے (آخرت کی) سرداری طلب کی تو وہ مجھے خلق خدا کو نصیحت کرنے میں ملی۔)

(۶) ــــــ جس شخص کو ان تین باتوں سے محبت ہو وہ ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے:

(۱) اچھا کھانا (۲) اچھا پہننا (۳) امیروں کی صحبت میں بیٹھنا۔

(۷) ——— " جن لوگوں کے دلوں میں شک ہوتا ہے وہ قبولِ حق سے محروم رہتے ہیں۔"

(۸) ——— " جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں رکھتا۔"

(۹) ——— " اپنے آپ کو عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کر دو۔ لیکن جب تک عبادت پر یقین نہیں ہو گا۔ عبادت قبول نہ ہو گی۔"

(۱۰) ——— " لوگوں کے لیے غائبانہ دعا کرنا ان کی ملاقات سے بہتر ہے کیونکہ اس سے ریا کے پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔"

(۱۱) ——— " ہر وقت خدا کے کاموں میں ایسے لگے رہو گویا تم نے تمام مخلوقات کو قتل کر دیا ہے"۔ یعنی دنیا سے بے تعلق ہوئے بغیر تقویٰ اور پرہیز گاری میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابُو عبیدؓ بن مسعود ثقفی

(۱)

۱۳ھ ہجری میں خلیفۃ الرسول حضرت ابُوبکر صدیقؓ نے وفات پائی اور حضرت عمر فاروقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے عراق کی طرف توجہ کی جہاں ایرانیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو سخت مشکل صورتِ حال کا سامنا تھا اور عراق میں مصروفِ جہاد عساکرِ اسلامی کے قائد حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ شیبانی کمک حاصل کرنے کے لیے بنفسِ نفیس مدینہ منورہ آئے ہوئے تھے۔ خود حضرت ابُوبکر صدیقؓ نے اپنی وفات سے ایک دن پہلے حضرت عمر فاروقؓ کو عراق کے بارے میں بدیں الفاظ وصیّت کی تھی:

"اے عمر! میں جو کہتا ہوں اس کو سنو اور اس پر عمل کرو۔ مجھے اُمید ہے کہ آج میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ دن میں میرا دم نکلے تو شام سے پہلے اور رات میں نکلے تو صبح ہوتے ہوتے مسلمانوں کو ترغیب دے کر مثنیٰؓ کی مدد پر آمادہ کرنا۔ کسی مصیبت کی وجہ سے تم کو دین کی خدمت اور احکامِ الٰہی کی تعمیل سے نہ رکنا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے بڑھ کر کونسی مصیبت ہو سکتی ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ اس دن مَیں نے کیا کیا تھا۔ خدا کی قسم اگر مَیں اس روز حکمِ الٰہی کی بجا آوری میں کوتاہی کرتا تو اللہ ہم کو تباہ کر کے سزا دیتا اور مدینہ میں آگ بھڑک اٹھتی۔ اگر اللہ تعالیٰ شام میں مسلمانوں کو فتح دے تو خالدؓ کے لشکر کو عراق بھیج دینا اس لیے کہ وہ آزمودہ کار اور وہاں کے حالات سے واقف ہیں۔"

سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی وفات کی خبر عرب میں پھیلی تو ان کے جانشین کی بیعت کے لیے

اطراف و دیار سے بے شمار لوگ مدینہ منورہ کی طرف امڈ پڑے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور تمام لوگوں کو جمع کر کے انہیں جہاد کے لیے عراق جانے کی ترغیب دی۔ یہ بہت ذمہ داری کا کام تھا اس لیے لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتے تھے۔ تین دن تک یہی کیفیت رہی۔ چوتھے دن حضرت عمر فاروقؓ نے ایسا پُرجوش خطبہ دیا کہ حاضرین کے دل ہل گئے —— حضرت مثنیٰؓ نے مجمعِ عام میں اٹھ کر بڑے جوش سے کہا:

"مسلمانو! معلوم نہیں تم خاموش کیوں ہو؟ ہم نے مجوسیوں کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ وہ مردِ میدان نہیں ہیں۔ ہم نے ان کے ملک کے ایک وسیع حصے پر قبضہ کر لیا ہے اور ان سے اپنی شجاعت کا لوہا منوا لیا ہے —— انشاءاللہ وہ ہمارے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکیں گے۔"

حضرت مثنیٰؓ کی تقریر ختم ہوئی تو مجمع میں سے گٹھے ہوئے جسم کے ایک تنو مند جوان اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت جوشِ شجاعت سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا، انہوں نے پکار کر کہا: "امیر المومنین اس کام کے لیے میں حاضر ہوں۔" اس جوان کی جرأت نے لوگوں کے خون کو گرما دیا۔ حضرت سلیطؓ بن قیس اور حضرت سعدؓ بن عُبید انصاری بھی "انا لھٰذا" (اس کام کے لیے میں حاضر ہوں) کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی سارا مجمع "ہم بھی حاضر ہیں۔ ہم بھی حاضر ہیں" کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ یہ دلاور جوان جن کی ہمتِ مردانہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی، حضرت ابو عُبیدؓ بن مسعود ثقفی تھے۔

(۲)

حضرت ابو المختار ابو عُبیدؓ بن مسعود طائف کے رہنے والے تھے اور بنو ثقیف کے سربرآوردہ افراد میں سے تھے۔ وہ اگرچہ عہدِ رسالت ہی میں سعادت اندوزِ اسلام ہو گئے تھے لیکن کسی وجہ سے شرفِ صحابیت حاصل نہ کر سکے تھے۔

صدیقِ اکبرؓ کی رحلت کے بعد وہ محض بیعتِ خلافت کے لیے مدینہ منورہ آئے

تھے۔ یہاں آکر حسنِ اتّفاق کہیئے یا حضرت ابو عبیدؓ کی خوش بختی کہ انہیں وہ عظیم الشان شرف حاصل ہوگیا جس نے انہیں تاریخ اسلام میں حیاتِ دوام بخش دی۔ انہوں نے جس انداز میں جہادِ عراق کی دعوت پر لبیک کہنے میں سبقت کی اس نے امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کو بہت متاثر کیا۔ انہوں نے حضرت مثنیٰؓ کو مدد دینے کے لیے ایک ہزار جوان منتخب کیے اور ان کا سردار حضرت ابو عبیدؓ کو مقرر کیا۔ بعض لوگوں نے حضرت عمر فاروقؓ کو مشورہ دیا کہ اس لشکر کا سردار کسی صحابی کو مقرر کیا جائے، لیکن امیرالمومنینؓ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "ابو عبید نے جہاد کی دعوت قبول کرنے میں سبقت کی اس لیے اپنے آپ کو اس فوج کی قیادت کا مستحق بنالیا۔" تاہم آپؓ نے حضرت ابو عُبَیدؓ کو نصیحت کی کہ تمہارے لشکر میں بہت سے صحابہؓ بھی شامل ہیں، ہر حال میں ان کا ادب ملحوظ رکھنا اور تمام معاملات میں انہیں مشورے میں شریک رکھنا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت مثنیٰؓ کو ہدایت کی کہ تم فوراً عراق روانہ ہو جاؤ، امدادی لشکر ضروری تیاری کے بعد بہت جلد تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ جب تک یہ لشکر نہ پہنچے لڑائی کا آغاز نہ کرنا۔

حضرت مثنیٰؓ عراق پہنچے تو سارے ایران کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ پایا۔ انہوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ کمک پہنچنے تک اپنی فوج کو حیرہ سے ہٹا کر خفان لے آئیں جہاں ایرانی پشت کی طرف سے حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ ایک ماہ بعد حضرت ابو عبیدؓ بھی خفان میں ان سے آملے۔ حضرت ابو عُبَیدؓ کا لشکر اب کم و بیش دس ہزار جوانوں پر مشتمل تھا، کیونکہ راستے میں کئی عرب قبائل جہاد میں شرکت کا شرف حاصل کرنے کے لیے ان کے ہمراہ ہو لیے تھے۔

اُدھر پوران دخت ملکۂ ایران نے رستم بن فرخ زاد کو ایران کا وزیر اعظم مقرر کر کے اسے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ رستم ایک جنگجو اور صاحب تدبیر شخص تھا۔ اس نے ایران کی عسکری قوت کو نئے سخطوط پر منظم کیا اور تمام سرحدی اضلاع میں مسلمانوں کے خلاف بغاوت کرادی۔ اس کے بعد اس نے دو زبردست لشکر جابان (جاپان) اور شہزادہ نرسی کی ماتحتی میں مسلمانوں کے مقابلے کے لیے روانہ کیے۔ جابان عراق کا ایک

نامور رئیس تھا اور عربوں سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ نرسی ایران کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اپنی جنگی صلاحیتوں کی بنا پر بڑی شہرت رکھتا تھا۔ یہ دونوں افسر مختلف راستوں سے مسلمانوں کی طرف روانہ ہوئے۔ جابان نے حیرہ اور قادسیہ کے درمیان نمارق کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ حضرت ابو عُبیدؓ کو بھی ایرانی لشکر کی پیشقدمی کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ لڑائی کے لیے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ جابان نمارق سے آگے بڑھتا، حضرت ابو عُبیدؓ خفان سے نکل کر اس کے مقابل ہوئے۔ دونوں لشکروں میں گھمسان کا رن پڑا اور کسی فریق نے بھی جان توڑ کر لڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن بالآخر مسلمانوں کے اُبلتے ہوئے جوش کے سامنے ایرانی مات کھا گئے اور سخت بدحواسی کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ جابان اور ایرانی فوج کا ایک نامور افسر مردان شاہ مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ مردان شاہ کو تو اس کے گرفتار کرنے والے مسلمان نے قتل کر دیا، لیکن جابان اس حیلے سے بچ گیا کہ جس مجاہد نے اس کو گرفتار کیا تھا وہ اس کو پہچانتا نہ تھا۔ جابان نے اس سے کہا کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، تمہارے کیا کام آؤں گا، مجھ کو چھوڑ دو تو میں تمہیں دو جوان غلام دے دوں گا۔ اس مجاہد نے جابان کی بات منظور کر لی اور اس کو امان دے دی۔ پھر وہ اس کو ابو عُبیدؓ کے پاس لے گیا اور جو بات جابان کے ساتھ طے کی ان کے سامنے بھی اس کو پختہ کر دیا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگوں نے جابان کو پہچان لیا اور انہوں نے غل مچا دیا کہ یہ ایرانی فوج کا سالار ہے، اس کو کسی حالت میں بچ کر نہیں جانا چاہیے۔ لیکن حضرت ابو عُبیدؓ نے للکار کر کہا: "اسلام میں بدعہدی جائز نہیں۔ ایک مسلمان جابان کو امان دے چکا ہے اب اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔" تمام مسلمان خاموش ہو گئے اور جابان کو رہا کر دیا گیا۔

حکیم الاُمّت علامہ محمد اقبالؒ نے اس ایمان افروز واقعہ کو ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

شد اسیرِ مسلمے اندر نبرد — قائدے از قائدانِ یزدجرد
گبر باراں دیدہ و عیار بود — حیلہ جُو و پُرفن و مکار بود
از مقامِ خود خبردارش نہ کرد — ہم ز نامِ خود خبردارش نہ کرد

گفت می خواہم کہ جاں بخشی مرا
چوں مسلماناں اماں بخشی مرا

کرد مسلم تیغ را اندر نیام
گفت "خونت ریختن بر من حرام"

چوں درفش کاویانی چاک شد!
آتشِ اولادِ ساساں خاک شد!

آشکارا شد کہ جابان است او
میرِ سر بازانِ ایران است او

قتلِ او از میرِ عسکر خواستند
از فریبِ او سخن آراستند

بو عُبیدؓ آں سیّدِ فوجِ حجاز
در وغا عزمش ز لشکر بے نیاز

گفت اے یاراں! مسلمانیم ما
تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما

نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است

ہر یکے از ما امینِ ملت است
صلح و کینش صلح و کینِ ملت است

ملت از گردد اساسِ جانِ فرد
عہدِ ملت می شود پیمانِ فرد

گرچہ جابان دشمنِ ما بودہ است
مسلمے او را اماں بخشودہ است

خونِ او، اے معشرِ خیرالانام!
بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام

ترجمہ و مفہوم : ایک لڑائی میں یزدجرد کے سپہ سالاروں میں سے ایک کسی مسلمان کے ہاتھ قید ہو گیا۔ یہ مجوسی بہت جہاندیدہ، عیّار، حیلہ ساز، مکّار اور چالباز تھا۔ اس نے مسلمان سپاہی کو نہ اپنا نام بتایا اور نہ اپنے مرتبے سے آگاہ کیا۔ بولا، میں چاہتا ہوں کہ تو میری جان بخش دے اور مسلمانوں کی طرح امان دے دے۔ مسلمان سپاہی نے اپنی تلوار میان میں ڈال لی اور کہا کہ تیرا خون بہانا مجھ پر حرام ہے۔ بعد میں جب ایرانی پرچم چاک ہوا اور ساسانیوں کی آگ مٹی میں مل گئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایرانی جانبازوں کا سردار جابان ہے۔ لوگوں نے اس کے فریب کا حال اپنے سپہ سالار کو بتایا اور ان سے اس کے قتل کی اجازت مانگی۔ ابو عُبیدؓ جو اسلامی لشکر کے سپہ سالار تھے اور میدانِ جنگ میں جن کا عزم لشکر سے بے نیاز تھا، بولے، ”اے دوستو! ہم مسلمان ہیں ہم ایک

ہی بربط کے تار اور صدا ہیں۔ بلالؓ اور قنبرؓ کے حلق سے جو نعرہ بلند ہو ہمارے نزدیک وہ حضرت علیؓ اور حضرت ابوذرؓ کا نعرہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک ملت کا امانت دار ہے اور اس کی صلح یا جنگ ملت کی صلح یا جنگ ہے۔ ملت میں ہر فرد کا وجود بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور ایک فرد کا عہد پیمان پوری ملت کا عہد و پیمان بن جاتا ہے۔ اگرچہ جابان ہمارا دشمن ہے لیکن ایک مسلمان نے اس کو امان دے دی ہے اس لیے اے خیر الانامؐ کی امت کے لوگو! اس کا خون اب مسلمانوں کی تلواروں پر حرام ہو چکا ہے۔"

(۳)

نمارق کی فتح کے بعد حضرت ابو عبیدؓ کسکر کی طرف بڑھے جہاں شہزادہ نرسی تیس ہزار فوج کے ساتھ خیمہ زن تھا۔ جابان کی بچی کھچی فوج بھی کسکر آکر اس لشکر میں شامل ہو گئی تھی۔ ادھر رستم کو جابان کی شکست کی خبر ملی تو اس نے شہزادہ نرسی کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے ایک امدادی لشکر جالینوس نامی ایک ایرانی سردار کی سرکردگی میں کسکر کی طرف روانہ کر دیا۔ شہزادہ نرسی ابھی اس امدادی لشکر کے پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا کہ ابو عبیدؓ دریائے فرات عبور کر کے اس کے سر پر جا پہنچے۔ کسکر کے قریب سقاطیہ کے مقام پر دونوں فوجوں میں ہولناک جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، لیکن مسلمانوں کے تیز و تند حملوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ جلد ہی میدانِ جنگ سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد مسلمان جالینوس کی طرف بڑھے جو بارسما (یا باقیشیا) میں مقیم تھا۔ انہوں نے ایک ہی حملے میں اسے بھی بھاگنے پر مجبور کر دیا اور اس نے مدائن پہنچ کر دم لیا۔ اب حضرت ابو عبیدؓ نے سقاطیہ کو مرکز بنایا اور حضرت مثنیٰؓ اور فوج کے کئی دوسرے افسروں کو چھوٹے چھوٹے دستے دے کر عراق عرب کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔ انہوں نے چند دن کے اندر اندر تمام باغی قبائل کو زیر کر لیا اور ایرانیوں پر اپنی دھاک بٹھا دی۔

طبری کا بیان ہے کہ سقاطیہ کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ بے شمار مالِ غنیمت

آیا۔ اس میں کھانے پینے کی اشیاء بہت کثیر مقدار میں تھیں۔ ان میں کھجور کی ایک خاص قسم نرسیان بھی تھی۔ یہ بے انتہا لذیذ تھی اور اس میں ایک عجیب مہک تھی۔ ایرانی حکمرانوں نے اسے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ حضرت ابو عُبَیدؓ نے یہ کھجوریں نہ صرف مسلمانوں میں تقسیم کیں بلکہ عراق کے غریب کسانوں کو بھی کھلائیں اور ان کا خمس مدینہ منورہ بھی بھیجا۔ انہیں بھیجتے وقت حضرت ابو عُبَیدؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو ایک خط روانہ کیا جس میں یہ الفاظ تحریر کیے:

"اللہ تعالےٰ نے ہمیں یہاں نہایت مرغوب غذائیں عطا فرمائی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی ان سے لذت اندوز ہوں اور اللہ کے فضل و انعام کو یاد کریں۔"

حضرت ابو عُبَیدؓ کے قیامِ سقاطیہ کے دوران میں ایک دن بار سماء اور زوابی کے ایرانی رئیسوں فرخ اور فراوندار نے اظہارِ خلوص کے لیے نہایت پرتکلف کھانے پکوائے اور انہیں لے کر حضرت ابو عُبَیدؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یہ ہماری طرف سے آپ کی دعوت ہے۔ حضرت ابو عُبَیدؓ نے پوچھا، کیا ہماری تمام فوج کے لیے ایسے ہی کھانوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، نہیں یہ صرف آپ کے لیے ہیں۔ جلدی میں ہم سارے لشکر کے لیے اہتمام نہیں کر سکے۔

حضرت ابو عُبَیدؓ نے ان کی دعوت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا:
"مسلمانوں کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں، تف ہے ابو عُبَیدؓ پر کہ وہ اکیلے اکیلے یہ کھانے کھائے اور دوسرے مسلمانوں کو نہ پوچھے۔ خدا کی قسم جب تک سارے مسلمانوں کے لیے ایسے کھانے مہیا نہ ہوں گے میں ان کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔" چنانچہ جب تک سارے اسلامی لشکر کے لیے اسی قسم کے کھانوں کا انتظام نہ ہو گیا، حضرت ابو عُبَیدؓ نے ان کھانوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

(۴)

ایران کے وزیرِ اعظم رستم نے نرسی اور جالینوس کی شکست کی خبر سنی تو وہ فرطِ غضب

سے دیوانہ ہو گیا۔ اب اس نے اپنے ایک نہایت جہاندیدہ اور نامور افسر ذوالحاجب بہمن جادویہ کو بھاری لشکر دے کر اس شان سے روانہ کیا کہ ایران کا قومی جھنڈا "درفش کاویانی" اس کے سر پر لہراتا تھا اور تین سو کوہ پیکر جنگی ہاتھی اس کی فوج کے آگے آگے چل رہے تھے جن کے پاؤں کی دھمک سے زمین ہل رہی تھی۔ یہ لشکر دریائے فرات کے کنارے ایک مقام "قس الناطف" میں خیمہ زن ہوا۔ ادھر سے حضرت ابو عُبَیدؓ کسکر سے چل کر فرات کے دوسرے کنارے پر واقع ایک مقام مروحہ میں مقیم ہوئے۔ بہمن جادویہ نے انہیں پیغام بھیجا کہ تم اس پار اتر آؤ گے یا ہم آئیں؟ حضرت مثنیٰؓ، حضرت سلیطؓ اور دوسرے صائب الرائے مسلمانوں نے مشورہ دیا کہ ایرانی فوج کو اس طرف بلانا چاہیے، لیکن ابو عُبَیدؓ جو نشۂ شجاعت سے سرشار تھے، سمجھے کہ یہ بزدلی کی دلیل ہے۔ انہوں نے اپنے لشکر کے سرداروں سے کہا، ایرانی ہم سے زیادہ موت پر دلیر نہیں ہیں، دریا ہم عبور کریں گے۔ بہمن جادویہ کے قاصد نے جب دورانِ گفتگو میں کہا کہ ہمارے لشکر میں عام خیال ہے کہ عرب مردِ میدان نہیں ہیں تو حضرت ابو عُبَیدؓ کو اور بھی جوش آ گیا اور انہوں نے اسی وقت فوج کو کمر بندی کا حکم دے دیا۔ حضرت مثنیٰؓ کو حضرت ابو عُبَیدؓ کے اس طرزِ عمل سے سخت اختلاف تھا، لیکن اطاعتِ امیر سے انحراف ان کا شیوہ نہ تھا۔ بس اتنا کہہ خاموش ہو گئے کہ دریا کے پار جا کر لڑنے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہے، مگر ہم بہرحال امیر کے پیچھے چلیں گے۔

مسلمانوں نے کشتیوں کا پُل باندھ کر دریا عبور کیا تو انہوں نے اپنے اور ایرانی لشکر کے درمیان بہت کم فاصلہ پایا۔ پھر یہ تنگ میدان ناہموار بھی تھا اس لیے مسلمان اپنی صف بندی مناسب طریقے سے نہ کر سکے۔ مقابلہ شروع ہُوا تو ایرانیوں نے پہلے اپنے جنگی ہاتھی آگے بڑھائے۔ مسلمانوں کے گھوڑے ان کی مہیب صورتیں دیکھ کر بدکنے لگے۔ حضرت ابو عُبَیدؓ اور ان کے ساتھ کئی دوسرے جانباز اپنے گھوڑوں سے کود پڑے اور تلواریں سونت کر ہاتھیوں پر ہلہ بول دیا۔ وحشی ہاتھیوں نے بہت سے مسلمانوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا۔ حضرت ابو عُبَیدؓ بڑھ بڑھ کر ان کی سونڈوں پر وار کرتے اور اپنے

ساتھیوں کی ہمت بندھاتے تھے۔ ان کی بے پناہ جرأت دیکھ کر دوسرے مسلمان بھی دیوانہ وار ہاتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ عین اس وقت ایک مہیب سفید ہاتھی حضرت ابوعُبَیدؓ پر حملہ آور ہوا۔۔۔ انہوں نے اپنی تلوار کے ایک بھرپور وار سے اس کی سونڈ مستک سے الگ کر دی۔ لیکن ہاتھی نے بھی آگے بڑھ کر اسلام کے اس شیر دل فرزند کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل ڈالا۔ حضرت ابوعُبَیدؓ کی شہادت کے بعد ان کے بھائی حکمؓ بن مسعود ثقفی نے پرچم اپنے ہاتھ میں لے لیا، لیکن ایک ہاتھی نے انہیں بھی شہید کر دیا۔ غرض قبیلہ ثقیف کے چھ بہادر اسی طرح عَلَم سنبھال کر آگے بڑھے اور شہید ہو گئے۔

آخر مثنیٰؓ بن حارثہ نے عَلَم سنبھالا اور لوگوں کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھانے کی کوشش کی، لیکن ہاتھیوں کے خوفناک ریلے سے مسلمانوں کی صفیں لوٹ چکی تھیں اور وہ بے تحاشا پیچھے ہٹ رہے تھے۔ ایک مجاہد عبداللہ بن مرثد ثقفی نے غیرت کھا کر دریا کا پُل توڑ دیا اور مسلمانوں کو للکار کر کہا:

"لوگو! ابوعُبَیدؓ کے نقشِ قدم پر چل کر جان دے دو یا دشمن پر فتح حاصل کرو۔"

عبداللہ کے اس جذباتی فعل سے مسلمانوں کو اور بھی نقصان پہنچا اور ان کی کثیر تعداد بدحواسی کے عالم میں پیچھے ہٹتی ہوئی غرقِ آب ہو گئی۔ اس وقت مثنیٰؓ کچھ دوسرے سرفروشوں کو ساتھ لے کر ایرانیوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو دوبارہ پُل تیار کرنے کی ہدایت کی اور بھاگنے والوں کو پکار کر کہا:

"لوگو! گھبراؤ نہیں، میں ہوں مثنیٰ بن حارثہ، دشمن میری لاش پر سے ہی گزر کر تمہاری طرف آ سکتا ہے۔ تم اطمینان سے پُل عبور کرو۔"

اسی اثنا میں مثنیٰؓ پر کسی ایرانی نے نیزے کا وار کیا جو ان کی زرہ پر لگا اور اس کی ایک کڑی اُن کے جسم میں پیوست ہو گئی، لیکن ان کے قدم لمحہ بھر کے لیے بھی نہ ڈگمگائے اور وہ اس وقت تک میدان میں کوہِ استقلال بن کر ڈٹے رہے جب تک کہ پُل دوبارہ تیار نہ ہو گیا اب وہ باقی فوج کو ساتھ لے کر نہایت منظم طریقے سے دریا کی دوسری طرف اتر گئے۔

یہ افسوسناک واقعہ تاریخ میں "معرکۂ جسر" یا "پُل کی لڑائی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں تقریباً چھ ہزار مسلمانوں نے جامِ شہادت پیا، تاہم بہمن جادویہ کو مسلمانوں کا تعاقب کرنے کی ہمت نہ پڑی اور وہ اپنی فوج کو لے کر اسی مقام سے واپس مدائن چلا گیا۔

علامہ بلاذری کے بیان کے مطابق واقعۂ جسر رمضان ۱۳ھ میں پیش آیا۔ اگلے ہی سال رمضان ۱۴ھ میں حضرت مثنیٰؓ بن حارثہ نے بویب کے مقام پر ایرانیوں کو زبردست شکست دے کر معرکۂ جسر کا بدلہ لے لیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ معرکۂ بویب میں ایک لاکھ ایرانی مقتولوں کے مقابلے میں صرف ایک سو مسلمان شہید ہوئے۔

معرکۂ جسر میں بلاشبہ حضرت ابو عُبیدؓ سے تدبیر کی غلطی ہوئی اور اسی کے نتیجے میں انہیں اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑا۔ تاہم انہوں نے اپنی شجاعت، استقامت، بے خوفی اور حسنِ کردار کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر مرتسم کیے وہ ان کے نام کو ابدالآباد تک زندہ رکھیں گے۔

حضرت ابو عُبیدؓ کی ازدواج و اولاد کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ اُن کے بیٹے مختار نے سیدنا حسینؓ اور دوسرے شہدائے کربلا کے بیشتر قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا اور اسی بنا پر تاریخ میں بڑی شہرت حاصل کی۔

حضرت سعید بن مُسیب رحمہ اللہ

(رئیس التابعین)

(۱)

حضرت سعیدؒ بن المُسَیبؒ اُس مقدس جماعت کے گل سر سبد ہیں جو علم و عمل میں سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرامؓ کا عکس و پرتو تھی۔ یہی وہ جماعت تھی جس نے ہادیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کی علمی اور اخلاقی وراثت کو سارے عالم میں پھیلایا، ہماری مراد تابعین عظامؒ سے ہے۔ یوں تو ہر اس شخص کو تابعی کہا جاسکتا ہے جس نے کسی ایک صحابیؓ یا ایک سے زیادہ صحابہ کرامؓ کا فیض صحبت اٹھایا ہو لیکن اہل سیر نے خالص دینی نقطۂ نگاہ سے صرف انہی اصحاب کو تابعین میں شمار کیا ہے جو علم و فضل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی صحابہ کرامؓ کا نمونہ تھے۔ تابعین عظامؒ کی جماعت میں سات بزرگوں کو خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ "فقہاءِ سبعہ" کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

حضرت سعیدؒ بن المُسَیبؒ، حضرت عروہؒ بن زبیرؓ، حضرت خارجہ بن زیدؒ، حضرت عبید اللہ بن عبد اللہؒ، حضرت قاسمؒ بن محمد بن ابوبکر صدیقؓ، حضرت ابوبکر بن عبد الرحمٰنؒ، حضرت سلیمان بن یسارؒ

یہ وہ عظیم المرتبت شخصیتیں ہیں جن کو علم و عمل کے اعتبار سے سارے عالم اسلام نے امام و مقتدیٰ تسلیم کیا اور جن کے ارشادات و فتاویٰ کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا۔ "فقہاءِ سبعہ" میں حضرت سعید بن مُسَیبؒ کو اتنا بلند مقام حاصل ہوا کہ سب نے انہیں بالاتفاق "رئیس التابعین" قرار دیا اور "فقیہ الفقہاء"

کے معزز لقب کا تاج ان کے سر پر رکھا۔

حضرت سعیدؒ بن مُسیّبؓ، سیّدنا حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت کے تیسرے یا چوتھے سال مدینہ منوّرہ میں پیدا ہوئے۔ کنیت ابو محمد تھی اور قریش کے خاندان بنو مخزوم سے تعلق تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

سعیدؒ بن مُسیّبؓ بن حزنؓ بن ابی وہب بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن کعب بن لُوَیّ بن غالب۔

والدہ اُمّ سعید، قبیلہ اسلم سے تھیں۔

حضرت سعیدؒ کے والد اور دادا دونوں کو شرفِ صحابیت حاصل تھا۔ والد حضرت مُسیّبؓ کو بیعت رضوان کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ اُن سے سات احادیث مروی ہیں۔ دادا حُزنؓ بن ابی وہب فتح مکّہ کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بارگاہِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟ عرض کیا، حُزن ــــــ چونکہ حُزن کے معنی غم کے ہیں حضورؐ نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ نام بدل کر سہل (یا بروایتِ دیگر سہیل) رکھ لو۔ حضرت حزنؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ یہ نام میرے والدین کا رکھا ہوا ہے اور لوگ سالہا سال سے مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں اس لیے یہی رہنے دیں۔ حضورؐ نے انہیں اپنا نام برقرار رکھنے کی اجازت دے دی۔ ابن سعدؒ نے حضرت سعیدؒ سے یہ قول منسوب کیا ہے کہ (شاید اس نام اور واقعہ کی وجہ سے) ہمارے گھر میں ہمیشہ غمگینی چھائی رہی۔ حافظ ابنِ حجرؒ کا بیان ہے کہ حضرت حُزنؓ جنگِ یمامہ (سلاھ) میں بھی شریک ہوئے۔

۲

حضرت سعیدؒ اس وقت پیدا ہوئے جب رسالت کا مقدس اور پُر بہار عہد گزر چکا تھا تاہم حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کرنے والے اکثر صحابۂ کبارؓ ابھی حیات تھے۔ اس طرح حضرت سعیدؒ کو بہت سے جلیل القدر صحابہ کرامؓ و صحابیاتؓ سے کسبِ فیض کا موقع مل گیا۔ ان میں سے کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرت عمر فاروق رضؓ، حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ، حضرت ابو ذر غفاری رضؓ، حضرت ابو ہریرہ رضؓ، حضرت جبیرؓ بن مطعم، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص، حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ، حضرت مسورؓ بن مخرمہ، حضرت حکیمؓ بن حزام، حضرت ابو سعید خدری، حضرت زید رضؓ بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ، حضرت عثمانؓ بن ابی العاص، حضرت عتابؓ بن اسید، حضرت معمرؓ بن عبداللہ، حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان رضؓ، حضرت ابو قتادہ رضؓ، حضرت ابو درداء رضؓ، حضرت حسانؓ بن ثابت، حضرت مسیبؓ بن حزنؓ (والد)۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ، اُمّ المؤمنین حضرت اُمِ سلمہ رضؓ، حضرت اسماءؓ بنت عمیس، حضرت اُمِ سُلیم رضؓ، حضرت خولہ رضؓ بنت حکیم، حضرت فاطمہ رضؓ بنت قیس۔

صحابۂ کبار کے علاوہ حضرت سعیدؒ نے بعض تابعین سے بھی اکتساب فیض کیا۔ نہیں حصولِ علم کا بے پناہ شوق تھا اس لیے اس راہ میں دن رات ایک کر دیئے اور مدینہ منورہ سے نکل کر بھی تحصیلِ علم سے گریز نہیں کیا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" میں لکھا ہے کہ حضرت سعیدؒ نے ایک ایک حدیث کی طلب میں کئی بار دور دراز کا سفر کیا اور سفر کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ان کی طلبِ صادق کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال کے اندر اندر وہ علم و فضل کا مجمع البحرین بن گئے اور اہلِ علم نے انہیں رئیس التابعین اور فقیہ الفقہاء تسلیم کیا۔ ان کے علم و فضل کو دیکھ کر فقیہ الامت حضرت عبداللہ رضؓ بن عمر رضؓ اپنے تلامذہ سے فرمایا کرتے تھے:

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سعیدؒ بن مسیبؓ کو دیکھتے تو خوش ہوتے"

ابن خلکانؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمر رضؓ، حضرت سعیدؒ بن مسیبؒ کو ایک نادرۂ روزگار عالم کہا کرتے تھے

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ حضرت سعیدؒ بن مسیّبؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فیصلوں کے سب سے بڑے عالم تھے۔

امام نوویؒ کہتے ہیں کہ حضرت سعیدؒ بن مسیّبؒ کی امامت، جلالتِ علمی اور تمام اعمالِ خیر میں اپنے معاصرین پر ان کے تفوّق پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے انہیں امام، شیخ الاسلام اور اجلّ تابعی کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ابن عماد حنبلیؒ کا بیان ہے کہ حضرت سعیدؒ بن مسیّب کی ذات حدیث، تفسیر، فقہ، زہد و تقویٰ اور حلیہ علمی اور عملی کمالات کی جامع تھی۔

حضرت قتادہؓ، امام مکحولؒ اور امام ابنِ شہاب زہریؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے سعیدؒ بن مسیّبؓ سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

میمون بن مہرانؒ کا بیان ہے کہ میں جب مدینہ گیا اور وہاں کے سب سے بڑے عالم کو پوچھا تو لوگوں نے سعید بن مسیّبؒ کے گھر پہنچا دیا۔

سلیمان بن موسیٰؒ کا قول ہے کہ سعید بن مسیّب افقہ التابعین تھے۔

حدیث اور فقہ حضرت سعیدؒ کے خاص فن تھے۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو بات ایک مرتبہ سن لیتے تھے اسے ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ میں نے جو کچھ اپنے دل کے سپرد کیا اس نے اس میں کبھی میری خیانت نہیں کی۔ حضرت ابوہریرہؓ ان کے خسر تھے۔ اس نسبت سے وہ سب سے بڑھ کر ان سے فیض یاب ہوئے تھے چنانچہ ان کی مرویات کا بڑا حصہ حضرت ابوہریرہؓ ہی کی احادیث پر مشتمل ہے۔ ان کے تمام معاصرین ان کے کمالِ حفظِ حدیث کے معترف تھے اور ان کی مرویات کو بہت وقیع اور مستند سمجھتے تھے۔

فقہ میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ مدینہ منوّرہ کے شہرۂ آفاق فقہاء سبعہ کے رئیس سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اکابر صحابہؓ کی موجودگی میں فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ مختلف مسائل میں فتویٰ طلب کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ بڑے بڑے علماء و اکابر تابعین بھی مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی ان کے پاس جانے کی تلقین کرتے تھے۔ حضرت قتادہؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سعیدؒ بن مسیّبؓ سے زیادہ حلال اور حرام کا جاننے والا نہیں دیکھا۔

حضرت حسن بصریؒ جیسے بزرگ بھی مشکل مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نزدیک ان کی یہ قدر و منزلت تھی کہ ان سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مدینہ منورہ کا ہر عالم اپنا علم لے کر خود میرے پاس آیا لیکن سعیدؒ بن مُسیّبؒ کا علم میرے پاس لایا جاتا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ جس زمانے میں مدینہ کے گورنر تھے، حضرت سعیدؒ کو اپنے پاس بلانا ان کی شانِ علمی کے خلاف سمجھتے تھے اور ہمیشہ کوئی قاصد بھیج کر ان سے مسئلہ دریافت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کا قاصد غلطی سے حضرت سعیدؒ کو ان کے پاس لے گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ انہیں دیکھتے ہی معذرت کرنے لگے کہ میرے قاصد نے غلطی سے آپ کو یہاں تشریف لانے کی زحمت دی۔ میں نے تو صرف آپ سے مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا تھا۔

حضرت سعید بن مُسیّبؒ کے شاگردوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

حضرت سالمؒ بن عبداللہ بن عمرؓ، امام زہریؒ، امام قتادہؒ، امام محمد باقرؒ، امام یحییٰ بن سعید انصاریؒ، شعبہؒ، ابنِ منکدرؒ، عمرو بن مرہؒ، عبدالحمید بن جبیرؒ، داؤد بن ابی ہندؒ، عبدالخالق بن سلمہؒ، ہاشم بن ہاشمؓ بن عتبہ

(۳)

حضرت سعیدؒ جملہ دینی علوم میں درجۂ تبحر رکھنے کے علاوہ شعر و سخن کا بھی بڑا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ خود تو شعر نہیں کہتے تھے لیکن شعر سننا پسند کرتے تھے۔

تعبیرِ رؤیا میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ بقول ابن سعدؒ یہ فن انہوں نے جلیل القدر صحابیہ حضرت اسماءؓ بنتِ ابوبکر صدیقؓ سے سیکھا تھا اور حضرت اسماءؓ نے اسے اپنے والدِ بزرگوار سے حاصل کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ابنِ سعدؒ نے بہت

سے واقعات بیان کیے ہیں جن سے تعبیرِ رویاء میں حضرت سعیدؒ کی مہارت اور بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے چند واقعات یہ ہیں:

ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں سایہ میں بیٹھا ہوں، پھر بعض لوگ مجھے زبردستی دھوپ میں لے گئے لیکن میں موقع پاکر بھاگ نکلا اور دوبارہ سایہ میں آبیٹھا۔ حضرت سعیدؒ نے فرمایا، تم کسی دن کفر پر مجبور کیے جاؤ گے لیکن پھر اسلام کے دامن میں پناہ لو گے۔ کچھ عرصہ بعد یہ شخص ایک جنگ میں کافروں کے ہاتھ قید ہو گیا۔ انہوں نے اسے زبردستی کافر بنالیا لیکن وہ موقع پاکر قید سے بھاگ نکلا اور کفر پر تین حرف بھیج کر مدینہ منوّرہ واپس آگیا۔

ایک شخص نے اپنا خواب بیان کیا کہ ایک نر بکرا ثنیۃ الوداع سے بھاگا آرہا ہے اور کہہ رہا ہے ذبح کرو ذبح کرو، ایک آواز آئی ذبح کر دیا ہے۔ حضرت سعیدؒ نے فرمایا، سمجھ لو کہ ابن صلاء مرگیا۔ اس پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ابن صلار کی موت کی خبر موصول ہوئی۔ ابن صلاء اہلِ مدینہ کے غلاموں میں سے تھا۔ وہ حکام کے پاس لوگوں کی چغلیاں کھایا کرتا تھا اور انہیں پریشان کیا کرتا تھا۔

حصین بن عبید اللہؒ بے اولاد تھے۔ ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کی گود میں ایک انڈا پڑا ہے۔ اپنا یہ خواب حضرت سعیدؒ کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے کہا، یہ انڈا عجمی مرغی کا ہے تم کسی عجمی عورت سے شادی کرو اللہ تمہیں اس سے اولاد دے گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اللہ نے انہیں ایک لڑکا عطا کیا۔

جس زمانے میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور عبد الملک کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، ایک شخص نے حضرت سعیدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں نے خواب میں عبد الملک کو منہ کے بل گرا کر اس کی پیٹھ میں چار میخیں گاڑ دی ہیں۔

حضرت سعیدؒ نے فرمایا، یہ خواب تم نے نہیں دیکھا۔ اس نے کہا میں نے ہی دیکھا ہے۔ حضرت سعیدؒ نے فرمایا، اگر تم سچ نہیں بتاتے تو میں اس کی تعبیر نہیں بتاؤں گا۔

اس شخص نے اقرار کیا کہ میں نے نہیں بلکہ یہ خواب عبد اللہ بن زبیرؓ نے دیکھا ہے اور مجھے

آپ کے پاس اس کی تعبیر پوچھنے کے لیے بھیجا ہے۔ فرمایا اگر تم نے ان کا خواب صحیح بیان کیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ عبدالملک، ابن زبیرؓ کو قتل کر دے گا اور اس کی صلب سے چار خلیفے پیدا ہوں گے۔

ایک اور شخص نے خواب دیکھا کہ عبدالملک نے چار مرتبہ مسجدِ نبوی کے سامنے پیشاب کیا ہے۔ اس نے حضرت سعیدؒ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ عبدالملک کی پشت سے چار خلیفے پیدا ہوں گے۔

ان دونوں خوابوں کی تعبیر بالکل درست نکلی۔ عبداللہ بن زبیرؓ عبدالملک کی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے اور عبدالملک کے چار لڑکے ولید، سلیمان ہشام اور یزید ثانی خلیفہ ہوئے۔

ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اپنے ہاتھ میں پیشاب کر رہا ہوں۔ حضرت سعیدؒ نے اس کی یہ تعبیر دی کہ تمہارے نکاح میں کوئی ایسی عورت ہے جس سے تمہارا نکاح ناجائز ہے۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ واقعی اس کے نکاح میں ایسی عورت تھی جو دودھ شریک ہونے کی وجہ سے اس پر حرام تھی۔

ایک آدمی نے حضرت سعیدؒ کو بتایا کہ میں نے خواب میں اپنے آپ کو آگ میں گھستے دیکھا ہے۔ انہوں نے فرمایا تم سمندری سفر کرو گے اور تمہاری موت قتل کے ذریعہ سے ہوگی۔ عبدالرحمٰن بن سائبؒ کا بیان ہے کہ یہ تعبیر بالکل صحیح نکلی۔ اس شخص نے سمندر کا سفر کیا جس کے دوران میں وہ بمشکل بچا پھر قدید کی لڑائی میں قتل ہوا۔

شریک بن نمیر نے خواب میں دیکھا کہ اس کے دانت اس کے ہاتھوں میں گر گئے ہیں۔ اس نے حضرت سعیدؒ سے اس کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ تم اپنے خاندان کے اپنے ہم عمر لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کرو گے۔

ایک شخص نے پوچھا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک کبوتری مسجد کے منارہ پر آکر بیٹھ گئی۔ حضرت سعیدؒ نے فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ (بصرہ کا گورنر) حجاج بن یوسف، عبداللہ بن جعفرؓ کی بیٹی سے شادی کرے گا۔ اور واقعی کچھ عرصہ

بعد ہی ہوا۔
فرمایا کرتے تھے کہ خواب کی تعبیر زیادہ سے زیادہ چالیس سال تک ظاہر ہو جاتی ہے۔ پاؤں میں بیڑی دیکھنے خواب کو دین میں راسخ اور ثابت قدم ہونے کی علامت بتاتے تھے۔ خواب میں خرما تر دیکھنے کی تعبیر یہ دیتے تھے کہ رزق میں برکت ہوگی۔

(۴)

حضرت سعید بن مُسَیَّبؒ کو عبادت و ذکرِ الٰہی سے بے انتہا شغف تھا قائم اللیل اور دائم الصَّوم تھے۔ علامہ شعرانیؒ اور ابن جوزیؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے متواتر پچاس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ اس سے ان کی شب بیداری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابن سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے کہ رات کو تنہائی میں اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرماتے:

"اے ہر برائی اور بدی کے منبع اٹھ میں تجھے اس اونٹ کی طرح تھکا کے چھوڑوں گا جو بھاری بوجھ اور کثرت سفر کی وجہ سے چلنے میں لڑکھڑا جاتا ہے۔"

یہ فرما کر تہجد میں مشغول ہو جاتے اور فجر تک پڑھتے رہتے اس دوران میں کھڑے کھڑے پاؤں سوج جاتے۔ صبح کو پھر اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتے:

"تجھے یہی حکم ہے اور تو اسی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔"

نماز باجماعت کا یہ اہتمام تھا کہ باختلاف روایت چالیس یا پچاس برس تک ایک وقت کی نماز باجماعت کبھی ناغہ نہیں ہوئی۔ ہمیشہ وقت پر مسجد پہنچتے، پہلی صف میں جگہ لیتے اور تکبیرِ اولیٰ کبھی فوت نہ ہونے دیتے۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ لوگ نماز سے فارغ ہو کر واپس جا رہے ہوں اور وہ مسجد میں پہنچیں۔ واقعۂ حرّہ کے پُر آشوب زمانے میں بھی مسجد ہی میں جا کر نماز پڑھتے تھے حالانکہ اس وقت گھر سے نکلنے والے ہر شخص کو دار و گیر میں آنے کا خطرہ رہتا تھا ——— اس خیال سے کہ کہیں نماز باجماعت سے ناغہ نہ ہو جائے۔ مدینہ منوّرہ سے باہر کسی ایسے مقام پر نہ جاتے تھے جہاں نماز باجماعت

کا اہتمام نہ ہو۔

ممنوعہ دنوں کے سوا ہمیشہ روزہ سے رہتے تھے۔ حج بیت اللہ کا اس قدر شوق تھا کہ زندگی میں کم و بیش پچاس حج کیے۔ قرآن کریم کی بکثرت اور بلا ناغہ تلاوت اپنے اوپر لازم کرلی تھی یہاں تک کہ سفر میں سواری پر بھی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ زہد و ورع اور تقویٰ کی یہ کیفیت تھی کہ جس چیز کی حلت میں ذرا بھی شک ہوتا اس کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتے تھے یہاں تک کہ مسجد میں آنے والے شربت سے روزہ بھی نہیں افطار کرتے تھے بلکہ اپنے گھر سے پانی یا شربت منگوا کر پیتے تھے۔ قرآن کریم اور مسجد کی اتنی تعظیم کرتے تھے کہ ان کی تصغیر بھی گوارا نہ تھی۔ حدیث رسول ؐ کا اس قدر احترام تھا کہ علالت کی حالت میں بھی اس کو سناتے وقت اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ منہیات کے بارے میں اس قدر محتاط تھے کہ اپنی بچی کو ہاتھی دانت کی گڑیا سے کھیلنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

حضرت سعیدؒ نے کسب معاش کے لیے تجارت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ زیتون کے تیل اور جانوروں کے چارے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اس سے خاصے آسودہ حال ہو گئے تھے اور امراء و عوام کے نذرانوں اور تحائف سے بالکل بے نیاز تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے "البدایہ والنہایہ" میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

"اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے بخل و حرص کے داعیہ سے مجبور ہو کر مال جمع نہیں کیا اور نہ اسے حُبِ دنیا اور حصولِ شہوات کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس سے میری ایک غرض تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو بنو مروان کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچاؤں یہاں تک کہ تجھ سے آملوں اور تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کردے۔ دوسری یہ کہ اس سے اپنے اعزہ و اقربا کی خبر گیری کروں اور وہ سارے حقوق ادا کروں جو میرے ذمہ ہیں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس مال سے فقیروں، مسکینوں، یتیموں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کروں۔"[1]

شروع شروع میں انہیں حکومت کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا لیکن پھر انہوں نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ ان کے نام پر ایک کثیر رقم بیت المال میں جمع ہو گئی۔ انہیں بار بار اس کے لینے کے لیے بلایا گیا لیکن انہوں نے یہ رقم لینے سے صاف انکار کر دیا۔

(۵)

حضرت سعیدؒ بن مسیبؒ کی زندگی کا ایک واقعہ ایسا سبق آموز اور تحیر خیز ہے کہ تاریخ میں شاذ ہی اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ یہ واقعہ حضرت سعیدؒ کی دینداری، ایثار، ہمدردی، سادگی اور غریب پروری پر دال ہے۔ تاریخ ابن خلکان اور طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت سعیدؒ کی ایک صاحبزادی نہایت حسین و جمیل اور زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ تھی۔ خلیفہ عبدالملک نے اس لڑکی کے حسن صورت اور حسن سیرت کا حال سن کر اپنے ولی عہد کے لیے حضرت سعیدؒ سے اس کا رشتہ مانگا۔ انہوں نے کمال بے نیازی سے اس کی درخواست ٹھکرا دی۔ عبدالملک نے اس سلسلہ میں ان پر بہت دباؤ ڈالا اور سختیاں بھی کیں مگر وہ رضامند نہ ہوئے۔ اس کے برعکس انہوں نے اس گوہر گرانمایہ کا نکاح ایک نادار مگر دین دار طالب علم کے ساتھ نہایت سادگی اور بے تکلفی سے کر دیا۔

کثیر بن ابی وداعہ قریشی کا ایک معمولی اور غریب نوجوان تھا[1]، اسے حصول علم کا بہت شوق تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ حضرت سعیدؒ کی خدمت میں پابندی سے حاضر رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ چند دن غیر حاضر رہا۔ جب آیا تو حضرت سعیدؒ نے پوچھا:

"اتنے دن کہاں رہے؟"

اس نے عرض کیا، "حضرت، میری اہلیہ فوت ہو گئی تھی اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔"

حضرت سعیدؒ نے فرمایا۔ "تم نے مجھے کیوں اطلاع نہ کی کہ میں بھی اس کی تجہیز و تکفین میں

---

[1] بعض روایتوں میں اس کا نام ابی وداعہ آیا ہے۔

شریک ہوتا۔"

کثیر نے کہا، "میں نے خیال کیا کہ آپ کو کیا زحمت دوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ جانے لگا تو حضرت سعیدؒ نے پوچھا، "دوسری شادی کا کوئی انتظام ہوا ہے کہ نہیں۔"

ابن ابی وداعہ نے عرض کیا "حضرت میں ایک غریب اور نادار آدمی ہوں مجھے کون اپنی فرزندی میں قبول کرے گا۔"

حضرت سعیدؒ نے فرمایا، "اگر میں تمہیں رشتہ دے دوں تو تم راضی ہو؟"

کثیر نے کہا، "حضرت اس سے بڑھ کر میری کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔"

حضرت سعیدؒ نے اسی وقت مجلس نکاح منعقد کی۔ گواہ بلائے، خطبۂ مسنونہ پڑھا اور دو یا تین درہم پر کثیر سے اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔

کثیر کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی مگر اب اس کو یہ فکر لاحق تھی کہ رخصتی کے لیے ضروری ساز و سامان کیسے فراہم کروں گا۔ لیکن حضرت سعیدؒ نے اس مشکل کو بھی حل کر دیا۔ شام کے وقت انہوں نے اپنی صاحبزادی کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ پہلے دو رکعت نماز خود پڑھی پھر دو رکعت صاحبزادی سے پڑھوائی۔ اس کے بعد اپنی لخت جگر کو ہمراہ لے کر داماد کے گھر پہنچے۔ داماد کا بیان ہے کہ

"میں روزہ افطار کر کے اور مغرب کی نماز کے بعد کھانا کھانے بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی، میں نے پوچھا، کون؟ جواب ملا سعید۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کون سعید ہے، سعیدؒ بن مسیبؓ تو اپنے گھر اور مسجد کے سوا کہیں آتے جاتے نہیں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حضرت سعیدؒ بن مسیب کھڑے ہیں۔ میں نے عرض کیا، حضرت مجھے طلب فرمالیا ہوتا خود تشریف آوری کی زحمت کیوں فرمائی۔"

حضرت سعیدؒ نے فرمایا، نہیں میرا ہی حق آنے کا تھا، میں نے سوچا تم

نے شادی کی ہے اب تمہارا رفیقۂ حیات کے بغیر رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس لیے تمہاری اہلیہ کو تمہارے پاس چھوڑنے آیا ہوں، لو یہ تمہاری اہلیہ ہے وہ ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ پھر لڑکی کو دروازے کے اندر کر کے کواڑ بند کر دیئے اور تشریف لے گئے۔ میری بیوی شرم سے گر پڑی میں اس کو لے کر اندر لایا اور پھر چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو پکارا۔ وہ آئے تو میں نے ان کو بتایا کہ حضرت سعیدؒ بن مسیبؒ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح میرے ساتھ کر دیا ہے اور اب وہ کسی کو اطلاع دیئے بغیر اپنی صاحبزادی کو میرے گھر چھوڑ گئے ہیں وہ اس وقت میرے مکان میں بیٹھی ہے۔ اس پر ہمسایوں نے مسرت کا اظہار کیا۔——— میری والدہ کو پتہ چلا تو وہ دوڑی دوڑی آئیں اور کہنے لگیں کہ میں تین دن تک اپنی بہو کا بناؤ سنگھار کروں گی اگر اس دوران میں تم اس کے قریب گئے تو میں کبھی تمہارا منہ نہ دیکھوں گی۔ چنانچہ جب میں تین دن کے بعد اپنی بیوی سے ملا تو اسے حسن میں آفتاب حسن میں ماہتاب، علم و فضل کے زیور سے آراستہ، قرآن کی حافظ، حدیث کی عالم اور حقوق شوہری سے بڑی باخبر پایا۔ شادی کے بعد میں ایک مہینہ تک حضرت سعیدؒ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا اور نہ انہوں نے ہی میرے گھر میں قدم رنجہ فرمایا۔

پھر ایک دن میں ان کے حلقۂ درس میں حاضر ہوا اس وقت وہ حدیث پڑھانے میں مشغول تھے۔ جب درس ختم ہوا اور سب لوگ چلے گئے تو حضرت سعیدؒ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا اس اللہ کی بندی کا کیا حال ہے۔ میں نے عرض کیا، حضرت بالکل ٹھیک ہے۔ خیرخواہوں کے لیے خوشی اور معاندین کے لیے حسد اور غصے کا باعث ہے۔ فرمایا، اگر کچھ روی دیکھو تو سختی سے پیش آنا۔ میں گھر واپس آیا تو انہوں نے (اپنی پاک کمائی میں سے) بیس ہزار روپے ہمارے لیے بھیج دیئے۔"

(۶)

حضرت سعیدؒ نہایت راست باز اور حق گو تھے۔ کلمۃ الحق کہنے سے انہیں کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی تھی، نہ کسی قسم کی ترغیب و ترہیب —— اور نہ کوئی خوف اور دباؤ۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے جب مکہ معظمہ میں اپنی خلافت کا اعلان کیا تو جابر بن اسود کو مدینہ منورہ کا عامل بنایا اور اسے ہدایت کی کہ اہلِ مدینہ سے ان کی خلافت پر بیعت لے۔ دوسرے لوگوں نے تو بیعت کر لی لیکن حضرت سعیدؒ نے فرمایا کہ جب تک تمام مسلمانوں کا کسی ایک شخص پر اتفاق نہ ہو جائے میں کسی کی بیعت نہیں کروں گا۔ جابر بن اسود نے ان پر بڑا دباؤ ڈالا لیکن وہ نہ مانے۔ اس پر جابر کو طیش آگیا اور اس نے حضرت سعیدؒ کو کوڑوں سے پٹوانے کا حکم دیا۔ اسی جابر نے اپنی چوتھی بیوی کو طلاق دے کر اس کی عدت گزرنے سے پہلے ہی پانچویں شادی کر لی تھی جو شرعاً ناجائز ہے۔ حضرت سعیدؒ نے جابر کی اس حرکت کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی قرار دیا تھا، اسے اس بات کا بھی غصہ تھا۔ جب حضرت سعیدؒ کو کوڑے پڑ رہے تھے اس وقت بھی ان کی زبان اعلانِ حق میں مصروف تھی۔ وہ کہہ رہے تھے "کتاب اللہ کا حکم سنانے سے مجھے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ تو نے چوتھی بیوی کی عدت گزرنے سے پہلے پانچویں سے شادی کر کے اللہ تعالیٰ کی ایک حد سے تجاوز کیا ہے۔ میں یہ کہنے سے کبھی باز نہ آؤں گا جو تیرے دل میں آئے کر گزر لیکن یاد رکھ جلد ہی تجھ پر برا وقت آنے والا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت سعیدؒ کے مرتبہ شناس تھے۔ انہیں جابر کی حرکت کا علم ہوا تو انہوں نے اس کو ایک سخت خط لکھ کر حضرت سعیدؒ سے بدسلوکی کرنے پر سخت ملامت کی اور حکم دیا کہ ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔ کچھ عرصہ بعد حضرت ابن زبیرؓ عبدالملک کی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور جابر وغیرہ کو

حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان سے بھی حضرت سعیدؒ کو شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ عبدالملک نے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کیا اور ہشام بن اسمٰعیل والیٔ مدینہ کو حکم بھیجا کہ اہل مدینہ سے ان دونوں کی بیعت لو۔ حضرت سعیدؒ کی رائے تھی کہ ایک خلیفہ کی زندگی میں کسی اور کی بیعت درست نہیں۔ چنانچہ جب ہشام نے ان سے ولید اور سلیمان کی بیعت کا مطالبہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں عبدالملک کی زندگی میں دوسری بیعت نہیں کر سکتا۔ ہشام نے ان پر سخت دباؤ ڈالا یہاں تک کہ قتل کی دھمکی دی لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اس پر ہشام نے انہیں کوڑے لگانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی اپنے سپاہیوں کو ہدایت کی کہ ان کی تشہیر کرتے ہوئے راس الثنیہ تک لے جاؤ۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں مجرموں کو سولی دی جاتی تھی۔ حضرت سعیدؒ سولی پانے کے لیے تیار ہو گئے اور جب سپاہیوں نے ان سے کہا کہ ابو محمد قتل کا وقت قریب ہے بے ستری سے بچنے کے لیے جانگھیا پہن لیں، تو انہوں نے بخوشی جانگھیا پہن لیا۔ اس کے بعد سپاہی انہیں کوڑے مارتے راس الثنیہ کی طرف لے چلے، راستے میں ان کے ننگے بدن پر کوڑے برستے دیکھ کر ایک عورت بولی، "ہائے یہ کیسی رسوائی کی بات ہے؟" حضرت سعیدؒ نے فرمایا، "یہ رسوائی نہیں ہے، رسوائی تو آخرت کی رسوائی ہے جس سے بچنے کے لیے میں یہ ظلم سہہ رہا ہوں۔"

ہشام نے ان کے عزم و ثبات کو دیکھا تو واپس لا کر قید کرنے کا حکم دیا۔ جب انہیں قید خانے کی طرف لے جانے لگے تو فرمایا، اے حکومت کے اہل کارو، اگر مجھے اپنے قتل کیے جانے کا یقین نہ ہوتا تو میں کبھی جانگھیا نہ پہنتا —— قید خانے میں بھی انہیں کئی لوگوں کے ذریعے سمجھا بجھا کر رام کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ اپنی بات پر نہایت سختی سے قائم رہے۔

عبدالملک کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے ایک طرف ہشام کو ملامت کا

خط لکھا کہ خدا کی قسم سعید اس سلوک کے بجائے صلہ کے زیادہ مستحق ہیں وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن سے فتنہ انگیزی اور مسلمانوں کی بدخواہی کا ڈر ہو اس لیے ان کو مت ستاؤ۔ دوسری طرف اس نے اپنے ذاتی معتمد قبیصہ بن ذویب کے مشورہ پر حضرت سعیدؒ کو معذرت کا خط بھیجا جس میں لکھا کہ ہشام نے آپ کے ساتھ جو زیادتی کی ہے وہ میرے حکم اور مرضی کے بغیر کی ہے۔ حضرت سعیدؒ نے یہ خط پڑھ کر فرمایا، "بہرحال جس نے مجھ پر ظلم کیا ہے اس کے اور میرے درمیان خدا ہے وہ خوب واقف ہے۔" ہشام بھی خلیفہ کا خط پاکر سخت نادم ہوا اور حضرت سعیدؒ کو رہا کر دیا۔

حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ حضرت سعیدؒ ایک مرتبہ بازار میں بیٹھے تھے۔ اس وقت مطلب بن سائب بھی ان کے ساتھ۔ اتنے میں بنو مروان کا ایک قاصد ادھر سے گزرا۔ حضرت سعیدؒ نے اس سے پوچھا:

"تم بنی مروان کے ہرکارے ہو؟"

قاصد: "جی ہاں"

حضرت سعیدؒ: "تم نے انہیں کس حال میں چھوڑا ہے؟"

قاصد: "بہت اچھے حال میں ہیں۔"

حضرت سعیدؒ: "تم اسے اچھا حال کہتے ہو، وہ انسانوں کو بھوکا رکھتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔"

یہ سن کر قاصد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ آنکھیں نکالتا ہوا حضرت سعیدؒ کی طرف بڑھا۔ مطلب بن سائب نے سمجھا بجھا کر رخصت کیا اور حضرت سعیدؒ سے کہا۔ "خدا آپ کو معاف فرمائے آپ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہیں۔"

حضرت سعیدؒ نے فرمایا، "بیوقوف آدمی خاموش رہو۔ جب تک میں خدا کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہوں وہ مجھے ان ظالموں کے قبضے میں نہیں دے گا۔"

(۷)

حضرت سعیدؒ بن مسیبؒ کے استغناء اور حکمرانوں سے بے نیازی کی بھی عجیب

شان تھی۔ ایک مرتبہ خلیفہ عبدالملک مدینہ منورہ آیا اور اس نے حضرت سعیدؒ سے ملاقات کرنی چاہی وہ مسجدِ نبوی میں معمول کے مطابق مصروفِ عبادت تھے۔ عبدالملک نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک شخص کو بھیجا کہ حضرت سعیدؒ کو بُلا لائے۔ اس نے آکر کہا، " امیر المومنین آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور اس وقت مسجد کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ "

حضرت سعیدؒ نے فرمایا، " نہ امیر المؤمنین کو مجھ سے کوئی حاجت ہے اور نہ مجھے امیر المؤمنین سے کوئی حاجت ہے۔ اگر ان کی کوئی ضرورت ہو بھی تو وہ پوری نہیں ہو سکتی۔ "

عبدالملک نے یہ جواب سن کر دوبارہ آدمی بھیجا۔ حضرت سعیدؒ نے اس کے ساتھ جانے سے پھر انکار کر دیا۔ اس پر وہ شخص برافروختہ ہو کر بولا " آپ عجیب آدمی ہیں کہ امیر المؤمنین بار بار بُلا رہے ہیں اور آپ اس قسم کا خشک جواب دیتے ہیں۔ اگر امیر المؤمنین نے منع نہ کر دیا ہوتا تو میں آپ کا سر قلم کر کے لے جاتا۔ "

حضرت سعیدؒ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ " اگر خلیفہ کوئی بھلائی کرنا چاہتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی کہ وہ یہ بھلائی میری بجائے تمہارے ساتھ کرے اور اگر اس کا ارادہ کچھ اور ہے تو خدا کی قسم میں اپنی نشست اس وقت تک نہیں بدلوں گا جب تک وہ جو کرنا چاہتا ہے نہ کر گزرے۔ " عبدالملک نے یہ جواب سن کر صرف اتنا کہا، " خدا ابو محمد پر رحم کرے ان کی سختی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ " یہ کہہ کر حضرت سعیدؒ سے ملے بغیر چلا گیا۔

ایک اور موقع پر خلیفہ عبدالملک مدینہ منورہ آیا ہوا تھا۔ کسی سبب سے ایک رات اسے نیند نہ آتی تھی اس نے حاجب کو حکم دیا کہ مسجد میں جا کر دیکھو اگر مدینہ کا کوئی داستان گو مل جائے تو اسے ساتھ لے آؤ تاکہ ذرا جی بہلے۔ حاجب مسجدِ نبوی میں آیا، کافی رات گزر چکی تھی اور مسجد خالی تھی البتہ ایک گوشے میں حضرت سعیدؒ بن مسیبؓ ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ حاجب انہیں پہچانتا نہ تھا۔ ان

کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا لیکن حضرت سعیدؒ نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ حاجب نے اشارے سے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

حضرت سعیدؒ: "اپنی ضرورت بیان کرو، تم کیا چاہتے ہو؟"

حاجب: امیرالمؤمنین جاگ رہے ہیں اور انہیں نیند نہیں آرہی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ کسی داستان گو کو لے آؤں اس لیے میرے ساتھ چلو۔

حضرت سعیدؒ: کیا انہوں نے مجھے بلوایا ہے؟

حاجب: نہیں بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ جاکر دیکھو اگر مدینہ کا کوئی داستان گو ہو تو لے آؤ۔ میں نے دیکھا کہ تم جاگ رہے ہو اس لیے تمہیں لے چلتا ہوں۔

حضرت سعیدؒ: امیرالمؤمنین سے جاکر کہہ دو کہ میں ان کا داستان گو نہیں ہوں۔

حاجب نے عبدالملک کو جاکر بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی مسجد میں ملا تھا مگر وہ کوئی دیوانہ سا تھا میں نے اسے اپنے ساتھ آپ کی خدمت میں لانا چاہا لیکن اس نے جواب دیا کہ میں امیرالمؤمنین کا قصہ خواں نہیں ہوں۔

عبدالملک حضرت سعیدؒ کے مزاج سے واقف تھا، بولا، وہ سعیدؒ بن مسیبؒ ہیں۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

جس زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مدینہ منورہ کے گورنر تھے اور مسجدِ نبوی کی تعمیرِ نو ہو رہی تھی۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک اس کام کے معائنہ کے لیے مدینہ منورہ آیا۔ دستور کے مطابق تمام لوگوں کو مسجد سے نکال دیا گیا۔ حضرت سعیدؒ دو معمولی چادریں زیب تن کیے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے ذکر و فکر میں مشغول تھے۔ ان کو اٹھانے کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔ ایک شخص نے ادب سے عرض کیا، "امیرالمؤمنین مسجد کا معائنہ کرنے تشریف لا رہے ہیں، بہتر ہے کہ آپ بھی تھوڑی دیر کے لیے مسجد سے باہر تشریف لے جائیں۔ انہوں نے فرمایا، میرے اٹھنے کا جو وقت ہے بخدا اس سے پہلے نہیں اٹھوں گا۔"

اُس نے کہا، "اچھا نہ اٹھیے مگر کم از کم اتنا تو کیجیے گا کہ جب امیرالمؤمنین ادھر

سے گزریں تو انہیں سلام کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیے گا۔"

بولے، "خدا کی قسم میں اس کے لیے کھڑا نہیں ہو سکتا۔"

اتنے میں خلیفہ مسجد میں آگیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، ابن مسیبؒ کے مرتبہ شناس اور ان کی طبیعت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ولید کو دوسری سمتوں میں پھراتے رہے تاکہ اس کی نظر حضرت سعیدؒ پر نہ پڑے لیکن جب وہ دیوارِ قبلہ کی طرف مڑھا تو اس کی نظر حضرت سعیدؒ پر پڑ گئی۔ پوچھا، یہ شیخ کون ہیں، سعیدؒ بن مسیبؒ تو نہیں ہیں؟"

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ بولے، جی ہاں وہی ہیں۔ پھر ان کی طرف سے عذر کرنے لگے، یہ اب بہت ضعیف ہو گئے ہیں، آنکھوں سے بھی کم دکھائی دیتا ہے اگر آپ کو پہچان لیتے تو سلام کے لیے ضرور اٹھتے۔

ولید بولا، "ہاں میں ان کی حالت سے واقف ہوں، ان کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں میں خود ان کے پاس چلتا ہوں۔"

پھر وہ گھومتا گھامتا روضۂ اقدس کے پاس آیا۔ کچھ دیر وہاں ٹھہر کر حضرت سعیدؒ کے پاس پہنچا اور بولا "فرمائیے شیخ مزاج کیسے ہیں؟"

حضرت سعیدؒ نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا، "الحمد للہ بخیریت ہوں، آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

ولید نے کہا "الحمد للہ اچھا ہوں۔" یہ کہہ کر مسجد سے نکل گیا اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے کہا۔ "یہ پرانی یادگار ہیں۔"

(۸)

اخلاق و عادات میں حضرت سعیدؒ بن مسیبؒ صحابۂ کرامؓ کا نمونہ تھے۔ طبعاً بڑے نرم اور صلح پسند تھے لیکن حق بات کہنے میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفۂ وقت عبد الملک بن مروان نے ان سے کہا، ابو محمد اب میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ نہ اچھا

کام کرنے کی خوشی ہوتی ہے اور نہ کوئی بُرا کام کرنے کا رنج۔ فرمایا، تمہارا قلب بالکل مر چکا ہے۔ ان کی حق گوئی خودداری اور استغنا کے کچھ واقعات اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ اُموی حکمرانوں سے بعض وجوہ کی بنا پر اختلاف تھا لیکن سختیاں جھیلنے کے باوجود ان کے بدخواہ نہیں تھے۔ ابن سعدؒ نے ابوبکر بن عبداللہؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب ابن مُسیّبؒ سے بنوامیّہ کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ فرماتے، میں ان کے بارے میں وہی کہتا ہوں جو میرے رَبّ نے کہنے کا حکم دیا ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ——— (الحشر آیہ ۱۰)

(اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں گناہ معاف فرما اور مومنوں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ اور حسد نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار تو بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے)

لڑائی جھگڑے سے حضرت سعیدؒ کو سخت نفرت تھی۔ ان کے ایک ہمعصر عمران بن عبداللہ خزاعیؒ کا بیان ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی چادر چھیننا چاہتا تو وہ خود چادر کو اس کی طرف پھینک دیتے۔

کثرتِ عبادت میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن ایک مرتبہ جب ان کے غلام برد نے بعض آدمیوں سے عبادت میں ان کے بے پناہ انہماک کا ذکر کیا تو فرمایا:

"برد! خدا کی قسم یہ عبادت نہیں ہے۔ عبادت الٰہی کہتے ہیں امورِ الٰہی میں غور کرنے اور اس کے محارم (جن امور سے اس نے منع کیا ہے) سے بچنے کو۔"

نہایت نیک دل اور مخلوقِ خدا کے خیرخواہ تھے۔ ابن سعدؒ نے عبدالرحمٰن بن حرملہؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ایک دن میں نمازِ فجر کے لیے گھر سے نکلا تو راستے میں ایک شخص

کو شراب کے نشے میں مدہوش پایا۔ میں اسے کھینچ کر اپنے گھر لے گیا۔ اس کے بعد حضرت سعید بن مسیبؒ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا، "ایک شخص نے کسی آدمی کو شراب کے نشہ میں مدہوش پایا، اس صورت میں وہ کیا کرے، اس کو حاکم کے سامنے پیش کر کے حد جاری کرائے یا نہیں؟ حضرت سعیدؒ نے فرمایا، اگر تم اس کو اپنے کپڑے سے چھپا سکتے ہو تو چھپا لو اور اس کی عیب پوشی کرو۔" نماز سے فارغ ہو کر میں گھر واپس آیا تو وہ شرابی ہوش میں آچکا تھا مجھے دیکھ کر شرم سے نگاہیں نیچی کر لیں۔ میں نے کہا، تمہیں شرم نہیں آتی اگر آج پکڑے جاتے اور تم پر حد جاری کی جاتی تو لوگوں کی نظروں میں تمہاری کیا عزت رہ جاتی؟ تم جیتے جی مر جاتے اور تمہاری شہادت ناقابل قبول ہوتی۔

اس شخص نے کہا: "خدا کی قسم آئندہ کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا"

غرض اس پردہ پوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شخص تائب ہو گیا۔

حضرت سعیدؒ بن مسیبؓ سے بہت سے حکیمانہ اقوال منقول ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) کوئی عالم، شریف اور باکمال ایسا نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی عیب نہ ہو لیکن جس کی خوبیاں اس کی خامیوں سے زیادہ ہوں اس کی خامیوں کی تشہیر نہ کرنی چاہیے بلکہ اس کی خوبیوں کی وجہ سے درگزر کرنا چاہیے۔

(۲) دنیا کی ایسی دولت میں کوئی خیر نہیں ہے جس کو انسان اس نیت سے حاصل نہیں کرتا کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنے دین اور اپنی شرافت کو بچائے اور صلہ رحم کرے۔

(۳) مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہی مدد کافی ہے کہ وہ اپنے دشمن کو مصیبت میں مبتلا دیکھے جس سے وہ محفوظ ہے۔

(۴) ظالموں اور ان کے حامیوں کو جب بھی دیکھو تو دل میں ان سے نفرت کرو تاکہ تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں۔

(۵) بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اطاعت جیسا حصولِ عزت کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں اور اس کی نافرمانی سے بڑھ کر ذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے اعمال پر پردہ ڈالتا ہے۔ جب کسی کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے پردہ سے نکال دیتا ہے اور اس کے عیوب لوگوں کو معلوم ہو جاتے ہیں۔

(۷) دنیا ذلیل ہے اور ہر ذلیل اس کی طرف مائل ہے جو اسے ناجائز ذرائع سے حاصل کرتا ہے اور بے محل صرف کرتا ہے۔

(۸) جب انسان اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر کے دوسروں سے بے نیاز ہو جائے تو لوگ اس کے محتاج ہو جاتے ہیں۔

(۹)

حضرت سعیدؒ بن مسیبؓ ولید بن عبدالملک کے عہد میں بیمار پڑے طویل علالت نے مرض الموت کی صورت اختیار کر لی۔ عبدالرحمٰن بن حرملہؒ کہتے ہیں کہ میں عیادت کے لیے گیا اس وقت نماز پڑھنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ لیٹے لیٹے نماز پڑھنی شروع کی۔ میں نے سورۂ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا پڑھتے سنا۔ رکوع و سجود کے وقت اپنے سر کے ساتھ سینے کی طرف اشارہ کرتے تھے اور پیشانی کی طرف کوئی چیز نہیں اٹھاتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا، جب مریض میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی سکت نہ ہو تو (لیٹے لیٹے) اشارہ سے پڑھ لے اور اپنے سر کی طرف کوئی چیز نہ اٹھائے۔

وفات سے پہلے اپنے بیٹے محمدؒ کو وصیت کی کہ میری میت پر سرخ چادر نہ ڈالنا، جنازہ کے پیچھے آگ نہ لے جانا، کسی کو جنازہ کی اطلاع نہ دینا۔ صرف چار آدمی اٹھانے کے لیے کافی ہیں۔ کسی بین کرنے والے کو ساتھ نہ لینا۔ بخور دینے کے لیے انگیٹھی ساتھ نہ لے جانا، قبر پر خیمہ نہ لگانا۔

حضرت نافع بن جبیرؒ بیمار پرسی کے لیے آئے تو محمدؒ سے کہا کہ بستر کو قبلہ رخ

کردو۔ حضرت سعیدؒ نے سُن کر فرمایا، اس کی ضرورت نہیں، میں قبلہ پر پیدا ہوا ہوں، اسی پر مروں گا اور انشاء اللہ اسی پر اٹھوں گا۔

تھوڑی دیر کے بعد بے ہوش ہو گئے۔ اس وقت حضرت نافعؒ نے ان کا بستر قبلہ رُخ کر دیا۔ ہوش آیا تو پوچھا، بستر کو کس نے پھیرا۔ کسی کو جواب دینے کی ہمت نہ پڑی۔ پھر خود ہی فرمایا، نافع نے کیا ہوگا لیکن اس سے کیا حاصل؟ اگر میں مسلمان ہوں تو خواہ کسی سمت مروں میرا رُخ قبلہ ہی کی جانب ہوگا اور اگر اسلام کو تسلیم نہیں کرتا اور دل قبلہ کی جانب نہیں ہے تو پھر رُخ کو قبلہ کی طرف پھیرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب میں مسلمان ہوں تو پھر جدھر بھی میرا منہ ہو وہ اللہ ہی کی طرف ہے۔

اس کے بعد ملتِ اسلامیہ کے اس رجلِ عظیم نے (۹۴ھ میں) پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اس وقت ان کی عمر باختلافِ روایت ۷۵ یا ۷۹ سال کی تھی۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی اور ایک صاحبزادے محمدؒ کا پتہ چلتا ہے، محمدؒ علم الانساب میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ابن العماد حنبلیؒ کا بیان ہے کہ ان کے علاوہ اور اولاد بھی تھی۔

حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی داڑھی میں خضاب کر لیتے تھے۔ مونچھیں کبھی باریک اور کبھی ذرا موٹی کترواتے تھے۔ لباس عام طور پر سفید ہوتا تھا البتہ عمامہ اکثر سیاہ ہوتا تھا اور کبھی کبھار سفید بھی۔ کپڑے پورے پہنتے تھے۔ قمیص، لمبا کرتا، موزہ، عمامہ اور کبھی کبھی پاجامہ بھی۔ طیلسانی کپڑا بہت پسند کرتے تھے۔ چادر بالعموم باریک ابریشم کی ہوتی تھی۔

حضرت سعیدؒ بن مسیّبؒ نے اپنے علم و فضل اور سیرت و کردار کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ ملتِ اسلامیہ کے لیے تا ابد مشعلِ راہ بنے رہیں گے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت سعید بن جبیر رحمتہ اللہ

①

حضرت ابوعبداللہ سعیدؒ بن جبیر کا شمار ان جلیل القدر تابعین میں ہوتا ہے جو علم و عمل کا مجمع البحرین تھے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور بنی والبہ بن الحارث بن ثعلبہ بن دودان کے غلام تھے۔ والبہ اسد بن خزیمہ کی ایک شاخ تھا۔ اس نسبت سے انہیں والبی الاسدی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ جیسی بلند مرتبہ شخصیتوں کے فیضانِ علم سے پورا پورا استفاضہ کیا تھا اور علم وفضل کا بحرِ زخار بن گئے تھے۔ تفسیر حدیث اور فقہ میں وحید العصر تھے۔ ان کے علم وفضل سے ایک دنیا فیض اٹھاتی تھی۔ حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہوتے تھے اور بے دھڑک حق بات اس کے منہ پر کہہ دیتے تھے۔ بیحد عابد و زاہد تھے۔ خشیتِ الٰہی اور سوز و گداز کا اتنا غلبہ تھا کہ ہر وقت آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔ قرآنِ کریم کے حافظ تھے اور عام طور پر دو رات میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔ حج بیت اللہ کے لیے اکثر جاتے تھے اور فرطِ ذوق وشوق میں کوفہ ہی سے احرام باندھ لیا کرتے تھے۔ لوگوں کی عیب جوئی اور غیبت سے سخت پرہیز کرتے۔ ان کی زبان پر ہر وقت یہ دعا جاری رہتی:

اللھم انی اسالك صدق التوکل علیك وحسن الظن بك

(الٰہی میں تو اس چیز کا طالب ہوں کہ تجھ پر سچا توکل اور حسنِ ظن حاصل ہو۔)

اپنے نفس کو بیحد حقیر سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ کسی شخص کو گناہ میں مبتلا دیکھتا ہوں

لیکن جب اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہوں تو اس کو لوٹتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔

کسی نے پوچھا سب سے بڑا عابد کون ہے؟ فرمایا: "جس نے گناہوں میں مبتلا ہو کر توبہ کر لی اور پھر یہ خیال کیا کہ میری سب نیکیاں گناہوں کے مقابلہ میں بے حقیقت ہیں۔

اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے تھے اور محض نماز و روزہ اور ذکر و شغل کو اسلام نہیں سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے "ذکر یہ ہے کہ آدمی زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی اطاعت کرے۔ جس نے اپنے ہر قول و فعل میں اللہ کے احکام کی اطاعت نہ کی، وہ خواہ کتنی ہی عبادت کرے اسے اللہ کی یاد رکھنے والا نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ کی یاد تو یہ ہے کہ اس کا خوف گناہ کرنے کی طاقت ہی نہ چھوڑے۔"

نماز پڑھتے وقت سورۂ بقرہ کی اس آیت کو بار بار دہرایا کرتے تھے اور خوفِ خدا سے کانپا کرتے تھے ـــــــ

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (آیہ ۲۸۱)

ـــــ (اس دن سے ڈرو جس دن خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو سعیدؒ بن جبیر کے فتووں پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر کوفہ سے کوئی شخص ان سے فتویٰ لینے یا کوئی مسئلہ پوچھنے آتا تو معاً اس سے یہ سوال کرتے:

"کیا تمہارے شہر میں سعیدؒ بن جبیر نہیں ہیں؟"

ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت سعیدؒ سے کہا، حدیثیں سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا، میں آپ کی موجودگی میں حدیث کس طرح سنا سکتا ہوں۔ ابنِ عباسؓ نے فرمایا، کیا یہ خدا کی نعمت نہیں ہے کہ تم میرے سامنے حدیثیں بیان کرو اگر صحیح بیان کرو گے تو بہتر ورنہ میں تصحیح کر دوں گا۔"

(۲)

ایک دفعہ حضرت سعیدؒ بن جبیر کے علم و فضل کے اعتراف میں حجاج بن یوسف ثقفی نے انہیں جامع کوفہ کا امام اور کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔ جب کوفہ کے لوگوں نے مطالبہ کیا کہ ہمارا قاضی کوئی عربی النسل شخص ہونا چاہیئے تو حجاج نے انہیں منصب قضا سے ہٹا دیا۔

سعیدؒ بن جبیر نے خلقِ خدا کو فیض پہنچانے کی غرض سے عہدۂ امامت و قضا قبول کر لیا تھا ورنہ وہ حجاج بن یوسف کے مظالم کی وجہ سے اس سے سخت نفرت کرتے تھے۔ حجاج نے ہزارہا بندگانِ خدا کا خونِ ناحق بہایا تھا۔ بیت اللہ پر سنگباری کر کے اس کی بےحرمتی کی تھی۔ حواریٔ رسولؐ حضرت زبیرؓ بن العوام کے جلیل القدر فرزند اور صدیقِ اکبرؓ کے نواسے عبداللہ (ابن زبیرؓ) کو شہید کیا تھا اور ذات النطاقین اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ کی توہین کی تھی۔ وہ رسولِ کریمؐ کی اس پیشگوئی کا مصداق تھا کہ قبیلۂ ثقیف میں ایک کذّاب اور ظالم پیدا ہوگا۔ حضرت اسماءؓ کے قول کے مطابق کذّاب مختار ثقفی تھا اور ظالم حجاج ثقفی ——— سعیدؒ بن جبیر حجاج کے مظالم اور سفاکیوں سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ جب اس کے ایک جرنیل ابنِ اشعث نے حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو ابن جبیرؒ نے کھلم کھلا ابنِ اشعث کا ساتھ دیا۔ انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ حکومت وقت کے خدا کے بندوں پر مظالم، نمازوں میں تاخیر اور مسلمانوں کی تذلیل و تحقیر پر اس کا مقابلہ کرو ——— اس فتویٰ کی بناء پر حجاج ان کا جانی دشمن بن گیا۔

(۳)

ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد بنی اُمیّہ کی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ ان کی بےپناہ عسکری طاقت نے ابنِ اشعث کو شکست دی اور وہ سیستان کی طرف نکل گیا۔ سعیدؒ بن جبیر مکّہ چلے گئے وہاں بنی اُمیّہ کی طرف سے خالد بن عبداللہ قسری حاکم تھا۔ اس نے سعیدؒ بن جبیر کو پکڑ کر حجاج کے پاس بھجوا دیا۔

حجاج انہیں دیکھتے ہی شعلۂ جوّالہ بن گیا اس کی جفاجُو اور خون آشام طبیعت کو ایک ضیافت ہاتھ آگئی۔ سعیدؒ بن جبیر اور اس کے درمیان اس موقع پر جو گفتگو ہوئی تاریخ نے اسے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

حجاج : (طنزاً) تمہارا نام کیا ہے؟

سعیدؒ : سعید بن جبیر (سعید کے معنی نیک بخت کے ہیں اور جُبیر کے معنی اصلاح یافتہ

چیز کے ہیں۔)

حجاج: (چیں بجبیں ہو کر) انت لشقی بن کسیر تم شقی بن کسیر ہو —— (شقی کے معنی بدبخت اور کسیر کے معنی ٹوٹی پھوٹی چیز کے ہیں۔)

سعیدؒ: میری ماں میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں۔

حجاج: شقیت امک وشقیت انت (تم بھی بدبخت ہو اور تمہاری والدہ بھی بدبخت)

سعیدؒ: غیب کا علم تیرے پاس نہیں یہ کسی دوسری ذات کے پاس ہے۔

حجاج: میں تم کو دنیا کے بدلے بھڑکتی ہوئی آگ کے سپرد کروں گا۔

سعیدؒ: اگر میں یہ جانتا کہ ایسا کرنا تیرے اختیار میں ہے تو تجھے عبادت کے لائق سمجھتا۔

حجاج: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔

سعیدؒ: آپؐ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول تھے، ہمارے ہادی ورہبر تھے —— اور رحمۃ اللعٰلمین تھے۔

حجاج: علیؓ اور عثمانؓ کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے۔

سعیدؒ: علیؓ نوجوانوں میں سب سے پہلے اسلام لائے۔ رسول کریمؐ کے چچازاد بھائی، سیدۃ النساءؓ کے سرتاج اور حسنینؓ کے باپ تھے —— عثمانؓ دامادِ رسول تھے، ذوالنورین تھے۔ اپنا گھر بار راہِ خدا میں لٹایا۔ ان کو ناحق قتل کیا گیا۔[1]

حجاج: خلفاء کی نسبت تمہارا کیا قول ہے؟

سعیدؒ: لست علیھم بوکیل (میں ان کا وکیل نہیں ہوں)

حجاج: ان میں کون سب سے بہتر تھا؟

---

[1] بعض روایتوں میں اس سوال وجواب کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ حجاج نے حضرت سعیدؒ سے پوچھا کہ علیؓ وعثمانؓ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؟ حضرت سعیدؒ نے جواب دیا کہ میں وہاں گیا ہوتا تو مجھے معلوم ہوتا (یعنی غیب کا حال میں کیسے بیان کر سکتا ہوں۔)

سعیدؒ: ارضاھم لخالقی جو میرے خالق کی رضا کا سب سے زیادہ پابند تھا۔

حجاج: خالق کی رضا کا کون سب سے زیادہ پابند تھا؟

سعیدؒ: علم ذلک عند الذی یعلم سرھم ونجواھم اس کا علم اس ذات کو ہے جو بھیدوں اور پوشیدہ باتوں سے واقف ہے۔

حجاج: امیر المؤمنین عبد الملک کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

سعیدؒ: اس کے عظیم گناہوں میں سے ایک گناہ تمہارا وجود ہے۔

حجاج: میرے متعلق کیا کہتے ہو؟

سعیدؒ: تمہارا قول و فعل کتاب الٰہی کے خلاف ہے۔ تم اپنا رعب اور دبدبہ قائم کرنے کے لیے سفاکیاں کرتے ہو۔ یہ کام تمہیں برباد کر رہے ہیں۔ کل داورِ محشر کے سامنے حاضر ہو گے تو قدرِ عافیت معلوم ہو جائے گی۔

حجاج: تم پر ہلاکت ہو۔

سعیدؒ: ہلاکت اس شخص پر ہے جس کو جنت سے الگ کر کے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔

حجاج: تم ہنستے کیوں نہیں؟

سعیدؒ: وہ کس طرح ہنس سکتا ہے جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور مٹی کو آگ کھاتی ہے۔

حجاج: پھر ہم لوگ تفریحی مشاغل سے کیوں ہنستے ہیں؟

سعیدؒ: سب کے دل یکساں نہیں ہوتے۔

حجاج: تم نے تفریح کا سامان کبھی دیکھا بھی ہے؟

اب حجاج نے عود اور بانسری بجانے کا حکم دیا۔ سعیدؒ ان کی آواز سن کر رونے لگے۔ حجاج نے کہا، یہ رونے کا کیا موقع ہے، عود اور بانسری کے نغمے تو تفریح بخش ہیں۔

سعیدؒ نے جواب دیا۔ نہیں، بانسری کی آواز نے مجھے وہ دن یاد دلا دیا جب صور پھونکا جائے گا اور عود ایک کاٹے ہوئے درخت کی لکڑی ہے جو ممکن ہے۔

ناحق کاٹی گئی ہو اور اس کے تار بکریوں کے پٹھوں کے ہیں جو ان کے ساتھ قیامت کے دن اٹھائی جائیں گی۔

اس گفتگو کے بعد حجاج بولا، سعید تمہاری حالت قابلِ افسوس ہے۔

حضرت سعیدؒ نے فرمایا: "وہ شخص افسوس کے قابل نہیں ہے جو آگ سے نجات پا گیا ہو اور جنت میں داخل کر دیا گیا ہو۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ اس موقع پر حجاج نے بہت سے موتی زبرجد اور یاقوت منگوا کر اپنے سامنے رکھے۔ حضرت سعیدؒ نے انہیں دیکھ کر فرمایا:

"اگر تم نے انہیں اس لیے جمع کیا ہے کہ ان کے ذریعے یوم قیامت کے خوف سے بچ جاؤ تو ٹھیک ہے ورنہ یاد رکھو کہ قیامت کا ایک جھٹکا دودھ پلانے والی عورتوں کو ان کے شیرخوار بچوں سے غافل کر دے گا اور جو چیزیں دنیا کے لیے جمع کی جائیں ان میں صرف پاکیزہ اور طیب چیزیں ہی عمدہ اور پسندیدہ ہیں۔"

پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی:

حجاج: کیا میں نے تمہیں کوفہ کا امام اور قاضی نہیں بنایا تھا؟

سعیدؒ: بیشک بنایا تھا۔

حجاج: کیا میں نے تمہیں ایک لاکھ کی رقم خیرات کرنے کے لیے نہیں دی تھی؟

سعیدؒ: بیشک دی تھی۔

حجاج: تو پھر تم میری مخالفت پر کیوں کمربستہ ہوئے؟

سعیدؒ: تمہارے مظالم اور بداعمالیوں نے مجھے اس پر مجبور کیا اور پھر مجھے ابن اشعث کی بیعت کا پاس بھی تھا۔

حجاج: خدا کی قسم میں تجھے قتل کیے بغیر یہاں سے نہ ہٹوں گا۔

سعیدؒ: کوئی بات نہیں تم میری دنیا خراب کر دو گے میں تمہاری آخرت برباد کر دوں گا۔

حجاج: بتاؤ تم کس طریقے سے قتل ہونا پسند کرو گے؟

سعیدؒ : تو خود ہی پسند کر۔ رَبِّ اکبر کی قسم جس طرح تو مجھ کو قتل کرے گا اسی طرح خدا تم کو آخرت میں قتل کرے گا۔

حجاج : کیا تمہارا جی چاہتا ہے کہ تمھیں معافی مل جائے ؟

سعیدؒ معافی دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ رہا تو ۔۔۔ تو یہ تیری قدرت سے باہر ہے کہ کسی کو بَری کرے یا کسی کا عذر قبول کرے۔

حجاج : تو میں تم کو ضرور قتل کردوں گا۔

سعیدؒ : ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اگر میرا آخری وقت آگیا ہے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اگر ابھی وقت نہیں آیا تو کوئی مجھے مار نہیں سکتا۔

(۴)

اب حجاج فرطِ غضب سے بیتاب ہو گیا۔ جلاد کو حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور قتل کردو ۔۔۔ اس وقت حاضرین میں سے ایک شخص بے قابو ہو کر اس معدنِ علم وفضل کی مصیبت پر رونے لگا۔ حضرت سعیدؒ بن جبیر نے فرمایا: "بھائی روتے کیوں ہو ہر بات کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے پھر یہ آیت پڑھی:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا۔ (الحدید آیۃ ۲۲)

(زمین میں جو مصیبتیں بھی پہنچتی ہیں۔ یا تمہارے نفسوں پر وارد ہوتی ہیں ان کے پیدا ہونے سے قبل کتاب میں لکھی ہیں۔)

اس کے بعد اپنے لڑکے کو آخری بار دیکھنے کے لیے بلا بھیجا۔ وہ آئے تو بے اختیار رونے لگے۔ سعیدؒ نے انہیں صبر کی تلقین کی اور کہا: "بیٹے اس سے زیادہ تیرے باپ کی زندگی تھی ہی نہیں۔ رونے سے کیا ہو گا۔"

اب جلاد نے انہیں مقتل کی طرف کھینچا۔ حضرت سعیدؒ بن جبیر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ حجاج نے کہا اسے واپس لاؤ۔

جب پھر حجاج کے سامنے آئے تو اس نے پوچھا: "تم کس بات پر ہنسے ؟"
سعیدؒ نے جواب دیا: "عجبت من جرأتك علی اللہ وحلم اللہ علیك۔"
(خدا کے مقابلے میں تیری جرأت اور تیری نسبت خدا کا عفو و علم دیکھ کر مجھے تعجب ہوا)
حجاج اس فقرے کو سن کر اور بھڑک اٹھا اور جلّاد کو حکم دیا اسے میرے سامنے قتل کرو۔
جلّاد نے چھرا ابچھا دیا حضرت سعیدؒ بھی سر کٹانے کے لیے مستعد ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر یہ آیت پڑھی:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (الانعام آیۃ ۸۰)

(میں نے سب سے یکسو ہو کر اپنے تئیں اسی ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمان و زمین بنائے، ایک طرف کا ہو کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔)
حجاج نے حکم دیا اس کا منہ قبلے کی طرف سے پھیر دو۔
حضرت سعیدؒ کی زبان پر قرآن حکیم کے یہ الفاظ جاری ہو گئے:

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (سورۂ بقرہ)

(جدھر تم رخ کرو گے ادھر اللہ کی ذات ہے)
اب حجاج نے حکم دیا اسے منہ کے بل لٹا دو۔
سعیدؒ خود ہی اوندھے لیٹ گئے اور اس آیت کی تلاوت کی:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی۔ (طٰهٰ آیت ۵۵)

(ہم نے اسی (زمین) سے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور اسی سے ایک دفعہ پھر نکالیں گے)
حجاج اب سخت مشتعل ہو گیا۔ اس نے چلّا کر جلاد کو حکم دیا "اس کا سر فوراً قلم کر دو۔"

سعیدؒ نے اس وقت بارگاہِ رب العزت میں دعا مانگی " بار الٰہا میرے قتل کے بعد اس ظالم کو کسی اور کے قتل پر قادر نہ کرنا " ـــــ پھر کلمۂ شہادت پڑھا

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ ـــــ ابھی کلمۂ شہادت زبان پر جاری تھا کہ جلاد کی تلوار گردن پر پڑی اور سر تنِ مبارک سے جدا ہو گیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

شہادت کے بعد جسم مبارک سے خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ حجاج کو اتنا خون نکلنے سے بہت تعجب ہوا، اپنے طبیب خاص سے اس کی وجہ دریافت کی، اس نے کہا:

دوسرے لوگوں کا خون قتل کا حکم سنتے ہی خشک ہو جاتا ہے لیکن سعیدؒ کی طبیعت بالکل مطمئن تھی اور قتل کا خوف مطلقاً ان کے دل میں نہ تھا اسی لیے ان کے جسم سے خلافِ معمول زیادہ خون نکلا۔"

یہ المناک واقعہ شعبان ۹۴ھ میں پیش آیا اس وقت حضرت سعیدؒ کی عمر باختلافِ روایت ۴۹ یا ۵۰ سال کی تھی۔ ان کی شہادت سے لوگوں میں کہرام مچ گیا۔

خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا:

" خدایا ثقیف کے ظالم سے سعیدؒ کے قتل کا انتقام لے۔ خدا کی قسم دنیا کے تمام باشندے بھی سعیدؒ کے قتل میں شریک ہوتے تو خدا ان سب کو منہ کے بل نارِ جہنم میں جھونک دیتا۔"

اس واقعہ کے بعد حجاج تھوڑا عرصہ ہی زندہ رہا۔ اس کے معدے میں کیڑے پڑ گئے جسم میں سردی سما گئی اور عجیب و غریب دماغی عارضہ ہو گیا۔ اکثر بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے۔ بے ہوشی کی حالت میں یا رات کو خواب میں سعیدؒ بن جبیر اسے نظر آتے جو پوچھتے " فاسق تو نے مجھے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا؟" چونک کر کہتا " میرا سعید سے کیا تعلق۔"

غرض اسی طرح نہایت کرب والم کے عالم میں ۹۵ھ میں راہیٔ عدم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مردِ صالح سعیدؒ بن جبیر کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور ان کی شہادت کے بعد حجاج کسی شخص کے قتل پر قادر نہ ہو سکا۔

علامہ دمیریؒ نے حیوٰۃ الحیوان میں لکھا ہے:

"حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حجاج کو اس کے مرنے کے بعد خواب میں دیکھا کہ وہ بدبودار مردار کی صورت میں ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ اللہ نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس نے کہا کہ اللہ نے مجھ کو ہر مقتول کے عوض میں جس کو میں نے قتل کیا تھا ایک ایک دفعہ قتل کیا لیکن سعیدؒ بن جبیر کے بدلے میں مجھ کو ستر مرتبہ قتل کیا گیا۔"

اس کے بعد علامہ دمیریؒ لکھتے ہیں:

"اگر کہا جائے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حجاج کو ہر اس شخص کے بدلے میں جس کو اس نے قتل کیا ایک مرتبہ قتل کیا اور سعیدؒ بن جبیر کے لیے ستر دفعہ قتل کیا حالانکہ حجاج نے عبداللہ بن زبیرؓ کو بھی قتل کیا تھا جو صحابی تھے اور سعیدؒ بن جبیر تابعی تھے اور صحابی تابعی سے افضل ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حجاج نے جب عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل کیا ہے تو علم میں ان کے مثل بہت سے صحابہ موجود تھے جیسے عبداللہ بن عمرؓ اور انسؓ بن مالک وغیرہ۔ لیکن جب سعیدؒ بن جبیر کو قتل کیا ہے تو کوئی نظیر ان کا موجود نہ تھا اور اکثر مصنفین نے ذکر کیا ہے کہ جب حضرت حسن بصریؒ کو سعیدؒ بن جبیر کے قتل ہونے کی خبر ہوئی تو انہوں نے فرمایا، خدا کی قسم سعیدؒ بن جبیر دنیا سے ایسے وقت میں اٹھے کہ جب تمام دنیا مشرق سے لے کر مغرب تک ان کے علم کی محتاج ہے۔ یہ وجہ تھی کہ ان کے قتل کی وجہ سے حجاج پر زیادہ عذاب ہوا۔"

(حیوٰۃ الحیوان مطبوعہ مصر۔ جلد ا صفحہ ۱۴۹)

حضرت سعیدؒ کو شہر واسط میں سپردِ خاک کیا گیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے تین لڑکے چھوڑے، عبداللہ، محمد اور عبدالملک۔

ابنِ سعدؒ نے حضرت سعیدؒ کا حلیہ اس طرح لکھا ہے:

رنگ سیاہ۔ سر اور داڑھی کے بال سفید۔ خضاب لگانا پسند نہ کرتے تھے۔ کسی نے وسمہ کے خضاب کے بارہ میں پوچھا، فرمایا، اللہ تو بندہ کے چہرے کو نور سے روشن کرتا ہے اور بندہ اس کو سیاہی سے بجھا دیتا ہے۔

حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں بیان کیا ہے کہ سعید بن جبیر عمامہ باندھا کرتے تھے اور پیچھے کی طرف ایک بالشت شملہ چھوڑ دیا کرتے تھے۔

ان کے ارشد تلامذہ میں دو صاحبزادوں عبداللہ اور عبدالملک کے علاوہ ابواسحٰق سبیعیؒ، عطاء بن سائبؒ، اشعث بن ابی الشعثا، طلحہ بن مصرف، عبدالملک بن سلیمانؒ، ابوالزبیر مکیؒ اور آدم بن سلیمانؒ جیسے اکابرِ امت شامل ہیں۔

حضرت صفوان بن سُلَیم زُہری رح

(۱)

تابعین عظام کی مقدس جماعت میں جو حضرات زہد و ورع، کثرتِ عبادت، انفاق فی سبیل اللہ اور استغنا کے اعتبار سے آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکے، حضرت ابو عبداللہ صفوان بن سلیم رح (یا بروایتِ دیگر سلام) کو ان میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ پہلی صدی ہجری کے چوتھے یا پانچویں عشرے میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے ان کا تعلق قریش کے خاندان بنو زُہرہ سے تھا۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رض، حضرت انس رض بن مالک اور حضرت ابوامامہ باہلی رض جیسے جلیل القدر صحابہ اور حضرت سعید رح بن مُسیّب رض، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رح، عبداللہ بن سلیمان الاغر رح اور عطاء بن یسار رح جیسے عظیم المرتبت تابعین سے اکتسابِ فیض کیا اور مدینہ منورہ کے ممتاز فقہاء میں شمار ہوگئے۔ ابنِ عماد حنبلی رح نے انہیں فقیہ القدوہ اور حافظ ذہبی رح نے ثقہ حجۃ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ حضرت صفوان رح کے فیضانِ علمی سے اس دور کے بہت سے اربابِ علم بہرہ یاب ہوئے۔ ان میں سے ابن منکدر رح، موسیٰ بن عقبہ رح، یزید بن ابی حبیب، زید بن اسلم رح اور امام مالک بن انس رح کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

(۲)

حضرت صفوان رح کو عبادت و ریاضت سے بے انتہا شغف تھا اور وہ زہد و اتقا کے اعتبار سے اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رح کا قول ہے کہ صفوان اللہ تعالیٰ کے بہترین بندوں میں سے تھے، ان کے وسیلہ سے لوگ

بارانِ رحمت کی دعا کیا کرتے تھے۔

فرض نمازوں کے علاوہ سنن اور نوافل کا بھی خاص اہتمام تھا۔ ساری ساری رات عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ نیند انہیں یادِ الٰہی سے غافل نہ کر دے، گرمیوں میں بند کمرے کے اندر اور سردیوں میں کھلی چھت پر عبادت کیا کرتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ نماز میں کھڑے کھڑے ان کے پاؤں پر وَرم آجاتا تھا اور نڈھال ہو کر گر پڑتے تھے۔ سجدوں کی کثرت سے پیشانی زخمی ہو گئی تھی۔ ان کی سخت کوشی کی انتہا یہ تھی کہ ایک بار نرم بچھونے پر نہ سونے کا عہد کر لیا۔ اس عہد پر اتنی سختی سے کاربند رہے کہ تقریباً چالیس سال تک بستر کے قریب بھی نہ گئے۔ اللہ کی راہ میں بے دریغ خرچ کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ بدن کے کپڑے تک بھی اتار کر دے دیا کرتے تھے۔ ابنِ جوزی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سخت سردی کے موسم میں مسجد سے باہر نکلے تو ایک برہنہ تن آدمی کو سردی میں ٹھٹھرتے پایا۔ انہوں نے اسی وقت اپنے کپڑے اتار کر اس شخص کو دے دیئے اور خود ایک معمولی چادر سے اپنی ستر پوشی کی۔

(۳)

حضرت صفوانؒ کے استغناء اور دنیا سے بے رغبتی کی بھی عجیب شان تھی۔ دنیا ان کے پیچھے پیچھے پھرتی تھی اور وہ اس کی طرف مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ سلاطین و امراء ان کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے تھے لیکن وہ ان کو ٹھکرا دیتے تھے۔ ان کے نزدیک سب سے بڑی دولت یہ تھی کہ انہیں مسجدِ نبوی میں عبادت کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع مل جائے۔ ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک مدینہ منورہ آیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہمراہ مسجدِ نبوی میں نمازِ ظہر پڑھنے گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر مقصورہ کا دروازہ کھولا تو اس میں حضرت صفوان بن سلیمؒ کو مصروفِ عبادت دیکھا۔ سلیمان اُن کا شناسا نہیں تھا۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

سے پوچھا:

"یہ کون بزرگ ہیں میں نے ایسا نورانی چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کہا "امیرالمؤمنین یہ صفوان بن سلیمؒ ہیں۔"

سلیمان نے حضرت صفوانؒ کا نام سن رکھا تھا اور ان کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی شہرت بھی اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنے ایک غلام کو پانچ سو دینار کی ایک تھیلی دی اور حکم دیا کہ اسے لے جا کر حضرت صفوانؒ کی خدمت میں پیش کرو۔ غلام نے لے جا کر پیش کی اور کہا "پانچ سو دینار کی یہ تھیلی امیرالمؤمنین کی جانب سے آپ کی نذر ہے وہ یہاں مسجد میں موجود ہیں۔"

حضرت صفوانؒ نے فرمایا۔ "میاں تمہیں دھوکا ہوا ہے کسی اور کے پاس بھیجی ہوگی۔"

غلام نے حیران ہو کر پوچھا، "کیا آپ صفوان بن سلیم نہیں ہیں؟"

فرمایا "ہوں تو میں ہی صفوان بن سلیم۔"

غلام نے عرض کیا "تو پھر آپ ہی کو دی ہے۔"

حضرت صفوانؒ نے فرمایا، "بھائی تم جا کر دوبارہ پوچھ آؤ۔"

جونہی غلام پوچھنے کے لیے مڑا حضرت صفوانؒ اپنا جوتا اٹھا کر مسجد سے نکل گئے اور پھر جتنی دیر تک سلیمان مسجد میں موجود رہا وہ مسجد سے غائب رہے۔ غلام نے ان کو بہتیرا تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے آخر اس نے مایوس ہو کر تھیلی سلیمان کو واپس کر دی۔

(۴)

حضرت صفوانؒ اس کثرت سے عبادت کرتے تھے کہ اس میں مزید کسی قسم کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ ابن جوزی نے "صفوۃ الصفوہ" میں ابو حمزہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے صفوانؒ کو عبادت کے اس درجہ پر دیکھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کل قیامت برپا ہونے والی ہے تو وہ عبادت کی جس حد تک

پہنچ چکے تھے اس میں مزید اضافہ کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

حضرت صفوانؒ نے چالیس سال سے بستر استراحت کو ترک کر رکھا تھا۔ ۱۳۲ھ میں سخت بیمار ہو گئے یہاں تک کہ جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ اس حالت میں لوگوں نے عرض کیا:

"اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی رحمت نازل کرے کیا اس حالت میں بھی آپ نہ لیٹیں گے۔"

فرمایا: "اگر لیٹ گیا تو اللہ سے کیا ہوا میرا عہد ٹوٹ جائے گا"۔ لیکن جب لوگوں کا اصرار حد سے بڑھا تو ذرا سی ٹیک لگالی، اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ازواج و اولاد کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں ملتی۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ



حضرت عُقبہؒ بن نافع فہری

①

المغرب (شمالی افریقیہ) پر اسلام کی باران رحمت کا پہلا چھینٹا اس وقت پڑا جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں فتح مصر کے فوراً ہی بعد مجاہدین اسلام نے اس کی طرف پیشقدمی کی اور امیر مصر حضرت عمروؓ بن العاص کی فوجیں شمالی ساحل کے قبائل کو مغلوب کرتی ہوئی برقہ تک جا پہنچیں۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ذوالنورینؓ کا دور خلافت آیا تو ۲۶ھ میں مسلمانوں نے والی مصر عبداللہؓ بن ابی سرح کی زیر قیادت طرابلس الغرب (لیبیا) پر چڑھائی کی۔ اس وقت افریقیہ (بشمول طرابلس) پر قیصر روم کی طرف سے جرجیر (گریگوریس) نامی ایک بطریق حکومت کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد اسے شکست دی اور پھر سارے ملک میں پھیل گئے۔ رومیوں نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ مسلمانوں کی اُبلتی ہوئی قوت کے مقابلہ کا خیال ترک کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے پچیس لاکھ دینار سالانہ پر مسلمانوں سے صلح کر لی اور اسلامی لشکر ایک سال تین مہینے بلادِ مغرب میں مقیم رہ کر واپس چلا گیا۔ مسلمانوں کی مراجعت کے بعد رومیوں کی باسی کڑھی میں پھر ابال آیا، انہوں نے اپنا عہد و پیمان توڑ ڈالا اور اسلامی حکومت کی اطاعت سے منحرف ہو گئے لیکن کچھ ایسے موانع پیش آئے کہ مسلمان عرصہ تک اس طرف توجہ نہ کر سکے یہاں تک کہ ۴۱ھ میں امیر معاویہؓ کا دور حکومت شروع ہو گیا۔ انہوں نے ۴۵ھ میں معاویہؒ بن خدیج کو ایک زبردست فوج دے کر شمالی افریقیہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے رومیوں کو شکستوں پر شکستیں دے کر شمالی افریقیہ کے کئی وسیع علاقے اور ساحلی مقامات فتح کر لیے لیکن وہ رومیوں اور سرکش بربریوں کی متحدہ قوت کا پوری طرح استیصال نہ کر سکے۔ فی الحقیقت ان کی جبلت ہی ایسی تھی کہ جب تک

ان کے سر پر فوجی قوت مسلط رہتی وہ مطیع رہتے۔ ذرا سی ڈھیل بھی ملتی تو فوراً باغی ہو جاتے۔ ان کی سرکوبی کے لیے اب امیر معاویہؓ کی نظر انتخاب ایک ایسے مرد مجاہد پر پڑی جس کی شجاعت و شہامت اور شوقِ جہاد کی شہرت مصر سے نکل کر مرکزِ حکومت دمشق تک آپہنچی تھی۔ یہ مرد مجاہد حضرت عقبہؓ بن نافع فہری تھے۔

(۲)

حضرت عقبہؓ بن نافع بن عبد قیس القرشی الفہری کا شمار پہلی صدی ہجری کے نامور سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ وہ مشہور صحابی حضرت عمروؓ بن العاص فاتح مصر کے بھانجے تھے۔ ان کی ولادت عہدِ رسالت کے آخری سالوں میں ہوئی۔ انہیں کمسنی میں شرفِ صحابیت حاصل ہوا یا نہیں؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ عام طور پر انہیں تابعین میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت عقبہؓ کی پرورش اور تعلیم و تربیت نہایت پاکیزہ ماحول میں ہوئی۔ وہ جوان ہوئے تو اپنے اعلیٰ کردار، شجاعت، صالحیت، ذوقِ عبادت اور شوقِ جہاد کی بناء پر نہ صرف بنو فہر بلکہ دوسرے لوگوں میں بھی نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، یہاں تک کہ لوگ انہیں ایک مستجاب الدعوات جوانِ صالح سمجھتے تھے۔

اہلِ سیر کا بیان ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر اپنے ماموں حضرت عمروؓ بن العاص کے پاس مصر چلے گئے اور وہاں دشمن کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔

مولوی محمد جمیل الرحمٰن نے "تاریخ مغرب" میں "کتاب الاستبصار فی عجائب الامصار" کے حوالے سے حضرت عقبہؓ کے قیامِ مصر کے زمانے کی ایک دلچسپ روایت بیان کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمروؓ بن عاص کے زمانۂ ولایت میں حضرت عقبہؓ بن نافع مصر گئے اور وہاں کے کسی گاؤں میں قیام کیا، ان کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہؓ بھی تھے۔ ان میں جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص بھی شامل تھے۔ ایک دن ان سب کے سامنے دستر خوان بچھا ہوا تھا کہ اچانک ایک چیل نے کھانے پر جھپٹا مارا اور ایک ہڈی لے اڑی۔ یہ دیکھ کر حضرت عقبہؓ نے کہا: "خدا کرے اس کی گردن ٹوٹ جائے۔" یہ کہنا تھا کہ چیل سر کے بل گری اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا۔ حضرت عقبہؓ نے پوچھا: "اے ابو عبداللہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" حضرت عبداللہؓ نے فرمایا، "میں نے سنا ہے کہ اس جانب بعض لوگ لشکر کشی کریں گے اور سب کے سب شہید ہو جائیں گے۔" حضرت عقبہؒ نے فوراً ہاتھ اٹھائے اور دُعا کی "یا اللہ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔" حضرت عقبہؒ کی یہ دعا ان کے شوقِ شہادت کی مظہر تھی۔

حضرت عمروؓ بن العاص نے اپنی وفات (۴۳ھ / ۶۶۳ء) سے کچھ عرصہ پہلے حضرت عُقبہؒ کو عساکرِ افریقیہ کا سپہ سالار مقرر کیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں انہوں نے سوڈان پر یلغار کی اور کئی علاقوں کو فتح کرتے ہوئے غدامس تک پہنچ گئے۔ وہ پہلے مسلمان سپہ سالار ہیں جنہوں نے سوڈان میں پرچم اسلام بلند کیا۔ ۵۰ھ / ۶۷۰ء میں امیر معاویہؓ نے انہیں شمالی افریقیہ کی مہم کا قائد مقرر کیا تو انہوں نے دس ہزار سرفروشوں کے ساتھ ایسی زبردست یلغار کی کہ سارے بلادِ مغرب میں زلزلہ پڑ گیا۔ مجاہدینِ اسلام نے تیونس (قرطاجنہ) تک کا علاقہ فتح کر لیا اور رومیوں اور ان کے ساتھی بربریوں کی سخت گوشمالی کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس مہم کے دوران میں ایک مرتبہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ ایک لق و دق صحرا میں سے گزر رہے تھے کہ لشکر کے پاس پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ دور دور تک پانی یا کسی آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لوگ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بہت دوڑے لیکن ناکام واپس آئے۔ یہ بڑا نازک وقت تھا کیونکہ ہزاروں آدمیوں اور جانوروں کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ اس وقت حضرت عقبہؒ بن نافع نے دو رکعت نماز پڑھ کر ایک طویل دُعا کی۔ اللہ کی شان، اسی وقت حضرت عُقبہؒ کے گھوڑے نے اپنے سُم سے زمین کو کریدنا شروع کیا۔ جب تھوڑی سی ریت ہٹ گئی تو ایک بڑا پتھر دکھائی دیا۔ حضرت عُقبہؒ کے حکم سے اس پتھر کو ہٹایا گیا تو اس کے نیچے سے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ عُقبہؒ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور بلند آواز سے پکارے۔ "اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے پانی بھیج دیا۔" اہلِ لشکر جو پیاس سے نڈھال تھے، فرطِ مسرت سے بے خود ہو گئے انہوں نے اس چشمے سے چھوٹی چھوٹی نالیاں مختلف سمتوں میں نکالیں

اور پانی کا ذخیرہ مشکوں اور برتنوں میں جمع کر لیا۔ اس کے بعد اس واقعہ کی نسبت سے اس مقام کا نام "ماء الفرس" (گھوڑے کا چشمہ) مشہور ہو گیا۔

بلادِ مغرب کی مہم سے فارغ ہو کر حضرت عقبہؓ نے سوچا کہ اس علاقے میں ایک ایسا شہر بسانا چاہیے جو اسلامی قوت کا مرکز ہو اور نہ صرف سرکش بربریوں کی شورشوں کی روک تھام کر سکے بلکہ رومیوں کے بحری حملوں کا مؤثر دفاع بھی کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے صوبہ بیزاسین (BYZACENE) کے وسط میں القیروان کے مستحکم فوجی قلعے اور شہر کی بنیاد رکھی۔ علامہ ابن العذاری المراکشی نے "البیان المغرب" میں لکھا ہے کہ حضرت عقبہؓ نے جو جگہ شہر کی تعمیر کے لیے منتخب کی وہاں میلوں تک گھنا جنگل اور دلدلی علاقہ تھا جو حشرات الارض اور خونخوار درندوں کا مسکن تھا۔ جب انہوں نے ایسے خطرناک علاقے میں شہر کی تعمیر کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے ساتھیوں نے ان سے کہا:

"اے امیر آپ نے ایسے گھنے جنگل اور دلدلوں میں شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے جس میں کوئی انسان قیام کرنا پسند نہیں کر سکتا۔ ہمیں ڈر ہے کہ سانپ اور خونخوار درندے ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔"

حضرت عقبہؓ کے لشکر میں اٹھارہ صحابہ کرامؓ اور باقی سب لوگ تابعین تھے۔ عقبہؓ نے صحابہ کرامؓ کو ساتھ لے کر بارگاہِ ربّ العزت میں بآوازِ بلند دعا کی "الٰہی تو ہمیں اپنے فضل و کرم سے نواز اور ہمیں یہ شہر آباد کرنے کی توفیق عطا فرما۔" دوسرے اہلِ لشکر نے بھی اس دعا میں نہایت خشوع و خضوع سے ان کا ساتھ دیا۔ پھر حضرت عقبہؓ جنگل کے قریب گئے اور پکار کر کہا:

"اے سانپو اور اے درندو! ہم رسولِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور تابعین ہیں۔ تم یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ اس جگہ ہم اقامت اختیار کرنے والے ہیں۔ اگر تم یہاں سے نہ گئے تو ہم تمہیں ہلاک کرنے میں آزاد ہوں گے۔"

اس کے بعد چشمِ فلک نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا کہ تمام درندے اپنے بچوں

کو اٹھائے جنگل سے بھاگ رہے ہیں اور سانپ بچھو وغیرہ بھی ان کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے یہ علاقہ تمام وحوش اور حشرات الارض سے خالی ہو گیا۔ اس کے بعد درخت کاٹ کر شہر کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس واقعہ کے چالیس برس تک اہلِ افریقیہ نے اس علاقہ میں کسی بچھو، سانپ یا درندے کا نام و نشان تک نہ پایا۔"

حضرت عقبہؓ نے سب سے پہلے دارالامارۃ اور جامع مسجد کے لیے چار دیواری بنوائی۔ ابن العذاریؒ کہتے ہیں کہ اس موقع پر قبلہ کی سمت کے بارے میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا جس نے آہستہ آہستہ شدید صورت اختیار کر لی۔ حضرت عقبہؓ کو اس سے بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس مشکل کے حل کی دعا مانگی۔ ایک دن اسی فکر میں سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی صورت کے بزرگ آئے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں "صبح جب تم اٹھو تو جھنڈا ہاتھ میں لے کر اس کو اپنی گردن پر رکھ لو، تم اپنے آگے تکبیر کی آواز سنو گے دوسرا کوئی شخص اس آواز کو نہ سن سکے گا۔ اس جگہ کا خیال رکھو جہاں یہ تکبیر تم کو سنائی نہ دے بس وہی مقام تمہارا قبلہ اور محراب ہے......" اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی۔ اسی وقت اٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھی پھر صبح کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ جب پو پھٹی تو پھر دو رکعت نماز پڑھی اس وقت انہوں نے اپنے سامنے تکبیر کی آواز سنی۔ لوگوں سے پوچھا کہ جو کچھ میں سن رہا ہوں کیا تمہیں بھی سنائی دے رہا ہے؟ انہوں نے کہا "نہیں" اب انہیں یقین ہو گیا کہ قبلہ کی سمت متعین کرنے میں ان کی راہنمائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جھنڈا اٹھایا اور اس کو گردن پر رکھ کر تکبیر کی آواز کے پیچھے پیچھے چلے لوگوں کا ایک جمِ غفیر بھی ان کے ساتھ تھا۔ آخر اس محراب تک جا پہنچے جو جامع مسجد کی چار دیواری میں پہلے ہی موجود تھی یہاں تکبیر کی آواز بند ہو گئی۔ اس پر انہوں نے اسی مقام پر جھنڈا گاڑ دیا اور لوگوں سے کہا کہ یہ تمہاری محراب اور سمتِ قبلہ ہے۔ چنانچہ جامع مسجد اور شہر کی دوسری مسجدوں میں بھی قبلہ کا رخ اسی کے مطابق رکھا گیا۔

یہ قضیہ طے ہو جانے کے بعد شہر کی تعمیر تیزی سے شروع ہو گئی اور جلد ہی

"القیروان" کا عظیم الشان شہر وجود میں آگیا۔ اس کی جامع مسجد نہایت شاندار تھی۔ اس کا طول تین ہزار ذراع اور عرض چھ سو ذراع تھا (ذراع نصف گز انگریزی کے برابر ہوتا ہے) اسی طول وعرض سے مسجد کی وسعت اور شان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

القیروان کی تاسیس سے مسلمانوں کو ایک مضبوط فوجی مستقر مل گیا اور انہیں جمعیتِ خاطر بھی حاصل ہو گئی اس کے ساتھ ہی افریقیہ میں اشاعتِ اسلام کا راستہ صاف ہو گیا۔

(۳)

حضرت عقبہؒ کو نو تعمیر شہر میں زیادہ عرصہ قیام کرنا نصیب نہ ہوا۔ القیروان کے آباد ہونے کے فوراً بعد ۵۵ ہجری (۶۷۷ء) میں امیر معاویہؓ نے حضرت مسلمہؓ بن مخلد انصاری کو مصر اور افریقیہ کا والی مقرر کیا۔

(ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ تقرر ۵۲ ہجری (۶۷۵ء) میں ہوا) حضرت مسلمہؓ نے حضرت عقبہؒ کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے ایک غلام ابوالمہاجر کو افریقیہ کا والی مقرر کیا۔ ابوالمہاجر نے قیروان پہنچ کر حضرت عقبہؒ کے ساتھ ان کے شایانِ شان برتاؤ نہ کیا اس سے ان کو سخت رنج ہوا اور انہوں نے دمشق جا کر امیر معاویہؓ سے ابوالمہاجر کی شکایت کی۔ امیر معاویہؓ نے ان کو دوبارہ افریقیہ کی ولایت پر بھیجنے کا وعدہ کیا لیکن اپنی زندگی میں انہیں یہ وعدہ پورا کرنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ ابوالمہاجر نے الجزائر کی طرف پیشقدمی شروع کر دی تھی۔ علامہ ابن خلدونؒ کا بیان ہے کہ ابوالمہاجر الجزائر میں داخل ہو کر تلمسان تک بڑھتے چلے گئے، اس دوران میں انہوں نے ایک ممتاز بربری سردار کُسیلہ بر لنسی کو شکست فاش دی شکست کھانے کے بعد کُسیلہ نے اسلام قبول کر لی اور ابوالمہاجر نے اس کے مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اپنے مشیروں میں شامل کر لیا۔

امیر معاویہؓ کی وفات (سنہ ۶۰ھ / ۶۸۰ء) کے بعد یزید اول تختِ حکومت پر بیٹھا اس نے ۶۲ھ (۶۸۰ء) میں اپنے والدِ ماجد کے وعدہ کو پورا کیا اور حضرت عقبہؒ بن نافع کو دوبارہ افریقیہ کا والی مقرر کر دیا۔ حضرت عقبہؒ فوراً عازمِ قیروان ہو گئے اور وہاں پہنچ کر ابوالمہاجر سے

عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چونکہ سرکش بربری اور رومی نت نئے فتنے اٹھاتے رہتے تھے حضرت عقبہؓ نے عزم بالجزم کر لیا کہ خواہ انہیں ساری عمر لڑنا پڑے وہ ان سرکش عناصر کی بیخ کنی کر کے رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لڑکوں کو بلایا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا، "میرے بچو میں نے اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ لہٰذا جب تک زندہ رہوں گا، کفار سے جہاد کرتا رہوں گا۔" اس کے بعد وہ ایک مضبوط فوج کے ساتھ قیروان سے وسطی المغرب کی طرف بڑھے اور باغہ (یا باغایہ) پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں بڑی تعداد میں رومی اور بربری جمع تھے۔ حضرت عقبہؓ نے ایک خونریز معرکہ کے بعد ان کے متحدہ لشکر کو شکست دی۔ یہ لوگ شکست کھا کر شہر میں محصور ہو بیٹھے۔ اسلامی لشکر کچھ عرصہ محاصرہ کیے رہا لیکن محصورین نے شہر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کی۔ حضرت عقبہؓ نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور زاب کے علاقہ میں واقع رومیوں کے ایک بڑے مرکز لمیس پر دھاوا بول دیا۔ لمیس میں رومیوں کا ایک جرار لشکر موجود تھا لیکن اس نے بُری طرح شکست کھائی۔ اب حضرت عقبہؓ نے آگے بڑھ کر فزان کو جا گھیرا۔ وہاں کے حکمران کو مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ فزان کی تسخیر کے بعد حضرت عقبہؓ نے ودان، قفصہ اور قسطیلہ پر پرچم اسلام بلند کیا اور تھوڑے وقفہ کے بعد اربہ کے مقام پر رومیوں کے ایک زبردست لشکر کو شکست دیتے ہوئے تاہرت کا رُخ کیا۔ وہاں کے رومیوں کو مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنی مدد کے لیے بربریوں کو بلا لیا۔ اس طرح رومیوں اور بربریوں کا ایک بہت بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن انہوں نے اپنی جانیں راہِ حق میں وقف کر رکھی تھیں اس لیے دشمن کی کثرتِ تعداد کو مطلق خاطر میں نہ لائے اور سر سے کفنی باندھ کر کفار کی مہیب طاغوتی قوت پر لوٹ پڑے۔ رومی اور بربری جنگجو جان توڑ کر لڑے لیکن مسلمان سرفروشوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور بالآخر انہوں نے بُری طرح شکست کھائی۔ تاہرت سے حضرت عقبہؓ نے طنجہ کا رُخ کیا جو بحر روم کے کنارے افریقیہ کا آخری شہر اور رومیوں کا ایک مضبوط مرکز تھا۔ وہاں کا حکمران جولیان

(JULIAN) بڑے اثر و اقتدار کا مالک تھا اور مغرب کے بیشتر حکمران اس کے باجگذار تھے۔ اس نے باختلافِ روایت حضرت عقبہؓ سے شکست کھا کر یا خود ہی برضاؤ رغبت مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ حضرت عقبہؓ کا ارادہ تھا کہ طنجہ سے آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے اندلس (SPAIN) پر حملہ آور ہوں لیکن جولیان نے انہیں مشورہ دیا کہ ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ کوہِ اطلس کبیر اور سوس کے کافر بربروں سے کسی بھی وقت اسلامی اقتدار کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عقبہؓ نے طنجہ سے سوسِ ادنیٰ کا رخ کیا اور زرھون، ویلیلی، نفیس، سوسِ اقصیٰ اور درعہ کو مسخر کرتے ہوئے صحرائے لمتونہ تک پہنچ گئے وہاں سے بحرِ اوقیانوس کے شمالی ساحل کی طرف بڑھے اور بلادِ آسفی میں جبلِ دَرَن (اطلس کبیر) کے مصمودہ بربر قبائل اور پھر تارودانت تک متقابل اطلس (ANTI ATLAS) کے بربروں کو مطیع و منقاد کرتے ہوئے بحرِ اوقیانوس کے شمالی ساحل پر پہنچ گئے۔ اب وہ سارا شمالی افریقہ فتح کر چکے تھے لیکن جذبۂ جہاد کا یہ عالم تھا کہ بحرِ اوقیانوس کی وسعتوں کو اپنے راستے میں حائل دیکھ کر بصد حسرت و یاس آسمان کی طرف نظر کی اور کہا:

"بارِ الٰہا اگر یہ سمندر میرے راستے میں حائل نہ ہوتا تو جہاں تک زمین ملتی میں تیری راہ میں جہاد کرتا چلا جاتا۔"

پھر انہوں نے اپنے شبدیزِ صبا رفتار کو جست دے کر سمندر میں ڈال دیا اور جب پانی گھوڑے کی رانوں تک پہنچ گیا تو انہوں نے اسے روک لیا اور تلوار ہوا میں لہراتے ہوئے بڑے جوش اور جذبے سے یوں گویا ہوئے:

"خدائے قادر و توانا تو خوب جانتا ہے کہ تیرا یہ عاجز بندہ اس نیت سے گھر سے نکلا تھا کہ تیرے ولی ذوالقرنین کی طرح زمین کی آخری حدود تک تیرا نام بلند کرتے تاکہ تیرے سوا کوئی دوسرا نہ پوجا جائے لیکن آج اس سمندر نے اس کا راستہ روک لیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ساحل سے بڑی بیدلی کے ساتھ واپس آئے۔

(۴)

حضرت عقبہؓ کی فتوحات نے تمام شمالی افریقیہ پر مسلمانوں کا سکہ بٹھا دیا تھا اور بظاہر ان کی حریف کوئی بڑی قوت باقی نہ رہ گئی تھی لیکن دفعتہً کسیلہ بربنسی کی غداری نے سارے افریقیہ میں انقلاب برپا کر دیا۔

کسیلہ بربنسی، حضرت عقبہؓ کے پیشرو ابو المہاجر سے شکست کھا کر مسلمان ہو گیا تھا اور ان کا مشیر بن گیا تھا۔ حضرت عقبہؓ نے ۶۲ھ میں دوسری مرتبہ افریقیہ کی عنانِ حکومت سنبھالی تو ابو المہاجر نے ان سے کسیلہ کی سفارش کی اور اس کے مرتبہ کا لحاظ رکھنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عقبہؓ ابو المہاجر کو اپنا مخالف سمجھتے تھے اس لیے اس سفارش اور مشورہ نے ان کے دل میں کسیلہ کے بارے میں بھی کھٹک پیدا کر دی۔ چند دن بعد انہوں نے بعض شکوک کی بنا پر یا انتظامی اور احتیاطی تدبیر کے پیش نظر ابو المہاجر اور کسیلہ دونوں کو گرفتار کر لیا اور اپنی مہمات کے دوران میں انہیں پابزنجیر کر کے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ انہوں نے صرف ابو المہاجر کو گرفتار کیا اور کسیلہ کے خلاف صرف اتنی کارروائی کی کہ اس کو مجلسِ مشاورت سے خارج کر کے ایک عام سپاہی کی حیثیت دے دی۔ کسیلہ نے اسے اپنی توہین سمجھا اور بعد میں ایک موقعہ پر جب حضرت عقبہؓ نے اسے جانور ذبح کرنے پر مجبور کیا تو وہ دل میں ان کا جانی دشمن بن گیا اور ان سے بدلہ لینے کے لیے موقع کی تلاش میں رہنے لگا تاہم اس نے اپنے ظاہری رویہ میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

حضرت عقبہؓ بحر اوقیانوس کے شمالی ساحل سے واپس آتے ہوئے علاقۂ زاب میں طُبنہ کے مقام پر پہنچے تو اس اطمینان میں کہ اب کوئی مخالف و مزاحم باقی نہیں رہا اپنی فوج کو منتشر کر دیا۔ کہا جاتا کہ انہوں نے اپنے لشکر کو متعدد دستوں میں تقسیم کر کے قیروان کی جانب روانہ کر دیا اور اپنے ساتھ ایک مختصر سی جمعیت رکھی۔ اس اثناء میں کسیلہ ان کے لشکر سے فرار ہو گیا اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے فوج جمع کرنی شروع کر دی۔

حضرت عقبہؓ اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ صحرا کے کنارے تہودا کے مقام پر کسیلہ نے ایک جرار لشکر کے ساتھ انہیں آگھیرا۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت عقبہؓ نے تہودا کے رومیوں کو اسلام کی دعوت دی لیکن وہ حضرت عقبہؓ کے ساتھ اتنے کم آدمی دیکھ کر مقابلہ پر آمادہ ہو گئے۔ انہیں کسیلہ کی حضرت عقبہؓ سے عداوت کا علم تھا۔ چنانچہ انہوں نے عین اس وقت جب مسلمانوں نے تہودا کا محاصرہ کر رکھا تھا کسیلہ کو پیغام بھیجا کہ عقبہؓ سے انتقام لینے کا یہ بہترین موقع ہے کیونکہ ان کے پاس مٹھی بھر آدمی ہیں۔ کسیلہ یہ پیغام ملتے ہی ایک بڑے لشکر کے ساتھ تہودا پہنچ گیا اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ مسلمانوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی جبکہ کسیلہ کا لشکر چھ ہزار سے زیادہ بربری جنگجوؤں پر مشتمل تھا لیکن حضرت عقبہؓ اور ان کے ساتھیوں کے دلوں میں تو شوق شہادت کے شعلے بھڑک رہے تھے ——— اپنے سے بیس گنا بربریوں کو مطلق خاطر میں نہ لائے۔ ان غیور مردان حق نے اپنی ڈھالیں اور تلواروں کے نیام توڑ پھینکے اور سروں سے کفن باندھ کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ بربریوں کی کثیر تعداد ماری گئی لیکن حضرت عقبہؓ اور ان کے تمام جانباز ساتھی بھی مردانہ وار لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ یوں حضرت عقبہؓ کے دل میں رتبۂ شہادت پر فائز ہونے کی جو آرزو مدت العمر سے مچل رہی تھی، وہ پوری ہو گئی۔ اس موقع پر ابوالمہاجر نے جو پابزنجیر حضرت عقبہؓ کے ساتھ تھے، عجیب مومنانہ کردار کا مظاہرہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضرت عقبہؓ نے انہیں آزاد کر دیا اور کہا کہ تم قیروان جا کر مسلمانوں کو منظم کرو، میں شہادت حاصل کرتا ہوں لیکن ابوالمہاجر نے کہا کہ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا کیونکہ میرا مطلوب و مقصود بھی جام شہادت پینا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھی حضرت عقبہؓ اور دوسرے مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو نہایت بہادری سے لڑ کر شہادت پائی۔ ان تمام شہیدانِ راہ حق کی قبریں آج بھی اس مقام پر موجود ہیں جو اب ایک چھوٹے سے گاؤں کا مرکز بن گیا ہے اور زیارت گاہِ خواص و عوام ہے۔ یہ گاؤں حضرت عقبہؓ کے نام پر "سیدی عقبہ"

کہلاتا ہے اور تہودا کی قدیم جائے وقوع کے قریب بسکرہ کے جنوب مشرق میں چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حضرت عقبہؒ کی شہادت (۶۴ھ ۶۸۵ء) کے بعد کسیلہ نے قیروان پر قبضہ کر لیا لیکن پانچ سال بعد عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں زہیرؒ بن قیس بلوی نے اس کو قیروان سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور پھر ممش کے مقام پر ایک خونریز جنگ کے بعد اس کو عبرتناک شکست دی۔ اس لڑائی میں کسیلہ اور اس کے ساتھ بڑے بڑے بربری اور رومی سردار مارے گئے اور یوں حضرت عقبہؒ کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

قُتَیبہ بن مسلم باہلی

①

اُموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت (۸۶ھ تا ۹۶ھ) میں مجاہدینِ اسلام نے خراسان سے بخارا کی طرف پیشقدمی کی تو راستے میں دریائے جیحون (OXUS) کو اپنے سامنے حائل پایا۔ دشمن مسلمانوں کی پیشقدمی کی اطلاع پاکر تمام کشتیاں دوسرے کنارے کی طرف لے گیا تھا اور جیحون کے دریائے زخّار کو عبور کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اسلامی لشکر کے سپہ سالار نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انہوں نے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ بارگاہِ ربّ العزت میں یہ دُعا کی:

"الٰہی اگر تو جانتا ہے کہ میری غرض تیری راہ میں جہاد کرنا اور تیرے دین کو سربلند کرنا ہے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس دریا میں غرق نہ کرنا اور اگر میری نیت اس کے سوا کچھ اور ہے تو مجھے اس دریا میں غرق کر دینا۔"

یہ دُعا کرکے سپہ سالار نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور اُن کے ساتھ ہی پورا لشکر پیادہ وسوار دریا میں اتر گیا۔ اللہ کی شان کسی مجاہد کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا اور سارے مجاہدین دریا کو اس طرح عبور کر گئے جیسے خشک زمین پر چل رہے ہوں۔ مسلمانوں کے یہ مستجاب الدعوات سپہ سالار جن کا اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی پر اس قدر رسختہ ایمان تھا کہ ہر قسم کے مادی اسباب سے بے نیاز ہو کر محض دینِ حق کی خاطر حدِ نظر تک پھیلے ہوئے دریائے زخّار میں کود پڑے، قتیبہ بن مسلم باہلی تھے۔

(۲)

ابوحفص قتیبہ بن مسلم باہلی کا شمار تاریخ اسلام کے نازشِ روزگار سپہ سالاروں اور فاتحین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے جوشِ ایمان، عزم وہمت، شجاعت و بسالت اور عظمتِ کردار کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ قیامت تک نہ مٹ سکتے ہیں اور نہ ماند پڑ سکتے ہیں۔ پوری دنیا کی تاریخ ہو یا صرف مسلمانوں کی، کوئی بھی مؤرخ اس کو احاطہ تحریر میں لاتے وقت قتیبہ بن مسلم کے نام اور کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ فی الحقیقت ایسا کرنا ممکن ہی نہیں۔ وہ بلاشبہ قرنِ اول کی ایک ایسی تابندہ شخصیت ہیں، جن پر ملّتِ اسلامیہ بجا طور پر ناز کرسکتی ہے۔

قتیبہ ایک فوجی گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ کنیت باختلافِ روایت ابوالحفص یا ابوالحارث تھی۔ ان کے والد مسلم قبیلہ باہلہ کے سردار اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کی فوج میں افسر تھے۔ "دائرۂ معارف اسلامیہ" کے مطابق قتیبہ ۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت عمدہ تعلیم وتربیت پائی کیونکہ عنفوانِ شباب میں جب وہ منظرِ عام پر آئے تو ان کی شہرت ایک نڈر سپاہی اور صاحبِ کردار نوجوان کی تھی۔ انہوں نے خلیفہ عبدالملک کے عہد میں حجاج بن یوسف کی فوج میں شامل ہوکر عبدالرحمٰن بن محمد بن اشعث کے خلاف کئی معرکوں میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی شجاعت اور بے خوفی کی دھاک بٹھا دی۔ حجاج بن یوسف اُن کی عسکری صلاحیتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خلیفہ سے منظوری لے کر ۸۵ھ (اور بروایتِ دیگر ۸۶ھ) میں قتیبہ کو خراسان کا والی مقرر کیا۔ اس منصب پر فائز ہونے کے بعد قتیبہ کی اس شاندار زندگی کا آغاز ہوا جس نے انہیں دنیا کے عظیم ترین فاتحین کی صف میں لا کھڑا کیا۔

قتیبہ نے خراسان کے دارالحکومت مرو (MERV) پہنچ کر سب سے

پہلے اپنی فوج کو خاص قسم کی تربیت دینے کا اہتمام کیا کیونکہ ان کے نزدیک کامیابی کے لیے جذبۂ ایمان کے ساتھ اعلیٰ حربی صلاحیت بھی بہت ضروری تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے اچھے نمونے سے پوری فوج میں اولوالعزمی اور شجاعت وجرأت کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ فوج کی تنظیم نو اور تربیت تسلی بخش طور پر ہو چکی ہے تو ایک دن ساری فوج کو جمع کر کے اس کے سامنے جہاد کی اہمیت اور فضیلت پر ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا۔ اس خطبہ نے سپاہیوں کے دلوں میں شوقِ شہادت کے شعلے بھڑکا دیئے اور وہ راہِ حق میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب وقت آگیا تھا کہ جوشِ جہاد سے سرشار ان مجاہدین کو میدانِ جہاد میں سرگرمِ عمل کر دیا جائے۔ چنانچہ ۸۶ھ میں قتیبہؒ نے ترکستان پر یلغار کر دی۔ ترکستان کے بعض حصوں پر اگرچہ پہلے ہی مسلمانوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا لیکن وہاں کے حکمران وقتاً فوقتاً علمِ بغاوت بلند کرتے رہتے تھے اور اس زمانے میں بھی ان کا رویہ باغیانہ تھا اس کے علاوہ بعض علاقوں نے ابھی تک اسلامی حکومت کی اطاعت قبول نہ کی تھی۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت ترکستان کے حکمرانوں میں باہم منافست تھی۔ قتیبہ طالقان پہنچے تو بلخ کے سردار بھی اطاعت قبول کر کے ان سے آملے۔ اس کے بعد قتیبہ نے دریائے جیحوں کو جگہ کاٹ کر عبور کیا اور صغانیاں کی طرف بڑھے۔ شاہ صغانیان کو مقابلہ کی ہمت نہ پڑی اس نے تحائف و ہدایا کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور سونے کی کنجی ان کی خدمت میں پیش کر کے اپنا مہمان بنایا۔ صغانیاں سے قتیبہؒ نے طخارستان (علاقۂ بدخشاں) کا رُخ کیا۔ شاہ اخرون وشومان (طخارستان) کو جب اپنے حریف شاہ صغانیاں کی اطاعت کا حال معلوم ہوا تو اس نے بھی ایک کثیر رقم خراج کے طور پر دے کر اطاعت قبول کر لی۔ ان دونوں کو مطیع کرنے کے بعد قتیبہ اپنے بھائی صالح بن مسلم کو مفتوحہ علاقوں کے انتظام و نگرانی کے لیے چھوڑ کر مرو واپس آگئے۔ ان کی واپسی کے بعد صالح نے اپنے ساتھی، آزمودہ کار جرنیل نصر بن سیار کی مدد سے کاشان اور فرغانہ کے علاقے میں واقع شہر خشک (اخشیکت) بیغر اور

اور ست فتح کیے۔

مرو واپس پہنچ کر قتیبہ کو معلوم ہوا کہ بادغیس کے تورانی حکمران نیزک کے پاس عرصہ سے کچھ مسلمان قید ہیں۔ قتیبہؒ نے نیزک کو ان مسلمانوں کی رہائی کے لیے لکھا اس نے انہیں فوراً رہا کر دیا اور اس شرط پر اطاعت قبول کرلی کہ مسلمان بادغیس پر حملہ نہیں کریں گے۔ اس کے بعد وہ ترکستان کے معرکوں میں قتیبہ کا معاون و مددگار بن گیا۔

(۳)

۸۷ھ میں قتیبہؒ نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے بھروسے پر دریائے جیحوں کو عبور کیا اور ماوراء النہر (یا بلادِ بخارا) کے اہم شہر بیکند کی طرف پیشقدمی کی۔ بیکند بت پرستوں کا نہایت مضبوط گڑھ تھا اور وہاں ایشیا بھر میں سب سے عمدہ اسلحہ تیار ہوتے تھے۔ اہلِ بیکند کو قتیبہ کی پیشقدمی کی خبر ملی تو انہوں نے صغد اور قرب و جوار کی دوسری قوموں سے مدد مانگی۔ ان قوموں نے بڑھ کر مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا اور سارے راستے روک لیے۔ دو مہینے تک یہ کیفیت رہی کہ نہ قتیبہ کا کوئی قاصد اسلامی علاقے میں جا سکتا تھا اور نہ اسلامی حکومت کا کوئی قاصد ان سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ حجاج بن یوسف والئ بصرہ اس صورت حال سے بہت پریشان ہوا اور اس نے تمام مسجدوں میں قتیبہ اور ان کے لشکر کی سلامتی کی دعائیں کرائیں۔ ادھر قتیبہؒ نے اس خطرناک صورت حال کا بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ مقابلہ کیا۔ نہ دشمن کی کثرتِ تعداد نے ان کو ہراساں کیا اور نہ دشمن کی اڑائی ہوئی اس جھوٹی افواہ نے کہ حجاج فوت ہو گیا، ان کے پائے استقلال میں جنبش آنے دی۔ ایک دن مسلمان سروں سے کفن باندھ کر دشمنوں پر اس طرح ٹوٹ کر گرے کہ ان کا گھیرا ٹوٹ گیا اور وہ شہر کی طرف بھاگ گئے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ایک کثیر تعداد کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا۔ پھر بھی بہت سے بھگوڑے شہر میں داخل ہو گئے اور دروازے بند کر لیے۔ قتیبہ نے نہایت سختی سے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ایک

روایت کے مطابق یہ محاصرہ پچاس دن تک جاری رہا۔ اس اثناء میں قتیبہ نے فصیل شہر کو گرانے کے لیے اس پر کاری ضربیں لگانی شروع کردیں۔ اہل بیکند کو جب یقین ہوگیا کہ فصیل ٹوٹنے کی صورت میں ان کا زیادہ نقصان ہوگا تو انہوں نے اطاعت قبول کرلی اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ قتیبہ نے شہر میں داخل ہوکر چند دن وہاں قیام کیا اور پھر ورقہ بن نصر کو بیکند کا عامل مقرر کرکے مرو کو واپسی کا عزم کیا۔ ابھی وہ پانچ فرسخ ہی گئے تھے کہ اہل بیکند نے بغاوت کردی اور ورقہ بن نصر کو شہید کرڈالا۔ قتیبہ کو ان لوگوں کی غداری کی اطلاع ملی تو وہ غضب ناک شیر کی طرح واپس آئے اور شہر کو بزور شمشیر مسخر کرکے تمام فتنہ پردازوں کا قلع قمع کرڈالا ساتھ ہی شہر پناہ کو بھی منہدم کراکے زمین کے برابر کردیا۔ ایک یک چشم بیکندی جو بغاوت کا سرغنہ تھا جب گرفتار ہوکر قتیبہ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اپنی جان کے فدیہ میں ریشمی کپڑے کے پانچ ہزار تھان دینے کی پیشکش کی۔ ان کی قیمت دس لاکھ درہم بنتی تھی لیکن قتیبہ نے اس کی پیشکش کو ٹھکرادیا اور یہ کہہ کر اس کو قتل کرادیا کہ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاسکتا۔ بیکند سے مسلمانوں کو کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس میں ہیرے جواہرات، اسلحہ اور سونے چاندی کے لاتعداد برتن بھی شامل تھے۔ مؤرخین نے بیکند کے ایک بت کدے کا ذکر کیا ہے جس میں کئی بت ٹھوس خالص سونے کے تھے اور چالیس ہزار درہم کی چاندی تھی۔ ایک بت کی آنکھوں کی جگہ دو ہیرے تھے جو کبوتر کے انڈوں جتنے تھے۔ قتیبہ نے یہ دونوں ہیرے مع دیگر سامان حجاج بن یوسف کو بھیج دیئے۔ اس نے ایک خط میں ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی شجاعت و بسالت کی تعریف کی۔

بیکند نہ صرف ایک بارونق اور متمول شہر تھا بلکہ فوجی نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اسے ماوراء النہر (وسط ایشیا) کا جنوبی دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ بیکند میں تیار ہونے والے اسلحہ کی بھی سارے ایشیا میں بڑی دھوم تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں سے مال غنیمت میں حاصل ہونے والے ہتھیار اگرچہ سپاہیوں میں بانٹ دیئے

گئے تھے پھر بھی ان کی اس قدر مانگ تھی کہ ایک ایک نیزہ ستر درہم میں بکا۔ تلوار دو سو درہم میں اور سپر اس سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئی۔ بیکند پر مکمل تسلط جمانے کے بعد قتیبہ واپس مرو آ گئے۔

(۲)

۸۸ھ ہجری کے موسم بہار میں قتیبہؒ پھر مناسب تیاریوں کے ساتھ مرو سے بلادِ بخارا کی جانب روانہ ہوئے اور نومشکث کو فتح کرتے ہوئے رامیثنہ (یا رامثنہ) پہنچے۔ وہاں کے باشندوں نے صلح کی درخواست کی جو قتیبہؒ نے منظور کر لی۔ ان مہمات سے فارغ ہو کر انہوں نے مرو کو واپسی کا ارادہ کیا۔ راستے میں صغدی، ترکی، فرغانی اور چینی نوجوں نے متحد ہو کر اسلامی لشکر کے پچھلے حصے (ساقہ) پر حملہ کر دیا۔ دشمنوں کے متحدہ لشکر کی قیادت خاقانِ چین کا بھتیجا (یا بروایتِ دیگر بھانجا) کر رہا تھا۔ قتیبہ اپنے لشکر کے ساتھ آگے نکل چکے تھے۔ امیر ساقہ عبدالرحمٰن بن مسلم نے اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ بڑی بہادری سے دشمن کے لشکرِ عظیم کو روکا اور اپنے بھائی قتیبہ کو اس حملہ کی اطلاع دی۔ قتیبہ یہ اطلاع ملتے ہی پلٹ پڑے اور دشمنوں کے ٹڈی دَل پر قہرِ خدا بن کر لوٹ پڑے۔ دو لاکھ دشمن جنگجوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن انہوں نے اپنے جوشِ ایمان کی بدولت دشمن کے متحدہ لشکر کو شکست فاش دی۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ اس لڑائی میں بادغیس کے حکمران نیزک نے مسلمانوں کو قابلِ قدر امداد دی اور خود بھی اسلامی لشکر میں شامل ہو کر بڑی بہادری سے لڑا۔ اس معرکے سے فارغ ہو کر قتیبہ ترمذ کے راستے واپس مرو آ گئے۔

۸۹ھ ہجری میں قتیبہؒ نے پھر بخارا کے قصد سے دریائے جیحوں کو عبور کیا۔ خرقانہ سفلی کے مقام پر پہنچے تو دشمن کا ایک بڑا لشکر ان کے مزاحم ہوا۔ قتیبہ نے اس لشکر کو شکست دی اور بخارا کے قریب پہنچ گئے۔ علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ شاہِ بخارا نے صلح کر کے اطاعت قبول کر لی لیکن ابنِ اثیر کہتے ہیں کہ بعض مشکلات کی بناء پر قتیبہؒ بخارا پر قبضہ نہ کر سکے۔ انہوں نے حجاج بن یوسف کو سارے حالات لکھ بھیجے۔ اس

نے بخارا کا نقشہ مانگ بھیجا اور اسے دیکھ کر پیشقدمی اور جنگ کے متعلق مفصل ہدایات بھیجیں یہاں تک کہ بخارا پر یلغار کرنے کی سمت بھی متعین کر دی اور راستہ میں پڑاؤ ڈالنے کے مقامات بھی مقرر کر دیئے۔ قتیبہؒ نے حجاج کی ہدایات کے مطابق تیاری کی اور ۹۰ھ میں دوبارہ بخارا پر حملہ آور ہونے کے لیے مرو سے چل پڑے۔

اگر بلاذریؒ کا یہ بیان درست تسلیم کر لیا جائے کہ شاہِ بخارا نے ۸۹ھ میں مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تھی تو ۹۰ھ میں بخارا پر قتیبہؒ کی لشکرکشی کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ شاہِ بخارا نے بغاوت کر دی تھی اور مسلمانوں کے حلقۂ اطاعت کو توڑ ڈالا تھا۔

(۵)

شاہِ بخارا کو قتیبہ کی پیشقدمی کی اطلاع ملی تو اس نے بڑے زور شور سے مقابلے کی تیاری کی اور اپنی مدد کے لیے ترکوں اور اہلِ صغد کو بھی بلا بھیجا لیکن ابھی یہ مدد پہنچنے نہ پائی تھی کہ قتیبہ نے بخارا کا محاصرہ کر لیا۔ جب ترکوں اور صغدیوں کا لشکر مدد کے لیے پہنچا تو اہلِ بخارا کی ہمت قوی ہوئی اور وہ بڑے جوش و خروش سے مقابلہ کے لیے نکلے۔ اس طرح اسلامی فوجیں دونوں طرف سے دشمنوں کے بیچ میں گھر گئیں۔ ترکوں نے مسلمانوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ ان کا ایک حصہ پیچھے ہٹتا ہٹتا عورتوں کے خیموں تک پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر عورتوں نے للکارا اور اپنے مردوں کے گھوڑوں کو مار مار کر میدانِ جنگ کی طرف دھکیل دیا۔ عورتوں کے اس اقدام سے مردوں کو بڑی غیرت آئی انہوں نے سنبھل کر ایسا تند و تیز حملہ کیا کہ ترکوں اور صغدیوں کو دھکیل کر قریبی نہر کے پار پہنچا دیا جہاں انہوں نے ایک اونچے ٹیلے پر پناہ لی۔ اس موقع پر قتیبہ نے للکار کر کہا "آج کون قبیلہ ہے جو دشمن کو اس ٹیلہ سے ہٹا دے۔" ان کی للکار سن کر بنو تمیم کے دو سرداروں وکیع بن الاسود اور ہریم نے اپنے قبیلہ کے جوانوں کے ساتھ لے کر مردانہ وار نہر کو عبور کیا اور دشمن پر جا پڑے۔ وکیع نے حملہ کے وقت کہہ دیا تھا کہ جو شہادت کا آرزومند ہے وہی میرے ساتھ چلے، دوسرا کوئی شخص ہرگز میرا ساتھ نہ دے۔ کہا جاتا ہے کہ آٹھ سو جانبازوں نے وکیع کے ہاتھ پر

موت کی بیعت کی اور نہر عبور کرنے کے بعد دشمنوں پر برقِ بے امان بن کر گرے۔ یہاں تک کہ ان کے قدم اکھڑ گئے۔ شاہِ بخارا نے بھی راہِ فرار اختیار کی اور قتیبہ نے فوراً بخارا پر پرچمِ اسلام بلند کر دیا۔ مسلمانوں کی اس شاندار فتح نے صغدیانہ (SOGHDIANA) کے حکمران کو دہشت زدہ کر دیا اور اس نے صلح کر کے اطاعت قبول کر لی۔ پروفیسر آرمینس ویمبرے نے "تاریخ بخارا" میں لکھا ہے کہ قتیبہ نے عین لڑائی کے دوران میں صغدیانہ کے حکمران کو ایک قاصد کے ذریعے خفیہ پیغام بھیجا جس میں اس کو اس کے اتحادیوں سے بدظن کر دیا اور اس نے قتیبہ سے خفیہ صلح کر لی اور بیس لاکھ درہم ہر سال بطور خراج دینے منظور کر لیا۔ چونکہ اتحادی لشکر میں اس کے آدمیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اس لیے اس کے میدانِ جنگ سے ہٹ جانے پر اہلِ بخارا اور ترک بھی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو، قتیبہؒ نے مظفر و منصور مرو کو مراجعت کی اور وہاں سے حجاج کو تسخیرِ بخارا کی خوشخبری بھیجی۔

(۶)

قتیبہ کو مرو واپس آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ انہیں بادغیس کے حکمران نیزک کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ نیزک نے اب تک ہر معرکے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا لیکن ترکستان میں ان کی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھ کر اس کو قتیبہ کی طرف سے خوف پیدا ہو گیا اور وہ ان سے خار کھانے لگا۔ مہم بخارا کے بعد وہ قتیبہ سے اجازت لے کر بادغیس آ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے کابل، بلخ، طالقان، فاریاب، جوزجان وغیرہ کے تمام حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملا کر علمِ بغاوت بلند کر دیا اور طخارستان سے مسلمان حاکم کو نکال دیا۔ اس وقت موسم سرما کی آمد آمد تھی اس لیے کسی بڑی مہم کا بھیجنا ممکن نہیں تھا تاہم قتیبہ نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن مسلم کو بارہ ہزار فوج دے کر طخارستان (بروایت دیگر بلخ یا بردقان) روانہ کیا اور ہدایت کی کہ وہاں پہنچ کر ان کا انتظار کیا جائے۔ جاڑوں کا موسم ختم ہوتے ہی ۹۱ھ میں قتیبہ خود اپنے لشکر کے ساتھ باغیوں کی سرکوبی

کے لیے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے طالقان کو ایک خونریز لڑائی کے بعد مسخر کیا اور باغیوں کو قرار واقعی سزا دی۔ ایک اور روایت کے مطابق اہلِ طالقان نے مقابلہ کے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیئے اس لیے قتیبہ نے ان کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ فاریاب کی طرف بڑھے، وہاں کے فرمانروا نے بھی اطاعت قبول کرلی اس لیے قتیبہ نے درگزر سے کام لیا۔ فاریاب سے انہوں نے جوزجان کا رُخ کیا۔ وہاں کا حکمران پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا اور اہلِ شہر نے اطاعت قبول کرلی۔ قتیبہ نے عامر بن مالک کو جوزجان چھوڑا اور خود نیزک کی تلاش میں بلخ سے ہوتے ہوئے خلم کی گھاٹی میں اپنے بھائی عبدالرحمن سے جا ملے جو وہاں قتیبہ کے انتظار میں خیمہ زن تھے۔ یہ ایک پُرپیچ اور دشوار گزار گھاٹی تھی اور نیزک نے اسی کے اندر اپنا اڈا قائم کر رکھا تھا۔ گھاٹی کے دہانہ پر بہت سے مسلح جنگجو اس کی حفاظت پر متعین تھے اور پشت پر ایک مستحکم قلعہ تھا جس تک پہنچنے کا بظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ حسنِ اتفاق سے قتیبہ کو وہاں کے ایک پہاڑی باشندے نے وہ پوشیدہ راستہ بتا دیا جو پہاڑی کی پشت پر جا کر قلعہ میں نکلتا تھا۔ قتیبہؒ نے ایک دستۂ فوج اس پہاڑی باشندے کے ساتھ کر دیا۔ ان لوگوں نے یکایک اہلِ قلعہ کو جا لیا۔ بہت سے مارے گئے اور جو زندہ بچ گئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ نیزک وہاں سے بھاگ کر وادیٔ فرغانہ کے قلعہ الکرز میں بند ہو گیا۔ یہ قلعہ بہت محفوظ تھا اور کسی فوجی دستے کا اس کے اندر داخل ہونا سخت محال تھا۔ قتیبہ نے دو ماہ تک اس قلعے کا محاصرہ کیے رکھا لیکن اس کی تسخیر کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ ادھر موسم سرما قریب آ رہا تھا اور مسلمانوں کا سامان رسد بھی تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ آخر قتیبہؒ کو ایک تدبیر سوجھی۔ انہوں نے نیزک کے ایک پرانے با اعتماد ساتھی سلیم نامی کو اس کے پاس روانہ کیا کہ جیسے بھی بن پڑے نیزک کو سمجھا بجھا کر ان کے پاس لے آئے۔ سلیم نیزک کو جاں بخشی کی امید دلا کر قتیبہ کے پاس لے آیا۔ قتیبہ نے اس کو قید کر دیا اور پھر اس کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے حجاج بن یوسف سے بھی اس کے بارے میں استصواب

کیا۔ سب نے اس کے قتل کا مشورہ دیا کیونکہ اس نے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نیزک کو اس کے سات سو ساتھیوں سمیت قتل کرا دیا۔

نیزک کے فتنہ کے خاتمہ کے بعد قتیبہ نے شومان کا رُخ کیا جہاں کے حکمران نے کش اور نسف کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ قتیبہ نے پہلے دو قاصد بھیج کر فرمانروائے شومان کو اطاعت قبول کرنے کی ترغیب دی لیکن اسے اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا اس نے ایک قاصد کو قتل کر دیا اور دوسرا جان بچا کر بھاگ آیا۔ اب قتیبہ کو مجبور ہو کر اس پر چڑھائی کرنی پڑی۔ قریب پہنچ کر قتیبہ کے بھائی صالح بن مسلم نے ایک مرتبہ پھر اس کو سمجھایا لیکن وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہ ہوا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ قتیبہؒ نے منجنیقوں سے پتھر برسا کر قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے۔ فرمانروائے شومان نے قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن مسلمانوں نے ایک ہی جھڑپ میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شومان پر قبضہ کرنے کے بعد قتیبہ نے کش اور نسف کو تسخیر کیا اور اپنے بھائی صالح کو بھیج کر صغدیانہ کے حکمران سے خراج وصول کیا۔ ان مہمات سے فارغ ہو کر قتیبہؒ نے مرو کو مراجعت کی۔ ۹۲ھ میں انہوں نے سجستان پر لشکر کشی کی لیکن وہاں کے فرمانروا نے کسی مزاحمت کے بغیر اطاعت قبول کر لی اور قتیبہ واپس مرو آ گئے۔

(۷)

۹۳ھ ہجری میں خوارزم (خیوا) کے فرمانروا "خوارزم شاہ" نے قتیبہ کی اطاعت قبول کی۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس زمانے کا خوارزم شاہ ایک کمزور حکمران تھا۔ اس کا بھائی خرزاد اس کو عضوِ معطل بنا کر تمام امورِ سلطنت پر حاوی ہو گیا تھا وہ ایک سفاک اور بدکردار آدمی تھا اور ساری رعیت کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ خوارزم شاہ اس کے مقابلے میں بے بس تھا اور مطلق دم نہ مار سکتا تھا تاہم اس کو خرزاد سے دلی نفرت تھی اور وہ اس کے پنجۂ ستم سے نجات حاصل کرنے کے لیے موقع کا منتظر تھا۔ جب ترکستان میں قتیبہ کی فتوحات اور قوت کا شہرہ ہوا تو خوارزم شاہ نے ان

کو خفیہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ اس کو خرزاد کے پنجۂ ستم سے نجات دلا دیں تو وہ ان کی اطاعت قبول کرلے گا۔ قتیبہ نے اس کی درخواست قبول کرلی اور خرزاد پر لشکر کشی کر کے اس کو شکست دی اور پھر قتل کرا دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق انہوں نے خرزاد اور اس کے حواریوں کو گرفتار کر کے خوارزم شاہ کے حوالے کر دیا جس نے سب کو قتل کرا دیا۔ قتیبہ نے وعدہ کے مطابق سلطنت خوارزم شاہ کے حوالے کردی۔ اس نے اپنے عہد کے مطابق قتیبہ کی اطاعت قبول کرلی اور بہت سا نقد و جنس ان کی نذر کیا۔ علامہ بلاذری نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے کہ اس واقعہ کے بعد خوارزم شاہ کو بھی زیادہ عرصہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا کیونکہ اس کی کمزوری اور نااہلی کی وجہ سے رعایا اس سے جلد ہی بیزار ہو گئی اور شورش برپا کر کے اس کو قتل کر دیا۔ قتیبہؒ کو اس کے قتل کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے بھائی عبید اللہ بن مسلم کو خوارزم کا حاکم مقرر کر دیا۔

(۸)

خوارزم (خیوا KHEWA) پر استیلا کے بعد قتیبہ سمرقند کی تسخیر کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ سمرقند جس کا قدیم نام مارکنڈا تھا، اس زمانے میں وسط ایشیا میں تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کی تجارت تبت، چین اور ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی اور اس وجہ سے یہ دور دور تک مشہور تھا۔ اسی تجارت کے سبب سمرقند اپنے دور کا نہایت پُر رونق شہر تھا۔ اہل سمرقند یعنی صغد نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی تھی لیکن پھر اپنے عہد سے منحرف ہو گئے تھے اور مسلمانوں کے خلاف ترکستان کے باغی حکمرانوں کی مدد کی تھی۔ سمرقند پر قتیبہ کی لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ صغد کی فتنہ پردازیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔ پہلے انہوں نے اپنے بھائی صالح (یا بروایت دیگر عبدالرحمٰن) کو ایک دستۂ فوج کے ساتھ سمرقند کی طرف روانہ کیا اور تین چار دن بعد خود بھی ایک جرار لشکر کے ساتھ اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ اس لشکر میں بخارا اور خوارزم کے بیس ہزار سپاہی بھی شامل تھے۔ سمرقند کے قریب پہنچ کر دونوں لشکر یکجا ہو گئے۔ اہلِ سمرقند کو کھلے میدان میں مسلمانوں کے

مقابل ہونے کی ہمت نہ پڑی اور وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ قتیبہ نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جب محاصرے کو ایک مہینہ گزر گیا تو اہل سمرقند نے اپنے پڑوسی حکمرانوں، بادشاہِ شاش، حاکمِ فرغانہ اور خاقانِ چین وغیرہ کو لکھا کہ اگر آج عربوں نے ہمیں مغلوب کر لیا تو کل تم بھی اس انجام سے نہ بچ سکو گے اس لیے ہماری جو مدد بھی کر سکتے ہو، کرو —— یہ حکمران پہلے ہی قتیبہ کی روز افزوں قوت سے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے اہل سمرقند کا پیغام ملتے ہی اپنی اپنی فوجیں ان کی مدد کے لیے روانہ کر دیں۔ ان میں شاہی خاندانوں کے افراد، بڑے بڑے امراء اور نامور بہادر شامل تھے اور ان سب کی قیادت خاقانِ چین کا بیٹا کر رہا تھا۔ قتیبہ کو اس امدادی لشکر کے آنے کی خبر ملی تو انہوں نے صالح کو چھ سو منتخب شہسوار دے کر اس امدادی لشکر کو روکنے پر مامور کیا۔ صالح نے آگے بڑھ کر اپنی فوج کے تین حصے کیے۔ دو حصوں کو دائیں بائیں گھاٹیوں کے اندر گھات میں بٹھا دیا اور خود امدادی فوج کے راستے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ رات گئے جونہی دشمن کا لشکر ادھر سے گزرا صالح نے اس پر حملہ کر دیا اور دوسرے مجاہدین بھی کمین گاہوں سے نکل کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس ناگہانی حملے نے دشمنوں کو حواس باختہ کر دیا۔ انہوں نے کچھ دیر مقابلہ کیا لیکن بُری طرح شکست کھائی۔ ان کے بہت سے نامور بہادر اور شہزادے مارے گئے جو زندہ بچ گئے وہ بھاگ نکلے یا مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔

امدادی فوج کی شکست کی خبر سمرقند پہنچی تو صغد کو سخت دھچکا لگا تاہم انہوں نے مقابلہ جاری رکھا۔ ادھر قتیبہ نے محاصرہ کو اور سخت کر دیا اور منجنیقوں سے فصیل شہر پر لگاتار پتھر برسانے شروع کر دیئے یہاں تک کہ اس میں شگاف پڑ گیا۔ مسلمان سرفروشوں کی ایک جماعت تیروں کی بارش میں ڈھالوں کو اپنے چہروں کی آڑ بناتے ہوئے اس شگاف کے سامنے پہنچ کر جم گئی۔ اب اہل سمرقند کی ہمت بالکل جواب دے گئی۔ اور انہوں نے ان شرائط پر صلح کر کے شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا:

(۱) اہلِ سمرقند ۲۰ لاکھ (بروایتِ دیگر بائیس لاکھ) درہم سالانہ خراج ادا کریں گے

(۲) تین دن تک مسلمانوں کی دعوت کریں گے۔

(۳) بت خانوں پر مسلمانوں کو اختیار حاصل ہوگا۔

(۴) مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوں گے اور ان کے داخلہ کے وقت مسلح آبادی شہر سے نکل جائے گی۔

(۵) مسلمان شہر میں مسجد بنا کر نماز پڑھا کریں گے اور خطبہ دیا کریں گے۔

اس معاہدہ کے مطابق مسلمان شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے لیکن مقررہ خراج کے علاوہ انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا اور ہر شخص کو اپنے مال اور جائداد پر قابض رہنے دیا البتہ قتیبہ بتوں کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے ان بتوں کو نذرِ آتش کرنے کا ارادہ کیا تو اہل سمرقند نے ان سے کہا کہ یہ ہمارے دیوتا ہیں ہم آپ کو خیرخواہانہ مشورہ دیتے ہیں کہ انہیں ہاتھ نہ لگائیں ورنہ یہ آپ کو برباد کر دیں گے۔ قتیبہؒ ان کی توہم پرستی اور مشرکانہ عقیدے پر ہنس پڑے اور انہیں بڑی نرمی سے سمجھایا کہ یہ بت کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ کہہ کر اپنے ہاتھ سے ان بتوں کو آگ لگا دی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ بت پگھل گئے تو ان میں سے ۵۰ ہزار مثقال سونا نکلا۔ علامہ بلاذری نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے کہ جب اہل سمرقند نے دیکھا کہ بتوں کو نذرِ آتش کرنے کے بعد قتیبہ کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تو ان کی ایک بڑی تعداد اسی وقت مشرف باسلام ہو گئی۔ اس کے بعد قتیبہ نے شہر میں مسجد تعمیر کر کے اس میں باجماعت نماز ادا کی اور خطبہ دیا۔

بعض مؤرخین نے فتح سمرقند کے سلسلے میں ایک عجیب کہانی بیان کی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ قتیبہؒ نے کسی حیلہ سے چار ہزار بند صندوق شہر کے اندر پہنچا دیئے۔ ان صندوقوں میں مسلح آدمی بٹھا دیئے گئے تھے۔ رات کو ان زرہ پوش مسلح جنگجوؤں نے صندوقوں سے نکل کر تہلکہ برپا کر دیا اور محافظوں کو ہلاک کر کے شہر کے دروازے کھول دیئے، اس کے ساتھ ہی قتیبہ اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہو گئے اور اہلِ سمرقند کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ بظاہر یہ کہانی لغو معلوم ہوتی ہے۔

سمرقند کی تسخیر کے بعد قتیبہ نے عبداللہ بن مسلم کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور کچھ فوج اس کے پاس چھوڑ کر مرو واپس آ گئے۔

(۹)

۹۴ھ میں قتیبہ نے ان حکمرانوں کی گوشمالی کا ارادہ کیا جنھوں نے اہل سمرقند کی مدد کی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک لشکر الشاش کی طرف روانہ کیا جس نے اس کو چند دن کے اندر فتح کر لیا۔ پھر وہ خود فرغانہ کی طرف بڑھے۔ راستے میں خوجندی ان کے مزاحم ہوئے، قتیبہ نے انہیں عبرت ناک شکست دی اور یلغار کرتے ہوئے فرغانہ کے دارالسلطنت کاشان تک پہنچ گئے۔ اس شہر کو فتح کر کے وہ اسبیجاب تک بڑھتے چلے گئے۔ جہاں سے چین کے حدود شروع ہو جاتے تھے۔ اسی زمانے میں حجاج بن یوسف فوت ہو گیا۔ قتیبہ کو اس کی وفات کی خبر ملی تو وہ سرحد چین سے واپس مرو آ گئے۔

۹۶ھ میں قتیبہ نے بڑے اہتمام سے چین پر فوجکشی کی تیاری کی کیونکہ خاقانِ چین نے اہلِ سمرقند کی مدد کے لیے اپنا بیٹا بھیجا تھا اور اس سے پہلے بھی وہ مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد کر چکا تھا۔ قتیبہ نے مجاہدین کے اہل و عیال کو حفاظت کے خیال سے ایک مضبوط فوج کی نگرانی میں سمرقند چھوڑ دیا اور خود پیشقدمی کرتے ہوئے فرغانہ پہنچ گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایک لشکر چین روانہ کیا جو کاشغر کو تسخیر کرتا ہوا چین کے علاقے میں دُور تک بڑھتا چلا گیا۔ قتیبہ بھی آگے بڑھ کر کاشغر میں خیمہ زن ہو گئے۔ خاقانِ چین کو مسلمانوں کی یلغار کی خبر ہوئی تو وہ گھبرا گیا کیونکہ یلغار کرنے والی وہ قوم تھی جس نے سارے وسطِ ایشیا کو زیروزبر کر ڈالا تھا۔ خاقانِ چین نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ مسلمانوں کے سپہ سالار سے گفت و شنید کرے۔ چنانچہ اس نے ایک قاصد یہ پیغام دے کر قتیبہ کے پاس بھیجا کہ میرے پاس اپنے کسی معتبر آدمی کو سفیر بنا کر بھیجو تاکہ میں اس سے تمہارے مقاصد کے بارے میں معلومات حاصل کر دوں۔

خاقانِ چین کا سفیر قتیبہ کے پاس آیا تو وہ کاشغر سے باہر اپنے پڑاؤ کے کھلے

میدان میں زمین پر چادر بچھائے دوسرے مسلمانوں کے شانہ بشانہ نمازِ عصر پڑھ رہے تھے۔ جب سفیر کو اشارہ کر کے بتایا گیا کہ مسلمانوں کا سپہ سالار وہ شخص ہے تو وہ ورطۂ حیرت میں پڑ گیا کیونکہ قتیبہ اور دوسرے مسلمانوں کے لباس میں کوئی فرق نہ تھا وہ تو اپنے فرمانروا کے دربار کی شان وشوکت اور جاہ وجلال دیکھنے کا عادی تھا اس کے تصور میں خاقان کے عظیم الشان محلات، سنہری مرصع تخت اور زرق برق لباس پہنے ہوئے چوبدار آنے لگے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ مسلمانوں کا سپہ سالار اور حاکمِ اعلیٰ اس قدر سادگی پسند ہوگا۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھا:

"جس فوج کا امیر ایسا ہو وہ کبھی مات نہیں کھا سکتی۔"

سفیر نے خاقان کا پیغام قتیبہ کو دیا تو انہوں نے ہبیرہ بن مشرج (یا مشمرج) کلابی کی قیادت میں دس عقلمند اور خوش بیان آدمیوں کی ایک سفارت خاقانِ چین کے دربار میں بھیجی اور اسے خاقان کے نام یہ پیغام دیا کہ میں جب تک سرزمین چین کو پامال کر کے تم سے خراج وصول نہ کر لوں گا واپس نہ جاؤں گا۔

یہ سفارت خاقانِ چین کے دربار میں پہنچی اور وہاں کئی روز تک قیام کیا۔ اس دوران میں اراکینِ سفارت کی خاقان سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات میں خاقان نے ہبیرہ سے کہا:

"تم معقول آدمی نظر آتے ہو، جاؤ اور اپنے سردار سے کہہ دو کہ اس کی خیر لوٹ جانے ہی میں ہے۔ مجھے تمہارے لشکر کی قلت تعداد کا علم ہو چکا ہے اگر تم لڑنے پر اصرار کرتے رہے تو میں ایسی فوجِ گراں تمہارے مقابلے پر بھیجوں گا جو تمہارا نام ونشاں تک مٹا دے گی۔"

ہبیرہ نے جواب دیا:

"اے بادشاہ، اس لشکر کو تھوڑا کون کہہ سکتا ہے جس کا ایک سرا چین میں ہو اور دوسرا ملک شام میں۔ ہم لوگ موت کو کھیل سمجھتے ہیں! اس سے ہرگز نہیں ڈرتے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے

اور میدانِ جنگ میں تو موت کو ہم سعادت سمجھتے ہیں۔"
ہبیرہ کے بے باکانہ جواب سے خاقان مرعوب ہوگیا اور اس نے پوچھا:
"تمہارا سپہ سالار کن شرائط پر صلح کر سکتا ہے۔"
ہبیرہ نے کہا "وہ قسم کھا چکا ہے کہ جب تک وہ تمہاری زمین کو روند کر تم سے خراج وصول نہ کرلے، واپس نہیں جائے گا۔"

خاقان کو مسلمانوں کی قوت کا پورا پورا اندازہ تھا اور وہ ان سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کہا، ہم تمہارے سردار کی قسم پوری کر دیں گے۔ پھر اس نے چند طشتوں میں کچھ مٹی، اور بہت سے قیمتی ہدایا و تحائف قتیبہ کے پاس بھیجے۔ ساتھ ہی ایک خطیر رقم خراج کے طور پر بھی بھیجی اور صلح کی درخواست کی۔ قتیبہؒ نے مٹی کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا اور صلح کی پیش کش منظور کر کے مرو کو مراجعت کی۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ قتیبہ کا مقصد چین پر قبضہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ صرف خاقانِ چین کے خطرے کا انسداد کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ خاقان نے صلح جویانہ رویہ اختیار کیا اس لیے انہوں نے اس سے خراج وصول کرنے پر اکتفا کیا اور واپس مرو چلے گئے۔

۱۰

جس زمانے میں قتیبہ چین کی مہم میں مصروف تھے۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے وفات پائی اور سلیمان بن عبدالملک مسندِ خلافت پر بیٹھا۔ سلیمان ولید کے دور کے تمام عمال بالخصوص حجاج بن یوسف اور اس کے ماتحت حکام کے سخت خلاف تھا۔ قتیبہ بھی ان میں شامل تھے۔ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ولید نے کسی بات پر ناراض ہو کر سلیمان کی ولی عہدی منسوخ کرنی چاہی تھی تو حجاج اور قتیبہ دونوں نے اس کی تائید کی تھی اس بناء پر سلیمان کے دل میں ان دونوں کے خلاف کھٹک تھی۔ حجاج تو ولید کی زندگی ہی میں فوت ہوگیا تھا اب صرف قتیبہ باقی تھے تاہم سلیمان نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد قتیبہ سے مطلق کوئی تعرض نہ کیا او

انہیں خراسان کی حکومت پر بحال رکھا لیکن خود قتیبہ کو سلیمان کی جانب سے سخت بدگمانی تھی اور انہیں یقین تھا کہ سلیمان جلد ہی ان کے حریف یزید بن مہلب کو خراسان کا گورنر مقرر کر دے گا۔ چنانچہ انہوں نے سلیمان کو اپنے خطوں میں جہاں اپنی وفاداری کا یقین دلایا وہاں وسطِ ایشیا میں اپنی خدمات کا ذکر کر کے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر ان کی جگہ یزید بن مہلب کو خراسان کی ولایت پر مامور کیا گیا تو وہ سلیمان کے حلقۂ اطاعت سے نکل جائیں گے۔ سلیمان نے ابھی ان کے دھمکی والے خط کا جواب نہیں بھیجا تھا کہ قتیبہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے سلیمان کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ قتیبہ نے اپنے ماتحتوں کو بھی ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کرنے کے لیے کہا لیکن خلافِ توقع انہوں نے ایسا کرنے میں تامل کیا۔ اس پر قتیبہ نے قبیلہ بنو تمیم کے بارے میں کچھ سخت الفاظ کہے کیونکہ وہی سلیمان کی سب سے بڑھ کر حمایت کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وکیع بن الاسود تمیمی تمام بنو تمیم کو ساتھ لے کر قتیبہ کے مقابلہ پر آ گیا۔ ہزاروں عجمیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ فریقین میں خونریز لڑائی ہوئی جس میں خلیفہ سلیمان کے حامیوں کا پلہ بھاری رہا اور قتیبہ اپنے بھائیوں اور لڑکوں سمیت مردانہ وار لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں کام آئے۔ کامیاب فریق نے ان کا سر کاٹ کر سلیمان کے پاس بھجوا دیا۔ یہ واقعہ ۹۶ھ کا ہے۔

قتیبہ بن مسلم جیسے عظیم فاتح کے اس انجام پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ ایک ایسا سپہ سالار جس کی عسکری صلاحیتوں نے بڑے بڑے طاقتور حکمرانوں کو اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور جس نے خراسان سے لے کر چین تک سارے وسطِ ایشیا کو ملا ڈالا تھا، صرف آپس کی بدگمانی اور مخالفت کی نذر ہو گیا ابنِ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایک خراسانی نے ان کے قتل کی خبر سنی تو بے ساختہ اس کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے:

"خدا کی قسم اگر قتیبہ جیسا فاتح ہم (اہلِ عجم) میں ہوتا تو ہم اس کی لاش کو محفوظ رکھتے اور دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے وقت اس تابوت کی برکت سے فتح طلب کرتے۔"

امام ربیعۃ الرائی رحمۃ اللہ علیہ

①

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں کی فتوحات کا سیلاب عرب سے نکل کر دُنیا کے دور دراز ملکوں تک پھیل گیا۔ اس زمانے میں فوج میں بھرتی ہونا ہر مسلمان کے لیے بڑی عزت کی بات تھی کیونکہ اس طرح اس کو اللہ کے راستے میں لڑنے کا موقع ملتا تھا۔ بنو اُمیّہ کی حکومت کے ابتدائی دَور کا ذکر ہے کہ دمشق سے ایک لشکر خراسان کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اس لشکر میں ایک نوجوان مجاہد ابو عبدالرحمٰن فروخ بھی تھے جو مدینہ منوّرہ کے رہنے والے تھے۔ فروخ اس لشکر میں شریک ہونے کے لیے جب گھر سے چلنے لگے تو ان کی بیوی اُمید سے تھی۔ وہ خاوند کی جُدائی کے خیال سے کچھ بے چین سی ہو گئی اور ان سے پوچھنے لگی کہ آپ کب تک واپس آجائیں گے؟

فروخ نے کہا کہ میری واپسی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مہم میں کتنا عرصہ لگتا ہے اور پھر میں لڑائی میں زندہ بھی بچ جاتا ہوں، اگر بچ رہا تو ہو سکتا ہے کہ چند ماہ تک واپس آجاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دو چار برس لگ جائیں۔ ہاں اگر لڑائی میں مارا گیا تو پھر جنت میں ہی تم سے ملاقات ہو گی۔ بیوی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا: نہیں، نہیں! ایسا مت کہیں، خدا آپ کو خیر و عافیت سے واپس لائے۔

فروخ نے بیوی کو تسلی دی اور اس کو بتایا کہ فلاں صندوق میں تیس ہزار اشرفیاں رکھی ہیں۔ یہ میری کُل پونجی ہے۔ اسے احتیاط سے رکھنا۔ میرا ارادہ ہے کہ جہاد سے فارغ ہو کر واپس آؤں تو اس رقم سے تجارت کروں۔ ہاں اگر میری غیر حاضری میں تمھیں کوئی ضرورت پیش آجائے تو تم اس رقم میں سے جتنی چاہو خرچ کر سکتی ہو اور

میرے جانے کے بعد اللہ تمھیں لڑکا یا لڑکی دے تو اس کی پرورش عمدہ طریقے سے کرنا۔ یہ کہہ کر انھوں نے بیوی کو خدا حافظ کہا اور دمشق جا کر اسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔

(۲)

اُس زمانے میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔ ایک مہم کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی۔ یہاں تک کہ فروخؔ کو ان مہموں میں حصّہ لیتے لیتے پورے ستائیس برس گزر گئے، لیکن جہاد میں مصروفیت نے انھیں گھر نہ لوٹنے دیا اور نہ گھر سے ان کا رابطہ ہی قائم ہو سکا۔

اُدھر اُن کے گھر سے نکلنے کے چار پانچ ماہ بعد اللہ نے ان کی بیوی کو چاند سا بیٹا دیا جس کا نام اس نے ربیعہؒ رکھا۔ یہ خاتون بڑی عقل مند اور دُور اندیش تھی۔ گو شوہر کی لمبی جدائی سے اس کی زندگی سوگوار ہو گئی تھی لیکن اس نے بچّے کی پرورش نہایت عمدہ طریقے سے کی اور اس کو پوری توجہ سے تعلیم و تربیت دلائی، یہاں تک کہ اپنے شوہر کی چھوڑی ہوئی اشرفیاں سب کی سب ربیعہؒ کی تعلیم پر خرچ کر دیں۔ لڑکا بھی ذہین اور محنتی تھا۔ اس نے بہت چھوٹی عمر میں قرآنِ پاک حفظ کر لیا اور پھر چند سال کے اندر اندر قرآن، حدیث، فقہ، ادب اور دوسرے تمام علوم پر ایسا عبور حاصل کر لیا کہ اس کے علمی کمالات کی سارے عرب میں دھوپ مچ گئی اور وہ بیس بائیس برس کی عمر میں اپنے وقت کا امام تسلیم کیا گیا۔ لوگ اب نوجوان ربیعہ کو "امام ربیعۃ الرائے" کہتے تھے۔ امام ربیعہؒ کا یہ معمول تھا کہ روزانہ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر لوگوں کو باقاعدگی سے درس دیتے تھے اور طلبا دُور دُور سے آ کر ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوتے تھے۔ ان طلبا میں سے کئی بعد میں خود اپنے وقت کے امام بنے۔ امام مالکؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور کئی دوسرے مشاہیرِ وقت امام ربیعہؒ ہی کے شاگرد تھے۔

(۳)

ستائیس برس کے بعد فروخؔ کو جہاد سے فرصت ملی تو انھوں نے سیدھا وطن

کا رُخ کیا۔ کئی دن کے سفر کے بعد وہ مدینے میں اس شان سے داخل ہوئے کہ گھوڑے پر سوار تھے۔ تلوار کمر سے بندھی ہوئی تھی اور ایک لمبا نیزہ ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر نیزے کی انی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام ربیعہؒ دروازہ کھول کر باہر نکلے ـــــ باپ بیٹا ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ فروخ بے تکلفی سے اندر جانے لگے تو امام ربیعہؒ نے انھیں ٹوکا:

"اے شخص تو میرے مکان میں بلا اجازت کیوں داخل ہو رہا ہے؟"

فرّوخ نے برہم ہو کر کہا: "او دشمنِ خدا یہ میرا اپنا گھر ہے، تو اس میں کیوں گھسا ہوا ہے؟"

امام ربیعہؒ نے بھی بڑا تلخ جواب دیا۔ اس طرح بات بڑھ گئی اور دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ شور و غُل سُن کر ہمسائے جمع ہو گئے۔ ربیعہؒ فروخ سے کہہ رہے تھے کہ خدا کی قسم میں تجھے حاکمِ وقت کے پاس لے جائے بغیر نہ چھوڑوں گا اور فرّوخ کی زبان پر بھی اسی قسم کے الفاظ تھے۔ کسی نے امام مالکؒ کو بھی اس جھگڑے کی خبر دے دی۔ وہ اپنے اُستاد کا معاملہ سمجھ کر فوراً وہاں آ گئے اور بڑے نرم لہجے میں فرّوخ سے مخاطب ہو کر کہا:

"میاں آپ زبردستی غیر کے مکان میں کیوں گھسنا چاہتے ہیں؟ آپ کسی دوسری جگہ کیوں نہیں ٹھہر جاتے؟"

اس وقت فرّوخ نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میرا نام عبدالرحمٰن فرّوخ ہے اور یہ میرا اپنا گھر ہے۔ ستائیس برس کے بعد میدانِ جہاد سے واپس آیا ہوں تو آپ میں سے کوئی مجھے پہچانتا ہی نہیں۔

فرّوخ کی آواز سُن کر ان کی بیوی نے کواڑوں کے پیچھے سے جھانکا تو فوراً شوہر کو پہچان لیا اور پھر امام ربیعہؒ کو بتایا کہ یہ تمہارے والد ہیں۔ ساتھ ہی فرّوخ سے کہا کہ یہ نوجوان آپ کا فرزند ہے جو آپ کے جانے کے چند ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ اب دونوں باپ بیٹے گلے مل کر خوب روئے۔

کھانا کھانے اور آرام کرنے کے بعد فروخ نے بیوی سے اپنی بچائی ہوئی رقم (تیس ہزار اشرفیوں) کے بارے میں پوچھا۔ بیوی نے کہا آپ اطمینان رکھیے ساری رقم محفوظ ہے۔ اتنے میں نماز اور درس کا وقت ہوگیا امام ربیعہؒ اذان سنتے ہی مسجدِ نبوی میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد بیوی نے شوہر سے کہا کہ آپ بھی مسجدِ نبوی میں جاکر نماز پڑھ آیئے۔ فروخ مسجد میں گئے تو دیکھا کہ ساری مسجد لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کے درمیان ایک صاحب بڑی شان اور وقار کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ تمام لوگ بڑے ادب اور احترام سے سر جھکائے ہوئے ہیں اور وہ صاحب ان کے سامنے درس دے رہے ہیں۔ یہ درس دینے والے صاحب امام ربیعہؒ تھے۔ چونکہ انھوں نے سر پر اونچی ٹوپی پہن رکھی تھی، اس لیے فروخ انھیں دور سے پہچان نہ سکے۔ کسی سے پوچھا یہ بزرگ کون ہیں؟

اس نے حیران ہوکر کہا: "آپ ان کو نہیں پہچانتے، یہ امام ربیعۃ الرائے بن ابو عبدالرحمٰن ہیں۔"

فروخ کو یہ سن کر اس قدر مسرت ہوئی کہ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور بے اختیار ان کے منہ سے نکلا "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میرے بیٹے کا درجہ اتنا بلند کیا۔" خوشی خوشی گھر آئے اور بیوی کو بتایا کہ آج میں نے اپنے بیٹے کی جو عزت اور شان دیکھی ہے، اس سے پہلے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی نہیں دیکھی تھی۔

بیوی نے کہا "آپ کو بیٹے کی یہ عظمت و شان پسند ہے یا تیس ہزار اشرفیاں؟"

فروخ نے جواب دیا: "خدا کی قسم تیس ہزار اشرفیاں اس مرتبے اور شان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔"

بیوی نے کہا "تو پھر سن لیں کہ میں نے یہ تمام رقم اس کی تعلیم پر خرچ کردی۔"

فروخ نے بے ساختہ جواب دیا: "خدا کی قسم ان اشرفیوں کا اس سے بہتر استعمال نہیں ہوسکتا تھا۔ تم نے بہت خوب کیا کہ ان اشرفیوں کو ٹھکانے لگاکر میرے

بیٹے کو ایک ایسے خزانے کا مالک بنا دیا جس کو کبھی زوال نہیں۔"

(۴)

امام ابو عثمان ربیعۃ الرائی کا شمار آئمہ تابعین میں ہوتا ہے۔ اُن کے والد ابو عبد الرحمٰن فروخ بنی تمیم بن جبرہ کے غلام تھے لیکن اللہ کی شان، اس غلام کے فرزندِ سعادت مند کو علم وفضل کے اعتبار سے اتنا بلند مقام حاصل ہوا کہ نہ صرف اس دَور کے سرآمدِ روزگار علماء وفقہا بلکہ فرمانروایان وقت بھی اس کے سامنے سرِ عقیدت جھکاتے تھے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ ربیعہ کی علمی وعقلی عظمت پر تمام علماء ومحدثین کا اتفاق ہے خطیب بغدادی کا قول ہے کہ ربیعہ فقہ وحدیث کے حافظ تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ فقہ وحدیث، اجتہاد اور رائے میں بصیرت کے اعتبار سے ربیعہ امام وقت تھے۔ علامہ ابنِ سعد کے نزدیک وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔

صحابہؓ میں امام ربیعہ نے خادم رسول اللہ حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت سائبؓ بن یزید سے اور تابعین میں حضرت سعید بن مسیّب، قاسم بن محمد، ابنِ ابی لیلیٰ اور محمد بن یحییٰ بن حبان وغیرہم جیسے جلیل القدر محدثین سے استفاضہ کیا تھا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں امام مالک، یحییٰ بن سعید، سفیان ثوری، اوزاعی، شعبہ، لیث اور ابنِ عیینہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں لکھا ہے کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ بھی امام ربیعہ کی خدمت میں کسبِ فیض کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے اور ان کے اقوال وآراء کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

اہلِ عراق میں غلط فہمی کی بناء پر مشہور ہو گیا تھا کہ ربیعہ قیاس اور رائے سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت امام ربیعہ کی رائے ہمیشہ سُنّتِ نبوی سے مستنبط ہوتی تھی اور وہ مسائلِ شریعت میں اپنی رائے اور قیاس کو دخل نہ دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبد العزیز بن ابی سلمہ عبد اللہ الماجشون نے اہلِ عراق سے

سے مخاطب ہو کر کہا، تم لوگ ان کو ربیعۃ الرائی کہتے ہو۔ خدا کی قسم میں نے ان سے بڑھ کر کوئی حافظِ سنت نہیں دیکھا۔

امام ربیعہؒ کو مبدءِ فیض نے کمال درجے کی ذہانت اور فراست عطا کی تھی اور فقہ میں وہ امامت اور اجتہاد کے درجے پر فائز تھے۔ حضرت یحییٰ بن سعیدؒ کہا کرتے تھے کہ "میں نے ربیعہؒ سے بڑھ کر زیادہ زیرک کوئی نہیں دیکھا۔" امام مالکؒ ان کے شاگردِ خاص تھے۔ ربیعہؒ کی وفات پر ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے "ربیعہؒ کے بعد فقہ کا مزہ جاتا رہا۔" امام ربیعہؒ کے علم و فضل نے انہیں مرجعِ خلائق بنا دیا تھا اور ان کے حلقۂ درس میں بڑے بڑے علماء و عمائد شریک ہُوا کرتے تھے۔

فضائلِ اخلاق کے اعتبار سے بھی امام ربیعہؒ ایک مثالی شخصیت تھے وہ نہایت عابد و زاہد، خود دار، مستغنی المزاج اور سخی تھے۔ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ سفاح نے انہیں قضا کا عہدہ پیش کیا لیکن انہوں نے اس کے قبول کرنے سے معذرت کر دی۔ ایک اور موقع پر سفاح نے ان کی خدمت میں ایک خطیر رقم بھیجی کہ اس سے اپنی خدمت کے لیے کوئی لونڈی خرید لیں لیکن انہوں نے یہ رقم بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف وہ خود خرچ کرنے میں بے حد فیاض اور سیر چشم تھے۔ ان کے جاننے والے کہا کرتے تھے کہ مدینہ میں ان سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں ہے۔ وہ اپنا مال سائلوں، ضرورتمند دوستوں، دوستوں کی اولاد اور شاگردوں پر بے دریغ لٹاتے رہتے تھے۔

امام ربیعہؒ بڑے لسان تھے اور اپنی مجالس میں کسی دوسرے کو تقریر کا موقع کم ہی دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ خطیب بغدادیؒ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ ربیعہؒ اپنی مجلس میں تقریر کر رہے تھے کہ اتفاق سے وہاں ایک اعرابی آ گیا۔ وہ دیر تک ان کی تقریر خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ امام ربیعہؒ نے سمجھا کہ وہ ان کے زورِ بیان اور فصاحت و بلاغت سے مسحور ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس سے پوچھا، تم لوگوں کے نزدیک بلاغت کی کیا تعریف ہے؟

اس نے جواب دیا:
مختصر الفاظ میں صحیح صحیح معنی ادا کرنا۔"
امام ربیعہؒ نے پھر پوچھا: "اور عجز عن الکلام (عجزِ بیان) کیا ہے؟"
اعرابی نے کہا: "وہ جس میں آپ مبتلا ہیں۔"
یہ جواب سن کر امام ربیعہؒ بہت شرمندہ ہوئے۔
علامہ خطیب بغدادیؒ اور ابنِ خلکانؒ کے قول کے مطابق امام ربیعہؒ نے ۱۳۶ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔
جائے وفات بعض نے انبار لکھی ہے اور بعض نے مدینہ منورہ ——
واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز — فاروقِ ثانی

خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین اور حضرت علی مرتضیٰ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد جس مسلمان فرمانروا کا نام تاریخ اسلام کے افق پر آفتاب کی طرح روشن اور تابناک ہے وہ حضرت ابوحفص عمرؓ بن عبدالعزیز ہیں جو بنو امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے۔ جس زمانے میں وہ سریر آرائے خلافت ہوئے اسلامی سلطنت بے انتہا وسعت اختیار کر چکی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی نظامِ حکومت میں کئی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں اور خلفائے راشدینؓ کا عہدِ باسعادت قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں ان خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اپنے مجددانہ کارناموں سے جسدِ ملت میں اسلام کی حقیقی روح پھونک کر ایک بار پھر خلفائے راشدین کا بابرکت دور واپس لے آئے۔ اسی لیے اربابِ سیر نے انہیں بھی بجا طور پر خلیفۂ راشد قرار دیا ہے اور فاروق ثانی کے لقب کا سزاوار ٹھہرایا ہے۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز قریش کی معزز شاخ بنو امیہ کے چشم و چراغ تھے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

عمرؓ بن عبدالعزیز بن مروان بن الحکم بن العاص بن اُمیہ بن عبد شمس بن عبدمناف بن قصیؒ۔

والدہ کا نام اُمِ عاصم تھا جو سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی پوتی تھیں۔ اس طرح حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی رگوں میں فاروقی خون بھی شامل تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی نانی ایک ایک نہایت دیندار اور پاک طینت خاتون تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادے حضرت

عاصمؒ سے ان کی شادی کا قصہ بھی عجیب ہے۔ محدث ابن جوزی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ رات کو مدینہ طیبہ کی گلیوں میں گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر کی دیوار کے قریب تھک کر بیٹھ گئے۔ امیرالمؤمنین نے گھر کے اندر ایک عورت کو اپنی لڑکی سے یہ کہتے سنا کہ بیٹی اٹھ کر جلدی سے دودھ میں پانی ملا دے۔ لڑکی نے ماں کو جواب دیا، اماں کیا تو نے امیرالمؤمنین کا یہ حکم نہیں سنا کہ کوئی شخص دودھ میں پانی نہ ملائے۔ ماں نے کہا اس وقت عمرؓ اور اس کے منادی یہاں کہاں، تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہے، اٹھ اور جلدی سے دودھ میں پانی ملا دے۔ لڑکی نے کہا، خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم امیرالمؤمنین کے سامنے تو ان کی اطاعت کا اقرار کریں اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی نافرمانی کا داغ اپنے دامن پر لگائیں اگر ہمیں امیرالمؤمنین نہیں دیکھ رہے تو نہ سہی، اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے یہ تمام گفتگو سنی تو لڑکی کی ایمانداری اور خوف خدا سے بہت متاثر ہوئے۔ غلام اسلم ساتھ تھے ان سے فرمایا کہ اس دروازے اور اس جگہ کو یاد رکھو۔ صبح ہوئی تو انہیں یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ اس مکان کا مالک کون ہے اور یہ کون عورتیں تھیں۔ انہوں نے واپس آکر بتایا کہ اس گھر میں ایک بیوہ عورت اپنی ناکتخدا لڑکی کے ساتھ رہتی ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ اگر مجھے نکاح کی ضرورت ہوتی تو میں خود اس لڑکی سے نکاح کر لیتا لیکن تم میں سے اگر کسی کی خواہش ہو تو میں اس کا نکاح اس لڑکی سے کر سکتا ہوں۔

بیٹوں میں حضرت عاصمؒ کے سوا باقی سب شادی شدہ تھے۔ اس لیے حضرت عاصمؒ نے اپنے جلیل القدر والد کے ایما پر اس نیک طینت لڑکی سے نکاح کر لیا۔ اور اسی لڑکی سے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی والدہ اُمِ عاصم پیدا ہوئیں۔

حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز یزید بن معاویہؓ کے زمانہ حکومت میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ سالِ ولادت باختلافِ روایت ۶۱ھ یا ۶۳ھ ہے۔

۶۵ ہجری میں مروان بن الحکم نے مصر پر قبضہ کیا تو عبدالعزیز کو وہاں کا گورنر

مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد عبدالعزیز نے مصر سے اپنی اہلیہ اُمّ عاصم کو لکھا کہ اپنے بچے عمرؓ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ سے مصر آجائیں۔ اُمِّ عاصم اپنے چچا حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے رخصت ہونے آئیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بچہ ہم سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے اس لیے اسے ہمارے ہاں چھوڑ جاؤ۔ چنانچہ وہ بچے کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس چھوڑ کر اکیلی ہی مصر چلی گئیں۔ عبدالعزیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ تھے۔ انہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ایسی عظیم المرتبت ہستی نے ان کے فرزند کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے۔ اس وقت ان کا بڑا بھائی عبدالملک اپنے والد مروان کی وفات کے بعد مسندِ حکومت پر بیٹھ چکا تھا۔ انہوں نے عبدالملک کو اپنے فرزند عمرؓ کے بارے میں لکھا کہ وہ ابن عمرؓ کے پاس مدینہ منورہ میں ہیں تو اس نے ایک ہزار دینار ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد عبدالعزیز نے حضرت عمرؓ کو مصر بلا لیا اور ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا لیکن جلد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے نونہال کی تعلیم و تربیت کے لیے مدینہ منورہ ہی مناسب جگہ ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کو پھر مدینہ بھیج دیا جہاں مشہور تابعی حضرت صالح بن کیسانؒ ان کے اتالیق مقرر ہوئے۔ صالحؒ اس دور کے بلند پایہ محدث اور عالم تھے۔ انہوں نے عمرؓ کو نہایت توجہ سے تعلیم دی اور انہیں کئی جلیل القدر صحابہ اور تابعین سے استفاضہ کرنے کے مواقع بھی بہم پہنچائے ان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت سائبؓ بن یزید، حضرت یوسف بن عبداللہ بن سلام اور حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ حضرت صالحؒ نے جس دلسوزی سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے کردار اور سیرت کی تعمیر کی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے نماز میں دیر کر دی۔ صالح بن کیسانؒ نے سبب پوچھا تو کہا، بال سنوارنے میں دیر ہو گئی۔ صالحؒ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا، اللہ اللہ، بالوں کے سنوارنے کو نماز پر مقدم سمجھتے ہو؟ چنانچہ ایک خط لکھ کر عبدالعزیز کو برخوردار کی اس حرکت کی اطلاع دی۔ انہوں نے فوراً ایک آدمی مدینہ منورہ روانہ کیا اس نے عبدالعزیز کی ہدایت کے مطابق پہلے عمرؓ کے بال مونڈے اس کے بعد کسی سے بات چیت کی۔ غرض اس ماحول میں تعلیم و تربیت پا کر چند سال کے اندر اندر حضرت عمر بن عبدالعزیز ایک متبحر عالم بن گئے۔ اسی زمانہ میں قرآن مجید بھی حفظ کیا اور

تفسیر، حدیث، فقہ، عربی ادب اور شعر و شاعری میں وہ کمال حاصل کیا کہ ان کے ہمعصر علمار مدینہ میں کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ حافظ ذہبیؒ نے ان کے علم و فضل کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"وہ بڑے امام، بڑے فقیہ، بڑے مجتہد، حدیث کے بڑے ماہر اور معتبر، حافظ اور سند تھے۔"

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ میں تابعین میں سے بجز عمر بن عبدالعزیزؓ کے کسی کے قول کو حجت نہیں سمجھتا۔

(۲)

تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ اپنے والد کے پاس مصر چلے گئے۔ اب زمانہ تعلیم کی پابندیاں ان سے اٹھالی گئیں۔ شاہی خاندان کے رکن اور مصر کے حاکم اعلیٰ کے فرزند تھے اس لیے عنفوانِ شباب میں بڑے نفاست پسند اور شہ خرچ ہو گئے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پہنتے اور عمدہ سے عمدہ خوشبویات استعمال کرتے تھے۔ داڑھی پر عنبر کا سفوف ملتے، اچھی سے اچھی غذائیں کھاتے اور نہایت جاہ و حشم سے رہتے تھے۔ ۸۶ھ میں ان کے والد عبدالعزیز نے وفات پائی تو اس وقت حضرت عمرؓ کا سن چوبیس پچیس برس کا تھا۔ اسی سال ان کے چچا عبدالملک نے اپنی بیٹی فاطمہ کی شادی ان سے کر دی اور انہیں خناصرہ کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس کے جلد ہی بعد عبدالملک نے بھی وفات پائی اور ولید بن عبدالملک تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس نے ۸۷ھ میں حضرت عمر عبدالعزیزؓ کو مدینہ منورہ کا گورنر مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ نے یہ منصب قبول کرنے سے پہلے یہ شرط رکھی کہ مجھے پہلے حکام کے ظلم و عدوان پر مجبور نہ کیا جائے۔ ولید نے یہ شرط منظور کر لی، اور حضرت عمرؓ تیس اونٹوں پر اپنا ذاتی سامان لدوا کر نہایت تزک و احتشام سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اہل مدینہ ان کے مرتبہ علمی سے واقف تھے اس لیے انہوں نے حضرت عمرؓ کی آمد پر بہت مسرت کا اظہار کیا۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عمرؓ نے وہاں کے دس اکابر فقہاء کو بلایا اور ان کے سامنے ایک پُراثر تقریر کی جس میں فرمایا کہ جب آپ کسی کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں یا آپ کو میرے کسی

افسر کے ظلم کا حال معلوم ہو تو آپ کو خدا کی قسم مجھے ضرور اس کی خبر کیجئے۔ انسدادِ مظالم میں آپ میرا ہاتھ بٹائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا اور آپ حامیٔ حق قرار پائیں گے۔ میں انشاء اللہ آپ لوگوں کی رائے اور مشورہ کے بغیر کوئی کام سرانجام نہ دوں گا ——— فقہا نے یہ تقریر سنی تو ان کو جزائے خیر کی دعا دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ۸۷ھ سے ۹۳ھ تک نہایت عدل و انصاف سے مدینہ منورہ کی گورنری کی۔ اس دوران میں انہوں نے مسجدِ نبویؐ کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ جن جن مسجدوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی، ان کو منقش پتھروں سے تعمیر کرایا اور رفاہِ عام کے متعدد دوسرے کام بھی انجام دیئے۔

۹۳ھ میں حضرت عمرؓ مدینہ کی گورنری سے الگ ہو گئے۔ ایک روایت کے مطابق خلیفہ ولید نے انہیں حجاج بن یوسف کی شکایت پر معزول کر دیا۔ (طبری)

دوسرا بیان ہے کہ انہوں نے ولید کے حکم سے بنو امیہ کے ایک مخالف خبیب بن عبداللہ بن زبیرؓ کو سزا دی جس کے صدمے سے وہ فوت ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس پر اس قدر ندامت ہوئی کہ انہوں نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ)

۹۶ ہجری میں ولید کی وفات کے بعد سلیمان بن عبدالملک تخت نشین ہوا تو اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اپنا مشیرِ خاص مقرر کیا اور تا دمِ مرگ ان کی غایت درجہ تعظیم و تکریم کرتا رہا۔ ۹۹ھ میں جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس دور کے نامور تابعی حضرت رجاء بن حیوٰۃؒ سے اپنے جانشین کے بارے میں مشورہ کیا اور ان سے کہا کہ میں نے اپنے نابالغ فرزند ایوب کو ولی عہد نامزد کیا ہے۔ حضرت رجاء نے اس سے اختلاف کیا اور کہا ——— "جانشین کسی صالح شخص کو بنانا چاہیئے تاکہ قبر میں امن رہے ———"

سلیمان نے کہا، میں آپ کے مشورے پر غور کروں گا۔ دو دن غور کرنے کے بعد اس نے وصیت نامہ چاک کر ڈالا اور حضرت رجاءؒ بن حیوٰۃ کو پھر بلا کر پوچھا، میرے لڑکے داؤد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے فرمایا: وہ قسطنطنیہ کی مہم پر گئے ہوئے ہیں اور معلوم نہیں کہ زندہ ہیں یا شہید ہو گئے ہیں ——— اس پر سلیمان نے پوچھا،

عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں کیا رائے ہے؟ حضرت رجاءؒ نے جواب دیا
"وہ نہایت متقی اور برگزیدہ مسلمان ہیں۔"
سلیمان نے کہا "خدا کی قسم وہ ایسے ہی ہیں۔"
یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ سے وصیت نامہ لکھا جس میں اپنے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ کو اور ان کے بعد اپنے بھائی یزید بن عبدالملک کو خلیفہ نامزد کیا۔ اس وصیت نامہ کو ایک لفافہ میں بند کر کے سربمہر کیا اور حضرت رجاءؒ کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ جس شخص کو میں نے اپنا جانشین نامزد کیا ہے، میرے اہلِ خاندان سے اس سربمہر لفافہ پر اس کی بیعت لیں۔

حضرت رجاءؒ نے سلیمان کی خواہش کے مطابق کارروائی کی۔ اس کے بعد اُموی خاندان کے تمام لوگ سلیمان کی عیادت کے لیے قصرِ خلافت میں گئے تو سلیمان نے بھی ان سے اس شخص کی غائبانہ بیعت لی جسے اس نے خلیفہ نامزد کیا تھا۔

اس بیعت کے تین روز بعد سلیمان نے وفات پائی۔ حضرت رجاءؒ بڑے صاحبِ تدبیر بزرگ تھے۔ انہوں نے سلیمان کی موت کو پوشیدہ رکھا اور شاہی خاندان کے افراد کو جمع کر کے ایک بار پھر سلیمان کے وصیت نامہ پر ان سے بیعت لی۔ جب سب نے فرداً فرداً بیعت کر لی تو حضرت رجاءؒ نے لفافہ چاک کیا اور سلیمان کی وصیت پڑھ کر سنائی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اس وقت "اِنّا لِلّٰہ" کی دو آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک آواز عمر بن عبدالعزیزؒ کے منہ سے نکلی اور دوسری ہشام بن عبدالملک کے منہ سے۔

عمرؒ بارِ خلافت کی عظیم ذمہ داری سے لرز گئے تھے اور ہشام تختِ خلافت سے محروم ہو کر رنجیدہ ہو گیا تھا۔ پھر یکایک ہشام اٹھ کھڑا ہوا اور کہا:
"ہم عمر بن عبدالعزیز کے ہاتھ پر قیامت تک بیعت نہیں کر سکتے۔"

اس موقع پر حضرت رجاءؒ نے بے مثال جرأت اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کڑک کر کہا: "خدا کی قسم ابھی اٹھ کر بیعت کرو ورنہ گردن اڑا دوں گا ـــــ" اس کے ساتھ ہی انہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ہاتھ پکڑ کر منبر پر بٹھا دیا ـــ اب

سب نے بلا چون و چرا ان کی بیعت کرلی۔

(۳)

خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زندگی میں یکسر انقلاب آگیا۔ وہ عمرؒ جو اس سے پہلے سب سے بڑھ کر خوش لباس، معطر اور بتختر کی چال چلنے والے تھے اب فاروقِ ثانی بن گئے اور حضرت مُصعبؓ بن عمیر، حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے قالب میں ڈھل گئے۔ سلیمان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر انہوں نے تمام شاہی سواریاں واپس کردیں اور اپنے خچر پر سوار ہو کر گھر کی طرف چلے۔ افسر پولیس نیزہ لے کر آگے چلا تو اس کو ہٹا دیا اور فرمایا :

"میں بھی تمام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں۔"

گھر پہنچے تو لونڈی نے ان کے چہرے کو متغیر دیکھ کر پوچھا، آپ پریشان اور ملول کیوں ہیں؟ فرمایا، آج دنیا میں کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس کا مجھ پر حق نہ ہو اور بغیر مطالبہ کے اس کا حق پورا کرنا مجھ پر فرض نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر پریشانی اور فکر کی کونسی بات ہو سکتی ہے — اس کے بعد وہ مسجد میں آئے اور لوگوں کو جمع کر کے فرمایا :

"لوگو مجھ پر خلافت کا بار میری مرضی کے بغیر ڈال دیا گیا ہے۔ اور عام مسلمانوں سے بھی مشورہ نہیں لیا گیا۔ میری بیعت کا جو قلادہ تمہاری گردن میں ہے اس کو میں خود نکال لیتا ہوں، تم جسے چاہو اپنا خلیفہ مقرر کرلو۔"

یہ تقریر سن کر تمام لوگوں نے بآوازِ بلند کہا کہ ہم نے آپ کو امیرالمومنین منتخب کیا اور آپ کی خلافت پر راضی ہوئے۔

جب لوگ خاموش ہوئے اور کوئی آواز ان کی مخالفت میں نہ اٹھی تو انہوں نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا :

"لوگو! قرآن حکیم کے بعد کوئی ایسی کتاب نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ میں کسی چیز کو شروع کرنے والا نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والا ہوں۔ جو چیز اللہ نے

حلال کر دی وہ قیامت تک حلال رہے گی اور جو حرام کر دی وہ ہمیشہ حرام رہے گی۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ خدا کی نافرمانی میں لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ ہاں جو شخص خدا کی اطاعت کرے اس کی اطاعت واجب ہے۔ میں کسی صورت میں تم سے بہتر نہیں ہوں لیکن خدا نے مجھ پر تم سے زیادہ ذمہ داری ڈال دی ہے۔" (طبقات ابن سعد)

اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے امورِ خلافت کی طرف توجہ کی۔ ان کے مسند نشینِ خلافت ہونے تک تاریخ اسلام پر پوری ایک صدی گزر چکی تھی۔ اور اس طویل مدت میں اسلام کا نظامِ سیاست، نظامِ معاشرت اور نظامِ اخلاق سخت زنگ آلود ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے مہتم بالشان تجدیدی اور اصلاحی کارناموں سے خلافتِ راشدہ کے نظم و نسق کو دوبارہ قائم کیا اور دنیا میں ایک بار پھر خلفائے راشدین کا عہدِ باسعادت لوٹ کر آ گیا۔ علامہ ابن خلدونؒ لکھتے ہیں: "حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز مروانی سلسلہ کی درمیانی کڑی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام مساعی خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کے دَور کے احیاء کے لیے وقف کر دیں۔"

اپنے مقصد کے حصول کے لیے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر جو اقدامات کیے وہ صحیح معنوں میں اسلامی انقلاب کے آئینہ دار تھے۔ اسی بنا پر اربابِ سِیَر نے انہیں اپنے عہد کا مجدد قرار دیا ہے

(۴)

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے سب سے پہلے وہ تمام اموال اور جاگیریں ان کے اصل مالکوں اور حقداروں کو واپس کرنے کا ارادہ کیا جن پر آلِ مروان نے ناجائز طور پر قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ کام اتنا دشوار اور خطرناک تھا کہ سارے خاندان کے برہم ہونے کا قوی اندیشہ تھا لیکن اس پیکرِ عزم و استقلال نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس طرح آپ کی اولاد مفلس ہو جائے گی ـــــ فرمایا، "میں ان کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔" پھر لوگوں کو مسجد میں جمع کر کے تقریر کی:

"لوگو! خلفائے بنو امیہ نے ہم کو عطایا اور جاگیریں دیں۔ سب اصل حقداروں کو واپس کرتا ہوں اور اپنی ذات اور خاندان سے آغاز کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیروں وغیرہ کی تمام اسناد اور دستاویزات منگائیں اور اپنے مولیٰ مزاحم کو حکم دیا کہ سب لوگوں کو ان کی عبارت پڑھ پڑھ کر سناتے جاؤ۔ وہ سناتے جاتے تھے اور حضرت عمرؓ ان کو قینچی سے کاٹتے جاتے تھے۔ صبح سے ظہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ اپنی اور پورے خاندان کی جاگیریں واپس کرا دیں۔ ان کی اہلیہ فاطمہ کے پاس ایک قیمتی نگینہ تھا جو انہیں اپنے والد عبدالملک کی طرف سے ملا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اہلیہ سے فرمایا کہ تم کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے، اس نگینہ کو بیت المال میں داخل کر دو یا مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اطاعت شعار بیوی نے وہ بیش قیمت نگینہ بلا چون وچرا بیت المال میں جمع کرا دیا۔

سب سے اہم معاملہ فدک کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالصہ تھا اور جس کی آمدنی آپؐ اپنی اور بنو ہاشم کی مختلف ضروریات پر صرف فرماتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے آپؐ سے اس کو مانگا تھا لیکن آپؐ نے انکار فرما دیا تھا۔ باغ فدک کے وہی مصارف خلفائے راشدینؓ نے بھی قائم رکھے لیکن بنو مروان نے دیگر جائداد پر قبضہ کے ساتھ اسے بھی اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو ان کی اور ان کے اہل وعیال کی معاش کا تمام تر مدار باغ فدک کی آمدنی پر تھا جو دس ہزار دینار سالانہ تھی لیکن وہ مردِ باخدا برضا ورغبت اس سے دست بردار ہو گئے اور آلِ مروان کو جمع کر کے فرمایا:

"فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالصہ تھا تمہارا اس کو اپنی جاگیر بنا لینا سراسر ظلم و ناانصافی تھا۔ جو چیز حضورؐ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ کو نہیں دی، اس پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ اب میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ فدک کی جو حالت عہدِ رسالت میں تھی میں اس کو اسی طرف لوٹاتا ہوں۔"

(ابوداؤد، ابن جوزی، امام سیوطیؒ)

اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیروں کی واپسی کے بعد عام غصب شدہ مالوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے پہلے جو مال اور جائدادیں ظالمانہ طریقوں سے غصب کی گئی تھیں وہ سب ایک ایک کرکے ان کے اصل مالکوں کو واپس کرادیں۔ ابن جوزیؒ نے "سیرت عمر بن عبدالعزیز" میں لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اموالِ مغصوبہ کی واپسی شروع کی تو ایک ضعیف العمر ذمی نے اٹھ کر کہا: "اے امیر المومنین! شہزادہ عباس بن ولید نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے" عباس وہیں مجلس میں موجود تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا: "یہ زمین مجھے میرے والد (ولید بن عبدالملک) نے جاگیر میں دی تھی اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے۔" یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے مدعی بوڑھے کی طرف دیکھا تو اس نے کہا، "امیر المومنین آپ کتاب اللہ کے مطابق جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا، "اللہ کی کتاب ولید کی سند پر مقدم ہے۔ عباس تم اس کی زمین چھوڑ دو۔"

ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے شام کے علاوہ سارے ممالکِ محروسہ کے عمال کے پاس تاکیدی احکام بھیجے کہ غصب شدہ مال و املاک واپس کرائیں۔ عراق میں اس کثرت سے مال واپس کیا گیا کہ وہاں کا خزانہ خالی ہوگیا اور صوبہ کی حکومت کے اخراجات کے لیے دارالخلافہ سے روپیہ بھیجنا پڑا۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے ان فقید المثال عادلانہ اقدامات سے بنو امیہ میں سخت برہمی پیدا ہوئی اور انہوں نے خاندان کے چند سرکردہ آدمی بارگاہِ خلافت میں بھیجے کہ وہ خلیفہ کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ حضرت عمرؓ نے ان کی باتیں سن کر فرمایا: "خدا کی قسم اگر تم میرے کام میں مزاحم ہوئے تو میں تمہیں ذلیل اور رسوا کر ڈالوں گا۔ میرے پاس سے چلے جاؤ۔"

ایک دفعہ آلِ مروان نے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی پھوپھی فاطمہ بنت مروان کو ان کے پاس سفارشی بنا کر بھیجا۔ فاطمہ نے ان سے کہا، "بیٹا تمہارے اہلِ خاندان شکایت کرتے ہیں کہ تم نے ان سے غیر کی دی ہوئی روٹی بھی چھین لی ہے چہ جائیکہ خود انہیں کچھ دیتے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "پھوپھی جان، میں نے ان کا کوئی حق نہیں روکا۔"
فاطمہ نے کہا: "سب لوگ شکایت اور واویلا کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ تمہارے خلاف شورش نہ برپا کر دیں۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "اگر میں یوم قیامت کے سوا کسی اور دن سے ڈروں تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کی برائیوں سے نہ بچائے۔"
اس کے بعد انہوں نے گوشت کا ایک ٹکڑا، ایک اشرفی اور ایک انگیٹھی منگوائی اور اشرفی کو آگ میں ڈال دیا۔ جب وہ خوب سرخ ہو گئی تو اس کو گوشت کے ٹکڑے پر رکھ دیا جس سے وہ بھن گیا۔ اب پھوپھی سے مخاطب ہو کر کہا، پھوپھی جان کیا آپ اپنے برادر زادے کے لیے اس قسم کے عذاب سے پناہ نہیں مانگتیں۔"
ایک مرتبہ آلِ مروان نے ہشام بن عبدالملک کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے گفتگو کے لیے بھیجا۔ ہشام نے جا کر حضرت عمرؓ سے کہا، "اے امیر المومنین جن معاملات کا تعلق آپ کے زمانے سے ہے ان کے متعلق اپنے طریقہ پر عمل کیجئے لیکن جو کچھ گزشتہ خلفاء کر گئے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہ کیجئے اور بنو امیہ کے قدیم حقوق کو برقرار رہنے دیجئے۔"
حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا، "اگر ایک ہی معاملہ میں تمہارے سامنے دو دستاویزیں پیش کی جائیں ایک امیر معاویہؓ کی اور دوسری عبدالملک کی تو تم ان میں سے کس پر عمل کرو گے؟" ہشام نے کہا، "میں امیر معاویہؓ کی دستاویز کو مقدم سمجھ کر اس پر عمل کروں گا۔"

اس موقعہ پر سعید بن خالد بن عمر بن عثمانؓ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا، امیر المؤمنین جو معاملہ آپ سے تعلق رکھتا ہے اس میں آپ حق و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجیے لیکن گزشتہ خلفاء کی برائی یا بھلائی کو اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہیں آپ سے ان کے متعلق سوال نہ ہو گا۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا، "میں تم سے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر ایک شخص چھوٹے بڑے بچے چھوڑ کر مر جائے اور بڑے بچے چھوٹے بچوں کا حق دبالیں تو تم اس وقت

کیا کرو گے جب چھوٹے بچے اپنے حق کے لیے تمہارے پاس فریاد کریں۔
سعید نے کہا، "میں ان کے تمام حقوق واپس دلاؤں گا۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں بھی تو یہی کام کر رہا ہوں۔ مجھ سے پہلے بعض خلفاء، ان کے اہل خاندان اور امراء و وزراء نے کمزور لوگوں کے حقوق دبا لیے تھے۔ ان مظلوموں نے مجھ سے داد رسی چاہی۔ ایسی صورت میں میرے لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ قوی سے ضعیف کا اور ظالم سے مظلوم کا حق واپس دلاؤں۔"
سعید اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور بول اٹھا "خدا امیر المومنین کو توفیق دے۔"
حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز اگرچہ سراپا حلم تھے لیکن حق نافذ کرنے کے معاملے میں اگر کوئی انہیں ناشائستگی سے ٹوکتا تو ان کا مثالی حلم غیظ و غضب کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔
ایک دفعہ شہزادہ عمر بن ولید بن عبدالملک نے ان کو ایک نہایت سخت خط لکھا جس میں ان پر یہ الزام عائد کیا کہ انہوں نے اپنے خاندان (آل مروان) کو ظلم و جور کے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ حضرت عمرؒ نے بھی اس خط کا بہت سخت جواب دیا جس کے آخر میں لکھا:

"اگر مجھے فرصت ہوتی تو میں تجھ کو اور تیرے خاندان کو روشن راستے پر لاتا۔ ہم نے مدتوں سے حق کو چھوڑ دیا۔ اگر تم فروخت کیے جاؤ اور تمہاری قیمت یتیموں مسکینوں اور بیواؤں پر تقسیم کی جائے تو کافی نہ ہوگی کیونکہ تم میں سب کا حق ہے۔

(سیرت عمرؒ بن عبدالعزیز)

۵

اقامت عدل کسی بھی اچھی حکومت (بالخصوص اسلامی حکومت) کا بنیادی فریضہ ہے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے یہ فریضہ اس شان سے انجام دیا کہ ان کی حکومت "شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں" کا مصداق بن گئی۔ انہوں نے تمام مغصوبہ اموال اور جائدادیں ان کے اصل حقداروں کو واپس کرا دیں۔ شاہی خاندان کے ارکان کے غرور اور نخوت کو توڑ ڈالا اور انہیں عام رعایا کی سطح پر لے آئے۔ تمام حکام اور عمال کو ان کے فرائض

کی تشریح کے سلسلے میں احکام جاری کیے۔ جن میں انہیں ہدایت کی کہ ہر کام میں خدا اور خدا کے رسول کی خوشنودی مدِنظر رکھو۔ ظالم اور سفاک حکام کو موقوف کر دیا۔ وہ تمام انعامات جو خلیفہ کے اقربا اور منظورِ نظر لوگوں کو دیئے جاتے تھے موقوف کر دیئے۔ کسی سے بغیر اجرت و مزدبیگار لینا مکمّا بند کر دیا۔ ظن و تخمین کی بناء پر سزا دینے اور عورتوں کو مردوں کے بدلے میں گرفتار کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی۔ نو مسلموں سے جزیہ لینا بند کر دیا۔ عدالت میں کسی سے امتیازی سلوک کرنے کی ممانعت کر دی۔ عدل و انصاف کے معاملے میں تمام لوگوں کو بلا تفریقِ مذہب و ملّت برابر قرار دیا۔ ابنِ جوزی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شہزادہ مسلمہ بن عبدالملک جو خاندانِ بنو امیّہ کا دست و بازو تھا اور حضرت عمرؓ کا سالا تھا، اس نے ایک گرجا کے منتظمین کے خلاف دعویٰ دائر کیا۔ عیسائی فریق مقدمہ عدالت کے اجلاس میں کھڑے ہو کر اپنا بیان دے رہے تھے لیکن مسلمہ خاندانی زعم کی بناء پر بیٹھا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے فرمایا:

"تمہارا فریق مخالف کھڑے ہو کر گفتگو کر رہا ہے اس لیے تمہیں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ تم بھی کھڑے ہو جاؤ۔"

پھر فریقین کے بیانات سن کر فیصلہ مسلمہ کے خلاف کیا اور زمین گرجا کے منتظمین کو دلا دی۔

ایک مرتبہ شہزادہ ہشام بن عبدالملک اور ایک عیسائی کے درمیان کسی بات پر تنازعہ ہو گیا۔ دونوں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے دونوں کو برابر کھڑا کیا۔ ہشام نے شاہی خاندان کا فرد ہونے کے زعم میں عیسائی سے سخت کلامی کی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سخت ڈانٹ پلائی اور سزا دینے کی دھمکی دی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کے حقوق کی جس حسن و خوبی سے حفاظت کی اس کی مثال خلفائے راشدینؓ کے دور کے سوا اور کسی دور میں نہیں ملتی۔ ذمیوں کی جان و مال کی اسی طرح حفاظت کی جس طرح مسلمانوں کی۔ ان میں سرِ مو فرق نہیں کیا۔ ان کے مذہب میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی اور ان کی مذہبی عمارات کی پوری پوری حفاظت کی۔ ان سے جزیہ کی وصولی میں نرمی اور سہولت پیدا کی اور انہیں ہر قسم کی رعایتیں دیں۔

ذمیوں کے حقوق کا وہ جس طرح خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مسلمان نے حیرہ کے کسی ذمی کو قتل کر ڈالا۔ حضرت عمرؓ نے وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے وارث کے حوالے کر دو۔ چاہے وہ قتل کرے چاہے خون بہا لے لے یا معاف کر دے۔ چنانچہ گورنر نے قاتل کو مقتول کے وارث کے حوالے کر دیا۔ اس نے اس کو قتل کر دیا۔

ایک مرتبہ ربیعہ شوذمی نے ایک ذمی کا گھوڑا بیگار میں پکڑ لیا اور اس پر سواری کی۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے ربیعہ کو چالیس کوڑے لگوائے۔

ایک دفعہ دمشق کے عیسائیوں نے حضرت عمرؓ کے پاس ایک گرجے کا دعویٰ کیا جو خاندان بنو نصر کی جاگیر میں آ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ گرجا عیسائیوں کو واپس دلا دیا۔

عدل کے معاملہ میں انہوں نے اپنی حیثیت حاکمہ کی نفی کر دی تھی اور خود کو دوسرے (عام) لوگوں کے برابر سمجھتے تھے۔ ایک بار ان کے ایک عامل عبدالحمید بن عبدالرحمٰن نے ان کو لکھا کہ ایک شخص کو میرے سامنے اس جرم میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ آپ کو گالیاں دیتا ہے۔ میں نے اس کو قتل کرنا چاہا تھا لیکن پھر اس خیال سے قید کر دیا کہ آپ سے استصواب کر لوں۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ اگر تم اس کو قتل کر دیتے تو میں تم سے قصاص لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو گالی دینے پر سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔ اگر تمہارا جی چاہے تو اس کو گالی دے لو ورنہ رہا کر دو۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے ایسی حرکت کی کہ ان کو غصہ آ گیا اور حکم دیا کہ اس کو برہنہ کر کے کوڑے لگائے جائیں لیکن جب کوڑے لگانے کا وقت آیا تو فرمایا، اس کو چھوڑ دو۔ اگر میں غصہ میں نہ ہوتا تو اس کو سزا دیتا، پھر یہ آیت پڑھی:

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس

غرض حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عدل وانصاف کی حکمرانی اس طرح قائم کی کہ لوگوں میں ان کے دورِ حکومت کے بارے میں حیرت انگیز روایتیں مشہور ہو گئیں۔ مثلاً ابن جوزی اور امام سیوطیؒ نے موسیٰ بن اعین کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم کرمان میں بکریاں چرایا

کرتے تھے۔ بھیڑیے ہماری بکریوں کے ساتھ چلتے پھرتے رہتے تھے اور بکریوں کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ ایک بھیڑیے نے ایک بکری پر حملہ کیا۔ میں نے اسی روز کہہ دیا کہ آج خلیفہ صالح ضرور اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ چنانچہ جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ واقعی اسی روز حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے وفات پائی تھی۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی۔ تاریخ الخلفاء للسیوطی)

امام سیوطیؒ نے "تاریخ الخلفاء" میں حضرت مالک بن دینارؒ سے روایت کی ہے کہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو چرواہے کہتے تھے کہ یہ کون صالح شخص خلیفہ ہوا ہے جس کے عدل کی بناء پر بھیڑیے ہماری بکریوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتے۔

(۶)

اقامتِ عدل کے ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے شریعت کے احیاء بدعات کے استیصال اور فواحش و منکرات کے انسداد پر بھی خاص توجہ دی۔ وہ اپنے عمال کو احیائے شریعت اور استیصالِ بدعت کی سختی سے تاکید کرتے رہتے تھے۔ جزیرہ کے عامل عدی بن اطاۃ کو ایک فرمان بھیجا جس میں لکھا:۔

"ایمان چند عقائد، چند احکام اور چند سنن کا نام ہے جس نے ان اجزاء کی تکمیل کر لی اس نے ایمان کو مکمل کر لیا اور جس نے ان کو مکمل نہیں کیا اس نے ایمان کو مکمل نہیں کیا۔ میں اگر زندہ رہا تو ان تمام اجزاء کو تمہارے سامنے واضح کر دوں گا تاکہ تم لوگ ان پر عمل کرو اور اگر مر گیا تو مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی حرص بھی نہیں ہے۔"

چنانچہ عقائد و عبادات و اخلاق وغیرہ میں جو رخنے پیدا ہو رہے تھے انہیں پوری شدت کے ساتھ روکا۔ عقائد میں معبد جہنی اور اس کے بعد غیلان دمشقی نے قضاء و قدر کا پیچیدہ مسئلہ چھیڑ کر لوگوں کے ذہن پراگندہ کر دیئے تھے۔ حضرت عمرؒ نے اس سے توبہ کرائی اور محدثین و فقہاء کو لکھا کہ وہ اس کے خیالات کو قبول نہ کریں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو معلوم ہوا کہ لوگ نماز کے وقت کی پابندی نہیں کرتے تو انہوں نے تمام عمال کے نام ایک فرمان بھیجا جس میں لکھا:

"نماز کے وقت تمام کام چھوڑ دو کیونکہ جس شخص نے نماز کو ضائع کیا وہ دوسرے فرائض کو سب سے زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔" (سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ)

ان ہدایات کے علاوہ انہوں نے ملک میں ہر جگہ عملی طور پر نماز کا اہتمام کیا اور مؤذنین کی تنخواہیں مقرر کیں۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ لوگوں کو دینی امور میں موشگافیاں کرنے سے روکتے تھے اور فرماتے تھے کہ مکتب کے بچوں اور صحرا کے بدوؤں کا دین اختیار کرو اور اس کے سوا ہر چیز کو بھول جاؤ۔ دقیق مسائل میں الجھنا اور ایک دوسرے سے تکرار کرنا ان کو سخت ناپسند تھا، فرماتے تھے کہ جب کسی قوم کو دیکھو کہ وہ عامۃ الناس کے سامنے اس قسم کے مسائل پر گفتگو کرتی ہے تو سمجھو کہ گمراہی کی بنیاد ڈالتی ہے۔

حضرت عمرؒ کی ان مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ احکام شریعت کی سختی سے پابندی کرنے لگے اختلافی مسائل میں ایک دوسرے سے الجھنے کے بجائے دینی امور کی تفصیلات کے بارے میں پیار اور محبت سے گفتگو کرنے لگے۔

حضرت عمرؒ لوگوں کو نہایت شدت کے ساتھ صدقات اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ حجاج بن یوسف کے زمانے میں نظامِ زکوٰۃ میں کئی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ انہوں نے پوری قوت سے ان کی اصلاح کی اور اپنے عمال کو لکھا کہ زکوٰۃ صرف انہی لوگوں سے وصول کریں جن پر واجب ہے، اس کی وصولی کے لیے ناجائز ذرائع اختیار نہ کریں اور اس کو بے محل ہرگز صرف نہ کریں۔ انہوں نے تمام خلافِ شرع ٹیکس منسوخ کر دیئے اور تمام خلافِ شرع سزائیں بند کر دیں۔ بعض عمال مجرموں کو دو دو تین تین سو کوڑے لگواتے تھے انہوں نے اس کی ممانعت کر دی اور فرمایا کہ "مسلمانوں کی پیٹھ بجز حق شرعی کے ہر حالت میں محفوظ ہے۔" حکام کو فرمان جاری کیا کہ کسی مسلمان قیدی کو اس طرح بیڑیاں نہ پہنائی جائیں کہ وہ نماز ادا نہ کر سکے، رات کو بیڑیاں اتار دی جائیں۔ قیدیوں سے

بدسلوکی نہ کی جائے! اور ان کو اچھی خوراک دی جائے۔

شراب نوشی کے انسداد کے لیے حکم دیا کہ کوئی غیر مسلم باہر سے شراب نہ لائے، شراب کی تمام دکانیں بند کر دی جائیں نبیذ کے بہانے جو لوگ شراب پیتے تھے اس کو بھی بند کر دیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو معلوم ہوا کہ بہت سے مسلمان لہو ولعب میں مشغول ہو گئے ہیں اور عورتیں جنازوں کے ساتھ بال بکھیرے نوحہ کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ انہوں نے تمام عُمّال کو ایک گشتی مراسلہ جاری کیا جس میں لکھا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ سفہا کی عورتیں زمانۂ جاہلیت کی طرح جنازوں کے پیچھے بال کھولے نوحہ کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ حالانکہ جب سے عورتوں کو آنچل ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ ان کو دوپٹہ اتارنے کی اجازت نہیں دی گئی پس اس قسم کے نوحہ و ماتم کو مناسب طریقے سے روکو، اہلِ عجم جن چیزوں سے جنہیں شیطان نے ان کی نگاہ میں محبوب کر دیا تھا، دل بہلاتے تھے، مسلمانوں کو اس لہو ولعب اور راگ باجے وغیرہ سے روکو اور جو نہ مانے اس کو اعتدال کے ساتھ سزا دو۔"

اہلِ عجم کے اثر سے مسلمانوں میں رواج ہو گیا تھا کہ عورتیں اور مرد حماموں میں بے باکانہ غسل کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے عورتوں کو حمام میں جانے سے بالکل روک دیا اور مردوں کو حکم دیا کہ وہ تہبند کے بغیر حمام میں غسل نہ کریں۔

حماموں کی دیواروں پر خلافِ شریعت تصویریں بنائی جاتی تھیں انہوں نے ایسی تصویریں بنانے کی ممانعت کر دی۔ ایک مرتبہ ایک حمام میں ایسی تصویر اپنے ہاتھ سے مٹا دی اور فرمایا کہ اگر اس تصویر کے بنانے والے کا پتہ چل جاتا تو میں اس کو سزا دیتا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے پہلے کے اُموی خلفاء نے جمعہ کے خطبہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے اہانت آمیز الفاظ شامل کر دیئے تھے۔ حضرت عمرؒ نے ان الفاظ کو نکال دیا اور ان کی جگہ کلام اللہ کی یہ آیت داخل کی جو آج تک خطبوں میں برابر پڑھی جا رہی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

(اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، برائی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نصیحت اس لیے کرتا ہے کہ تم لوگ سمجھو)

(۷)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مسند نشین خلافت ہونے کے بعد محسوس کیا کہ بیت المال کے مداخل اور مخارج میں شدید بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں۔ جائز اور ناجائز ہر قسم کی آمدنی بیت المال میں جمع کر لی جاتی تھی پھر اسی بے عنوانی سے اسے صرف کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دونوں قسم کی بدعنوانیوں کا تدارک کیا۔ انہوں نے شاہی خاندان کے تمام مخصوص وظائف بند کر دیئے۔ اپنا تمام ذاتی سامانِ امارت، لونڈی غلام، فرش فروش، لباس و عطریات وغیرہ فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی۔ شاہی اصطبل کے داروغہ نے خلیفہ کے لیے مخصوص سواریوں کے اخراجات مانگے تو حکم دیا کہ تمام سواریوں کو بیچ کر ان کی قیمت بیت المال میں داخل کر دو، میرے لیے میرا خچر کافی ہے۔ مدحیہ قصائد کے سلسلے میں شعراء کو بیت المال سے جو انعامات ملتے تھے انہیں موقوف کر دیا۔ خلیفہ کے شکوہ و تجمل اور کروفر کے تمام مصارف بالکل اڑا دیئے۔ ایک بار انہیں خبر ملی کہ عدی بن ارطاۃ شراب کا عشر لے کر بیت المال میں داخل کرتے ہیں، ان کو لکھا کہ ایسی آمدنی حرام ہے، بیت المال میں صرف حلال مال داخل کرو۔

بیت المال کی آمدنی بڑھانے کے لیے حجاج بن یوسف نومسلموں سے بھی جزیہ لیتا تھا۔ حضرت عمرؒ نے حکم جاری کیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں ان کا جزیہ فی الفور ساقط کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ جزیہ ترازو میں رکھا جا چکا ہو اور اس حالت میں بھی کوئی ذمی اسلام قبول کر لے یا آغازِ سال سے ایک دن قبل (جبکہ پورے سال کا جزیہ عائد ہو جاتا ہے) اسلام لے آئے تو بھی جزیہ نہ لیا جائے۔ اس حکم پر اس قدر لوگ مسلمان ہوئے کہ جزیہ کی آمدنی گھٹ گئی۔ مصر کے عامل حیان بن شریح نے شکایت لکھ بھیجی کہ ذمیوں کے اسلام نے جزیہ کو اتنا نقصان پہنچایا کہ

مجھے تیس ہزار اشرفیاں قرض لے کر مسلمانوں کے وظیفے دینے پڑے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو نہایت سخت خط لکھا کہ اس کی کچھ پروا نہیں نومسلموں سے جزیہ کی وصولی بہر صورت موقوف کردو۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ محصل خراج (تاریخ مقریزی)

ایک مرتبہ انہیں اطلاع ملی کہ جراح بن عبداللہ حاکم خراسان نومسلموں سے یہ کہہ کر جزیہ لیتا ہے کہ یہ لوگ جزیہ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے اسلام لائے ہیں، صدقِ دل سے نہیں۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اسے لکھا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ مبین کا داعی بنا کر بھیجا گیا تھا ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں، جو شخص نماز ادا کرے تمہیں اس سے جزیہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

جراح نے اس حکم پر عمل شروع کیا تو لوگ گروہ درگروہ مسلمان ہونے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر جراح کے بعض مشیروں نے اس کو بہکایا کہ ان نومسلموں کا ختنہ کرا کر ان کے اخلاص کا امتحان کرنا چاہیے۔ جراح نے حضرت عمرؒ سے اس کی اجازت چاہی تو انہوں نے جواب میں لکھا:

"اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داعیٔ اسلام بنا کر بھیجا تھا ختنہ کرنے والا بنا کر نہیں۔" آخر کار انہوں نے جراح کو اس کے عہدہ سے معزول کر دیا۔

(البدایہ والنہایہ۔ حافظ ابن کثیرؒ)

خراج کی اصلاح کے متعلق انہوں نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو یہ فرمان لکھا:

"زمین کا معائنہ کرو، بنجر زمین کا بار آباد زمین پر اور آباد زمین کا بنجر زمین پر نہ ڈالو۔ اگر بنجر زمینوں میں کچھ صلاحیت ہو تو اس صلاحیت کے مطابق خراج لو۔ کوشش کرو کہ وہ آباد ہو جائیں۔ جن آباد زمینوں میں پیداوار نہیں ہوتی، ان کا خراج نہ لو۔ جو زمینیں خشک سالی کا شکار ہو جائیں، ان کے مالکوں سے نرمی سے خراج وصول کرو۔ خراج میں صرف وزن سبعہ لو ٹکسال اور چاندی پگھلانے والوں سے، نوروز اور مہرجان کے ہدیے، عرائض نویسی، شادی اور گھروں کا ٹیکس نہ لو۔ جو ذمی مسلمان ہو جائے اس پر خراج نہیں ہے۔

(کتاب الخراج، امام ابویوسفؒ)

غرض انہوں نے بیت المال میں ہر قسم کے ناجائز مداخل بند کردیئے۔ ساتھ ہی بیت المال کی حفاظت کا نہایت کڑا انتظام کیا۔ ذرا سی بے احتیاطی پر سخت باز پرس کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یمن کے بیت المال سے ایک اشرفی گم ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے وہاں کے افسر خزانہ کو لکھا کہ میں تمہاری امانت داری میں شک نہیں کرتا لیکن تمہیں لاپرواہی کا مجرم قرار دیتا ہوں اور مسلمانوں کی طرف سے ان کے مال کا مدعی ہوں، تم پر فرض ہے کہ اپنی صفائی میں شرعی قسم کھاؤ۔

یزید بن مہلب بن ابی صفرہ والی خراسان کو خیانت کے جرم میں معزول کر کے قید کر دیا۔

تمام عمّال کو ہدایات جاری کیں کہ اپنی ضروریات میں کفایت شعاری سے کام لیں یہاں تک کہ بڑے حروف میں جلی قلم سے بھی نہ لکھیں۔ بیت المال کی آمدنیوں اور مصارف کی علیحدہ علیحدہ مدیں قائم کیں، زکوٰۃ، صدقہ، غنیمت جنگی اور دوسرے محاصل کا الگ الگ حساب رکھے جانے کا قاعدہ مقرر کیا۔

غرض حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے اصلاحی اقدامات سے بیت المال کو پھر تمام مسلمانوں کی مشترکہ امانت بنا دیا اور اس کا کل روپیہ ان کی ضروریات کے لیے وقف کر دیا۔ تمام اہل سیر اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام ناجائز آمدنیوں کے سدِباب کے باوجود حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عہدِ بابرکت میں رعایا اس قدر خوشحال ہو گئی کہ خلفائے راشدین کے دور کے سوا پوری تاریخ اسلام میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

ابنِ جوزی کا بیان ہے کہ "عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں رعایا بڑی خوشحال ہو گئی۔ ملک کے طول و عرض میں افلاس و غربت کا نام و نشان مٹ گیا یہاں تک کہ صدقہ لینے والے نہ رہتے تھے۔" (سیرت عمرؓ بن عبدالعزیز)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ اسی زمانہ میں فقراء اور مساکین میں روپیہ تقسیم کرنے جب شون پہنچے تو وہاں کوئی شخص خود خلیفہ سے زیادہ مفلس نہ ملا۔ (تہذیب التہذیب)

غربا و مساکین کی اعانت کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے مختلف طریقے اختیار کیے، ان میں کچھ یہ ہیں:

۱۔ بیت المال میں ایک خاص صیغہ قائم کیا جس سے ان قرضداروں کا قرض ادا کیا جاتا تھا جو ناداری کی وجہ سے ادا نہ کر سکتے تھے۔

۲- ایک عام لنگر خانہ قائم کیا جس سے فقراء و مساکین کو کھانا ملتا تھا۔

۳- شیر خوار بچوں کے وظیفے مقرر کیے۔

۴- حاجت مند لوگوں کے لیے مساویانہ طور پر غلہ مقرر کیا جو فی کس ساڑھے چار اردب ملتا ہے۔

۵- غرباء کے پاس جو کھوٹے سکے ہوتے تھے انہیں کھرے سکوں سے بدلنے کے احکام جاری کیے۔

۶- قیدیوں کا وظیفہ مقرر کیا۔

۷- جن لوگوں کے وظائف کسی جرم یا کسی اور سبب سے روک دیئے گئے ان کو تمام بقایا وظیفے دے دیئے۔

۸- شاہی فوج کے گزرنے سے کسی شخص کی کھیتی کو نقصان پہنچا تو اس کو تاوان دلایا۔

۹- اپاہجوں کے وظائف مقرر کیے۔

اس فیاضانہ طرز عمل سے بیت المال پر بہت بوجھ پڑا اور بعض عمال نے ان کو اس طرف توجہ دلائی، انہوں نے جواب میں لکھا کہ جب تک خزانے میں روپیہ ہے دیئے چلے جاؤ جب خالی ہو جائے تو اس میں کوڑا کرکٹ بھر دو۔

یحییٰ بن سعید کا بیان ہے کہ مجھے حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے صدقہ کی وصولی اور تقسیم کے لیے افریقہ بھیجا۔ میں نے صدقہ وصول کر کے فقراء کو بلایا کہ ان پر تقسیم کر دوں لیکن کوئی شخص صدقہ لینے کے لیے نہ آیا کیونکہ عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے لوگوں کو غنی کر دیا تھا اس لیے میں صدقہ کی رقم سے غلام خرید کر آزاد کر دیئے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے ایک شخص کو تقسیم مال کے لیے رقہ جانے کا حکم دیا۔ اس نے کہا، امیر المؤمنین رقہ میں میری کسی سے واقفیت نہیں ہے اس لیے میں امیر اور غریب میں تمیز نہ کر سکوں گا۔ فرمایا جو شخص تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو دے دو۔

(زرقانی شرح موطا)

محمد بن قیس سے روایت ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے حکم دیا کہ مستحقین پر صدقہ

تقسیم کیا جائے لیکن میں نے دوسرے سال دیکھا کہ جو لوگ صدقہ لیتے تھے وہ صدقہ دینے کے قابل ہو گئے۔ (طبقات ابن سعد)

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے عہد میں لوگ اس قدر آسودہ حال ہو گئے کہ ان کے عمال کو لوگوں کے کبر و نخوت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا، عدی بن ارطاۃ نے ایک خط لکھ کر اپنا یہ اندیشہ ظاہر کیا تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کو جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے جب اہل جنت کو جنت میں داخل کیا تو ان کے لیے یہ پسند کیا کہ وہ الحمد للہ کہیں، تم بھی لوگوں کو تلقین کرو کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

۸

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مجسم خیر تھے۔ انہوں نے جس قدر اصلاحیں کیں ان میں بندگانِ خدا کی خیر کا پہلو کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ ان کے علاوہ اصطلاحی معنوں میں بھی انہوں نے مفادِ عام کے بہت سے کام کیے۔ مسافروں کے آرام کا اس قدر خیال تھا کہ تمام ممالک محروسہ میں جگہ جگہ سرائیں بنوائیں۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے خراسان کے گورنر کو فرمان بھیجا کہ وہاں کے تمام راستوں میں بہت سی سرائیں تعمیر کرائی جائیں۔

ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے سمرقند کے گورنر سلیمان بن ابی السری کو حکم بھیجا کہ اس علاقہ کے تمام شہروں میں سرائیں تعمیر کراؤ، جو مسلمان ادھر سے گزریں ان کی ایک دن اور ایک رات مہمان نوازی کرو، ان کی سواریوں کی حفاظت کرو۔ جو بیمار ہو اس کو دو دن اور دو رات مہمان رکھو۔ اگر کسی کے پاس گھر تک پہنچنے کے لیے زادِ راہ نہ ہو تو وطن تک پہنچنے کے لیے زادِ راہ مہیا کرو۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے نقیع کی چراگاہ کے سوا ملک کی تمام چراگاہوں کو عام کر دیا اور حکم دیا کہ ان سے کسی کو روکا نہ جائے۔ حضرت عمرؓ بڑی بڑی عمارتیں بنوانا پسند نہیں کرتے تھے تاہم انہوں نے بعض شہروں میں مسجدیں تعمیر کرائیں، مدینہ منورہ میں حدودِ حرم کی تجدید کرائی۔ ۱۰۰ھ میں رومیوں نے لاذقیہ

کے ساحلی شہر کو برباد کر دیا تو انہوں نے اس کی از سرِ نو تعمیر اور قلعہ بندی کرائی۔
(فتوح البلدان، بلاذری)

۱۰۱ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک عامل بشر بن صفوان کے ذریعے ملک میں مردم شماری کرائی۔ اندلس (سپین) میں ان کے حکم سے اسمح بن مالک خولانی والیٔ اندلس نے مردم شماری کا کام انجام دیا۔

(۹)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حدودِ سلطنت میں توسیع کے بجائے اسلام کی توسیع و اشاعت کو اپنا مقصد قرار دیا اور اس کے لیے اخلاقی یا مادی جو ذریعہ بھی ممکن تھا، اختیار کیا۔ علامہ بلاذریؒ نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے کہ

"انہوں نے اسمٰعیل بن عبداللہ بن ابی المہاجر کو مغرب کا گورنر مقرر کیا۔ اسمٰعیل نے بربروں کو نہایت احسن طریقے سے اسلام کی دعوت دی۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خود ان کے نام دعوتِ اسلام کا خط لکھا۔ اسمٰعیل نے یہ دعوت نامہ انہیں پڑھ کر سنایا تو سب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے"۔

انہوں نے ماوراء النہر کے بادشاہوں کو بھی دعوتِ اسلام دی، ان میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا۔

سندھ کے حکمرانوں اور رئیسوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے تو ان میں سے اکثر اسلام لے آئے۔ راجہ داہر کا لڑکا جے سنگھ بھی انہی لوگوں میں تھا۔ ان سب کی زمینیں اور جائدادیں انہی کے قبضے میں رہنے دی گئیں اور انہیں مسلمانوں کے مساوی حقوق دیئے گئے۔

جراح بن عبداللہ الحکمی والیٔ خراسان کے ہاتھ پر چار ہزار ذمی مسلمان ہوئے۔ بعض عمّال نے انہیں لکھا کہ لوگ اس کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں کہ جزیہ کی آمدنی میں کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ میں چاہتا ہوں، سب ذمی مسلمان ہو جائیں اور ہماری اور تمہاری حیثیت محض کاشتکار کی رہ جائے کہ اپنے ہاتھ کی کمائی کھائیں۔
اسلام کی توسیع کی خاطر انہوں نے حکم دیا کہ جو ذمی اسلام قبول کرے اس کا جزیہ فوراً ساقط

کر دیا جائے اور جو حقوق مسلمانوں کے ہیں وہی اس کو دیئے جائیں۔ ان کے اس حکم سے شاندار نتائج برآمد ہوئے اور بے شمار ذمیوں نے برضا ؤ رغبت اسلام قبول کر لیا۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک پادری کو تالیفِ قلب کے لیے ایک ہزار اشرفیاں دیں، وہ ان کے حسنِ خلق سے اتنا متاثر ہوا کہ فوراً اسلام قبول کر لیا۔

ان کے عہد میں جو فوجیں رومیوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھیں، ان کے افسروں کو حکم بھیجا کہ وہ رومیوں کی کسی جماعت سے اس وقت تک نہ لڑیں جب تک ان کو اسلام کی دعوت نہ دے لیں۔

مؤرخ یعقوبی کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے عہد میں سلیط بن عبداللہ کی قیادت میں مبلغین کا ایک وفد تبت بھی بھیجا گیا تھا۔ بعض روایتوں میں تبت کے بجائے چین آیا ہے لیکن تبت بھی چین ہی کا حصہ تھا اس لیے ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں۔

غرض اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے اعتبار سے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا دور مثالی حیثیت رکھتا تھا۔

۱۰

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے جس انہماک سے حکومت کے مختلف شعبوں میں دُور رس اصلاحات نافذ کیں اسی تندہی سے دینی تعلیم کی ترویج و اشاعت اور ارشاد و ہدایت پر بھی خاص توجہ کی۔ قاضی ابوبکر بن حزمؒ کو لکھا کہ:

"لوگوں کو چاہیے کہ سرگرمی سے علم کی اشاعت کریں۔ تعلیم کے لیے حلقۂ درس میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں کیونکہ علم اس وقت تک برباد نہیں ہوتا جب تک اسے مخفی نہ رکھا جائے۔"

ایک اور عامل کو لکھا کہ:—

"اہلِ علم کو حکم دو کہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں کیونکہ حدیثیں مردہ ہو رہی ہیں" (ابن جوزی)

بدوؤں کی تعلیم و تربیت کے لیے یزید بن ابی مالک دمشقیؒ اور حارث بن یمجد الاشعری کو

مامور کیا۔ حضرت نافعؒ مولیٰ عبداللہ بن عمرؓ کو جو مدینہ کے بڑے فقیہ تھے، حدیث کی تعلیم دینے کے لیے مصر بھیجا۔ قاری جعثلؒ بن عاماں کو قرأت کی تعلیم دینے کے لیے مصر اور شمالی افریقہ بھیجا۔ حلاج ابو کثیر امویؒ کو اسکندریہ کا واعظ مقرر کیا اور حجاز میں متعین واعظ کو حکم بھیجا کہ ہر تیسرے دن لوگوں کو وعظ و پند کریں۔ حضرت یزید بن ابی حبیبؒ کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ اہلِ مصر کو حدیث و فقہ کی تعلیم دیں۔

(حسن المحاضرہ ــــ حافظ سیوطیؒ)

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؒ کا ایک عظیم کارنامہ تدوینِ حدیث ہے بقول ایک تذکرہ نگار اگر وہ تدوینِ حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو بخاری، مسلم، مؤطا اور حدیث کی دوسری کتابیں جو احادیثِ صحیحہ کا بہترین مجموعہ ہیں شاید وجود میں نہ آتیں۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔ عبدالسلام ندوی)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے جب دیکھا کہ اربابِ علم و فضل قانونِ قدرت کے مطابق روز بروز دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں تو انہوں نے علومِ دینی کے مٹ جانے کا خدشہ محسوس کیا چنانچہ انہوں نے مدینہ منورہ کے گورنر قاضی ابوبکر بن حزمؒ کو لکھا کہ :۔

"احادیثِ نبویہ کی تلاش کر کے ان کو لکھ لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہو جانے کا خوف معلوم ہوتا ہے اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قبول کی جائے۔"

(صحیح بخاری۔ کتاب العلم)

یہی فرمان انہوں نے تمام صوبوں کے گورنروں کے نام ارسال کیا اور اس کی تعمیل میں احادیث کے مجموعے مرتب و مدون کر کے تمام ممالک محروسہ میں تقسیم کیے گئے۔

(فتح الباری۔ ابن حجرؒ)

تدوینِ حدیث کے علاوہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے مغازی اور مناقب صحابہؓ کی تعلیم پر بھی توجہ کی اور عاصمؒ بن عمرو بن قتادہ کو، جو مغازی اور سیرت کے بہت بڑے عالم تھے، حکم دیا کہ وہ جامع دمشق میں مغازی اور مناقب کا درس دیا کریں۔ (ابن حجر عسقلانیؒ)

اگرچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا اصل مقصد دینی علوم کی اشاعت کرنا تھا لیکن انہوں

نے مسلمانوں کو غیر قوموں کے علوم سے بھی ناآشنا نہیں رکھا۔ مروان بن الحکم کے زمانے میں ایک یونانی حکیم اہرن القس کی ایک مشہور طبی کتاب کا ترجمہ ماسرجویہ نے کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی نقلیں کرا کے ملک میں انہیں شائع کیا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جہاں تمام بے جا مصارف کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ وہاں علماء اور طلبہ کی سرپرستی اور کفالت کے لیے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے۔ دُور دُور سے علماء اور فقہاء کو بُلا کر ان کی قدر افزائی فرماتے اور امورِ خلافت و شریعت میں ان سے مشورہ لیتے۔ جن اربابِ علم نے اپنے آپ کو تعلیم و تعلّم کے لیے وقف کر دیا۔ ان کو فکرِ معاش اور ضروریاتِ زندگی سے۔ بے نیاز کر دینا حضرت عمرؓ اپنا فرض سمجھتے تھے چنانچہ حمص کے گورنر کو لکھا: " جن لوگوں نے دنیا چھوڑ کر اپنے آپ کو فقہ کی تعلیم کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ میرا یہ خط ملتے ہی ان میں سے ہر ایک کو بیت المال سے سو سو دینار دے دو تاکہ وہ تعلیم دینے کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔"

قاسم بن مخیمرہ ایک محدّث تھے جو بڑی تنگی ترشی سے گزر بسر کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کا پچاس دینار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کی جانب سے ستر دینار قرض بھی ادا کر دیا اور سواری بھی دی۔ (تذکرۃ الحفاظ، الذہبیؒ)

ایک مرتبہ حضرت مجاہدؒ، حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو تیس درہم دیئے اور فرمایا کہ یہ رقم میں نے اپنے عطیے سے دی ہے۔

علماء کے علاوہ انہوں نے طلبہ کے بھی وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ اس طرح تعلیم دینے والے اور تعلیم حاصل کرنے والے سبھی ان کی فیاضی سے متمتع ہوتے تھے۔

علماءِ کرام کی ان کے دل میں بے حد قدر و منزلت تھی، ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک شخص کو حضرت سعید بن مسیبؒ کے پاس کوئی مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا۔ وہ شخص خود حضرت سعیدؒ ہی کو بلا لایا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے انہیں دیکھا تو سخت خفت اور ندامت کا اظہار کیا اور کہا، " قاصد نے غلطی سے آپ کو تکلیف دی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ آپ سے مسئلہ دریافت کر کے چلا آئے۔"

ایک بار انہوں نے فقہائے عراق سے درخواست کی کہ وہ ان کے پاس قدم رنجہ فرمائیں اور مجھے نصیحت فرمائیں۔ سب اصحاب آئے لیکن خواجہ حسن بصریؒ نے علالت کا عذر کیا اور ایک نصیحت آمیز خط بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے یہ خط آنکھوں سے لگایا اور اس کو پڑھ کر رو پڑے۔

ایک مرتبہ حضرت سالم بن عبداللہؒ اور محمد بن کعبؒ ان کے پاس گئے۔ انہوں نے دونوں سے نصیحت کی درخواست کی جب ان کی نصیحتیں سنیں تو شدتِ تاثیر سے رونے لگے۔

(۱۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی توجہ حدودِ سلطنت کو وسیع کرنے کی طرف نہ تھی بلکہ وہ حکومت کی داخلی کمزوریوں کو دُور کر کے ملک کو امن و امان اور عدل و انصاف سے معمور کرنا چاہتے تھے تاہم ان کا زمانۂ حکومت فوجی ہنگاموں سے یکسر خالی نہیں رہا۔ ان کے پیشرو خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے ایک بڑا لشکر بھیجا تھا۔ یہ لشکر موسم کی ناسازگاری اور رسد کی کمی کی وجہ سے سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کثیر مقدار میں اشیائے خور و نوش اور سامانِ حمل و نقل بھیج کر اس لشکر کو واپس بلا لیا۔ (طبری)

سنہ ۹۹ھ میں ترکوں نے آذربائیجان پر حملہ کیا اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کر ڈالا۔ ان کے علاوہ بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے حاتم بن نعمان باہلی کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ حاتم نے ان میں سے اکثر کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پچاس کو اسیر کر کے روانہ کیا۔ (طبری)

علامہ بلاذریؒ نے "فتوح البلدان" میں لکھا ہے کہ سندھ میں حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عامل عمرو بن مسلم باہلی نے ہندوستان کے بعض حصوں پر فوج کشی کی اور فتوحات حاصل کیں۔

سنہ ۱۰۰ھ میں خوارج کے فرقہ حروریہ نے عراق میں شورش برپا کی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ

نے ان کے نمائندوں کو بلا کر بہتیرا سمجھایا لیکن وہ اپنے نامعقول مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ گزشتہ اموی خلفاء پر لعنت بھیجیں لیکن حضرت عمرؓ کا جواب یہ تھا کہ خدا نے مجھے لعنت بھیجنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عبدالحمید والیٔ کوفہ کو لکھا کہ اگر یہ لوگ کسی مسلمان یا ذمّی سے تعرض نہ کریں تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو تاہم انہیں نرمی کے ساتھ حق کی طرف بلاتے رہو۔ خود بھی ایک خط خوارج کو براہِ راست لکھا جس میں انہیں فتنہ و فساد سے باز رہنے کی تلقین کی لیکن وہ لوگ نہ مانے اور لوگوں کے مال و دولت پر دستِ تطاول دراز کیا۔ اب حضرت عمرؓ نے ان شرائط کے ساتھ عبدالحمید کو ان سے لڑنے کی اجازت دے دی کہ عورتیں اور بچے قتل نہ کیے جائیں، بھاگنے والے اور زخمیوں کا تعاقب نہ کیا جائے اور فتح کے بعد جو مالِ غنیمت حاصل ہو وہ ان کے اہل و عیال کو واپس کر دیا جائے۔

عبدالحمید نے خارجیوں پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے مسلمہ بن عبدالملک کو جو جزیرہ میں متعین تھے، حکم دیا کہ وہ اہلِ شام کی فوج مرتب کر کے اس فتنہ کو دبائیں۔ مسلمہ نے حکم کی تعمیل کی اور خوارج کو شکست فاش دی۔

(طبقات ابنِ سعد)

(۱۲)

ابھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی اصلاحات کا سلسلہ جاری تھا کہ وہ رجب سنہ ۱۰۱ھ کے آغاز میں مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے بارہ میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ علالت طبعی تھی، دوسری یہ کہ زہر کا نتیجہ تھی۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آلِ مروان نے محسوس کیا کہ اگر مزید کچھ عرصہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی خلافت قائم رہی تو ان کا اقتدار کبھی واپس نہ آ سکے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک غلام کو ایک ہزار دینار دے کر ان کو زہر دلوا دیا۔ حضرت عمرؓ کو دورانِ علالت میں اس بات کا علم ہو گیا لیکن انہوں نے غلام سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ صرف اتنا کیا کہ اشرفیاں اس سے لے کر بیت المال میں داخل کرا دیں اور غلام سے کہا کہ میں تمہیں آزاد کرتا ہوں تم یہاں سے ایسی جگہ چلے جاؤ جہاں کوئی تمہیں دیکھ نہ سکے۔

ایک روایت میں ہے کہ طبیب نے بھی علالت کا سبب نہر خورانی کو قرار دیا اور اس کا علاج کرنا چاہا لیکن انہوں نے بوجوہ علاج کرانے سے انکار کر دیا۔ (ابن جوزی)

ایک اور روایت میں ہے کہ تکلیف زیادہ ہوئی تو کسی شخص نے علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ فرمایا، بھائی اگر مجھے یقین ہو کہ صرف اپنے کان چھو کر تندرست ہو سکتا ہوں تو اتنا بھی نہ کروں۔ اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت سے بڑھ کر مجھے کیا چیز عزیز ہو سکتی ہے۔

(تاریخ ملت۔ قاضی زین العابدین میرٹھی)

اس بیماری سے جانبری کی امید نہ تھی اس لیے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ یزید بن عبدالملک کے لیے یہ وصیت نامہ لکھوایا:

"میں تم کو اس حالت میں یہ وصیت نامہ لکھ رہا ہوں کہ مرض نے بالکل لاغر کر دیا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ خلافت کی ذمہ داریوں کے بارہ میں مجھ سے سوال کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کا حساب لے گا اور میں اس سے اپنا کوئی کام پوشیدہ نہ رکھ سکوں گا۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ ۖ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ (الاعراف آیت ۷)

(پھر ہم اپنے علم سے ان کے حالات بیان کریں گے اور ہم کہیں غائب تو نہیں تھے)

اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہو گیا تو میں کامیاب ہوا اور ایک طویل عذاب سے نجات پائی اور اگر ناراض ہوا تو میرے انجام پر افسوس ہے میں اس وحدہٗ لاشریک سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی رحمت سے نارِ جہنم سے نجات دے اور اپنی رضا سے جنت عطا کرے۔ تم کو تقویٰ اختیار کرنا چاہیے اور رعایا کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ میری طرح تم بھی تھوڑے ہی دن زندہ رہو گے۔ تم کو اس سے بچنا چاہیے کہ تم سے غفلت میں کوئی ایسی لغزش سرزد ہو جائے جس کو تلافی نہ کر سکو۔

سلیمان بن عبدالملک اللہ کا ایک بندہ تھا اللہ نے اس پر موت وارد کی۔ اس نے مجھ کو خلیفہ بنایا اور میرے لیے خود بیعت لی اور میرے بعد تم کو نامزد

کیا۔ میں جس حال میں تھا اگر وہ اس لیے ہوتا کہ میں بہت سی بیویوں کا انتخاب کروں اور مال و دولت جمع کروں تو اللہ نے مجھے ایسے بہتر سامان دیئے تھے جو وہ اپنے کسی بندے کو دے سکتا تھا لیکن میں سخت اور نازک سوال سے ڈرتا ہوں بجز اس کے کہ اللہ میری مدد فرمائے۔"

وفات سے کچھ پہلے ان کے برادرِ نسبتی مسلمہ بن عبدالملک نے عرض کیا:

" امیرالمؤمنین آپ نے اپنی اولاد کو مال و دولت سے ہمیشہ محروم رکھا اور انہیں بالکل تہی دست چھوڑے جا رہے ہیں ان کے بارے میں مجھے یا خاندان کے کسی اور شخص کو کچھ وصیت کرتے جائیے۔"

یہ سن کر فرمایا:

" تم کہتے ہو کہ میں نے اپنی اولاد کو مال و دولت سے ہمیشہ محروم رکھا، واللہ میں نے ان کا کوئی حق تلف نہیں کیا البتہ جس مال میں ان کا حق نہ تھا وہ ان کو نہیں دیا۔ تم کہتے ہو کہ ان کے متعلق کسی کو وصیت کرتا جاؤں تو اس معاملہ میں میرا وصی اور ولی میرا اللہ ہے جو نیکوکاروں کا ولی ہوتا ہے۔ میرے لڑکے اگر اللہ سے ڈریں گے تو اللہ ان کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال دے گا اور اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو میں ان کو مال دے کر معصیت پر زیادہ دلیر اور طاقتور نہ بناؤں گا۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنی اولاد کو اپنے پاس بلایا اور چشم پُرآب ہو کر فرمایا:

" میری جان تم پر قربان جن کو میں خالی ہاتھ چھوڑے جا رہا ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے تمہیں ایسی حالت میں چھوڑا ہے کہ تم پر کسی مسلمان یا ذمی کا کوئی حق نہیں ہے جس کا وہ تم سے مطالبہ کر سکے۔ میرے بچو! تمہارے باپ کے اختیار میں دو باتوں میں سے ایک بات تھی پہلی یہ کہ تم خوب دولت مند ہو جاؤ اور باپ دوزخ میں جائے۔ دوسری یہ کہ تم خالی ہاتھ رہو اور وہ جنت میں جائے۔ پیارے بچو! تمہارے باپ نے دوسری بات

پسند کی ہے۔ اٹھو اللہ تم کو اپنی حفاظت وامان میں رکھے۔"

بیس دن کی علالت کے بعد آخر وہ وقت آپہنچا جو ہر ذی روح کے لیے مقدر ہے۔ اس وقت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے اہل وعیال سمیت دیر سمعان میں تھے۔ ۲۰ یا ۲۵ رجب ۱۰۱ھ کو ان پر نزع کی کیفیت طاری ہونے لگی تو سب لوگوں سے فرمایا: "مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ ان کی اہلیہ فاطمہ اور برادرِ نسبتی مسلمہ بن عبدالملک باہر دروازے کے قریب کھڑے رہے انہوں نے سنا کہ فرما رہے ہیں:

"کیا مبارک چہرے ہیں جو نہ آدمیوں کے ہیں نہ جنوں کے۔"

پھر بار بار یہ آیت پڑھنے لگے:

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (سورہ قصص آیت ۸۳)

(یہ آخرت کا گھر ہم نے ان کے لیے تیار کر رکھا ہے جو زمین میں تکبر اور فساد کا ارادہ نہیں رکھتے اور انجام (نیک) تو پرہیزگاروں ہی کا ہے)

اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ مسلمہ نے فاطمہ سے کہا کہ فوت ہو گئے، اندر جا کر دیکھا تو واقعی یہ آفتابِ رشد وہدایت ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا تھا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ اس وقت باختلافِ روایت عمر کی ۳۹ یا ۴۰ منزلیں طے کی تھیں۔ دو سال پانچ مہینے چودہ دن مسندِ خلافت پر متمکن رہے۔ بروایتِ ابنِ سعد انہوں نے اپنی تجہیز وتکفین وغیرہ کے بارے میں یہ وصیتیں کی تھیں۔

حضرت رجاء بن حیوۃؒ میت کو غسل دیں، وہی کفن پہنائیں اور وہی قبر میں اتاریں، کفن میں پانچ کپڑے ہوں اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند موئے مبارک اور ناخنِ مقدس رکھے جائیں۔ حنوط میں مشک نہ ملایا جائے اور قبر کو اینٹوں سے نہ بنایا جائے۔

ان کی وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا گیا اور پھر ملتِ اسلامیہ کے اس رجلِ عظیم کو دیر سمعان

میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ تقویٰ کی انتہا یہ تھی کہ قبر کی جگہ بھی اپنی گرہ سے قیمت دے کر خریدی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ان کی وصیت کے مطابق زمین کی قیمت ان کے ترکے میں سے ادا کی گئی۔ یہ زمین ایک ذمی کی تھی۔ ابنِ جوزی نے ان کی ازواج و اولاد کی تفصیل اس طرح دی ہے:

۱۔ لمیس بنتِ علی بن حارث ۔ ان کے بطن سے دو لڑکے عبداللہ اور بکر اور ایک لڑکی ام عمار پیدا ہوئے۔

۲۔ اُمِ عثمان بنت شعیب بن زیان ۔ ان کے بطن سے صرف ایک لڑکا ابراہیم پیدا ہوا۔

۳۔ فاطمہ بنتِ عبدالملک بن مروان ۔ ان کے بطن سے تین لڑکے اسحٰق، یعقوب اور موسٰی پیدا ہوئے۔

۴۔ ام الولد یعنی صاحب اولاد لونڈی ۔ ان کے بطن سے سات لڑکے عبدالملک، ولید، عاصم، یزید، عبداللہ، عبدالعزیز، زیان اور دو لڑکیاں امینہ اور ام عبداللہ پیدا ہوئیں۔

اولاد میں سے بعض بچپن میں وفات پائی۔ بقیہ میں سے صرف عبدالملک، عبدالعزیز اور عبداللہ نے تاریخ میں شہرت پائی۔ عبدالملک نے نوجوانی کے عالم میں باپ کے سامنے ہی وفات پائی، نہایت متقی اور عبادت گزار تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا حلیہ یہ تھا۔ رنگ گورا، چہرہ پتلا، آنکھیں گہری، چہرے کے نقوش میں دلکشی اور وجاہت۔ پیشانی پر زخم کا داغ، بچپن میں گھوڑے نے پیشانی پر لات مار دی تھی۔ اس کے زخم کا داغ عمر بھر رہا اس لیئے "اشج بنوامیہ" کہلاتے تھے خلافت سے پہلے عیش و تنعم کی زندگی نے جسم کو نہایت شاداب اور تر و تازہ بنا دیا تھا۔ خلافت کے بعد احساسِ ذمہ داری اور زہد و تقشف کی وجہ سے اتنے لاغر ہو گئے تھے کہ پسلیوں کی ہڈیاں بغیر چھوئے گنی جا سکتی تھیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی اولاد کے لیے جو ترکہ چھوڑا اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ ان کا کل ترکہ ۱۷ دینار تھا، دوسری روایت کے مطابق

۲۱ دینار اور تیسری روایت کے مطابق ۱۴ دینار نقد اور ۶۰۰ دینار کی جائداد۔ بہت سے ارباب سیر نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔

(۱۳)

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی وفات کی خبر مشہور ہوئی تو عام و خاص، عالم و جاہل مسلم غیر مسلم سبھی کو سخت صدمہ ہوا۔ ایک قاصد ان کی وفات کی خبر لے کر بصرہ پہنچا تو اہل بصرہ میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو بے اختیار اشک بار نہ ہو گیا ہو۔ خواجہ حسن بصریؒ نے یہ خبر سن کر اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا: "اے ہر نیکی کے مالک"

عبدالملک بن عمیرؒ نے ان کی وفات کی خبر سنی تو بے اختیار ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

"اے امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے، آپ ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتے تھے، پاکباز تھے، حق کے ساتھ فیاض اور بخل کے ساتھ بخیل تھے نہ کسی پر عیب لگاتے تھے، نہ کسی کی غیبت کرتے تھے، غصہ کے وقت غصہ اور راضی ہونے کے وقت راضی ہوتے تھے۔"

محمد بن معبدؒ کا بیان ہے کہ میں شاہِ روم کے دربار میں گیا تو اسے سخت غمزدہ صورت بنائے زمین پر بیٹھے دیکھا، میں نے پوچھا، آپ کا کیا حال ہے؟ بادشاہ بولا، تمہیں معلوم نہیں کیا سانحہ ہوا؟ میں نے پوچھا، فرمائیے کیا ہوا؟ اس نے کہا، مردِ صالح کا انتقال ہو گیا۔ میں نے پوچھا، وہ کون؟ بولا، مسلمانوں کے امیر عمر بن عبدالعزیز۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر پھر بولا، اگر عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بعد کوئی شخص مردوں کو زندہ کر سکتا تھا تو وہ عمر بن عبدالعزیز ہی تھے۔ مجھے اس تارک الدنیا راہب کے حال پر کوئی حیرت نہیں جس نے اپنا دروازہ بند کر کے دنیا کو ترک کر دیا اور عبادت میں مشغول ہو گیا۔ میں تو اس شخص کا حال سن کر حیران ہوں جس کے قدموں کے نیچے دنیا تھی لیکن اس نے ٹھکرا کر راہبوں جیسی سادہ زندگی اختیار کی۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں سفر میں تھا۔ ایک نبطی مجھ سے ملا، تعارف کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا، کیا تم عمر بن عبدالعزیزؒ کے انتقال کے وقت موجود تھے۔ میں نے کہا، ہاں۔ یہ سن کر وہ رونے لگا اور ان کے حق میں رحمت کی دعا کرنے لگا ——— میں نے پوچھا، تم ان کے لیے رحمت کی دعا کیوں مانگتے ہو، وہ تو مسلمان تھے اور تم غیر مسلم ——— اس نے جواب دیا، میں عمرؒ بن عبدالعزیزؒ کو نہیں روتا، میں تو اس نور پر روتا ہوں جو زمین پر تھا اور اب بجھ گیا۔

(سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دَورِ خلافت میں قصیدہ گو شعراء کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی لیکن ان کی وفات پر اس دَور کے بڑے بڑے شعراء نے نہایت دلدوز مرثیے لکھے جن میں سے جریر، فرزدق اور محارب بن دثار کے مرثیوں نے بڑی شہرت پائی۔

(۱۴)

علم و فضل کے اعتبار سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ امام وقت تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے تمام دینی علوم میں انہیں یکساں دست گاہ حاصل تھی۔ ان کی جلالتِ علمی پر تمام علماء سلف اور اہلِ سیر کا کامل اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے جلیل القدر علماء امت کی رائے ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ پہلی صدی ہجری کے مجدد تھے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ "عمر بن عبدالعزیزؒ فقیہ، مجتہد، عالم سنت، کبیر الشان ثبت حجت، حافظ قرآن و حدیث، اللہ کے فرماں بردار، نرم دل اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔"

امام نوویؒ کا بیان ہے کہ ان کی جلالتِ شان، فضیلتِ علمی، صلاح، زہد و تقویٰ، عدل، شفقت علی المسلمین، حسنِ سیرت، سُنّتِ نبوی کے اتباع اور خلفاء راشدین کی پیروی پر سب کا اتفاق ہے۔

میمون بن مہرانؒ کا قول ہے کہ ہمعصر علماء عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے ان کے شاگرد معلوم ہوتے تھے۔

مشہور صاحب علم تابعی مجاہد بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ ہم لوگ انہیں تعلیم دینے گئے تھے

لیکن کچھ دنوں کے بعد ہم خود ان سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔

امام مالکؒ اور ابن عیینہؒ کا قول ہے کہ "عمر بن عبدالعزیزؒ امامِ عصر تھے۔"

حفظِ حدیث کے اعتبار سے وہ نہایت ملبند مقام پر فائز تھے اور جس قدر مرفوع احادیث ان کو یاد تھیں اتنی کسی دوسرے تابعی کے علم میں نہ تھیں۔ صحاح ستہ کے علاوہ سنن، مسانید و معاجم میں بھی ان کی مرویات کثیر تعداد میں ملتی ہیں۔ محدث باغندیؒ نے مستقل طور پر ان کی مرویات جمع کی ہیں۔ مزید برآں ایک مختصر مگر جامع مجموعہ بھی "مسند عمر بن عبدالعزیزؒ" کے نام سے موجود و مشہور ہے جو ۱۸۲۵ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (ASIATIC SOCIETY OF BENGAL) نے شائع کیا تھا۔

(محمد نعیم ندوی صدیقی، ماہنامہ "فاران" کراچی مئی ۱۹۶۸ء)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کو شعر و شاعری سے چنداں لگاؤ نہیں تھا لیکن اس سے عاجز نہیں تھے کبھی کبھی خود بھی اخلاقی شعر کہہ لیتے تھے اور ایسے ہی اشعار دوسروں سے سُن بھی لیتے تھے۔ وہ ایک اچھے خطیب بھی تھے اور ان کے خطبے نہایت پُرتاثیر ہوتے تھے۔ ابن جوزی نے ان کے متعدد خطبات و مواعظ جمع کیے ہیں۔ ابن جاحظ نے بھی "کتاب البیان والتبیین" میں ان کے دو خطبے نقل کیے ہیں جو بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔

(۱۵)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ یوں تو شروع ہی سے نماز روزہ اور دوسرے فرائض دینی کے پابند تھے لیکن خلیفہ بننے کے بعد عبادتِ الٰہی سے ان کا شغف اس قدر بڑھ گیا کہ دیکھنے والے تعجب کرتے تھے۔ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ اذان کی آواز سنتے ہی گھر سے نکل کھڑے ہوتے تھے اور تکبیرِ اولیٰ کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ نماز بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھتے تھے اور اس میں سُنّتِ نبوی کا پورا پورا اتباع کرتے تھے۔ خادمِ رسول اللہ حضرت انسؓ بن مالک کا قول ہے کہ میں نے عمرؒ بن عبدالعزیز سے زیادہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ فرض روزوں

علاوہ دوشنبہ اور جمعرات کو ہمیشہ روزہ رکھتے۔ روزانہ صبح اٹھ کر قرآنِ کریم کی تلاوت ضرور کرتے۔ گھر میں ایک حجرہ عبادت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا جس میں کمبل کے سلے ہوئے کپڑے رکھ چھوڑے تھے۔ رات کے پچھلے پہر اس حجرے میں جا کر دن کا لباس اتار ڈالتے اور یہ کمل کا لباس پہن کر عبادت اور گریہ و بکا میں مصروف ہو جاتے۔ نمازِ فجر کی اذان ہوتی تو ان کپڑوں کو تہہ کر کے صندوق میں رکھ دیتے اور مسجد چلے جاتے۔ نمازِ فجر کے بعد پھر اسی حجرے میں چلے جاتے اور دروازہ بند کر کے دیر تک مناجات اور تلاوت میں مشغول رہتے۔

(۱۶)

اخلاق و عادات کے اعتبار سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ گوناگوں اوصاف و محاسن کا ایک پیکرِ جمیل تھے۔ ان کے گلشنِ اخلاق میں حسنِ خلق، حُبِّ رسولؐ، حلم و تحمل، تواضع و انکسار، زہد و تقویٰ، صبر و شکر، خشیتِ الٰہی، عیادت و عزاداری، مسکین نوازی اور سادگی سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔

اہلِ سیر نے ان کے فضائلِ اخلاق کے سلسلے میں بیسیوں واقعات بیان کیے ہیں جن کو پڑھ کر کوئی بھی مسلمان یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فی الواقع خلیفۂ راشد اور ایک مثالی حکمران تھے۔

خلافت کا بارِ گراں اٹھانے سے پہلے نہایت فاخرہ لباس پہنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جس لباس پر لوگوں کی نظر پڑ جائے دوبارہ اس کو نہ پہنتے تھے دس دس پندرہ پندرہ اشرفی کی قیمت کا جُبہ بھی ان کو سخت اور کرخت معلوم ہوتا تھا۔ عمدہ سے عمدہ خوشبو استعمال کرتے تھے۔ جس راستے سے گزرتے وہ خوشبو سے مہک جاتا تھا۔ خود فرماتے ہیں:

"مجھے لباس خوشبو اور عیش پرستی کا شوق پیدا ہوا تو میں نے اسے اتنا پورا کیا کہ نہ میرے خاندان میں اور نہ کسی دوسرے خاندان میں کوئی مجھ جیسی امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔"

حضرتِ رجاء بن حیوۃؒ فرمایا کرتے تھے کہ (خلافت سے پہلے) عمر بن عبدالعزیزؒ سب سے

زیادہ خوش لباس، سب سے زیادہ معطر اور سب سے زیادہ تبختر کی چال چلنے والے تھے ـــــ" خلافت کے بعد عطریات اور اچھے لباس قصۂ پارینہ بن گئے۔ معمولی کپڑے کا صرف ایک ہی جوڑا زیب تن رہتا تھا اس میں بھی پیوند لگے رہتے تھے اور اسی کو دھو دھو کر پہنا کرتے تھے۔ ایک دن جمعہ کی نماز میں دیر سے پہنچے کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا، غلام کپڑے دھونے کو لے گیا تھا اور ان کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا۔

رجاء بن حیوۃؒ کہتے ہیں کہ دورِ خلافت میں ایک مرتبہ ان کے لباس (عمامہ، قمیص، قباء، موزہ اور چادر) کی قیمت لگائی گئی تو وہ صرف بارہ درہم ٹھہری۔ یہ اس شخص کی حالت تھی جو پندرہ پندرہ اشرفی کے جُبّہ کو بھی حقیر جانتا تھا۔ مسلمہ بن عبدالملک کا بیان ہے کہ میں مرض الموت میں عیادت کو گیا تو دیکھا کہ ایک میلی سی پھٹی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ میں اپنی بہن (حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی اہلیہ فاطمہ) سے کہا کہ امیرالمؤمنین کی قمیص بدل ڈالو۔ دوسرے دن گیا تو ان کے بدن پر پھر وہی قمیص نظر آئی۔ میں نے بہن سے کہا قمیص بدلوانے کو اس لیے کہا تھا کہ لوگ عیادت کے لیے آتے ہیں۔ بولیں، خدا کی قسم اس کے سوا دوسرا کپڑا نہیں ہے۔

بچے بھی اسی تنگی سے بسر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بچی امینہ کے پاس کپڑا نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ فرش پھاڑ کر ایک قمیص امینہ کے لیے تیار کر دی جائے۔ ان کی بہن ام البنین کو خبر ہوئی تو انہوں نے ایک تھان کپڑا بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ عمر سے کچھ نہ مانگو۔

ایک مرتبہ ان کے صاحبزادے عبداللہ نے کپڑے مانگے۔ فرمایا، خیار بن رباح بصری کے پاس جا کر لے لو، ہمارے کپڑے ان کے پاس رکھے ہوئے ہیں، وہ گئے تو خیار نے گاڑھے کے کپڑے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیئے۔ انہوں نے کہا، ایسا معمولی اور موٹا کپڑا تو میں نہیں پہنتا۔ خیار نے کہا، میرے پاس تو امیرالمؤمنین کے یہی کپڑے ہیں۔ عبداللہ نے والد کے پاس جا کر عرض کی کہ خیار کے پاس گاڑھے کے کپڑے ہیں جو میرے پہننے کے لائق نہیں۔ انہوں نے فرمایا، ہمارے پاس تو ان کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں۔ وہ بددل ہو کر لوٹنے لگے تو فرمایا کہ اگر اپنے وظیفہ سے پیشگی لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ وہ راضی ہو گئے تو کچھ

رقم دلوادی اور جب وظیفہ تقسیم ہوا تو اس میں سے کاٹ لی۔

ایک دن انگور کھانے کو جی چاہا۔ بیوی سے پوچھا، تمہارے پاس ایک درہم ہے میں انگور کھانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے جل کر کہا، امیر المومنین ہو کر ایک درہم کی بھی استطاعت نہیں۔ فرمایا، یہ دوزخ کی زنجیروں سے میرے لیے زیادہ آسان ہے۔

ایک دفعہ عید الفطر سے چند دن پہلے ان کی اہلیہ نے کہا کہ عید کے دن سب لوگ عمدہ سے عمدہ لباس پہنیں گے لیکن ہمارے بچوں کے پاس معمولی کپڑے ہیں مجھے نہایت شرم آتی ہے کہ امیر المومنین کی اولاد عید کے دن بھی اس قسم کے کپڑے پہنے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مہتمم بیت المال کو ایک رقعہ لکھا کہ میرا ایک ماہ کا وظیفہ پیشگی بھیج دیجئے۔ اس نے رقعہ کی پشت پر یہ الفاظ لکھ کر اسے واپس بھیج دیا، "امیر المومنین کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ ایک مہینے تک زندہ رہیں گے۔" یہ الفاظ پڑھ کر اشکبار ہو گئے اور اہلیہ سے کہا، ہمارے بچوں کو بہشت میں عمدہ پوشاک ملے گی اس لیے یہاں عمدہ لباس کی ضرورت نہیں۔

خلافت کے بعد اعلیٰ اور مرغن کھانے بھی ترک کر دیئے۔ نہایت معمولی غذا کھاتے تھے اور وہ بھی کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ ایک روز گھر کے خادم نے ان کی اہلیہ سے شکایت کی کہ ہر روز دال کھا کھا کر تنگ آگیا ہوں۔ انہوں نے کہا، "تمہارے آقا امیر المومنین کی بھی یہی غذا ہے۔"

ایک دن خلافِ معمول صبح کو گھر سے نکلنے میں بہت دیر کر دی۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا، رات کو مسور اور چنے کی دال کھائی تھی اس سے پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ایک شخص نے کہا، امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو جو کچھ دیا ہے ان میں سے اچھی چیزیں کھاؤ۔ فرمایا، تم نے اس کے الٹے معنی لیے اس سے مراد کسبِ حلال سے حاصل کیا جانے والا مال ہے نہ کہ لذیذ کھانا ۔۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو غذا میں روٹی کے سوکھے ٹکڑوں اور روغنِ زیتون کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ اہل وعیال کی گزران بھی اسی سادہ غذا پر تھی۔ ایک مرتبہ عشاء کی نماز کے بعد اپنی لڑکیوں کے ہاں گئے تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اُن کے سامنے آئیں۔ اس کی وجہ پوچھی تو بچیوں نے کہا کہ شام کے کھانے

میں مسور کی دال اور پیاز کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی اس لیے ہم نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا کہ آپ کو ان کی بُو نہ آئے۔ یہ سُن کر رو پڑے اور فرمایا، میری بچیو کیا تم یہ پسند کرتی ہو کہ تم اچھے اچھے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ دوزخ کا ایندھن بنے —— اس پر بچیاں بھی رونے لگیں۔

ان کے پیشرو حکمرانوں نے حاکم و محکوم اور غلام و آقا کی جو تفریق پیدا کر دی تھی اس کو بالکل مٹا دیا اور شاہی امتیازات ختم کر دیئے۔ خلفاء جب کسی جنازہ میں شرکت کے لیے جاتے تو ان کے لیے علیحدہ چادر بچھائی جاتی تھی حسبِ معمول ان کے لیے بھی چادر بچھائی گئی تو اس کو پاؤں سے ہٹا کر زمین پر بیٹھ گئے۔ قصرِ خلافت کے تمام پردے ہٹوا دیئے اور فرش قالین وغیرہ فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں جمع کرا دی۔ ملازمین کو تعظیم کے لیے اٹھنے سے منع کر دیا اور ان کے ساتھ برابر بیٹھنے لگے۔ دوسرے لوگوں کو بھی اپنے سامنے کھڑا ہونے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ تم کھڑے رہو گے تو میں بھی کھڑا رہوں گا، تم بیٹھو گے تو میں بھی بیٹھوں گا۔ ہم سب کو صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے۔

جو لوگ خلیفہ میں شان و تجمل دیکھنے کے عادی تھے وہ انہیں بمشکل سے پہچان سکتے تھے۔ حکم بن عمرو الرعینی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز ایک حلقہ سے اٹھ کر دوسرے حلقہ میں جا بیٹھتے تھے تو کوئی اجنبی یہ نہ جان سکتا تھا کہ امیر المؤمنین کس حلقہ میں ہیں تاآنکہ اسے اشارہ کر کے بتایا جاتا۔

لونڈی غلاموں کے ساتھ ان کا سلوک نہایت مشفقانہ تھا۔ وہ ان سے مساویانہ برتاؤ کرتے تھے اور اپنے آپ کو ان سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ پنکھا جھلتے جھلتے ایک لونڈی کی آنکھ لگ گئی۔ انہوں نے خود پنکھا لے لیا اور اس کو جھلنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گھبرا کر چلائی۔ فرمایا، تم بھی میری طرح انسان ہو، تم کو بھی گرمی لگتی ہوگی اس لیے میں نے چاہا کہ جس طرح تم مجھے پنکھا جھل رہی تھیں میں بھی تم کو جھل دوں۔

ایک مرتبہ حضرت رجاء بن حیوۃؒ سے گفتگو میں رات زیادہ گزر گئی اور چراغ جھلملانے لگا۔ پہلو میں خادم سویا ہوا تھا، حضرت رجاءؒ نے اس کو جگانا چاہا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا، اسے سونے دیں۔ حضرت رجاءؒ نے خود چراغ درست کرنے کا ارادہ کیا تو انہیں بھی روک دیا اور فرمایا، مہمان سے کام لینا مروت کے خلاف ہے۔ پھر خود اٹھ کر تیل لیا اور چراغ کو ٹھیک کر کے پلٹ کر فرمایا، "جب میں اٹھا تھا تب بھی عمرؓ بن عبدالعزیز تھا اور جب پلٹا تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں۔"

طبیعت میں انکسار اور فروتنی کے ساتھ انتہا درجے کا حلم و تحمل بھی تھا۔ ایک بار کسی شخص نے سخت گستاخی کی، فرمایا "تو چاہتا ہے کہ حکومت کے پندار میں تیرے ساتھ میں بھی ایسا سلوک کروں کہ تو قیامت کے دن مجھ سے بدلہ لینے والا بن جائے۔" یہ فرما کر اُسے معاف کر دیا۔

ایک بار منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے اٹھ کر کہا، "میں گواہی دیتا ہوں کہ تم فاسق ہو۔" چونکہ وہ شخص محض شر انگیزی کر رہا تھا، چاہتے تو اس کو سخت سزا دے سکتے تھے لیکن بڑی نرمی سے صرف اس قدر فرمایا "تم جھوٹے گواہ ہو، میں تمہاری شہادت کو قبول نہیں کرتا۔"

ایک بار رات کو مسجد میں گئے۔ اندھیرے میں ایک لیٹے ہوئے شخص کو پاؤں کی ٹھوکر لگ گئی۔ اس نے غصے سے کہا "کیا تم پاگل ہو" بولے، نہیں۔ خادم نے اس کو سزا دینا چاہی لیکن اس نے روک دیا اور فرمایا "اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم پاگل ہو، میں نے جواب دے دیا کہ نہیں۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک بار ایک شخص کاغذ کا پلندا لیے ہوئے آیا اور یہ پلندا دور سے ان کی طرف پھینک دیا۔ اس سے ان کے گالوں پر زخم آ گیا جس سے خون رِسنے لگا لیکن انہوں نے نہایت تحمل سے اس کی عرضی پڑھی اور اس کی حاجت پوری کر دی۔

ایک بار کسی نے انہیں ناشائستہ الفاظ سے خطاب کیا لیکن انہوں نے سکوت اختیار کیا۔ لوگوں نے پوچھا، آپ خاموش کیوں ہیں۔ فرمایا، تقویٰ نے منہ میں لگام دے

رکھی ہے۔

ایک دفعہ سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ ایک پا پیادہ شخص سواری کی جھپٹ میں آگیا۔ اس نے جھلّا کر کہا، تو دیکھ کے نہیں چلتا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے معذرت کی۔ پھر اس شخص نے کہا، کیا کوئی ہے جو مجھے اپنے پیچھے بٹھائے۔ انہوں نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ اس کو اپنی سواری پر بٹھا کر چشمہ تک لے چلو۔

ایک دفعہ ان کے ایک بچے کو کسی لڑکے نے مارا لوگ اس کو پکڑ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اہلیہ کے پاس لے گئے۔ حضرت عمرؒ نے شور سنا تو اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔ اتنے میں ایک عورت آئی اور کہا کہ یہ بچہ میرا ہے اور یتیم ہے۔ حضرت عمرؒ نے پوچھا، کیا اس کو وظیفہ ملتا ہے؟ عورت نے کہا، نہیں۔ اسی وقت حکم دیا کہ اس بچے کے نام وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

۱۷

اہلِ حاجت کی مدد کرنا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خاص شیوہ تھا۔ مسندِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ اس اُمّت کے چھوٹے بڑے اور سیاہ وسپید جملہ امور کا ذمہ دار ہوں اس لیے جب میں بے کس، غریب، محتاج، فقیر، گمشدہ قیدی اور اسی طرح کے دوسرے افراد کا خیال کرتا ہوں جو ساری مملکت میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور یہ سوچتا ہوں کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں مجھ سے سوال کرے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق مجھ پر داورِ حشر کی عدالت میں دعویٰ کریں گے تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر اللہ کے سامنے کوئی عذر اور شافع محشر کے سامنے کوئی جواب پیش نہ کر سکا تو میرا کیا انجام ہوگا۔ ان کے یہی احساسات تھے جن کی بناء پر انہوں نے اپنی ہمنشینی کے لیے جو شرطیں مقرر کی تھیں ان میں ایک شرط یہ تھی کہ میرے ہم نشینوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مجھ تک ان لوگوں کی حاجتیں پہنچائیں جو خود مجھ تک پہنچنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔

ایک بار ایک اعرابی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی حاجت ان کے سامنے

نہایت پُر درد الفاظ میں پیش کی۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے گردن جھکالی اور رو پڑے۔ پھر سر اٹھا کر پوچھا کہ تم سب کتنے آدمی ہو؟ اس نے کہا، "نو، ایک میں اور آٹھ بیٹیاں۔" انہوں نے اسی وقت سو درہم اپنی جیب سے دیئے اور سب کے وظیفے بیت المال سے مقرر کر دیئے۔

اپاہجوں اور اندھوں کا اس قدر خیال تھا کہ جب مالِ غنیمت میں غلام آتے تو ہر اپاہج اور ہر اندھے کو ایک ایک غلام عطا فرماتے۔

ایک مرتبہ ایک چور ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے پوچھا تو نے چوری کیوں کی۔ چور نے جواب دیا کہ میں سخت غریب ہوں، فاقے پہ فاقہ گزر رہا تھا اس لیے تن اور روح کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے اس فعلِ قبیح پر مجبور ہو گیا۔

حضرت عمرؒ نے اس کا عذر قبول کر لیا اور اس کو نہ صرف رہا کر دیا بلکہ بیت المال سے دس درہم بھی دلوا دیئے۔

ایک بار مصر سے ایک غریب عورت نے خط لکھا کہ اس کے گھر کی دیوار اس قدر نیچی ہے کہ لوگ اس کو پھاند کر اس کی مرغیاں چرا لے جاتے ہیں۔ حضرت عمرؒ نے عاملِ مصر کو فرمان بھیجا کہ میرا فرمان ملتے ہی فوراً جاؤ اور اس عورت کے مکان کی دیوار اونچی کر دو۔

ایک مرتبہ عراق کی ایک عورت اپنی یتیم بچیوں کے لیے وظیفہ مقرر کرانے کی غرض سے دمشق آئی۔ حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کے دروازے پر پہنچی تو لوگوں سے پوچھا: کیا امیر المومنین کے یہاں دربان بھی ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ یہاں کوئی دربان وغیرہ نہیں ہیں۔ تم جب چاہو ان کے گھر کے اندر جا سکتی ہو۔ عورت گھر میں گئی۔ حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کی اہلیہ فاطمہ بیٹھی روٹی پکا رہی تھیں۔ عورت نے سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔ عورت حیرت بھری نگاہوں سے امیر المومنین کے مکان کو دیکھنے لگی اور پھر کہنے لگی:

"میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ اس گھر کے فیض سے اپنے گھر کی ویرانی کو دور کر دوں گی لیکن یہ تو خود ویران ہو رہا ہے۔"

فاطمہ بولیں: ”بہن تم جیسے لوگوں کے گھروں کو آباد کرنے کے لیے ہی یہ گھر ویران ہو رہا ہے۔“

اتنے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ باہر سے آئے اور کنوئیں سے پانی کھینچ کھینچ کر مکان کے سامنے پڑی ہوئی مٹی پر ڈالنے لگے اس دوران میں انہوں نے دو تین بار اپنی اہلیہ کی جانب دیکھا، نوارد عورت نے فاطمہ سے مخاطب ہو کر کہا، ”بی بی آپ پردہ میں ہو جائیں، یہ مزدور آپ کو بار بار گھور رہا ہے۔“

فاطمہ بولیں: ”یہ مزدور نہیں ہیں، یہی امیرالمؤمنین ہیں۔“

اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سلام کر کے اندر آئے اور مکان کے اس حصہ میں چلے گئے جہاں عبادت کیا کرتے تھے۔ پھر اپنی اہلیہ کو پاس بلایا اور پوچھا، ”یہ کون عورت ہے؟“ انہوں نے کہا ”یہ ابھی آئی ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

حضرت عمرؒ نے نوارد عورت کو بلایا اور دریافت فرمایا، ”بی بی، تم کیا چاہتی ہو۔“ عورت نے کہا، ”امیرالمؤمنین میں عراق کی رہنے والی ہوں۔ خاوند فوت ہو گیا ہے اور بے سہارا ہوں۔ میری پانچ لڑکیاں ہیں اور پانچوں بڑی بے شعور اور بے پروا ہیں۔ ان کی کفالت کے لیے آپ سے مدد کی التجا کرنے حاضر ہوئی ہوں۔“

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا ”یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہاری سبھی لڑکیاں بے شعور اور بے پروا ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے رو پڑے۔ پھر قلم دوات نکال کر حاکم عراق کے نام خط لکھنا شروع کیا۔ پوچھا، ”تمہاری بڑی بیٹی کا کیا نام ہے؟ اس نے نام بتایا۔ امیرالمؤمنین نے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے کہا۔ الحمدللہ۔ پھر آپ نے دوسری بیٹی کا نام دریافت فرمایا۔ نام معلوم ہونے پر اس کا بھی وظیفہ مقرر کر دیا۔ عورت نے پھر الحمدللہ کہا۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی لڑکی کا نام دریافت کر کے ان کا بھی وظیفہ مقرر کر دیا اور عورت نے ہر مرتبہ الحمدللہ کہا۔ اب وہ اپنی خوشی ضبط نہ کر سکی اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو دعائیں دینے لگی۔ انہوں نے اپنا قلم روک لیا اور فرمایا: ”تم جب تک اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتی رہیں جو اس کا حقیقی سزاوار ہے میں تمہاری بیٹیوں کے لیے

وظیفہ مقرر کرتا گیا لیکن اب تم نے یوں میری تعریف و توصیف شروع کر دی ہے گویا یہ وظیفہ دینے والا میں ہوں۔ اس لیے اب میں پانچویں کے لیے وظیفہ مقرر نہیں کر سکتا۔ تم اپنی چاروں لڑکیوں سے کہنا کہ وہ اپنے وظائف میں سے تھوڑا تھوڑا اس کو بھی دے دیا کریں۔ وہ عورت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فرمان لے کر عراق گئی اور اسے حاکم عراق کے سامنے پیش کیا۔ وہ اس فرمان کو دیکھ کر رو پڑا اور بولا، "اللہ اس فرمان کے لکھنے والے پر اپنی رحمت نازل کرے۔" عورت نے گھبرا کر پوچھا "کیا وہ فوت ہو گئے؟" حاکم نے کہا "ہاں" یہ سن کر عورت کی چیخ نکل گئی۔ حاکم نے کہا "بی بی تم کچھ فکر نہ کرو، میں اس فرمان کی تعمیل کروں گا۔" چنانچہ اس نے فرمان کے مطابق عورت کی چاروں بیٹیوں کے وظیفے مقرر کر دیئے۔

ایک دفعہ بارش کے دن ایک نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اتفاقاً ایک مسافر آ گیا جس کے بدن پر چادر نہ تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو بلا لیا اور اپنی چادر کا ایک حصہ اس کو اڑھا دیا۔

۱۸

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پر کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی آ پڑتی وہ صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ ان کا محبوب ترین فرزند عبدالملک، عزیز ترین بھائی سہل بن عبدالعزیز اور نہایت وفادار خادم تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وفات پا گئے۔ لیکن حضرت عمرؒ نے ایسے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا کہ لوگ تعجب کرتے تھے۔ عبدالملک کو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر کھڑے ہو کر صرف اتنا کہا، اے فرزند اللہ تجھ پر رحم کرے، بچپن میں تم خوشی کا باعث تھے اور جوانی میں حقِ پدری ادا کرنے والے تھے لیکن آج سے زیادہ میری آنکھوں کو کبھی آنسو خنک معلوم نہیں ہوئے۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا، اللہ کی امانت تھی اس نے لے لی کوئی شخص نوحہ و بکا ہرگز نہ کرے۔ یہی حکم تمام ممالک محروسہ میں بھیج دیا کہ کوئی شخص میرے فرزند کا ماتم نہ کرے۔ لوگ ان کے پاس پرسا دینے آتے اور بڑے رقت انگیز الفاظ استعمال کرتے لیکن وہ ہمیشہ صبر و شکر کا اظہار کرتے۔ ایک دفعہ ربیع بن سبرہ تعزیت کے لیے آئے اور کہا، امیر المؤمنین آپ کو اللہ تعالیٰ اجرِ عظیم

دے کہ چند روز کے وقفہ میں آپ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ خدا کی قسم آپ کے فرزند جیسا فرزند، آپ کے بھائی جیسا بھائی اور آپ کے غلام جیسا غلام نہیں دیکھا۔ حضرت عمرؓ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر فرمایا، اس ذات کی قسم جس نے ان کی موت کا فیصلہ کیا، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ یہ واقعات نہ ہوتے جو اس کی رضا وہ میری رضا۔

طبیعت میں بے انتہا شرم و حیا تھی یہاں تک کہ جن اعضاء کا نام لینے سے شرم محسوس ہوتی ہے ان کا نام نہیں لیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے ان کے سامنے کسی سے کہا "تیری بغل کے نیچے" فرمایا "شائستہ طریقے سے گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں نے پوچھا، وہ کیسے؟ بولے "ہاتھ کے نیچے کہنا بہتر تھا۔"

ایک دفعہ خود ان کی بغل میں پھوڑا نکلا۔ لوگوں نے پوچھا کہ کہاں پھوڑا نکلا ہے چونکہ بغل کا نام لینا پسند نہ تھا، فرمایا: "میرے ہاتھ کے باطن میں"۔

مزاج میں متانت اور سنجیدگی کی یہ کیفیت تھی کہ نہ بلند آواز سے گفتگو کرتے تھے اور نہ دوسروں کو بلند آواز سے گفتگو کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ فرماتے تھے کہ آواز بس اتنی ہونی چاہیے کہ دوسرا شخص آسانی سے سن لے۔

ہنسی مذاق کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک روز ان کے خاندان کے چند لوگ جمع ہوئے اور ہنسی مذاق کی باتیں شروع کر دیں۔ امیر المومنین نے تیز نظر سے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا، کیا تم لوگ ایسی یاوہ گوئی کے لیے جمع ہوئے ہو؟ تم کو چاہیے کہ مجلسوں میں قرآنِ کریم یا حدیثِ رسول اللہؐ کے متعلق گفتگو کرو، ورنہ کم از کم تمہاری گفتگو شریفانہ تو ہونی چاہیے۔

نہایت شیریں کلام، خوش خُلق اور نرم دل تھے۔ کسی کو دکھ یا مصیبت میں مبتلا دیکھتے تو اشکبار ہو جاتے اور اس کا دکھ درد دُور کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے! ان کی رحمدلی اور شفقت صرف انسانوں تک محدود نہیں تھی، جانوروں کو تکلیف دینا بھی گوارا نہ تھا۔ انہوں نے فرمان جاری کیا تھا کہ ڈاک کے جانوروں کے منہ میں بھاری لگام نہ دی جائے اور کوڑے کی نوک میں چبھنے والا لوہا نہ لگایا جائے۔ ایک دفعہ خبر ملی کہ

مصر میں اونٹوں پر ہزار رطل کا بوجھ لادا جاتا ہے۔ فوراً حاکم مصر کو حکم بھیجا کہ کسی اونٹ پر چھ سو رطل سے زیادہ کا بوجھ نہ لادا جائے۔ دشمنوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک نہایت فراخدلانہ تھا۔ خوارج نے سرکشی کی تو ان شرائط پر ان سے جنگ کرنے کی اجازت دی کہ عورتیں بچے اور قیدی قتل نہ کیے جائیں، زخمیوں کا تعاقب نہ کیا جائے، جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے وہ ان کے اہل وعیال کو واپس کر دیا جائے۔ اور قیدی راہِ راست پر آجائیں تو ان کو فوراً رہا کر دیا جائے۔

جس غلام نے زہر دیا تھا اس کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ یہ تلقین بھی کی کہ ایسی جگہ چلا جائے جہاں سے گرفتار نہ ہو سکے۔

دوست دشمن ہر ایک کی عیادت و تعزیت کے لیے بے تکلف جاتے تھے اور ان کو تسلی دیتے تھے۔ توکل علی اللہ کی یہ کیفیت تھی کہ کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ پہرہ داروں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں تم سے بالکل بے نیاز ہوں اور تقدیرِ الٰہی شاکر ہوں جس کا جی چاہے چلا جائے۔

۱۹

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے فضائل اخلاق میں تقویٰ و تورع اور دیانت و امانت داری سب سے نمایاں اوصاف تھے۔ اگر کبھی ذمیوں کے ہاں مہمان بننے کا اتفاق ہوتا تو ان کی پیش کی ہوئی اشیاء سے خور و نوش اس وقت استعمال نہ کرتے جب تک ان کو قیمت نہ دے لیتے اور یہ قیمت بھی بازار کے عام نرخ سے زیادہ ہوتی۔

رعیت یا خاندان کے کسی شخص سے کسی قسم کا ہدیہ قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہدیہ قبول فرما لیتے تھے۔ بولے حضورؐ کے لیے ہدیہ بلاشبہ ہدیہ تھا لیکن یہ ہمارے اور ہمارے بعد والوں کے لیے رشوت ہے۔

بیت المال کو اللہ اور مسلمانوں کی امانت سمجھتے تھے اور اس سے معمولی سا فائدہ اٹھانا بھی گوارا نہ تھا۔ رات کو جب تک سرکاری کام کرتے تھے اس وقت تک بیت المال کی شمع جلاتے تھے لیکن جب اپنا کام کرنا ہوتا تو اس شمع کو گل کر دیتے یا اٹھوا دیتے اور

اپنا ذاتی چراغ منگوا کر کام کرتے۔

ایک مرتبہ بیت المال کا مشک ان کے سامنے رکھا گیا تو فوراً اپنی ناک بند کر لی کہ اس کی خوشبو ناک میں نہ جانے پائے۔ اس پر ان کے ایک ہم نشین نے کہا کہ امیر المومنین خوشبو سونگھنے میں کیا حرج ہے۔ فرمایا، خوشبو سونگھنا بھی تو مشک سے فائدہ اٹھانے کے مترادف ہے اور میرے لیے جائز نہیں ہے کہ بیت المال کی کسی چیز سے بلا استحقاق فائدہ اٹھاؤں۔

ایک دفعہ انہوں نے اپنے غلام مزاحم سے کہا کہ میرے لیے ایک رحل خرید کر لاؤ۔ وہ ایک رحل لائے جو ان کو بہت پسند آئی۔ مزاحم سے پوچھا، اس کو کہاں سے خریدا؟ انہوں نے کہا، بیت المال کے توشہ خانے میں کچھ عمدہ قسم کی لکڑی پڑی تھی میں نے یہ رحل اسی سے بنوائی ہے۔ فرمایا، اسی وقت جاؤ اور بازار سے اس کی قیمت لگاؤ۔ وہ بازار گئے اور واپس آ کر بتایا کہ اس کی قیمت نصف دینار لگائی گئی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تقویٰ یا غایت احتیاط کی بناء پر حکم دیا کہ بیت المال میں میری طرف سے دو دینار داخل کر دو۔

بیت المال کے مصارف سے فقراء و مساکین کے لیے جو مہمان خانہ قائم کیا تھا اس سے نہ خود فائدہ اٹھاتے تھے اور نہ خاندان کے کسی فرد کو فائدہ اٹھانے دیتے تھے۔ اس کے باورچی خانہ میں اپنے لیے غسل اور وضو کا پانی گرم کرانا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی لاعلمی میں ملازم ایک مہینہ تک باورچی خانہ میں پانی گرم کرتا رہا۔ ان کو معلوم ہوا تو اتنی لکڑی خرید کر باورچی خانہ میں داخل کرا دی۔

ایک دفعہ غلام کو گوشت کا ایک ٹکڑا بھوننے کے لیے دیا۔ وہ سرکاری باورچی خانہ سے بھون لایا۔ انہوں نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا اور غلام سے فرمایا، یہ تم ہی کھا لو میری قسمت میں نہ تھا۔

ایک دن بیت المال میں بہت سے سیب آئے۔ انہیں عام مسلمانوں میں تقسیم کر رہے تھے کہ ان کا ایک کمسن بچہ وہاں آ گیا اور ایک سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ انہوں نے اس کے منہ سے چھین لیا۔ وہ روتا ہوا ماں کے پاس گیا اور شکایت کی۔ ماں نے بازار سے سیب منگا دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ گھر آئے تو سیب کی خوشبو سونگھ کر بولے:

بیت المال کا کوئی سیب تو ہمارے گھر میں نہیں آیا؟ اہلیہ نے سارا واقعہ بیان کیا تو فرمایا، خدا کی قسم میں نے سیب بچے کے منہ سے نہیں اپنے دل سے چھینا تھا لیکن مجھے یہ پسند نہ تھا کہ مسلمانوں کے حصہ کے ایک سیب کے بدلہ میں اپنے آپ کو برباد کر دوں۔

ایک مرتبہ اپنی اہلیہ فاطمہ کے سامنے لبنان کے شہد کا شوق ظاہر کیا۔ فاطمہ نے لبنان کے عامل ابن معدیکرب کو لکھ بھیجا۔ انہوں نے بہت سا شہد بھیج دیا لیکن جب یہ شہد حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے فاطمہ سے مخاطب ہو کر کہا، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ابن معدیکرب سے فرمائش کر کے یہ شہد منگوایا ہے۔ فاطمہ نے اثبات میں جواب دیا تو اس کو چکھا تک نہیں اور فروخت کروا کر قیمت بیت المال میں داخل کرا دی۔ ساتھ ہی ابن معدیکرب کو ایک سخت خط لکھا کہ خدا کی قسم اگر تم نے آئندہ ایسا کیا تو اپنے منصب پر قائم نہیں رہ سکتے اور میں تمہارا منہ دیکھنا بھی پسند نہ کروں گا۔

ایک دفعہ ان کی اہلیہ نے ڈاک کی سرکاری سواری پر ایک آدمی کو روانہ کیا اور وہ دو دینار کا شہد خرید لایا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس کو فروخت کر ڈالا۔ اس کی قیمت دو دینار سے زیادہ وصول ہوئی۔ انہوں نے دو دینار بیوی کو واپس دے کر باقی رقم بیت المال میں جمع کرا دی اور بیوی سے کہا، تم نے عمر کے لیے مسلمانوں کے جانور کو ناحق تکلیف دی۔

ایک مرتبہ ان کی خدمت میں کچھ کھجوریں پیش کی گئیں جو ڈاک کے گھوڑوں پر لائی گئی تھیں۔ انہیں معلوم ہوا تو کھجوروں کو فروخت کر کے ان کی قیمت بیت المال میں جمع کرا دی۔

ایک دفعہ رات کو بیت المال کے چراغ کی روشنی میں سرکاری کام کر رہے تھے کہ گھر سے غلام آیا اور باتیں کرنے لگا۔ یہ باتیں امور خانہ داری سے متعلق تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے فرمایا:

"پہلے چراغ بجھا دو، پھر باتیں کرو۔ اس لیے کہ چراغ میں تیل بیت المال کا ہے۔ اس کا استعمال صرف مسلمانوں کے مفاد ہی کے سلسلہ میں جائز ہو سکتا ہے۔"

اہل سیر نے اس قبیل کے اور بھی بہت واقعات لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے

کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے زہد و اتقا، امانت و دیانت اور احساس ذمہ داری کا جو نمونہ پیش کیا، خلفائے راشدینؓ کے دور کے سوا تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

(۲۰)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی محبت عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ ہر کام میں اسوۂ نبویؐ کو پیش نظر رکھتے اور آخرت کا ذکر کرتے وقت اکثر یہ بھی کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جن صحابہ کرامؓ کا فیض صحبت اٹھایا ان سے اور اپنے ہمعصر تابعین سے حضورؐ کے جو ارشادات سنتے انہیں اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیتے پھر انہیں بڑے لطف و انبساط کے ساتھ لوگوں کو سناتے اور ان کے مطابق عمل بھی کرتے۔ ان کی مرویات کثیر تعداد میں کتب حدیث میں موجود ہیں۔

مرض الموت میں بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ مدینہ منورہ میں سفر آخرت اختیار کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ آپ کی آخری آرام گاہ بنتی، روضۂ اطہر میں ایک قبر کی جگہ اور ہے۔ فرمایا، خدا کی قسم اگر اللہ تعالیٰ مجھے آگ کے سوا ہر قسم کے عذاب دے تو میں ان کو بخوشی برداشت کروں گا لیکن میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہو کہ میں اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلوئے مبارک میں دفن ہونے کے قابل سمجھتا ہوں۔

انہوں نے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی چند متبرک یادگاروں (پلنگ، گدا، چادر، پیالہ، ترکش، عصا اور چکی) کو ایک حجرے میں محفوظ کر دیا تھا اور ہر روز ان کی زیارت کر کے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے تھے۔ کبھی کبھی قریش کے لوگوں کو بھی ان کی زیارت کرواتے اور ان سے مخاطب ہو کر کہتے، یہ تبرکات اس ذاتِ گرامیؐ کی یادگار ہیں جن کی بدولت اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو معزز کیا۔

ان تبرکات کے علاوہ حضورؐ کی کوئی اور یادگار کہیں مل جاتی تو اس کو چومتے اور سر آنکھوں پر رکھتے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب رسول اولاد میں سے ایک شخص نے انہیں

حضورؐ کا ایک فرمانِ مبارک دکھایا جس میں آپؐ نے ان صاحبِ رسول کو جاگیریں عطا فرمائی تھیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس فرمان مبارک کو چوم کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ انتقال سے پہلے وصیت کی کہ ان کے کفن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند موئے مبارک اور ناخن رکھ دیئے جائیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت کی بنا پر وہ حضورؐ سے انتساب و تعلق کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں اہانت آمیز جملے خطبہ سے یکسر خارج کر دیئے اور حضرت علیؓ کا ذکر ہمیشہ بڑی عزت و احترام سے کیا۔ جس زمانے میں مدینہ منورہ کے گورنر تھے۔ ایک دن حضرت فاطمہ بنت علیؓ ان کے یہاں تشریف لائیں تو ان کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کی۔ دورِ خلافت میں ایک دن حضرت علیؓ کے آزاد کردہ غلام زریق ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ بیت المال کے رجسٹر میں میرا نام درج نہیں ہے حالانکہ میں مدینہ کا رہنے والا ہوں، قرآن مجید اور فرائض مجھے یاد ہیں، موالی بنی ہاشم میں ہوں اور حضرت علیؓ کی غلامی کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔

زریق کی شکایت سن کر حضرت عمرؒ اشکبار ہو گئے اور فرمایا کہ میں خود علیؓ کا غلام ہوں۔ پھر اپنے مولیٰ مزاحم سے پوچھا کہ اس قسم کے لوگوں کا کتنا وظیفہ مقرر ہے؟ انہوں نے کہا، سو یا دو سو درہم۔ انہوں نے حکم دیا، حضرت علیؓ سے نسبت کی بنا پر زریق کا وظیفہ پچاس دینار مقرر کر دو۔

ایک دفعہ بنو امیہ کے بہت سے لوگ دروازے پر ملاقات کے منتظر تھے ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا غلام بھی تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب سے پہلے اس کو شرفِ باریابی بخشا اور اپنے خاندان کے لوگوں کی برہمی کی پروا نہ کی۔

ایک مرتبہ محبوبِ رسولؐ (حِبّ النبیؐ) حضرت اسامہ بن زیدؓ کی بیٹی ان سے ملنے آئیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آگے بڑھ کر ان کا پرتپاک استقبال کیا، اپنی جگہ پر بٹھایا اور انہوں نے اپنی جو ضرورتیں بیان کیں ان کو پورا کیا۔

مدینۃ النبیؐ سے بھی اس قدر محبت تھی کہ فرماتے تھے "میں یہ تو برداشت کر لوں گا

کہ کوئی شخص اس جرم میں میرے سامنے پیش کیا جائے کہ وہ شراب لے جا رہا تھا لیکن میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی ایسا مجرم میرے سامنے لایا جائے جس نے حرمِ مدینہ سے کوئی چیز (درخت یا گھاس) کاٹی ہو۔"

مدینہ منورہ کی گورنری سے سبکدوش ہو کر وہاں سے چلنے لگے تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔ جب تک شہر کے در و دیوار نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے بار بار مڑ کر ان کو دیکھتے رہے۔

(۲۱)

خشیتِ الٰہی جو تمام عبادات و اعمال کی روح ہے، اس کا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پر اس قدر غلبہ تھا کہ ہر وقت محاسبۂ آخرت کے خوف سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ معمول تھا کہ نمازِ عشاء کے بعد مسجد میں یا اپنے حجرے میں بیٹھ کر رو رو کر دعائیں کرتے تھے، اسی حالت میں آنکھ لگ جاتی بیدار ہوتے تو پھر یہی مشغلہ جاری ہو جاتا۔ غرض اسی طرح سوتے جاگتے رونے اور دعائیں کرنے میں ساری رات گزر جاتی تھی۔ جب کبھی رات کو فقہاء ان کے پاس جمع ہوتے تو بیشتر وقت موت اور قیامت کے ذکر میں گزرتا۔ یہ ذکر سب پر گریہ طاری کر دیتا تھا۔

قرآن مجید کی جن آیات میں قیامت کا ذکر سنتا ان کو سنتے تو بے اختیار رونے لگتے تھے۔ اگر کوئی شخص مؤثر نصیحت کرتا تو اکثر ان پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ ان کی اہلیہ فاطمہ بنتِ عبدالملک کا بیان ہے کہ ان سے زیادہ کوئی شخص خدا سے ڈرنے والا نہیں تھا وہ اپنے بستر پر بھی خدا کو یاد کرتے تھے تو خوف کی شدت سے کانپنے لگتے تھے۔ یزید بن حوشبؒ کا قول ہے کہ "میں نے عمر بن عبدالعزیزؒ اور حسن بصریؒ سے زیادہ کسی شخص کو قیامت سے ڈرنے والا نہیں دیکھا، معلوم ہوتا تھا گویا دوزخ صرف انہی دونوں کے لیے بنائی گئی ہے۔"

جب لوگ ان سے گریہ و بکاء کے متعلق کچھ کہتے تو فرماتے، تم لوگ رونے پر ملامت نہ کرو کیونکہ فرات کے کنارے اگر بکری کا ایک بچہ بھی ہلاک ہو جائے تو اس کے بدلہ میں عمر بن عبدالعزیز پکڑا جائے گا۔

اپنے عمّال اور حکّام کو بھی خط لکھ لکھ کر محاسبۂ آخرت سے ڈرایا کرتے تھے ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے یہی اوصاف و محاسن تھے جن کی بنا پر ائمۂ دین، علماء سلف اور ارباب سیر نے انہیں عمرؓ (فاروق) ثانی، پانچواں خلیفہ راشد اور پہلی صدی ہجری کا مجدد قرار دیا ہے ۔ ابو سلیمان دارانیؒ کا قول ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ زہد میں خیرالتابعین حضرت اویس قرنیؒ سے بھی آگے ہیں کیونکہ ان کے پاس دنیا پوری آن بان کے ساتھ آئی لیکن انہوں نے اس کو ٹھکرا دیا اور حضرت اویس قرنیؒ کو دنیا سے سابقہ ہی نہیں پڑا ۔

حضرت مالک بن دینارؒ فرمایا کرتے تھے، لوگ کہتے ہیں کہ مالک زاہد ہے، مالک کا زہد کیا ؟ زاہد عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں کہ دنیا منہ کھولے ہوئے ان کے سامنے آئی اور انہوں نے اس سے منہ موڑ لیا ۔

فی الحقیقت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سیرت و کردار کا احاطہ کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے ۔ مختصر یہ کہ وہ ایک مثالی حکمران اور حسن کردار کا نہایت اعلیٰ نمونہ تھے اڑھائی سال کی مختصر مدت میں انہوں نے جو عظیم کارنامے سرانجام دیئے وہ رہتی دنیا تک ان کا نام زندہ و تابندہ رکھیں گے ۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت یحییٰ بن یعمر اللیثی

(۱)

بنو اُمیہ کے دورِ اقتدار میں جو اربابِ فضل و کمال شہرت اور عظمت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے، حضرت ابو سلیمان یحییٰ بن یعمرؒ ان میں سے ایک ہیں۔ ان کا نسبی تعلق بنو لیثؓ سے تھا اور دینی علمی اور اخلاقی اعتبار سے وہ اس مقدس جماعت کے رکن تھے جو علم و عمل میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا عکس پر تو تھی۔ ہماری مراد تابعین والا مقام سے ہے۔ اہلِ سیر نے حضرت یحییٰ بن یعمرؒ کے سالِ ولادت کی تصریح نہیں کی لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرنِ اول کے دوسرے یا تیسرے عشرے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے حضرت عثمان ذو النورینؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت سلیمانؓ بن صُرد الخزاعی جیسے اکابر صحابہ سے روایتیں کی ہیں۔ امام ذہبیؒ نے حُفاظِ حدیث تابعین کے دوسرے طبقے میں ان کے حالات بیان کیے ہیں اور انہیں ایک بلند مرتبہ فقیہ بھی قرار دیا ہے۔

علامہ ابن سعدؒ اور حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ کا بیان ہے کہ حضرت یحییٰ بن یعمرؒ قرآن، حدیث، فقہ، زبان و ادب اور دوسرے علوم کے جامع تھے۔ نحو کی تعلیم انہوں نے اپنے دور کے مشہور ماہر نحو ابو الاسود الدؤلی سے حاصل کی تھی اور اپنے ذہن رسا کی بدولت علمِ نحو اور عربی زبان و ادب میں درجۂ کمال پر پہنچ گئے تھے۔ زبان پر عبور کے ساتھ فصاحت و بلاغت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ قرآنِ حکیم جو ابتدا میں نقطوں سے خالی تھا اس پر سب سے پہلے حضرت یحییٰ بن یعمرؒ نے پڑھنے والوں کی آسانی کے لیے نقطے لگائے۔ یہ ان کا ایسا اہتمم بالشان کارنامہ ہے جو انہیں تابعینِ کرام میں امتیازی حیثیت کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

ڈاکٹر صبحی صالح نے اپنی کتاب "علوم القرآن" میں لکھا ہے کہ قرآن پاک پر نقطے اور اعراب لگانے کا آغاز (خلیفہ عبدالملک کے حکم سے) ابوالاسود الدؤلی نے کیا تھا حضرت یحییٰ بن یعمرؒ نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا اور ان دونوں کے شاگرد نصرؒ بن عاصم اللیثی نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

حقیقتِ حال کچھ بھی ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عظیم کارِ خیر کا بیشتر حصہ حضرت یحییٰ بن یعمرؒ نے انجام دیا۔

(۲)

حکومتِ وقت نے حضرت یحییٰ بن یعمرؒ کے تفقہ فی الدین اور دوسرے کمالاتِ علمی کا اعتراف یوں کیا تھا کہ انہیں خراسان کے دارالحکومت مرو (MERV) کا قاضی مقرر کر دیا تھا۔ اس منصب کے فرائض وہ جس دردمندی سے انجام دیتے تھے تاریخ میں شاذ ہی اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔

علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ مرو میں باقاعدہ دارالقضا تھا لیکن حضرت یحییٰ بن یعمرؒ نے لوگوں کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ حصول عدل کے لیے ان کے پاس کسی بھی جگہ آ سکتے ہیں یہاں تک کہ وہ بازار یا گلی میں جا رہے ہوں تو وہاں بھی ان کے سامنے مقدمے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ چلتے پھرتے گلیوں اور بازاروں میں مقدموں کے فیصلے کر دیا کرتے تھے۔ ان کے ایک ہمعصر یحییٰ بن موسیٰ بن یسارؒ کہتے ہیں کہ "یحییٰ بن یعمرؒ سواری پر کہیں جا رہے ہوتے اور راستے میں دو فریق اپنا کوئی تنازعہ لے کر ان کے سامنے آ جاتے تو وہ سواری روک کر فریقین کے بیانات سنتے اور کھڑے کھڑے اپنا فیصلہ

سنا دیتے۔ اس طرح میں نے انہیں بارہا گلیوں اور بازاروں میں فیصلہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"
عدل و انصاف کے بارے میں حضرت یحییٰ بن یعمر رح کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اسے "دارالقضا" تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ لوگوں کو ہر جگہ اور ہر وقت اس سے بہرہ ور ہونے کی سہولت حاصل ہونی چاہیے۔

(۳)

حضرت یحییٰ بن یعمر رح کو خاندانِ رسالت سے گہری عقیدت تھی۔ ابن عساکر رح کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس تشریف رکھتے تھے، اتفاق سے سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر چھڑ گیا۔ حجاج کہنے لگا کہ حضرت حسین ع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں سے نہیں ہیں (کیونکہ صاحبزادی کی اولاد ہیں اور اولاد کا نسب نانا کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔)

حضرت یحییٰ نے غصّہ کے ساتھ کہا، "اے امیر! تم نے جھوٹ بولا"۔

حجاج نے غضب ناک ہو کر کہا، آپ کی سلامتی اسی میں ہے کہ اس خیال سے باز آجائیں یا قرآن سے کوئی دلیل پیش کریں جس میں اولاد کا نسب نانا کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

حضرت یحییٰ رح نے فوراً قرآنِ پاک کی یہ آیتیں پڑھیں:-

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى
وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى
وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (الانعام آیہ ۸۵-۸۶)

ترجمہ (ہم نے ان (ابراہیم) کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور سب کو ہدایت دی اور پہلے نوح کو بھی ہدایت دی تھی۔ ان (ابراہیم) کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی، اور ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی۔ یہ سب نیکوکار تھے۔)

اور پھر کہا کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذرّیت میں شمار فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ان کے نانا ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ان کا نسب والدہ ہی سے چلا ہے ــــ عیسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان اس سے بہت کم تعلق ہے جتنا حسنؓ حسینؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہے۔

حجاج خاموش ہو گیا لیکن پھر سوچ کر کہا کہ ــــ میرے سامنے میری تکذیب کرنے پر آپ کو کس چیز نے جری کر دیا؟ حضرت یحییٰؒ نے فرمایا، قرآن کریم کی اس آیت نے جس میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور ان کے متبعین سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ حق بات کو نہ چھپائیں گے ــــ حجاج اب بالکل لاجواب ہو گیا تاہم اس نے حضرت یحییٰؒ کا اپنے دارالحکومت میں رہنا پسند نہ کیا اور انہیں خراسان بھیج دیا۔

حضرت یحییٰ ابن یعمرؒ نے باختلاف روایت ۱۱۹ھ یا ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ ان کے ارشد تلامذہ میں حضرت سلیمان تیمیؒ، قتادہؒ، عکرمہؒ، عطاء خراسانیؒ، ازرق بن قیسؒ، عبداللہ سدوسیؒ اور اسحٰق بن نویدؒ کے اسماء گرامی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت عبداللہ بن مبارک مروزی رحمۃ اللہ

(فقیہ المشرق والمغرب)

①

خلیفہ ہارون الرشید عباسی (سنہ ۱۷۰ھ تا سنہ ۱۹۳ھ) کے عہد میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان سرحدوں پر وقتاً فوقتاً معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ ایسے ہی ایک معرکے میں رومی اور اسلامی لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو رومی لشکر سے ایک زرہ پوش جنگجو نے اپنی صف سے نکل کر مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا۔ اسلامی لشکر سے ایک مجاہد جس نے اپنے چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا، جھپٹ کر اس کی طرف بڑھا اور ایک ہی وار میں رومی جنگجو کا کام تمام کر دیا۔ پھر ایک اور رومی سپاہی ہنکارتا ہوا میدان میں آیا۔ نقاب پوش مجاہد نے اس کو بھی ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی رومی جنگجو مقابلہ میں آئے اور نقاب پوش مجاہد نے اپنی تلوار یا نیزے کے وار سے سب کو جہنم رسید کر دیا۔ مسلمانوں نے فرطِ مسرت میں نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دوڑ کر اس مجاہد کو یہ دیکھنے کے لیے گھیر لیا کہ آخر یہ شیر بیشۂ شجاعت کون ہے جس کو اپنی شناخت کرانا بھی پسند نہیں۔ انھوں نے بڑے زور اور اصرار سے اس کے چہرے سے ڈھاٹا ہٹایا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ کوئی عام لشکری نہیں تھا بلکہ علم و فضل کے مجمع البحرین — فقیہ المشرق والمغرب حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تھے — وہی عبداللہ بن مبارکؒ جن کے فضل و کمال کے تمام دنیائے اسلام میں ڈنکے بج رہے تھے اور جن کے مرجوعِ خلائق ہونے کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ رقہ تشریف لے گئے تو ہزاروں لوگ استقبال کے لیے دیوانہ وار اٹھ دوڑے۔ اس قدر ہنگامہ ہوا کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں اور ساری

فضا غبار آلود ہوگئی۔ اتفاق سے خلیفہ ہارون الرشید بھی ان دنوں رقہ آیا ہوا تھا۔ اس کے حرم کی ایک خاتون نے شاہی محل (قصر الخشب) کے برج سے یہ نظارہ دیکھا تو ملازموں سے پوچھا، یہ ازدحام کیسا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ "خراسان کے ایک عالم آرہے ہیں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے۔ یہ سب لوگ ان کے استقبال میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے کشمکش کر رہے ہیں۔" بے ساختہ بولی:۔ "واللہ بادشاہ تو حقیقت میں یہ ہیں۔ بھلا ہارون الرشید کیا بادشاہ ہے جو لوگوں کو سپاہیوں، چوبداروں، کوڑوں اور ڈنڈوں کی مدد سے اپنے گرد جمع کرتا ہے۔"

(۲)

حضرت ابو عبدالرحمٰن عبداللہ بن مبارکؒ تبع تابعین کی اس مقدس جماعت کے گل سر سبد ہیں جس کا ہر فرد اپنی ذات میں دین کا ستون اور زمانہ کا امام تھا۔ اُن کے والد مبارک بن واضح ترک، بنو حنظلہ کے ایک رئیس کے غلام تھے وہ نہایت ہی نیک اور دیندار آدمی تھے اور زہد و تقویٰ، دیانت و امانت اور خوفِ خدا کے اعتبار سے فی الواقع اسم بامسمیٰ تھے۔ حنظلی رئیس نے اپنے باغ کی نگرانی ان کے سپرد کر رکھی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے مبارکؒ کو حکم دیا کہ باغ سے ایک شیریں انار توڑ کر لاؤ۔ وہ گئے اور ایک انار لاکر پیش کر دیا۔ مالک نے اسے چیر کر چکھا تو ترش نکلا۔ اس نے خفا ہو کر کہا، میں نے میٹھا انار مانگا، تم نے کھٹا لاکر دے دیا جاؤ کوئی اچھا سا شیریں انار لاؤ۔ وہ گئے اور دوسرے درخت کا انار لاکر پیش کیا۔ بدقسمتی سے وہ بھی کھٹا نکلا۔ آقا کا غصہ اب اور بھڑک اٹھا اور اس نے انہیں ڈانٹتے ہوئے تیسری مرتبہ پھر میٹھا انار لانے کے لیے بھیجا۔ اب کی بار بھی انار ترش نکلا تو اس نے برافروختہ ہو کر کہا "کیا تمہاری قوتِ ذائقہ ترش و شیریں کی تمیز نہیں کر سکتی؟ مبارک نے کہا "نہیں"

آقا نے سبب پوچھا تو انہوں نے کہا: "آپ نے مجھے انار کھانے کی اجازت نہیں دی ہے اس لیے میں نے آج تک باغ کے کسی انار کو چکھا تک نہیں۔ میرا کام

تو باغ کی دیکھ بھال کرنا ہے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کس درخت کے انار میٹھے ہیں اور کس کے کھٹے۔"

آقا نے اپنے طور پر حالات کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مبارک نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اسے ان کی غیر معمولی دیانت داری اور خوفِ خدا پر بڑی حیرت ہوئی اور وہ ان کی بہت عزت و تکریم کرنے لگا۔

اس رئیس کی ایک ناکتخدا لڑکی تھی جس کے لیے اونچے اونچے گھرانوں کی طرف سے پیغام پر پیغام آ رہے تھے۔ دنیاوی ثروت کے لحاظ سے پیغام دینے والوں میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا اس لیے رئیس فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ کونسا پیغام قبول کرے اور کونسا رد کرے۔ اسی شش و پنج میں ایک دن اس نے مبارک سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا۔ انہوں نے بڑے اخلاص کے ساتھ کہا کہ:

"زمانہ جاہلیت میں لوگ اعلیٰ حسب نسب والا داماد تلاش کرتے تھے یہودیوں کے نزدیک داماد کے لیے مالدار ہونا ضروری تھا اور عیسائی حسن و جمال کو اہمیت دیتے تھے لیکن اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک دیندار ہونا وجہ ترجیح ہے۔ آپ جو طریقہ مناسب سمجھیں، اختیار کریں۔"

آقا کو مبارک کا یہ مخلصانہ مشورہ بے حد پسند آیا۔ اس مشورے پر غور و فکر کے بعد ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا:

"مجھے اپنی لختِ جگر کا شوہر بننے کے لیے مبارک سے بہتر کوئی شخص نظر نہیں آتا۔"

بیوی نے پہلے تو مبارک کے افلاس اور کم حیثیتی کا عذر پیش کیا لیکن بالآخر وہ بھی شوہر سے متفق ہو گئی اور اپنی بیٹی کی شادی مبارک سے کر دی ساتھ ہی انہوں نے مبارک کو آزاد کر دیا۔

حضرت عبداللہؒ اسی رئیس زادی کے بطن اور مبارک جیسے صاحبِ تقویٰ باپ کی صلب سے ۱۱۸ھ میں مرو (MERV) میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے

مشہور ہوئے۔

(۲)

حضرت عبداللہؒ کے والد مبارکؒ بن واضح نہ صرف ایک متقی آدمی تھے بلکہ علم کی قدر و قیمت سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ انہوں نے اپنے فرزندِ دلبند کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور پوری کوشش کی کہ ان کا بیٹا علم کے آسمان پر سورج بن کر چمکے۔

اس وقت صحابہ کرامؓ کا دور گزر چکا تھا البتہ ہزاروں تابعین و تبع تابعین اور دوسرے اربابِ علم و فضل دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے کوئی معروف شہر اور قصبہ ایسا نہیں تھا جو اہلِ فضل و کمال سے خالی ہو۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت مرو میں ہوئی اس کے بعد وہ حصولِ علم کے لیے مرو سے نکل کھڑے ہوئے اور سالہا سال تک شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں گھوم پھر کر جواہرِ علم اپنے دامن میں سمیٹتے رہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے فاصلہ دیکھا نہ اُس زمانے کے سفر کی صعوبتیں، جہاں بھی کسی صاحبِ علم کا پتہ چلا، اس کی خدمت میں پہنچے اور مقدور بھر اکتساب فیض کیا۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

"ابن المبارکؒ کے زمانے میں ان سے زیادہ علم کا حریص اور علم کی جستجو کرنے والا کوئی نہ تھا۔ طلبِ علم کے لیے انہوں نے دور دراز ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا مثلاً شام، عراق، یمن، مصر، کوفہ و بصرہ وغیرہ۔"

حضرت ابو اسامہؒ گواہی دیتے ہیں کہ:

"میں نے عبداللہ بن مبارکؒ سے بڑھ کر کسی کو ملک در ملک گھوم کر طلبِ علم کرنے والا نہیں دیکھا۔" (تذکرۃ الحفاظ، حافظ ذہبیؒ)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:

"ابن المبارکؒ کے دور میں ان سے زیادہ علم کی تلاش کرنے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ (تہذیب التہذیب)

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں:

" تحصیلِ علم کے شوق میں عبداللہ بن مبارکؒ کو اپنی حیثیت کی پروا بھی نہیں ہوتی تھی وہ اپنے سے چھوٹے اور فروتر لوگوں سے بھی معلومات حاصل کرتے تھے (تہذیب الاسماء)

خود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا بیان ہے کہ " میں نے (مختلف دیار و امصار) کے چار ہزار شیوخ و اساتذہ سے کسبِ فیض کیا ان میں سے ایک ہزار کی روایتوں کو میں نے لکھ لیا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے جن شیوخ و اساتذہ سے جملہ دینی علوم حاصل کیے، ان میں سرِ فہرست حضرت امامِ اعظم حضرت ابو حنیفہؒ، حضرت امام سفیان ثوریؒ اور حضرت امام اوزاعیؒ ہیں۔ دوسرے شیوخ و اساتذہ میں سے چند کے اسماء گرامی یہ ہیں:

امام مالک بن انسؒ مدنی، امام اعمشؒ، ہشام بن عروہؒ، حمیدؒ بن ابی حمید الطویل، موسیٰ بن عقبہ صاحب المغازیؒ، یحییٰ بن سعید الانصاریؒ، سلیمان التیمیؒ، عبدالرحمٰن بن یزیدؒ، اسمٰعیل بن ابی خالدؒ احمسی، سفیان بن عیینہؒ، لیث بن سعدؒ، مسعر بن کدام کوفیؒ، شعبہ بن حجاجؒ، ابن جریجؒ، سعید بن ابی عروبہؒ، مہران بصریؒ، حماد بن سلمہؒ، ابن ابی ذیبؒ، صالح بن صالحؒ، عمرو بن میمونؒ جزری، معمر بن راشدؒ بصری، عبداللہ بن عونؒ بصری، ابو الصلت زائدہ بن قدامہ کوفیؒ، بریدؒ بن عبداللہ بن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعریؒ، عاصم بن سلمان الاحولؒ، داؤد بن قیس فرا قرشی مدنیؒ، ابو سعید ابراہیم بن طہمان خراسانیؒ، زکریا بن ابی زائدہ کوفیؒ، وغیرہم۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ سے ابن مبارکؒ کو بے حد عقیدت و محبت تھی۔ حافظ ابن حجرؒ نے " تہذیب التہذیب " میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

" اگر اللہ تعالیٰ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے ذریعہ میری مدد نہ کرتا تو میں عام آدمیوں کی طرح ہوتا۔"

حافظ ذہبیؒ نے بھی "مناقب" میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا اسی سے ملتا جلتا قول نقل کیا ہے، البتہ اس میں " تو میں عام آدمیوں کی طرح ہوتا (کنت کسائر الناس) " کے بجائے " تو میں ایک بدعتی شخص ہوتا (کنت بدعیاً) " کے الفاظ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ امام ابو حنیفہؒ کا ذکر ہمیشہ بڑے احترام اور عقیدت سے کرتے۔ انہوں نے ان کی شان میں بہت سے اشعار بھی کہے۔
(تاریخ بغداد خطیب بغدادی)

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ابن مبارکؒ نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کے چشمۂ علم سے پوری طرح سیراب ہونے کے بعد امام سفیان ثوریؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے خود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

" میں سفیان ثوریؒ کے ساتھ اس وقت تک وابستہ نہیں ہوا جب تک میں نے امام ابو حنیفہؒ کے علوم پر پوری دسترس حاصل نہ کرلی۔" (دسترس کی وضاحت انہوں نے ہاتھ کی مٹھی بند کرکے کی)۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تحصیل علم کے سلسلے میں امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ علامہ خطیب بغدادیؒ نے اسے "تاریخ بغداد" میں "ابن مبارک" کی زبانی یوں نقل کیا ہے:

" میں طلب علم کے لیے شام گیا اور بیروت (جو اس زمانے میں شام کا ایک حصہ تھا) جاکر امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا، اے خراسانی، کوفہ میں یہ کون بدعتی ابو حنیفہ نامی پیدا ہوا ہے؟ یہ سن کر میں گھر واپس آیا، امام ابو حنیفہؒ کی کتابیں نکالیں اور ان میں سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر نکالے (اور انہیں ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا) اس میں تین دن لگ گئے۔ تیسرے روز یہ کتاب ہاتھ میں لیے ان کے پاس پھر گیا —— وہ مسجد کے مؤذن بھی تھے اور امام

بھی۔ میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا، یہ کیا ہے ؟ میں نے عرض کیا، یہ لیجئے ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے ایک مسئلہ پر نظر ڈالی جس پر لکھا تھا، قال النعمان، اذان کہہ کر کھڑے کھڑے کتاب کا پہلا حصہ پڑھ لیا۔ پڑھ کر کتاب آستین میں رکھ لی۔ پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر کتاب نکالی اور سب پڑھ لی۔ اس کے بعد مجھ سے دریافت فرمایا، اے خراسانی! یہ نعمان بن ثابت کون ہیں ؟ میں نے کہا، ایک شیخ ہیں، عراق میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ امام اوزاعیؒ نے فرمایا، بڑی شان کے شیخ ہیں، جاؤ اور ان سے بہت سا فیض حاصل کرو۔ میں نے کہا یہ وہی ابو حنیفہ ہیں جن سے مجھ کو آپ نے روکا تھا۔"

اس طرح ابن مبارکؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں امام اوزاعیؒ کی غائبانہ غلط فہمی کو نہایت خوبصورت انداز سے دور کر دیا اور پھر امام اوزاعیؒ کے فیضانِ علمی سے بھی خوب بہرہ یاب ہوئے۔

(۴)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو غیر معمولی قوت حافظہ عطا کی تھی اور وہ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ اپنے بے پناہ شوقِ علم، محنت، جستجو، قوتِ حافظہ، ذہانت، ذکاوت اور بڑے بڑے آئمہ عصر کے فیضِ صحبت کی بدولت چند سال کے اندر اندر وہ مسندِ علم وفن کے صدر نشین بن گئے۔ یہاں تک کہ ان کے شیوخ اور اساتذہ نے بھی ان کے کمالاتِ علمی کا برملا اعتراف کیا۔ امام سفیان ثوریؒ سے ایک مرتبہ کسی خراسانی نے کوئی مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا "تمہارے پاس مشرق و مغرب کے سب سے بڑے عالم عبداللہ بن مبارک موجود ہیں ان سے کیوں دریافت نہیں کرتے؟"

ایک اور روایت میں ہے کہ کسی شخص نے امام سفیان ثوریؒ کے سامنے حضرت عبداللہ بن مبارک کو یا "عالم المشرق" کہہ کر خطاب کیا۔ امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا، کیا کہہ رہے ہو وہ تو "عالم المشرق والمغرب" ہیں۔ (خطیب بغدادی)

عبداللہ بن سنان رح کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مبارک مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تو حضرت سفیان بن عیینہ رح اور حضرت فُضَیل بن عیاض رح ان کو رخصت کرنے دُور تک ساتھ گئے۔ اثنائے راہ میں ان میں سے ایک نے کہا، یہ فقیہ اہل مشرق ہیں تو دوسرے نے لوٹکتے ہوئے کہا، اہلِ مشرق ہی کے نہیں اہل مغرب کے بھی فقیہ ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ۔ ذہبی رح)

ابن حبان رح کا قول ہے کہ ابن مبارک میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہو گئے تھے کہ ان کے عہد میں تمام کرۂ ارض پر کسی میں مجتمع نہیں ہوئے تھے۔

(تہذیب التہذیب۔ ابن حجر رح)

علی بن المدینی رح، عثمان بن طالوت رح سے روایت کرتے ہیں کہ کمالِ علم دو آدمیوں پر ختم ہو گیا، عبداللہ بن مبارک رح اور یحییٰ بن معین رح پر۔ (تاریخ خطیب بغدادی)

امام نووی رح فرماتے ہیں: "عبداللہ بن مبارک رح کی امامت و جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تمام چیزوں میں امام تھے۔ ان کے ذکر سے نزولِ رحمت ہوتا تھا اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی امید کی جاتی تھی۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱)

امام ذہبی رح ان کا تعارف یوں کراتے ہیں:

"ابن المبارک، امام، حافظ، علامہ، شیخ الاسلام فخر المجاہدین اور قدوۃ الزاہدین تھے"۔ (تذکرۃ الحفاظ)

اسمٰعیل بن عیاش رح فرماتے ہیں: "روئے زمین پر ابن المبارک رح کی مثال موجود نہیں۔"

امام نسائی رح کا قول ہے کہ میں ابن المبارک کے زمانے میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو مرتبے میں ان سے زیادہ ہو اور جس کے اندر تمام خصائلِ حمیدہ اس اس جامعیت کے ساتھ پائے جاتے ہوں۔

امام مالک بن انس رح فرمایا کرتے تھے، "ابن المبارک خراسان کے فقیہ ہیں۔"

ابو اسحٰق الفزاری رح کا قول ہے، "حضرت عبداللہ بن مبارک رح تمام مسلمانوں کے

امام ہیں ——— (تاریخ خطیب البغدادی)

حافظ ابن حجر عسقلانی رح فرماتے ہیں، "ابن المبارک رح ماہرِ حدیث ——اور حافظ الحدیث ہیں ——— (تہذیب التہذیب)

یحییٰ بن معین رح کے سامنے کسی نے حضرت عبداللہ بن مبارک رح کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا: "وہ مسلمانوں کے سرداروں میں سے ایک سردار تھے۔ (سیّد المسلمین) (تاریخ خطیب بغدادی)

علامہ ابن سعد رح لکھتے ہیں:

"ابن المبارک رح نے علم کی تحصیل کا حق ادا کرنے کے لیے کثیر روایات بیان کیں، علم کے مختلف ابواب واقسام پر متعدد کتابیں تصنیف کیں، زہد اور ترغیب جہاد میں اشعار کہے، وہ معتبر تھے، ——— حجت تھے، کثیر الحدیث تھے اور اس قابل تھے کہ ان کے قول کو سند تسلیم کیا جائے ——— (تہذیب الاسماء)

حسن بن عیسیٰ رح کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ علماء کے ایک اجتماع میں حضرت عبداللہ بن مبارک رح کے اوصاف وخصائل کا ذکر چھڑ گیا تو سب نے بالاتفاق تسلیم کیا کہ وہ ایک جامع الصفات ہستی ہیں، علمِ دین، فقہ، ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، کم گوئی، قیام اللیل، عبادت، حج، جہاد، شہسواری، شجاعت، صحت مندی، شہزوری، کم آمیزی، مہمل گوئی سے اجتناب وغیرہ صفات ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں ——— (تذکرۃ الحفاظ)

غرض حضرت عبداللہ بن مبارک رح کے ہمعصر اور بعد کے علماء سلف سبھی نے ان کے کمالاتِ علمی اور سیرت وکردار کی بڑے مؤثر الفاظ میں تعریف وتوصیف کی ہے ابن مبارک رح کے ہمعصر علماء جن میں سے بعض امامِ وقت تھے، نہ صرف ان کی تعریف زبان سے کرتے تھے بلکہ عملی طور پر بھی ان کی بے حد تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

یحییٰ بن یحییٰ اندلسی رح کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم امام مالک بن انس رح کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ ابن المبارک رح تشریف لائے۔ امام مالک رح جو کبھی کسی کے لیے نہ اٹھتے

تھے اور نہ اپنی نشست تبدیل کرتے تھے، اٹھ بیٹھے اور اپنی نشست بدل کر ابن المبارکؒ کو اپنے پاس بٹھا لیا —— (تہذیب التہذیب ۔ ابن حجرؒ)

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام مالک بن انسؒ حدیث کا درس دے رہے تھے۔ اتفاق سے عبداللہ بن مبارکؒ بھی پہنچ گئے۔ ایک شاگرد نے ابن المبارکؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا، اس مسئلہ کے بارے میں آپ لوگوں یعنی اہلِ خراسان کے پاس کوئی حدیث یا اثر ہو تو پیش کیجئے۔ ابن المبارک غایت احترام میں اور از راہِ حسنِ ادب بہت آہستہ آہستہ جواب دیتے رہے۔ امام مالکؒ کو ان کا حسنِ ادب اور اندازِ تکلم بہت پسند آیا جب وہ چلے گئے تو انہوں نے اہلِ مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا، یہ عبداللہ بن مبارک خراسان کے فقیہ ہیں —— (تذکرۃ الحفاظ)

احمد بن سنانؒ سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ پہلی مرتبہ حماد بن زیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دریافت کیا، آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟ جواب دیا، خراسان سے، پوچھا، خراسان کے کس شہر سے، عرض کیا، مرو سے۔ اب حمادؒ نے پوچھا، وہاں کے ایک صاحب عبداللہ بن مبارک کو بھی آپ جانتے ہیں؟ عرض کیا، جانتا ہوں۔ پوچھا، وہ کیسے ہیں؟ بولے، عبداللہ بن مبارک ہی تو آپ کے سامنے حاضر ہے۔ حماد یہ سن کر بے قرار ہو گئے سلام کیا اور مرحبا کہتے ہوئے گلے لگا لیا۔

(تاریخ خطیب بغدادیؒ)

۵

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ قرآن، حدیث، فقہ، سیرت و مغازی اور دوسرے دینی علوم کے علاوہ دنیوی علوم، زبان و ادب، نحو و بلاغت، لغت و شاعری وغیرہ کے بھی بحرِ ذخار تھے گویا ان کی ذات دینی و دنیوی علوم کی جامع تھی یہاں تک کہ علم طب بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں تھا۔ حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں حسنؒ سے روایت کی ہے کہ ابنِ مبارکؒ ایک دن امام سفیان ثوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ شدتِ کرب سے کراہ رہے ہیں۔ دریافت کیا، آپ کو کیا تکلیف ہے؟ انہوں

نے اپنے مرض کی کیفیت بیان کی۔ حضرت عبداللہؒ نے اسی وقت پیاز کی ایک گنٹھی منگوائی اور اسے کاٹ کر حضرت سفیان ثوریؒ سے کہا، اسے سونگھئے۔ انھوں نے تھوڑی دیر اس کو سونگھا تو ایک چھینک آئی اور طبیعت بالکل بحال ہو گئی۔ اس وقت حضرت امام ثوریؒ کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آ گئے:

"سبحان اللہ آپ فقیہ بھی ہیں اور طبیب بھی۔"

شعر و شاعری کا ذوق نہایت پاکیزہ تھا، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ان کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان پر اخلاقی تعلیمات کی گہری چھاپ ہے۔

فقہ میں اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ ان کی موجودگی میں بڑے بڑے علماء و فقیہ مسئلہ بتانے سے احتراز کرتے تھے۔ اگرچہ فقہ و اجتہاد میں وہ اپنے جلیل القدر استاد حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مرتبے کو نہیں پہنچے تاہم امام مالکؒ، امام نوویؒ، امام ذہبیؒ، ابن حماد حنبلیؒ، ابن شماسؒ اور حافظ ابن حجرؒ سبھی نے ان کے تفقہ کا اعتراف کیا ہے۔

علم حدیث سے حضرت عبداللہؒ کو خاص شغف تھا اسی لیے وہ ایک یگانۂ روزگار محدث اور امام العصر تسلیم کیے گئے۔ علم حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہمعصر محدثین میں اگر کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تو وہ فیصلہ کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے کیونکہ تمام کے نزدیک ابن مبارکؒ حفظ حدیث کے اعتبار سے حکمٌ فی الحدیث کی حیثیت رکھتے تھے۔ علم حدیث کے لیے جس قوتِ حافظہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابن مبارک کو اس سے وافر حصہ عطا کیا تھا خطیب بغدادی نے ان کے ایک دوسرے معاصر صخر کی زبانی اپنی تاریخ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ اور ابن مبارک نے خطیب کا طویل خطبہ سنا خطبہ ختم ہوا تو ابن مبارکؒ نے فرمایا، مجھ کو یہ تمام خطبہ یاد ہو گیا۔ پھر انھوں نے ایک شخص کی فرمائش پر اسی وقت وہ تمام خطبہ شروع سے اخیر تک سنا دیا۔

حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد علی بن الحسن بن شفیق سے ایک حدیث کے بارے میں گفتگو چھڑ گئی۔ ساری رات اسی گفتگو میں مسجد کے

دروازے پر کھڑے کھڑے گزر گئی لیکن ابن المبارکؒ کو احساس بھی نہ ہوا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ابن المبارکؒ صاحب الحدیث اور حافظ الحدیث تھے۔ (تہذیب التہذیب ابن حجرؒ)

حدیث سے اپنے والہانہ شغف کی بنا پر گھر سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ نعیم بن حمادؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا، آپ کو مکان میں ہر وقت تنہا بیٹھے رہنے سے وحشت نہیں ہوتی؟ فرمایا، "وحشت کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس تنہائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے فیض صحبت سے شرف یاب ہوتا ہوں۔" (تاریخ بغداد ۔ خطیب بغدادی)

کتبِ حدیث میں حضرت ابن المبارکؒ سے مروی روایات کی تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اپنی روایات کے بارے میں اسناد کا خاص خیال رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ روایت کو ہر مرحلہ میں ثقۃً عن ثقۃٍ ہونا چاہیے (یعنی معتبر شخص، معتبر شخص سے روایت کرے) ——— (تذکرۃ الحفاظ ذہبیؒ)

اپنے تبحر علمی اور زبردست قوت حافظہ کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ محض حافظہ سے روایت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب دیکھ کر بیان کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے "ابن المبارک صاحبِ حدیث اور حافظ الحدیث تھے اور کتاب سے حدیث بیان کرتے تھے۔" (تہذیب التہذیب)

حدیثِ نبویؐ کا ان کے دل میں حد سے زیادہ احترام تھا۔ روایت و سماع کے خاص اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ صرف سماعِ حدیث کے اہل حضرات کے سامنے ہی حدیث بیان کرتے تھے۔ وہ ایسی بات کو برداشت نہیں کرتے تھے جس سے حدیث کی شان اور وقار میں ذرا بھی تخفیف کا پہلو نکلتا ہو۔

ایک مرتبہ ایک شخص طویل مسافت طے کر کے سماعِ حدیث کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور آتے ہی روایتِ حدیث کی درخواست کی۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے ملازم سے کہا "چلو" اور سواری پر بیٹھ کر چلنے لگا۔ حضرت عبداللہؒ

نے فوراً اٹھ کر رکاب تھام لی۔ اس شخص نے کہا، آپ نے حدیث تو سنائی نہیں لیکن میری سواری کی رکاب تھام رہے ہیں۔ فرمایا، ہاں میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ تمہارے لیے اپنی ذات کو ذلیل کر دوں لیکن حدیثِ نبوی ؐ کی توہین مجھے گوارا نہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ)

ایک اور موقع پر کسی شخص نے راستہ میں ان سے روایتِ حدیث کی درخواست کی۔ فرمایا، "یہ موقع حدیث کی روایت وسماع کا نہیں ہے۔" (تبع تابعین)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اگرچہ علم وفضل کے بحرِ بے کراں بن گئے تھے لیکن ان کے سینے میں تحصیلِ علم کے شوق کی شمع عمر بھر فروزاں رہی۔ حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن المبارکؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کب تک علم حاصل کرتے رہیں گے تو انہوں نے جواب دیا، موت تک انشاء اللہ۔

ایک اور موقع پر اسی قسم کے سوال کے جواب میں فرمایا:۔

"شاید وہ کلمہ اب تک میں نے سنا ہو جو میرے کام آئے۔" (العلم والعلماء)

چنانچہ جہاں ایک دنیا ان کے خوانِ علم کی ریزہ چین تھی وہ خود بھی زندگی کے کسی دور میں بھی دوسروں کے فیوضِ علمی سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

(۶)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ سفروں میں گزرا۔ لڑکپن سے جوانی تک کے زمانے میں تحصیلِ علم کے سلسلے میں سفر کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ اکثر تجارت، حج، جہاد فی سبیل اللہ، دعوت وتبلیغ اور ارشاد واصلاح کے لیے پابرکاب رہتے۔ یہی سبب تھا کہ وہ کسی خاص مقام پر مجلسِ درس قائم نہیں کر سکے لیکن ان کے کمالاتِ علمی نے ایک دنیا کو مسخر کر لیا تھا۔ جہاں بھی جاتے لوگ جوق در جوق ان کے گرد جمع ہو جاتے اور مقدور بھر اکتسابِ فیض کرتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ ممالکِ اسلامیہ کے اس قدر لوگوں نے ان سے استفاضہ کیا کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں۔

طبعاً شہرت سے متنفر تھے اور گمنام رہنا پسند کرتے تھے یہاں تک کہ اگر انہیں معلوم

ہو جاتا کہ کسی شاگرد نے ان کا قول نقل کرتے ہوئے قال عبد اللہ بن المبارک لکھا ہے تو اس کے پاس چاقو بھیجتے تھے کہ اس سے میرا نام اپنی تصنیف میں سے چھیل دو، میری کیا حقیقت ہے کہ کسی قول کو میری طرف منسوب کیا جائے لیکن خدا کی قدرت، جس قدر بھی انہوں نے گمنام رہنے کی کوشش کی اسی قدر شہرت بڑھتی گئی اور وہ مرجع خلائق بن گئے۔

آج کل سفر کے لیے جس قدر آسانیاں اور سہولتیں میسر ہیں ابن المبارکؒ کے زمانے میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج جو سفر چند ساعتوں میں طے ہو جاتا ہے اُس زمانے میں ہفتوں اور مہینوں میں طے ہوتا تھا اور پھر راستے میں جو دشواریاں اور مصیبتیں پیش آتی تھیں ان کی تفصیل جان کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کے لاتعداد سفروں پر نظر ڈالیں تو لامحالہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی زندگی بالکل مجاہدانہ تھی۔ کبھی مرو میں ہیں تو کبھی بغداد میں، کبھی بصرہ میں ہیں تو کبھی رقہ میں۔ کبھی شام میں ہیں تو کبھی مصر میں۔ کبھی حجاز میں ہیں تو کبھی یمن میں۔ انہوں نے تجارت میں لاکھوں روپے پیدا کیے اور لاکھوں ہی راہِ خدا میں صرف کیے۔ فی الحقیقت ان کے سفر کا عنوان "تجارت" ہوتا تھا لیکن اس کی روح علمی افادہ و استفادہ اور مخلوقِ خدا کی خدمت ہوتی تھی۔

حضرت ابن المبارکؒ کے چند خاص تلامیذ اور رواۃ کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ ان میں ایسی عظیم المرتبت ہستیاں بھی ہیں جن کی روایات کو صحاحِ ستّہ کے محدثین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور ایسی بھی کہ جن کو درجۂ امامت حاصل ہوا اور خلقِ کثیر نے ان سے کسبِ فیض کیا۔

امام احمد بن حنبلؒ، یحییٰ بن معینؒ، فضیل بن عیاضؒ، اسحاق بن راہویہؒ، ابو داؤد الطیالسیؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، نعیم بن حماد الخزاعی مروزیؒ، محمد بن العلاء کوفیؒ، ابوبکر بن عیاشؒ، علی بن الحسن بن شفیق مروزیؒ، سلیمان المروزیؒ وغیرہ۔

ابنِ مبارکؒ کے رواۃ میں امام سفیان ثوریؒ، معمر بن راشدؒ، سفیان بن عیینہؒ، عبد الرحمٰن

بن مہدی بصریؒ اور ابو اسحاق الفزاریؒ بھی شامل ہیں۔ یہ اصحاب ابنِ مبارکؒ کے استاد بھی تھے۔

(۷)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے گلشنِ اخلاق میں خشیتِ الٰہی، شجاعت، شوقِ جہاد، تواضع و انکسار، جود و سخا، خدمتِ خلق، اکرامِ ضیف، رقتِ قلب، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، خودداری اور اربابِ حکومت سے گریز، سب سے خوشرنگ پھول ہیں۔ ان کی سیرت و کردار میں صحابہ کرامؓ کی پُر عظمت اور پاکیزہ زندگی کی جھلک نظر آتی تھی حضرت سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں:

"میں نے صحابہ کرامؓ کے حالات پر غور کیا اور عبداللہ بن المبارکؒ کے حالات بھی دیکھے تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ کرامؓ کو اس بناء پر ابن المبارکؒ پر فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور آپؐ کی صحبت اور غزوات میں ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔" ——— (تاریخ خطیب بغدادی)

گویا مخصوص فضائل کے سوا عادات و اخلاق میں ابن المبارکؒ صحابہ کرامؓ کا نمونہ تھے۔ فی الحقیقت ان کو صحابہ کرامؓ سے اس قدر عقیدت اور محبت تھی کہ اپنے طور طریقوں کو انہی کے سانچہ میں ڈھال لیا تھا۔ اصحابِ رسولؐ کا ان کے نزدیک جو بلند مقام تھا اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جاسکتا ہے جو ابنِ خلکانؒ نے ابو علی غسانی سے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ کسی نے ابن المبارکؒ سے پوچھا، حضرت معاویہؓ بن ابو سفیانؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (تابعی) میں سے کون افضل ہے۔ ابن المبارکؒ نے جواب دیا، واللہ وہ غبارِ راہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں حضرت معاویہؓ کی ناک میں داخل ہوا ہے وہ بھی عمر بن عبدالعزیزؒ پر ہزار درجہ فضیلت رکھتا ہے۔ حضرت معاویہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور جب حضورؐ نے سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ فرمایا تو جواب میں

حضرت معاویہؓ نے رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی اس سوال کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟ ———— (وفیات الاعیان)

خشیتِ الٰہی کی یہ کیفیت تھی کہ ہر وقت اللہ کے خوف سے لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ نعیم بن حمادؒ سے روایت ہے کہ جب وہ (اپنی تالیف) "کتاب الزہد والرقائق" طلبہ کے سامنے پڑھتے تو ان پر سخت رقت طاری ہو جاتی تھی اور (جوشِ گریہ میں) ان کے منہ سے اس طرح آواز نکلتی تھی جیسے ذبح کی ہوئی گائے کے منہ سے۔ اس وقت وہ بات کرنے کے قابل نہیں رہتے تھے ——— (تاریخ خطیب بغدادی)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن مبارکؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو اونچا مرتبہ دیا وہ اس بناء پر تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرتے تھے۔

(صفوۃ الصفوۃ - ابنِ جوزی)

ابن المبارکؒ کے ایک ہمعصر عالم قاسم بن محمدؒ سے روایت ہے کہ میں اکثر سفر میں عبداللہ بن مبارکؒ کے ساتھ رہتا تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا تھا کہ آخر ان میں وہ کونسی خوبی ہے جس کی بناء پر ان کی اتنی قدر ہے اور مخلوقِ خدا ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتی ہے۔ نماز وہ بھی پڑھتے ہیں ہم بھی پڑھتے ہیں، روزے وہ رکھتے ہیں تو ہم بھی رکھتے ہیں، وہ حج کو جاتے ہیں تو ہم بھی جاتے ہیں، وہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں تو ہم بھی جہاد میں شریک ہوتے ہیں لیکن جہاں دیکھیں ہر ایک کی زبان پر عبداللہ بن مبارک ہی کا نام ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ شام کی طرف سفر کر رہے تھے۔ راستے میں رات آ گئی۔ ایک جگہ قیام کیا۔ کھانے کے لیے جب سب دستر خوان پر بیٹھے تو اتفاقاً چراغ بجھ گیا اور اندھیرا ہو گیا۔ ایک آدمی نے اٹھ کر چراغ جلایا۔ جب روشنی ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ عبداللہ بن مبارکؒ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اندھیرے میں ان کو قبر کا اندھیرا یاد آ گیا اور ان پر رقت طاری ہو گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہی خوفِ خدا ان کے فضل و شرف کا باعث ہے۔ (صفوۃ الصفوۃ - ابنِ جوزی)

ابن المبارکؒ اگر خالق اور مخلوق کے معاملہ میں انتہائی رقیق القلب تھے تو باطل کے مقابلے میں شیرِ ژیاں تھے۔ جب بھی موقع ملتا جہاد میں شریک ہوتے اور میدانِ جنگ میں شجاعت و بسالت کا حق ادا کر دیتے۔ ایک دفعہ کچھ لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کہ وہ عزلت پسند ہیں اور جہاد سے کوئی رغبت نہیں رکھتے لیکن جب رومیوں کے خلاف ایک لڑائی میں ایک نقاب پوش مجاہد نے کئی رومیوں کو یکے بعد دیگرے ڈھیر کر دیا تو اس مجاہد کے چہرے سے کپڑا ہٹانے کے بعد وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ مجاہد عبداللہ بن مبارکؒ تھے۔ اہلِ سیر کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؒ اکثر مصیصہ اور طرطوس وغیرہ کا سفر کرتے تھے اور یہ سفر محض شرکتِ جہاد کے لیے ہوا کرتا تھا۔

ایک دفعہ کسی مجوسی سے مقابلہ پیش آگیا، لڑائی کے دوران میں مجوسی کی عبادت کا وقت آگیا۔ اس نے ان سے مہلت چاہی کہ میں عبادت سے فارغ ہو لوں اس کے بعد تم سے نبرد آزما ہوں گا۔ وہ مان گئے۔ مجوسی نے سورج کے سامنے سجدہ کیا تو ان کو سخت غصہ آیا اور اس کو قتل کرنا چاہا لیکن پھر حکمِ الٰہی کا خیال آیا کہ عہد کی بازپرس ہو گی تو ضبط سے کام لیا۔ مجوسی عبادت سے فارغ ہوا تو ان کی پاسداریٔ عہد سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

دینی و دنیوی وجاہت اور جلالتِ قدر کے باوجود حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی طبیعت میں عجز و انکسار اور فروتنی کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔ اپنی تعریف سننا گوارا نہیں کرتے تھے اور اپنی تعظیم و تکریم کے مظاہرے بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ابو وہب مروزی نے پوچھا کہ تکبر کی تعریف کیا ہے؟ فرمایا "تکبر یہ ہے کہ دوسرں کو حقیر اور خود کو باعزت سمجھا جائے۔" پھر فرمایا "تکبر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم اپنی کسی چیز کی نسبت یہ خیال کرو کہ یہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔"

فرمایا کرتے تھے "جس شخص نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس کی علامت یہ ہو گئی کہ وہ اپنے آپ کو کُتے سے بھی ذلیل سمجھنے لگا۔"

ایک مرتبہ کسی سبیل پر پانی پینے کے لیے گئے وہاں بھیڑ تھی لوگوں کا ریلا جو آیا تو

دھکا لگنے سے دور جا گرے۔ جب وہاں سے واپس چلنے لگے تو حسنؒ سے جوان کے ساتھ تھے کہنے لگے "زندگی ایسی ہی ہو کہ نہ لوگ ہمیں پہچانیں اور نہ ہماری توقیر کریں۔"

مرو میں ان کے پاس ایک وسیع مکان تھا جس میں ہر وقت عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا۔ ان کو یہ عقیدت مندی ناپسند تھی کچھ عرصہ تو اسے برداشت کیا لیکن جب دیکھا کہ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو مرو سے کوفہ چلے گئے اور وہاں ایک تنگ و تاریک مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ لوگوں نے پوچھا، حضرت اتنا کشادہ مکان چھوڑ کر اس تنگ و تاریک مکان میں رہنے سے آپ کی طبیعت نہیں گھبراتی؟ فرمایا، لوگ عقیدتمندوں کے ہجوم میں رہنا پسند کرتے ہیں لیکن میں اس کو ناپسند کرتا ہوں اسی لیے تو مرو سے کوفہ بھاگ آیا ہوں۔

عام لوگوں کے ساتھ تو ان کے عجز و انکسار کی یہی کیفیت تھی لیکن حاکموں اور امیروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کے پاس جانا وقارِ علم کے منافی سمجھتے تھے۔ ابراہیم موصلی کا بیان ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید عین ذربہ آیا تو اس نے دو تین مرتبہ عبداللہ بن مبارکؒ سے ملنے کی خواہش کی لیکن میں نے کسی نہ کسی حیلے سے ٹال دیا —— کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ان کے سامنے دین و شریعت کے خلاف کوئی بات ہوگی تو وہ خلیفہ کو سختی سے روکیں گے اور یہ بات اسے ناگوار گزرے گی۔ اتفاقاً ایک دن عبداللہ بن مبارکؒ خود ہی خلیفہ سے ملنے تشریف لے آئے۔ ملاقات کے بعد کسی نے ان سے پوچھا، آپ تو ہارون الرشید کی ملاقات سے گریز کرتے تھے اب کیسے آگئے؟ فرمایا، میں اپنے دل کو موت پر راضی کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں ہوتا تھا اب جبکہ وہ راضی ہو گیا تو میں ہارون سے ملنے آگیا۔ گویا وہ ہارون الرشید کے سامنے حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تھے اور اس کا نتیجہ ان کے قتل کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا۔ جب ان کا نفس اپنی موت پر راضی ہو گیا تو وہ بے دھڑک خلیفہ کے پاس آگئے۔ کسی دنیوی غرض کے لیے تو حکمرانوں سے ان کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کو نہ صرف خود امراء و سلاطین

سے ملنا ناپسند تھا بلکہ وہ اپنے احباب و اقربا کو بھی اس سے منع کیا کرتے تھے۔ ان کے ایک نہایت عزیز دوست اور شاگرد اسمٰعیل بن علیہؒ تھے، وہ بھی بہت بڑے عالم اور محدث تھے اور کاروبار میں بھی ان کے شریک تھے۔ انہوں نے بعض حاکموں اور امیروں کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ امراء و حکام کے ساتھ ان کا یہ اٹھنا بیٹھنا اس سبب سے تھا کہ انہوں نے زکوٰۃ و صدقات کی تحصیلداری کا عہدہ قبول کر لیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے سخت ناگواری کا اظہار کیا۔ ایک دن اسمٰعیلؒ ان کی مجلس میں آئے تو ان سے مخاطب نہیں ہوئے، اسمٰعیل کو بہت رنج ہوا گھر جا کر ابن المبارکؒ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں ان کی بے توجہی اور ناراضی پر اپنے رنج و غم اور ندامت کا اظہار کیا اور نہایت لجاجت کے ساتھ ان کی ناراضی کا سبب دریافت کیا۔ اس خط کے جواب میں حضرت عبداللہؒ نے چند اشعار لکھ بھیجے جن کا مطلب یہ تھا "تم نے علمِ دین کو ایسا باز بنا دیا ہے جو غریبوں کا مال سمیٹ کر کھا جاتا ہے۔ تم نے دنیا اور اس کی لذتوں کے لیے ایسی تدبیر اختیار کی ہے جو تمہارے دین کو پھونک کر رکھ دے گی۔ تمہاری وہ روایتیں کیا ہوئیں جو تم خود بیان کیا کرتے تھے اور جن میں دنیادار حاکموں سے میل جول رکھنے کی وعید آئی ہے۔ دیکھو دنیا پرست پادریوں کی طرح دین سے دنیا نہ کماؤ۔"
اسمٰعیلؒ یہ اشعار پڑھ کر رونے لگے اور اسی وقت اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

(۸)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے نزدیک علمِ دین کو دولت کمانے کا ذریعہ بنانا جائز نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے تجارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا تھا۔ وہ عموماً خراسان سے قیمتی سامان لاتے اور حجاز میں فروخت کرتے تھے۔ اللہ نے تجارت میں خوب برکت دی تھی لاکھوں ہی کماتے تھے اور لاکھوں ہی رضائے الٰہی کی خاطر کارہائے خیر میں صرف کرتے تھے۔ ان کی تجارت کا مقصد سرمایہ دار بن کر اپنی ذات کے لیے سامانِ عیش و راحت

جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اس ذریعے سے ایک تو وہ اپنی معیشت میں دوسروں کی دست نگری سے بے نیاز ہونا چاہتے تھے اور دوسرے مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کے شاگرد حضرت فضیل بن عیاضؒ نے پوچھا، حضرت آپ ہمیں تو نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا میں دل نہ لگاؤ اور آخرت کی فکر کرو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خود خراسان سے بیش قیمت سامانِ تجارت لاتے ہیں اور اسے بلد الحرام میں فروخت کرتے ہیں ؟ فرمایا :

"اے ابو علی یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ مصائب سے بچ سکوں اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکوں اور اس کی مدد سے اللہ کی اطاعت زیادہ سے زیادہ کروں اور اللہ کی طرف سے اپنوں پرایوں کے جو حقوق مجھ پر عائد ہوتے ہیں ان کی طرف سبقت کر کے اچھی طرح ادا کر سکوں۔"

ایک اور موقع پر حضرت فضیلؒ سے فرمایا : "اگر تم اور تمہارے ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت کا کھکھیڑ نہ اٹھاتا۔"

حضرت ابن المبارکؒ کی آمدنی کے مصارف کی بڑی بڑی مدیں یہ تھیں۔

۱۔ مہمان نوازی :

دستر خوان بہت وسیع تھا، سفر میں ہوں یا حضر میں مہمان نوازی کا خاص التزام تھا۔ دوست احباب ہوں یا اعزہ و اقارب، فقراء ہوں یا امراء، پڑوسی ہوں یا اجنبی، مسافر ہوں یا مقامی، ان کے دستر خوان پر سب کو دعوت عام تھی۔ کم از کم دو بچھڑوں کا گوشت روزانہ مہمان نوازی میں خرچ ہوتا تھا۔ مرغیوں اور بکریوں کا گوشت بھی پکتا تھا۔ ابو اسحٰق طالقانیؒ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفر کر رہے تھے تو ان کے ساتھ دو اونٹنیوں پر بھنی ہوئی مرغیاں لدی ہوئی تھیں۔ یہ ان مسافروں کے لیے تھیں جو ان کے ہم سفر تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ سفر میں ان کے دستر خوان کا سامان ایک یا دو گاڑیوں پر لادا جاتا تھا۔

اگر کوئی چیز کھانے کو دل چاہتا تو تنہا کبھی نہ کھاتے۔ کسی نہ کسی مہمان یا مہمانوں

کے ساتھ بیٹھ کر تناول کرتے اور فرمایا کرتے کہ مہمان کے ساتھ جو کھانا کھایا جاتا ہے آخرت میں اس کا محاسبہ نہیں ہوگا۔

خود روزے کثرت سے رکھتے تھے لیکن اپنے ساتھیوں کو فالودہ اور حلوا بنوا بنوا کر کھلایا کرتے تھے۔

۲۔ علماء اور طلبہ کی اعانت:

علماء اور طلبہ کی اعانت کے لیے ابن المبارکؒ اپنا مال بے دریغ لٹاتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ علماء اور طلبہ کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیا جائے تاکہ یکسوئی سے اشاعتِ علم اور تحصیلِ علم کر سکیں۔ وہ ایسے علماء اور طلبہ کی ڈھونڈ ڈھونڈ کر مدد کرتے تھے جو معاشی لحاظ سے پریشان حال ہوتے۔ اس مقصد کے لیے وہ جتنا روپیہ اپنے شہر کے علماء و طلبہ پر خرچ کرتے تھے اس سے کہیں زیادہ مال دوسرے شہروں کے علماء و طلبہ میں تقسیم کرتے تھے۔ خطیب بغدادیؒ نے حبان بن موسیٰؒ سے روایت کی ہے کہ بعض لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ آپ اپنے اہلِ شہر پر اتنا مال تقسیم نہیں کرتے جتنا دوسرے شہروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

"جن علماء و طلبہ پر میں اپنا مال خرچ کرتا ہوں، میں ان کے علم و فضل اور صدق و دیانت سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ لوگ علمِ دین کی اشاعت و طلب میں لگے ہوئے ہیں۔ آخر ان کی ذاتی (خانگی) ضرورتیں بھی تو وہی ہیں جو دوسرے لوگوں کی ہیں۔ اگر یہ لوگ بھی اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے میں لگ جائیں تو علم ضائع ہو جائے گا۔ اگر ہم نے انہیں فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا تو یہ یکسوئی کے ساتھ علم کی اشاعت کریں گے اور میرے نزدیک نبوت کے ختم ہونے کے بعد علم کی اشاعت سے افضل دوسرا کوئی کام نہیں ہے۔"

ایک مرتبہ ان سے کہا گیا کہ اہل علم (یعنی طالبینِ علم) کی ایک جماعت لوگوں

سے اموالِ زکوٰۃ لیتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ پھر ہم کیا کریں۔ اگر ہم ان کو اس سے منع کر دیں تو وہ طلبِ علم سے رک جائیں گے جب کہ معاش کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں ہے اور اگر ہم ان کو اس کے لیے اجازت دے دیں تو وہ یکسوئی کے ساتھ حصولِ علم میں لگے رہیں گے اور یہ کام دوسرے سب کاموں سے افضل ہے۔

۳ - حجّاج کی امداد :

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا معمول تھا کہ جب حج کے لیے روانہ ہونے لگتے تو اپنے تمام رفقائے سفر سے فرماتے کہ تم لوگ اپنا اپنا سفر خرچ میرے پاس جمع کرا دو۔ جب وہ اپنی رقمیں ان کے حوالے کر دیتے تو وہ ہر ایک کی رقم کو الگ الگ تھیلیوں میں بند کر کے ہر تھیلی پر اس کے مالک کا نام لکھ دیتے پھر ان سب تھیلیوں کو ایک صندوق میں رکھ کر اس کو مقفل کر دیتے۔ پورے سفر میں جو کچھ خرچ ہوتا اس کو خود برداشت کرتے! ان لوگوں کو عمدہ عمدہ کھانے کھلاتے اور ہر طرح کی آسائشیں مہیا کرتے۔ فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ پہنچتے تو ان سے پوچھ پوچھ کر سب کے اہل و عیال کے لیے حسبِ منشاء تحفے تحائف خرید کر دیتے۔ سفرِ حج ختم کر کے گھر واپس آتے تو اس زمانہ کے حجاج کے دستور کے مطابق ان کے مکانات پر سفیدی وغیرہ کراتے تین دن کے بعد تمام رفقائے سفر اور ان کے اعزہ واقارب کی پر تکلف دعوت کرتے اس سے فارغ ہو کر صندوق کھول کر ہر ایک کی تھیلی جس پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ زندگی بھر ان کا یہی شعار رہا۔

۴ - جود و سخا اور اہلِ حاجت کی امداد :

خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں علی بن حسن بن شفیقؒ سے روایت کی ہے کہ ابن المبارکؒ ہر سال فقراء پر ایک لاکھ درہم خرچ کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی کتابِ سیرت میں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حد فیاض اور سیر چشم تھے اور اہلِ حاجت کی امداد کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتے تھے۔

ایک مرتبہ (غالباً) جہاد میں شریک ہونے کے لیے بغداد سے مصیصہ کی جانب روانہ ہوئے تو کچھ صوفیہ بھی ان کے شریکِ سفر ہو گئے۔ انہوں نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ حضرات کے نفوسِ قانعہ اس بات پر انقباض تو محسوس کریں گے کہ آپ کی خدمت میں کوئی سفر خرچ پیش کیا جائے پھر بھی زادِ راہ کی ضرورت سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں۔ یہ کہہ کر ایک ملازم کو حکم دیا کہ ایک طشت لائے۔ وہ طشت لایا تو انہوں نے اس میں ایک معقول رقم رکھ دی اور اس کو ایک رومال سے ڈھانپ دیا۔ پھر ان حضرات سے فرمایا کہ ہر صاحب باری باری اس رومال کے نیچے ہاتھ ڈال کر جو کچھ مٹھی میں آئے لے لیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، کسی کو دس درہم مل گئے کسی کو بیس یا اس سے کم و بیش۔ مصیصہ پہنچ کر فرمایا کہ یہ پردیس ہے اور ضروریات باقی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے بھی تقسیم کر لیا جائے۔ یہ کہہ کر ہر ایک کو بیس بیس دینار عطا کیے۔

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت ابن المبارکؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ سات سو درہم کا مقروض ہوں، مجھے اس قرض سے نجات دلائیے۔ انہوں نے اسی وقت اپنے منشی کو لکھا کہ اس شخص کو سات ہزار درہم دے دیئے جائیں۔ وہ آدمی یہ خط لے کر منشی کے پاس پہنچا۔ اس نے پوچھا، تم پر کتنا قرض ہے اور تم نے کتنی رقم ابن المبارکؒ سے طلب کی تھی۔ اس نے کہا "سات سو درہم" منشی نے سمجھا کہ ابن المبارکؒ سے سہوِ قلم ہو گیا ہے اور وہ سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ گئے ہیں۔ چنانچہ اس نے ابن المبارکؒ کو لکھ بھیجا کہ یہ شخص تو صرف سات سو درہم کا مقروض ہے اور آپ نے سات ہزار دینے کا حکم دیا ہے کہیں سہوِ قلم تو نہیں ہو گیا؟ ابن المبارکؒ نے جواب میں لکھا کہ جس وقت میرا یہ خط تم کو ملے اسی وقت اس شخص کو چودہ ہزار درہم دے دو۔ منشی اور بھی حیران ہوا اور اس نے ازراہِ ہمدردی ان کو دوبارہ لکھا کہ آپ اس طرح اپنا سرمایہ بے دریغ لٹاتے رہے تو یہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ منشی کا خط پڑھ کر ابن المبارکؒ سخت برہم ہوئے اور اس کو سخت الفاظ میں لکھا کہ میں نے جو حکم دیا ہے

اس پر عمل کرو ورنہ میری جگہ پر آ بیٹھو تم جو حکم دو گے میں اس پر عمل کروں گا۔ میرے نزدیک دولتِ دنیوی سے زیادہ قیمتی سرمایہ ثوابِ آخرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک ہے کہ جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو غیر متوقع طور پر خوش کر دے گا اللہ اس کی مغفرت کر دے گا۔ میں نے دانستہ سات سو کے بجائے سات ہزار درہم لکھے تھے تاکہ یہ شخص اتنی خطیر رقم اچانک پا کر خوش ہو جائے۔ دوسری مرتبہ میں نے اپنے خط میں چودہ ہزار بھی سوچ سمجھ کر لکھے وہ اس لیے کہ سات ہزار کی بھنک اس شخص کے کان میں پڑ چکی تھی چودہ ہزار اس کے لیے یقیناً غیر متوقع ہوں گے اور یوں میں حضورؐ کے ارشاد کے مطابق اجرِ آخرت کا حقدار ٹھہروں گا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اکثر طرطوس آتے جاتے رہتے تھے۔ راستہ میں رقہ پڑتا تھا وہاں کی ایک سرائے میں قیام کیا کرتے تھے۔ سرائے میں مقیم ایک نوجوان نہایت اخلاص سے ان کی خدمت کیا کرتا تھا اور ان سے حدیث کا درس بھی لیتا تھا۔ ایک مرتبہ حسبِ معمول رقہ کی اس سرائے میں ٹھہرے تو اس نوجوان کو نہ دیکھا۔ لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس پر فلاں شخص کا دس ہزار درہم کا قرضہ تھا اسے ادا نہ کر سکا تو قرضخواہ نے دعویٰ کر دیا اور اس نوجوان کو قرض کی عدم ادائیگی کی پاداش میں قید خانے بھیج دیا گیا۔ حضرت ابن المبارکؒ نے قرض خواہ کو رات کے وقت تنہائی میں بلایا اور اسے دس ہزار درہم دے کر کہا کہ بھائی اس نوجوان کو رہا کرا دو۔ ساتھ ہی اس سے قسم لی کہ وہ اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرے گا۔ نوجوان کی رہائی کا انتظام کر کے ابن المبارکؒ اسی رات سرائے سے روانہ ہو گئے۔ نوجوان رہا ہو کر سرائے میں آیا تو اسے ابن المبارکؒ کی آمد اور روانگی کی اطلاع ملی۔ اس کو حضرتؒ سے شرفِ نیاز حاصل نہ کرنے کا اتنا قلق ہوا کہ اسی وقت طرطوس کی طرف روانہ ہو گیا۔ تین چار منزل کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اس نے عرض کیا: "جناب میں قید میں تھا۔ ایک نامعلوم شخص نے میرا قرض اپنی طرف سے ادا کر کے مجھے رہا کرا دیا معلوم نہیں وہ فرشتۂ رحمت کون تھا"۔ حضرت ابن المبارکؒ نے فرمایا، "بھائی اللہ تعالیٰ

کا شکر ادا کرو کہ اس نے اس نامعلوم شخص کو تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے کی توفیق بخشی۔"

راوی (محمد بن عیسٰی) کا بیان ہے کہ ابن المبارکؒ کی وفات کے بعد قرضخواہ نے یہ واقعہ لوگوں کو بتایا۔

۹

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ عبادت و ریاضت، زہد و ورع، امانت و دیانت اور حسنِ معاشرت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ حافظ ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں اسمٰعیل بن عیاشؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ روئے زمین پر عبداللہ بن مبارکؒ جیسی کوئی شخصیت نہیں ہے اور میری دانست میں کوئی اچھی خصلت ایسی نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں ودیعت نہ کر دیا ہو۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرمایا کرتے تھے "ربِ کعبہ کی قسم میری آنکھوں نے ابن المبارکؒ جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔"

عبادت و ریاضت سے بہت شغف تھا، پنجگانہ باجماعت فرض نمازوں کے علاوہ سنن و نوافل کا بھی خاص اہتمام تھا، بعض اوقات ساری ساری رات عبادت میں گزر جاتی تھی۔ کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ حج بیت اللہ کے لیے بھی اکثر تشریف لے جاتے تھے۔ دیانت و امانت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ قیامِ شام کے دوران میں کسی شخص سے قلم عاریتاً لیا۔ واپسی پر اسے قلم لوٹانا بھول گئے اور اسے اپنے ساتھ مرو لے آئے۔ گھر آکر دیکھا تو یاد آیا۔ افسوس کیا اور مرو سے شام تک طویل سفر دوبارہ صرف اس لیے کیا کہ وہ قلم اس کے مالک کے حوالے کر سکیں۔

حسنِ ادب کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے سامنے کوئی شاگرد قراءتِ حدیث کرتا تو وہ اس سے کسی عبارت کو دوبارہ نہیں پڑھواتے تھے بلکہ توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے تھے۔ ایک بار مجلس میں کسی شخص کو چھینک آگئی۔ اس نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ نہیں کہا۔ حضرت ابن المبارکؒ نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر اس سے پوچھا، جب کسی کو چھینک آئے تو اس کو

کیا کہنا چاہیے۔ اس نے کہا، الحمدللہ۔ اس پر انہوں نے فوراً کہا "یرحمک اللہ"
زندگی نہایت محتاط اور زاہدانہ تھی، ابو اسامہؒ اور شعیب بن حربؒ کہا کرتے تھے کہ ہم سال بھر میں تین دن بھی ابن المبارکؒ کی طرح نہیں گزار سکتے۔
ان کے زہد و ورع کی بناء پر اہلِ سیر نے انہیں زہاد تبع تابعین میں شمار کیا ہے
اسی طرح بعض ارباب سیر نے انہیں اولیاء اللہ میں شامل کیا ہے اور ان کی بہت سی کرامات بیان کی ہیں۔ علامہ خطیب بغدادی نے "تاریخ بغداد" میں ابو وہبؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ابن المبارکؒ کا گزر ایک نابینا پر ہوا تو اس نے بڑی لجاجت سے عرض کیا کہ میرے لیے بینائی کی دعا کیجیے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت خشوع و خضوع سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی بحال کر دی۔
وعظ و نصیحت اور ارشاد و اصلاح کا طریقہ نہایت بلیغ اور حکیمانہ ہوتا تھا۔ تذکروں میں ان کے سینکڑوں پُر معارف اقوال ملتے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

- بہت سے چھوٹے عمل ایسے ہوتے ہیں جن کو نیت بڑا بنا دیتی ہے اور بہت سے بڑے عمل ایسے ہوتے ہیں جن کو نیت چھوٹا بنا دیتی ہے۔
- سب سے سفلہ اور کمینہ وہ شخص ہے جو دین کو عیاشی کا ذریعہ بنائے۔
- عالم ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ دنیا کی محبت سے اس کا دل ہمیشہ خالی رہے۔
- دنیا کے مال پر کبھی غرور نہ کرو۔
- حق پر جمے رہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔
- ہر کام میں ادب اور تہذیب کا خیال رکھو۔ دین کے دو حصے ادب اور تہذیب ہیں۔
- ایسا دوست ملنا بہت مشکل ہے جو صرف اللہ کے لیے محبت کرے لیکن دوست فی الحقیقت یہی ہے۔
- آدمی اس وقت تک عالم رہتا ہے جب تک یہ سمجھتا رہے کہ شہر میں اس سے زیادہ علم رکھنے والے بھی موجود ہیں مگر جب وہ یہ سمجھنے لگ جائے کہ میں ہی سب

سے بڑا عالم ہوں تو یوں سمجھ لو کہ اب وہ جاہلوں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔

- گمنامی کو پسند کرو اور شہرت سے دور رہو مگر یہ ظاہر نہ کرو کہ تم گمنامی کو پسند کرتے ہو اس لیے کہ اس سے بھی غرور پیدا ہوگا۔
- سب سے گرے ہوئے لوگ وہ ہیں جو قرض پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔
- تواضع یہ ہے کہ اغنیا کے مقابلہ میں خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔
- حُسنِ خلق یہ ہے کہ غصہ نہ کیا جائے۔
- شریف وہ ہے جسے اطاعتِ الٰہی کی توفیق ہوئی اور رذیل وہ جس نے بے مقصد زندگی گزار دی۔

(۱۰)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ ۱۸۱ھ میں جہادِ فی سبیل اللہ کے لیے شام گئے۔ اثنائے سفر میں ہیت کے مقام پر طبیعت خراب ہوگئی یہاں تک کہ جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ انتقال سے پہلے غلام سے فرمایا، میرا سر زمین پر رکھ دو۔ غلام یہ سن کر رونے لگا۔ پوچھا، روتے کیوں ہو۔ اس نے عرض کیا، مجھے آپ کے مقامِ بلند کا خیال آگیا کہ اللہ اللہ اپنے وقت کی عظیم ترین ہستی اس طرح جان دے رہی ہے۔ فرمایا، بھائی اس میں رنج کی کوئی بات نہیں، میں نے خود بارگاہِ الٰہی میں دعا کی تھی کہ میں بے کسی اور فروتنی کی حالت میں جان دوں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ مرض الموت میں آواز بیٹھ گئی تھی اس لیے اندیشہ ہوا کہ مرتے وقت کلمۂ شہادت پڑھنے سے محروم نہ رہ جاؤں، اپنے شاگرد حسن بن ربیعؒ سے، جو ساتھ تھے، فرمایا کہ دمِ نزع تم میرے سامنے کلمۂ شہادت بلند آواز سے پڑھنا۔ جب تم ایسا کرو گے تو میری زبان پر بھی کلمۂ شہادت خود بخود جاری ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اسی حالت میں ۱۳ رمضان المبارک ۱۸۱ھ (۸ نومبر ۷۹۷ء) کو بروز چہار شنبہ وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ مقامِ وفات ہیت اگرچہ ان

کے وطن سے سینکڑوں میل دور تھا لیکن مخلوقِ خدا کے دلوں پر ان کی حکمرانی کا یہ عالم تھا کہ وفات کی خبر پھیلتے ہی لوگ جوق در جوق اس دور افتادہ قصبے کی طرف دوڑ پڑے۔ جنازے پر اس قدر ہجوم ہوا کہ ہیت کے حاکم کو اس واقعہ کی اطلاع بغداد بھیجنی پڑی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے یہ خبر سنی تو اس کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آ گئے۔ "افسوس علماء کے سردار کا انتقال ہو گیا۔" حضرت فضیل بن عیاض رح نے فرمایا، ابن المبارک فوت ہو گئے لیکن افسوس اس کا ہے کہ جو باقی رہ گئے۔ ان میں کوئی بھی ان کا مثل نہیں ہے۔

سفیان بن عیینہ رح بولے، اللہ عبداللہ بن مبارک کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ انہوں نے خراسان میں اپنا کوئی ثانی نہیں چھوڑا۔

اسی طرح دوسرے تمام علماء عصر نے بھی شاندار الفاظ میں انہیں خراجِ تحسین پیش کیا اور ان کی وفات پر اپنے دلی کرب کا اظہار کیا۔

مختلف تذکروں میں حضرت ابن المبارک رح کو بہت سی کتابوں کا مصنف بتایا گیا ہے لیکن ان میں سے بیشتر کتابیں نایاب ہو چکی ہیں۔ خوش قسمتی سے چند سال پہلے ان کی ایک معرکہ آرا تصنیف "کتاب الزہد والرقائق" بھارت میں چھپ کر منظرِ عام پر آ گئی۔ اس کتاب کے گیارہ حصے ہیں اور اس میں ۲۰۶۲ روایات ہیں۔ اسے مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں (ناسک / بھارت) نے شائع کیا ہے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

قاضی اسد بن فراتؒ

فاتح صقلیہ

①

خاندانِ عباسیہ کے گل سرسبد خلیفہ ہارون الرشید کے دورِ حکومت (۱۷۰ھ ۷۸۶ء تا ۱۹۳ھ ۸۰۹ء) میں بغداد علم و فن کا مرکز بن گیا تھا۔ خلیفہ خود بھی علم پرور تھا اور اس کے اعزہ و اقارب بھی۔ اربابِ علم و ہنر اور اہلِ کمال کی عزت و تکریم اور دلجوئی اُن کا خاص شیوہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ بغداد میں سرآمدِ روزگار علماء اور اربابِ فضل و کمال نے ہر طرف علم و فن اور رُشد و ہدایت کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں جن سے کسبِ نور کے لیے عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے شائقینِ علم بغداد کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ وہ علماء جن کے دم قدم سے بغداد بقعۂ نور بنا ہوا تھا، اُن میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ارشد تلامذہ بھی تھے۔ ایک محلّے میں اگر امام ابو یوسفؒ نے مسندِ درس بچھا رکھی تھی، تو دوسرے میں امام اسد بن عمروؒ نے۔ اسی طرح امام محمدؒ بن حسنؒ، جنہوں نے امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ دونوں سے کسبِ فیض کیا تھا، بغداد کے ایک محلے میں رونق افروز تھے اور مرجع خلائق بنے ہوئے تھے۔

اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ امام محمدؒ بن حسنؒ کے حلقۂ درس میں ایک غریب الدیار طالب علم شامل ہوا۔ اس کی پیشانی نورِ سعادت سے درخشاں تھی اور وہ نہایت ذہین و فطین تھا۔ حدیث و فقہ سے اس کا غیر معمولی شغف دیکھ کر امام محمدؒ اس پر بہت مہربان ہو گئے اور سعادت مند شاگرد کو خصوصی توجہ سے تعلیم دی یہاں تک

کہ تھوڑے ہی عرصے میں اُس کی علمی استعداد کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔

جب وہ حنفی مکتبِ فکر کے اس عظیم منبع علم سے پوری طرح سیراب ہو چکا، تو اس نے بغداد سے اپنے وطن کو مراجعت کا ارادہ کیا۔ سفر بڑا طویل اور کٹھن تھا اور اس کے لیے کثیر زادِ راہ درکار تھا۔ ادھر غریب طالب علم کے پاس لے دے کے کل چالیس درہم تھے، اور وہ مصارفِ سفر کے لیے سخت پریشان تھا، لیکن اُس کی طبعی غیرت کسی کے سامنے دستِ طلب پھیلانے میں آڑے آتی تھی۔ امام محمدؒ کو کسی طرح شاگردِ عزیز کی پریشانی کا علم ہو گیا۔ انہوں نے اُسے بلا کر فرمایا کہ چند روز یہاں اور ٹھہرو، شاید اللہ تعالیٰ تمہارے لیے معقول زادِ راہ مہیا کرنے کا کوئی سامان پیدا کر دے۔ سعادتمند شاگرد نے استاد کے ارشاد کے سامنے سر جھکا دیا اور ارادۂ سفر ملتوی کر دیا۔ اسی دوران میں شفیق اُستاد ایک دن ولی عہدِ سلطنت شہزادہ امین الرشید کے پاس تشریف لے گئے اور اُس کے سامنے پردیسی طالب علم کا علمی شغف اور دوسرے اوصاف و محاسن کچھ ایسے پیرائے میں بیان کیے کہ شہزادہ امین کے دل میں اُس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ایک دن غریب الوطن طالب علم کو بلا بھیجا۔ طالب علم ولی عہد کے محل میں پہنچا، تو ایک خادمِ خاص نے اُس کا استقبال کیا اور اس کو ایک کمرے میں بٹھا دیا، کچھ دیر بعد سامنے دسترخوان بچھایا اور اُس پر ڈھکا ہوا ایک خوان لا کر رکھ دیا۔

طالب علم نے پوچھا: "یہ دعوت تمہاری جانب سے ہے یا تمہارے آقا کی طرف سے؟"

خادم نے جواب دیا: "آقا کے حکم سے لایا ہوں۔"

طالب علم نے کہا: "تمہارے آقا کو یہ بات ہرگز پسند نہ ہو گی کہ اس کا مہمان میزبان کے بغیر کھانا کھائے۔ یہ خوان اٹھا لو اور میری طرف سے یہ حقیر انعام قبول کرو۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنی جیب سے چالیس درہم نکال کر خادم کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

خادم پردیسی طالب علم کی عالی ظرفی سے بڑا متاثر ہُوا ۔ اس نے اندر جا کر سارا واقعہ امین الرشید کے گوش گزار کیا، تو اس نے طالب علم کو فوراً اندر بُلا لیا اور اپنے سامنے بچھے ہوئے ایک تخت پر جگہ دی ۔

اب جو دونوں کے درمیان گفتگو شروع ہوئی، تو شہزادہ نووارد طالب علم کا تبحّرِ علمی دیکھ کر دنگ رہ گیا ۔ جب وہ شہزادے سے رخصت ہونے لگا، تو شہزادے نے اُسے ایک رقعہ دیا جس میں صاحب دیوان کے نام یہ حکم درج تھا کہ اُس طالب علم کو دس ہزار درہم فوراً ادا کیے جائیں ۔ ساتھ ہی دوبارہ ملنے کو کہا کہ انشاءاللہ تمہیں یہاں آنے سے مسرّت ہو گی ۔

پردیسی طالب علم کے مصارفِ سفر کے لیے دس ہزار درہم بہت کافی تھے ۔ وہ چاہتا، تو شہزادے سے دوبارہ مل کر اور بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا، لیکن یہ اس کی شانِ علم کے خلاف تھا، چنانچہ اس نے دس ہزار درہم پر ہی قناعت کی اور رقم وصول کر کے عازمِ مصر ہو گیا ۔

یہ پردیسی طالب علم، جن کی خودداری اور جلالتِ علمی نے رُبعِ مسکوں کی سب سے بڑی سلطنت کے ولی عہد کو چند لمحوں میں مسخر کر لیا، قاضی اسد بن فُرات فاتحِ سسلی (صقلیہ) تھے ۔

۲

ابو عبداللہ اسد بن فُرات بن سنان کا شمار تاریخ اسلام کے اُن نامور فرزندوں میں ہوتا ہے جو اگر ایک طرف علم و فضل کے اعتبار سے فقہائے اُمّت کی صفِ اوّل میں تھے تو دوسری طرف راہِ حق کے ایک سرفروش مجاہد بھی تھے ۔ وہ خود ازراہِ تفنن کہا کرتے تھے کہ میں اسد (شیر) ہوں جو وحشی جانوروں میں سب سے بہتر ہے، میرے والد فُرات ہیں جو دریاؤں میں سب سے بہتر ہے اور میرے دادا "سنان" (نیزے کی انی) ہیں جو ہتھیاروں میں سب سے بہتر ہے ۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ بنو سلیم بن قیس

کے غلام تھے۔ بنو سلیم نے آزاد کر دیا، تو وہ نیشاپور (خراسان) میں آ کر مقیم ہو گئے۔ اسد ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ اُن کے والد فرات بن سنان جو ایک مرد سپاہی تھے، اپنے وطن سے ہجرت کر کے دیارِ بکر چلے گئے اور اسد وہیں حران کے مقام پر ۱۴۲ھ ۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ اسی زمانے میں فرات بن سنان، بنو عباس کے ایک جرنیل محمد بن اشعث خزاعی کی فوج میں شامل ہو گئے۔ ۱۴۴ھ ۷۶۱ء میں عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے محمد بن اشعث کو خارجیوں اور بربریوں کی بغاوت فرو کرنے کے لیے افریقیہ بھیجا، تو فرات بھی اپنے اہل و عیال سمیت اس کی فوج کے ہمراہ قیروان آ گئے اور پانچ سال تک وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد انھوں نے تیونس کا رُخ کیا اور وہیں کے ہو رہے۔ اسد نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مراحل تیونس ہی میں طے کیے۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے کہ اسد نے قرآنِ حکیم کی تعلیم اٹھارہ برس کی عمر میں تیونس کے ایک گاؤں میں مکمل کی۔ اُسی زمانے میں اُن کی والدہ نے اپنے فرزند (اسد) کو خواب میں اس حالت میں دیکھا کہ اُن کی پیٹھ پر گھاس اُگی ہوئی ہے اور مویشی اس کو چر رہے ہیں۔ صبح اٹھ کر انھوں نے یہ خواب اپنے شوہر کو سنایا، تو وہ دوڑتے ہوئے تعبیرِ رُؤیا کے ایک ماہر کے پاس گئے اور اُس سے اس خواب کی تعبیر پوچھی۔ اس نے بتایا، یہ لڑکا ایک دن نادرۂ روزگار عالم بنے گا اور علم کے بھوکے اس کے خوانِ علم سے ریزہ چینی کریں گے۔

قرآن پاک کی تعلیم کے بعد اسد نے تیونس کے نامور عالم علی بن زیادؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اُن سے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر ۱۷۲ھ ۷۸۸ء میں مدینہ منورہ کا رُخ کیا جہاں امام مالکؒ بن انس مسندِ علم و فضل پر متمکن تھے اور تمام دنیائے اسلام کے شائقینِ علم کا مرجع بنے ہوئے تھے۔ اسد بھی امام موصوف کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور "مؤطا" ان سے سبقاً سبقاً پڑھی۔ جب وہاں اپنی تعلیم مکمل کر چکے، تو عراق جا کر فقہ حنفی کی تحصیل کا ارادہ کیا اور امام مالکؒ سے رخصت ہونے اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے بڑی محبت اور شفقت سے رخصت کیا اور فرمایا: "میں تمھارے لیے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ، قرآن اور اس اُمت کی

خیر خواہی کی وصیت کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اسد، عراق پہنچے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ارشد تلامذہ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ بن حسن، اسدؒ بن عمرو اور کئی دوسرے ممتاز فقہائے احناف سے فقہ حنفی کی تحصیل کی۔ امام محمدؒ بن حسن اُن کی ذہانت اور شوق دیکھ کر اتنے مہربان ہوئے کہ دن کے علاوہ رات کو بھی اُنہیں درس حدیث دیا کرتے۔ خود اسد بن فُرات کا بیان ہے کہ میں نے امام محمدؒ سے اپنی غریب الوطنی کا واسطہ دے کر خصوصی توجہ کی درخواست کی، تو انہوں نے فرمایا کہ تم عراقی طلبہ کے ساتھ دن کے وقت درس میں شریک رہو اور پھر رات میرے مکان میں گزارو، میں تمہیں اُس وقت بھی درس حدیث دیا کروں گا، چنانچہ میں رات کو امام محمدؒ کے گھر چلا جاتا۔ وہ بالاخانے میں رہتے اور میں نچلی منزل میں۔ میری خاطر وہ نیچے تشریف لاتے اور مجھ کو حدیث کا درس دیتے۔ جب رات زیادہ گزر جاتی اور مجھے اونگھ آنے لگتی، تو وہ میرے منہ پر پانی چھڑک دیتے جس سے میں ہوشیار ہو جاتا اور پھر پوری توجہ سے درس لینے میں مشغول ہو جاتا۔ میرے قیام بغداد کے دوران میں اُن کا یہ مشفقانہ برتاؤ مسلسل قائم رہا یہاں تک کہ میں اُن کے چشمۂ علم سے پوری طرح سیراب ہو گیا۔

اسدؒ کہتے ہیں کہ امام محمدؒ اپنے علمی فیوض و برکات سے متمتع کرنے کے علاوہ میری مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں امام مالکؒ نے مدینہ منورہ میں وفات پائی، تو پوری اسلامی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اب لوگوں کی نظریں امام مالکؒ کے شاگردوں پر پڑنے لگیں اور وہ امام موصوف کی روایتیں سننے کے لیے اُن کی طرف رجوع کرنے لگے۔ اسدؒ بن فرات بھی امام مالکؒ کے عقیدتمندوں اور مداحوں کا مرجع بن گئے۔ اس سلسلے میں انہیں یہ قابل فخر اعزاز حاصل ہوا کہ فقہ حنفی میں اُن کے اساتذہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسنؒ نے خود اُن سے "موطّا امام مالک" کا درس لیا۔

اسد بن فراتؒ، بغداد سے چلے گئے، مگر امام محمدؒ کے دل سے اُن کی یاد کبھی نہ گئی۔ جب بھی اُن کا ذکر آتا وہ ان کی بے حد تعریف اور ستائش کیا کرتے۔ عبدالرحمٰن بن

محمد دباغ نے اپنی کتاب "معالم الایمان فی معرفتہ اہل القیروان" میں لکھا ہے:

"امام محمدؒ، مکہ معظمہ میں اسد بن فرات کی تعریف کرتے اور ان کے طریقِ درس، مناظرہ اور علم حدیث کو بہت سراہتے تھے۔"

(۳)

عراق سے نکل کر اسد، مصر پہنچے جہاں امام مالکؒ کے ارشد تلامذہ عبد اللہؒ بن وہب، اشہبؒ اور عبد الرحمٰنؒ بن قاسم نے مسندِ درس بچھا رکھی تھی۔ اسد نے اگرچہ خود بھی براہِ راست امام مالکؒ سے استفادہ کیا تھا، لیکن اُن کی علمی پیاس کسی طرح بجھنے میں نہ آتی تھی۔ مصر پہنچ کر پہلے عبد اللہؒ بن وہب اور اشہبؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، لیکن اُن دونوں سے اختلاف پیدا ہوگیا۔ اس لیے عبد الرحمٰنؒ بن قاسم کی مجلسِ درس میں شامل ہوگئے۔ عبد الرحمٰن فقۂ مالکی کے نہایت بلند پایہ فقیہہ تھے اور زہد و اتقا میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے اسد بن فرات کو بے انتہا فیض پہنچایا اور انھی کے فیضِ صحبت کے نتیجے میں اسد بن فرات نے فقۂ مالکی کی سب سے پہلی کتاب "الاسدیہ" مرتب کی۔

۱۸۱ھ / ۷۹۷ء میں اسد واپس قیروان آئے، تو اُس وقت اُن کے علم و فضل کی شہرت تمام دُنیائے اسلام میں پھیل چکی تھی۔ قیروان میں اُن کی ذات شائقینِ علم کا مرجع بن گئی اور ہر طرف سے مخلوقِ خدا اُن سے فیضیاب ہونے کے لیے اُمڈ پڑی۔ اسد نے "مؤطا" اور "الاسدیہ" کا درس جاری کر دیا۔ عام لوگ تو ایک طرف رہے، افریقیہ اور مغرب کے مشاہیر علماء نے بھی اس درس میں شامل ہونا اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھا اور یوں "اسد بن فرات" قیروان میں ایک منارۂ نور کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ساتھ ہی اُن کی کتاب "الاسدیہ" کی شہرت بھی چار دانگِ عالم میں پھیل گئی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اسد بن فرات کے حلقۂ درس میں فقۂ مالکی کے مشہور عالم سحنون بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے اُستاد کی لاعلمی میں "الاسدیہ" کی نقل کسی طرح حاصل

کرلی (یا خود اُسے نقل کرلیا) اور اُسے اپنے ساتھ مصر لے گئے۔ وہاں ابھی عبدالرحمٰنؒ بن بن قاسم حیات تھے اور ضعیفی کے باوجود انہوں نے درس وافتاء کا سلسلہ جاری کررکھا تھا۔ سحنونؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے اپنے تلمیذِ رشید اسدؒ بن فرات کا حال دریافت کیا۔ سحنون نے کہا اُن کا علم سارے ممالک میں پھیل گیا ہے۔ ابن قاسمؒ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد سحنونؒ نے روزانہ "الاسدیہ" کا متن ابن قاسمؒ کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ اس متن میں سوالات اسد بن فُرات کے تھے اور جوابات خود ابن قاسمؒ کے۔ دورانِ قرأت میں ابن قاسمؒ نے اپنے بعض فتووں (یا جوابات) سے رجوع کرلیا اور بعض جوابات میں ترمیم کردی۔ غرض اسی طریقے سے سحنونؒ نے پوری "الاسدیہ" کی قرأت مکمل کی۔ جب سحنونؒ ابن قاسم سے رخصت ہونے لگے، تو انہوں نے اسد کے نام ایک خط لکھ کر اُن کے حوالے کیا کہ تمہاری مرتّب کی ہوئی "الاسدیہ" میں کہیں کہیں میں نے ترمیم کردی ہے، تم اپنے نسخے کی سحنون کے نسخے سے ملا کر تصحیح کرلو۔

اسدؒ کو شفیق استاد کا مکتوب گرامی ملا تو وہ بخوشی سحنون کے نسخے سے اپنے نسخے کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گئے، مگر اُن کے شاگردوں نے مشورہ دیا کہ اس طرح آپ (اس زمانے کے دستور کے مطابق) اپنے شاگرد سحنون کے شاگرد بن جائیں گے اور یہ بات آپ کی شان کے خلاف ہے کیونکہ آپ نے براہِ راست امام مالک سے حدیث و فقہ کا علم حاصل کیا ہے۔

اسدؒ نے شاگردوں کا مشورہ قبول کرلیا اور اپنا نسخہ اصل حالت میں رہنے دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اُسی زمانے میں قیروان کے ایک فقیہہ شیخ معمرؒ، اسدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو اُنہیں روتے ہوئے پایا۔ معمرؒ نے رونے کا سبب پوچھا، تو انہوں نے کہا: "بھائی، کیا پوچھتے ہو؟ میرے پاس اپنے شیخ عبدالرحمٰنؒ بن قاسم کا خط آیا ہے جس میں انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی مرتّب کی ہوئی "الاسدیہ" کو سحنون کے مرتّب کیے ہوئے نسخے کے مطابق کرلوں، حالانکہ سحنون نے خود مجھ سے تربیت حاصل کی ہے۔ اس ناگوار قضیے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سحنونؒ نے اپنی مسندِ درس بچھائی، تو لوگ جوق

در جوق اُن کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کے لیے لوٹ پڑے، کیونکہ تمام افریقیہ (تیونس) اور اقصائے مغرب (مراکش) میں اسد کے نام ابن قاسمؒ کے خط کی شہرت ہو چکی تھی اور سحنونؒ کے مرتب کیے ہوئے نسخے کے سامنے اسدؒ کی "الاسدیہ" ایک حد تک بے وقعت ہو گئی تھی۔ سحنونؒ کے ترمیم شدہ نسخے نے "المدونۃ الکبریٰ" کے نام سے شہرت پائی اور اُسی کی بدولت وہ امام کے لقب کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ "المدونۃ الکبریٰ" آج تک فقۂ مالکی کی سب سے ضخیم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ جس شخص نے حدیث و فقہ کی اس عظیم الشان عمارت کا ڈھانچہ کھڑا کیا، اس کا نام پس منظر میں چلا گیا اور اس کی کاوشوں کا ثمرہ اُس کے شاگرد کو مل گیا۔

اس واقعے کے بعد اسدؒ بن فرات اکثر مسائل میں فقۂ حنفی کے مطابق فتویٰ دینے لگے، کیونکہ اُن کے نسخہ "الاسدیہ" کے بعض مقامات مشکوک ہو گئے تھے اور وہ اُن پر کامل بھروسا نہ کر سکتے تھے۔ اس طرح چند سال کے اندر اندر اسدؒ بن فرات افریقیہ میں فقۂ حنفی کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے۔ ایک مؤرخ جعفر القصری نے لکھا ہے:

> "اسدؒ بن فرات، قیروان میں احناف کے امام تھے۔ علم و فضل اور تدین میں اُن کی بڑی شہرت تھی اور وہ سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل تھے۔"

اسد، امام احناف ہونے کے باوجود بڑے وسیع النظر اور روادار تھے اور اُن کے درس میں مالکی مذہب کے طلبہ بھی خاصی تعداد میں موجود رہتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اسدؒ بن فرات کے فتاویٰ کے علی الرغم اُنہیں ہمیشہ مالکی فقیہہ سمجھا گیا ہے اور فقہائے احناف کے طبقات کی کتابوں میں اُن کا نام درج نہیں۔ حق یہ ہے کہ اسد بن فُرات فقۂ حنفی میں درجۂ تبحر رکھتے تھے اور ہر اعتبار سے فقہائے احناف میں پہلی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

جس زمانے میں اسد بن فُرات تحصیل علوم سے فارغ ہو کر قیروان (تیونس) واپس آئے اور اپنی مسندِ درس بچھائی، تو وہ تقریباً چالیس برس کے پیٹے میں تھے۔ اس وقت

قیروان کے قاضی القضاۃ عبداللہ بن غانم تھے جنہیں خود خلیفہ ہارون الرشید نے اس عہدے پر مامور کیا تھا۔ عبداللہ بن غانم، اسد بن فُرات کے علمی تبحّر اور کمالات کے بے حد مدّاح تھے اور اُن کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ صاحبِ "معالم الایمان" کا بیان ہے کہ عبداللہ بن غانم اہم دینی مسائل و معاملات میں اسدؒ بن فُرات سے مشورہ بھی کیا کرتے تھے۔

اسدؒ کے قیروان میں ورود کے تین سال بعد ۱۸۴ھ / ۸۰۰ء میں افریقیہ پر اغالبہ کا پرچمِ اقبال بُلند ہوا۔ یہ لوگ بڑے علم دوست اور علماء و فُضلا کے قدردان تھے۔ پہلے اُغلبی فرمانروا ابراہیم بن اغلب نے عبداللہ بن غانم کو اُن کے عہدے پر برقرار رکھا۔ انہوں نے ۱۹۱ھ / ۸۰۷ء میں وفات پائی، تو ابراہیم بن اغلب نے ان کی جگہ ایک دوسرے عالِم ابو محرز کو قاضی القضاۃ مقرّر کیا۔ ۲۰۱ھ / ۸۱۶ء میں ابو محمد زیادۃ اللہ بن ابراہیم نے افریقیہ کی عنانِ حکومت سنبھالی، تو افریقیہ کے علماء و مشائخ نے اس کو ترغیب دی کہ وہ اسد بن فُرات کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر مقرّر کرے، کیونکہ وہ علم و فضل کے اعتبار سے ابو محرز پر فوقیت رکھتے ہیں۔ زیادۃ اللہ بڑا بیدار مغز حکمران تھا۔ اس نے علماء و مشائخ کی رائے سے اتفاق تو کیا، لیکن ابو محرز کو سبکدوش کرنا پسند نہ کیا، کیونکہ اُن کا تقرّر خود دولتِ اغالبہ کے بانی ابراہیم بن اغلب نے کیا تھا۔ البتہ اس نے دو سال بعد ۲۰۳ھ / ۸۱۸ء میں اسد بن فرات کو مساوی اختیارات کے ساتھ دوسرا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا اور ابو محرز کو بھی اس عہدے پر بحال رکھا۔ ابو محرز کو قدرتاً قاضی اسد کا تقرّر ناگوار گزرا، تاہم انہیں سلطان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ سات آٹھ سال تک کسی نہ کسی طرح وہ قاضی اسد کے ساتھ مل کر اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔

۲۰۹ھ / ۸۲۴ء میں منصور طنبدی نامی ایک شخص نے زیادۃ اللہ کے خلاف علمِ بغاوت بُلند کیا اور اس کو بیشتر مقبوضات سے محروم کر کے دارالحکومت قیروان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے آغازِ حکومت میں قاضی ابو محرز اور قاضی اسد دونوں اس کے دربار میں گئے۔ اُس وقت بہت سے فوجی افسر اور اکابرِ حکومت بھی منصور کی خدمت

میں حاضر تھے۔ منصور نے اُن کے سامنے زیادۃ اللہ کو ظالم ٹھہرایا اور کئی ظالمانہ کارروائیاں اُس سے منسوب کیں۔ ابو محرز نے بر بنائے مصلحت اُس کی ہاں میں ہاں ملائی، لیکن اُن کے برعکس قاضی اسدؒ نے منصور کی باتوں کو غلط قرار دیا اور اس کو ظالم ٹھہرایا۔ اس پر ایک فوجی افسر شمشیر برہنہ سونت کر اُن کے سر پر کھڑا ہو گیا، مگر کچھ دانا آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا اور دونوں قاضیوں کو واپس بھیج دیا۔ ۲۱۱ھ/۸۲۶ء میں زیادۃ اللہ کا ستارۂ اقبال پھر چمکا اور وہ منصور کو شکست دے کر حسب سابق قیروان پر قابض ہو گیا۔ جب اُسے منصور کے دربار میں ابو محرز اور قاضی اسد کی گفتگو کا علم ہوا، تو اس نے ابو محرز کو عہدۂ قضا سے سبکدوش کر دیا۔ اب قاضی اسدؒ بن فرات تنہا حکومتِ اغالبہ کے قاضی القضاۃ تھے۔

(۴)

اغالبہ کا دورِ حکومت (۱۸۴ھ/۸۰۰ء تا ۲۹۶ھ/۹۰۸ء) تاریخ اسلام کا ایک سنہری باب ہے۔ اس خاندان کے بیشتر حکمران بڑے جیوٹ اور بیدار مغز تھے۔ وہ اگرچہ رسمی طور پر خلافتِ عباسیہ کے ماتحت تھے، لیکن فی الحقیقت بالکل خود مختار۔ اُن کی بحری قوت اتنی زبردست تھی کہ بڑی بڑی یورپی حکومتوں کے بحری بیڑے اس کے سامنے خم کھاتے تھے۔ ایک سو گیارہ سال کے عرصے میں اغالبہ تمام شمالی افریقہ پر چھا گئے اور اُن کے حدودِ حکومت سواحلِ بحیرۂ روم کا احاطہ کرتے ہوئے حدودِ مصر تک جا پہنچے۔ اغالبہ کو اپنے عہدِ حکومت کے آغاز ہی میں سسلی (صقلیہ) کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً دس ہزار مربع میل پر محیط بحیرۂ روم کا یہ جزیرہ اپنی وُسعت، زرخیزی اور افریقی و یورپی سواحل سے قربت کی بناء پر بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس پر بزنطینی حکومت (حکومتِ روم شرقی) کا تسلط تھا۔ سسلی کے رومی غارت گر آئے دن شمالی افریقہ کے ساحلوں پر چھاپے مارتے اور مسلمانوں کے بحری جہازوں پر بھی حملے کرتے رہتے۔ اُن کے جواب میں مسلمانوں کے بحری بیڑے بھی وقتاً فوقتاً اُن پر حملہ آور ہوتے اور سردانیہ اور کارسیکا تک پہنچ جاتے۔ غرض ان جھڑپوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مطابق دوسرے اغلبی فرمانروا عبد اللہ بن

ابراہیم اور سسلی کی عیسائی حکومت کے درمیان ۱۹۸ھ ۸۱۳ء میں دس برس کے لیے معاہدۂ صلح ہو گیا۔ اس کی رُو سے قرار پایا کہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے پر حملے کرنے سے باز رہیں گی اور اگر سسلی میں کوئی مسلمان قیدی پہنچ جائے تو اُسے فوراً اغلبی حکومت کو لوٹا دیا جائے گا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ دس سال سے زیادہ مدت کے لیے تھا یا کم از کم اس میں یہ شق ضرور موجود تھی کہ اگر اس معاہدے پر دس برس تک کامیابی سے عمل ہوا، تو سمجھا جائے گا کہ اس میں خود بخود توسیع ہو گئی ہے۔

ابنِ خلدون، ابنِ اثیر اور بعض دوسرے عرب مؤرخین نے لکھا ہے کہ تیسرے اغلبی حکمران زیادۃ اللہ کے دورِ حکومت میں رومیوں نے نہایت بے حیائی سے یہ معاہدہ توڑ دیا اور سسلی کے ایک فوجی سردار فیمی AUPHAMIUS نے ۲۱۱ھ ۸۲۶ء میں ایک طاقتور بحری بیڑے کے ساتھ شمالی افریقہ کے ساحل پر حملہ کر دیا۔ اس نے کئی ساحلی شہروں کو اپنی غارت گری کا نشانہ بنایا۔ بہت سے مسلمان تاجروں کو قیدی بنا لیا اور ایک مدت تک افریقہ میں مقیم رہا۔ زیادۃ اللہ اس زمانے میں منصور طنبدی کی شورش رفع کرنے میں مشغول تھا اس لیے رومیوں کی شرارتوں کا سدِباب نہ کر سکا۔ ستم بر ستم یہ کہ سسلی کے رومی طالع آزماؤں نے بحیرۂ روم میں مسلمان تاجروں کے بحری جہازوں پر بھی چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ وہ جہازوں کو لوٹ لیتے اور مسافروں کو قیدی بنا کر سسلی لے جاتے۔ اُسی پُرآشوب دَور میں ایک ایسا دردناک واقعہ پیش آیا جس نے افریقی مسلمانوں کا پیمانۂ صبر و ضبط لبریز کر دیا۔ یہ واقعہ ایک عظیم المرتبت سِن رسیدہ عالمِ دین شیخ زید بن محمد جحمی کی شہادت کا تھا۔ وہ ۲۱۲ھ ۸۲۷ء میں افریقہ سے مسلمانوں کے ایک بیڑے کے ساتھ طلیطلہ جا رہے تھے کہ سسلی کے رومی بیڑے نے اسلامی جہازوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا لیکن رُومیوں کی تعداد کے سامنے اُن کی جمعیت بہت مختصر تھی۔ سب ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ اُن میں شیخ جحمی بھی تھے۔ افریقی مسلمانوں نے اُن کی شہادت بڑی شدت سے محسوس کی اور اس سنگین صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ اُدھر زیادۃ اللہ بھی اپنے اندرونی جھگڑوں سے فارغ ہو چکا تھا اور سسلی کے رومیوں کی شرارتوں کا سدِباب کرنے

کی تدبیروں پر غور کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ وہی فیمی جس نے ۲۱۱ھ / ۸۲۶ء میں افریقیہ کے ساحلی شہروں کو تاخت و تاراج کیا تھا، شہنشاہِ قسطنطنیہ سے باغی ہو کر اپنی فوج کے ہمراہ شمالی افریقیہ آ گیا۔ اس نے زیادۃ اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی گزشتہ حرکتوں پر ندامت کا اظہار کیا اور اس کو سسلی پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ بعض مؤرخین نے فیمی کے اس طرزِ عمل کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ وہ ایک خوبصورت راہبہ کے دامِ اُلفت میں گرفتار ہو گیا تھا اور اُسے گرجے سے لے اڑا تھا۔ رومی شہنشاہ میکائل ثانی کو اُس کی اس حرکت کا علم ہوا، تو اُس نے فیمی کی ناک (یا بروایتِ دیگر زبان) کاٹ دینے کا حکم دیا۔ فیمی کو شہنشاہ کے حکم کی اطلاع ملی، تو اس نے اپنی حامی فوج کے ہمراہ سسلی کے دارالحکومت سرقوسہ (سیراکوز) پر حملہ کر دیا اور قسطنطین گورنرِ سسلی کو شکست دے کر سرقوسہ پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے سسلی کے دوسرے شہروں کو بھی مطیع کر لیا اور شاہِ سسلی کا لقب اختیار کر کے خود مختار حکومت قائم کر لی، لیکن یہ حکومت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ فیمی کے ایک گورنر بلاطہ نامی نے عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس کی امداد کے لیے شہنشاہِ قسطنطنیہ نے بھی ایک زبردست فوج بھیج دی۔ فیمی شاہی فوج کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس کے لشکر کا بہت سا حصہ لڑائی میں کام آیا اور وہ شکست کھا کر باقی ماندہ فوج کے ساتھ افریقیہ آ گیا۔ دربارِ قیروان میں پہنچ کر فیمی نے زیادۃ اللہ سے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ سسلی کی حکمرانی سے کوئی سروکار نہ رکھے گا اور صرف بلاطہ سے انتقام لینے کی خاطر مسلمانوں سے تعاون کرے گا۔

فیمی کی تحریک نے زیادۃ اللہ کو سسلی کا معاملہ بلا تاخیر نپٹانے کا احساس دلایا، چنانچہ اُس نے فوراً مجلسِ مشاورت طلب کی جس میں ممتاز امراء و اکابر کے علاوہ ملک کے بڑے بڑے فقہا اور علماء بھی شامل تھے۔ زیادۃ اللہ نے یہ مسئلہ مجلس کے سامنے رکھا، تو اُس کے ارکان دو فریقوں میں بٹ گئے۔ ایک فریق کی رائے یہ تھی کہ حکومتِ سسلی کے ساتھ معاہدۂ صلح ابھی تک قائم ہے اور اس کی تنسیخ کے لیے جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ ثبوت کی محتاج ہیں۔

دوسرے فریق کا موقف یہ تھا کہ رومیوں کے نقضِ عہد کی وجہ سے معاہدۂ صلح کالعدم ہو چکا ہے اور اب ہم اس کے پابند نہیں رہے۔

قاضی ابو محرز پہلے فریق کی جانب تھے اور قاضی اسدؒ بن فرات دوسرے کی طرف۔ اس سلسلے میں زیادۃ اللہ کے سامنے اُن دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

ابو محرز: امیر (زیادۃ اللہ) کا یہ بیان کہ رومیوں نے معاہدے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں، تحقیق اور گہرے غور کا محتاج ہے۔

قاضی اسدؒ: یہ تحقیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ ہم رومی قاصدوں سے دریافت کریں کہ سسلی میں مسلمان قیدی ہیں یا نہیں۔ (یہ قاصد سسلی کے رومی گورنر نے زیادۃ اللہ کو یہ پیغام دے کر بھیجے تھے کہ فیمی کی مدد نہ کی جائے)

ابو محرز: اس معاملے میں ایلچیوں کے بیان پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

قاضی اسدؒ: یہ ایلچی ہی تھے جن کی وساطت سے معاہدہ ہوا تھا اُن سے کیوں صرفِ نظر کیا جائے؟

اس گفتگو کے بعد زیادۃ اللہ نے رومی قاصدوں سے حقیقتِ حال دریافت کی تو انہوں نے تصدیق کی کہ فی الواقع بہت سے مسلمان سسلی میں مقید ہیں۔ اُن کے اسی بیان کی بنیاد پر زیادۃ اللہ نے رُومیوں کو فسخِ معاہدہ کا مرتکب قرار دیا اور سسلی پر لشکر کشی کا اعلان کر دیا۔

اب مجلسِ مشاورت میں یہ سوال پیدا ہوا کہ سسلی کو فتح کرنے کے بعد کیا کیا جائے؟ مسلمان رُومی حکومت پر خراج عائد کر کے واپس آجائیں یا وہاں مستقل اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ مجلس نے کثرتِ رائے سے یہ فیصلہ صادر کیا کہ فتح کے بعد سسلی میں مستقل اسلامی حکومت قائم کی جائے۔

اس فیصلے کے بعد زیادۃ اللہ نے اپنا بحری بیڑا ازسرِنو منظم کیا اور زور شور سے سسلی پر حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے فیمی کو اطلاع بھیج دی کہ وہ سوسہ میں افریقی بیڑے کا انتظار کرے۔

⑤

جب سسلی پر لشکر کشی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں، تو زیادۃ اللہ کے سامنے اس اہم ترین مہم کی قیادت کا مسئلہ آیا۔ بڑے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کام کے لیے قاضی اسدؒ بن فرات ہی موزوں ترین آدمی ہیں، چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ سسلی پر یلغار کرنے والے بحری بیڑے اور لشکر کے سپہ سالار اسدؒ بن فرات ہوں گے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیادۃ اللہ کی نظرِ انتخاب قاضی اسد بن فرات پر کیوں پڑی، حالانکہ وہ ستر برس کے پیٹے میں تھے اور ملک کے سب سے بڑے دینی منصب پر فائز تھے۔ مؤرخین نے مختلف توضیحات کی ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ قاضی اسد اس سے پہلے بھی کئی بحری مہموں کی قیادت کر چکے تھے۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں صراحت سے بیان کیا ہے کہ چند سال پہلے قاضی اسد نے قوصرہ فتح کیا تھا۔ (یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جو تیونس اور سسلی کے درمیان واقع تھا) بعض نے یہ قیاس آرائی بھی کی ہے کہ عبداللہ بن ابراہیم اغلبی کے عہدِ حکومت (۱۹۶ھ / ۸۱۱ء تا ۲۰۱ھ / ۸۱۶ء) میں قاضی اسدؒ نے ایک مرتبہ جزیرہ کارسیلکا کو بھی ہنگامی طور پر فتح کیا تھا۔ چنانچہ بحری مہموں میں اپنے تجربے کی بنا پر وہ سسلی کی مہم کے قائد منتخب کیے گئے۔

کچھ تذکرہ نگار اس طرف گئے ہیں کہ قاضی اسدؒ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اگرچہ علم کی تحصیل اور اشاعت میں گزارا تھا، لیکن ان کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا اور ان کے مزاج میں عسکریت اس حد تک موجود تھی کہ وہ بڑے نڈر اور جی دار آدمی تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سپاہی باپ نے انہیں سپاہیانہ فنون سے بھی ضرور آراستہ کیا ہو گا۔

"اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ" میں ان کے انتخاب کے بارے میں یہ قیاس آرائی کی گئی ہے:

> "ان (اسد) کے جذباتی معتقدات اور شاید ان کی مخاصمت پسند قوتِ عمل ان کے امیر مقرر کر دیے جانے کا باعث بن گئی، یعنی انہیں اس مہم کا قائد بنا دیا گیا جو ۲۱۲ھ / ۸۲۷ء میں بوزنطی صقلیہ پر حملے کی غرض سے سوس سے روانہ ہوئی۔"

جہاں تک قاضی اسد کے معمر ہونے کا سوال ہے، تو تمام مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ بڑے نیک سیرت، پاکباز اور ارکانِ اسلام کی پابندی کرنے والے تھے۔ اس لیے ستر برس کی عمر میں بھی بڑے صحت مند اور توانا تھے، اور اس مہم کی قیادت کرنے کے پوری طرح اہل۔

قاضی اسدؒ کو جب زیادۃ اللہ کے فیصلے کا علم ہوا، تو وہ اس بارِ گراں کو اٹھانے میں کچھ متذبذب ہوئے اور سلطان کے پاس جاکر کہا: "مجھے قاضی القضاۃ کے دینی منصب سے الگ کر کے لشکر کا امیر کیوں بنایا جا رہا ہے؟" زیادۃ اللہ نے جواب دیا: "آپ قضا کے منصب پر بھی فائز رہیں گے اور لشکر کے قائد بھی ہوں گے۔ آئندہ آپ کو "قاضی امیر" سے خطاب کیا جائے گا۔" اس کے بعد اس نے منصبِ قضا اور امارتِ لشکر کا تحریری فرمان لکھ کر اسدؒ بن فرات کے حوالے کیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ قاضی اسدؒ بن فرات افریقہ میں پہلے شخص تھے — جو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) اور امارتِ فوج (سپہ سالار) جیسے بلند اور اہم عہدوں پر بیک وقت فائز ہوئے۔

قاضی اسدؒ کی قیادت میں جانے والی یہ مہم کوئی چھوٹے موٹے فوجی دستوں پر مشتمل نہ تھی، بلکہ اس میں نو سو سوار اور دس ہزار پیادے، جہاز رانوں کے علاوہ شریک تھے۔ علمائے اور صوفیہ کو قاضی اسدؒ بن فرات کی امارتِ فوج کا علم ہوا، تو وہ بھی اُن کی قیادت میں شریکِ جہاد ہونے کے لیے بے تاب ہو گئے اور اُن کی ایک کثیر تعداد اپنے حجروں اور خانقاہوں سے نکل کر لشکرِ اسلام میں شامل ہو گئی۔ لشکر کی روانگی کا دن آیا، تو امیر زیادۃ اللہ سمیت تمام شہر اس کی مشایعت کے لیے اُمڈ آیا۔ یہ سب لوگ بڑے جوش و خروش سے تکبیر کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ اس لشکر کی پہلی منزل افریقیہ کا ساحلی شہر سوسہ تھی۔ اسی بندرگاہ میں سو جنگی جہازوں پر مشتمل مسلمانوں کا بحری بیڑا تیار کھڑا تھا۔ قاضی اسد اپنا لشکر لے کر جہازوں پر سوار ہوئے، تو اعیانِ حکومت اور عوام نے انہیں بڑے پُرجوش انداز میں تکبیر کے نعروں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ اس وقت قاضی اسد رحمۃ

جہاز پر آئے اور ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا جس میں اُنہوں نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! میرے آباؤ اجداد میں سے کبھی کوئی امارت کے منصب پر فائز نہیں ہُوا۔ اگر آج مجھے یہ بلند عہدہ ملا ہے، تو صرف اس لیے کہ میں نے اپنی زندگی علم کی تحصیل اور اشاعت میں کھپا دی۔ گویا میری یہ عزت محض علم کی مرہونِ منت ہے، اس لیے میں تم کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ علم کے حصول میں اپنی جانیں لڑا دو۔ اگر اس میں مصائب اور تکالیف کا سامنا ہو، تو ان کا جرأت اور ہمت سے مقابلہ کرو۔ یہی بات دین اور دنیا میں تمہاری سرفرازی کا باعث ہو گی۔"

قاضی اسدؒ کی الوداعی تقریر کے بعد ۱۵ ربیع الاول ۲۱۲ھ (۸۲۷ء) کو جہازوں نے لنگر اٹھایا اور اپنے جیالے سواروں کو لے کر سسلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ فیمی بھی اپنے جہازوں اور فوج کے ساتھ اسلامی بیڑے کے پیچھے ہو لیا۔

ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ اسلامی بیڑا تین دن کے بعد سسلی (صقلیہ) کے ساحلی شہر مازر (MAZZARA) کے قریب لنگر انداز ہوا اور اسلامی لشکر نے جہازوں سے اتر کر کسی مزاحمت کے بغیر مازر پر قبضہ کر لیا۔ یہاں دو چار دن قیام کے بعد قاضی اسدؒ نے ابوذکی کنانی کو مازر کا گورنر مقرر کیا اور خود فوج کو لے کر مرج کی طرف بڑھے جہاں رومیوں کا ایک زبردست لشکر بلاطہ کی قیادت میں مسلمانوں کے مقابلے کے لیے جمع تھا۔ یہ لشکر ڈیڑھ لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ اس میں بلاطہ کی اپنی فوج کے علاوہ قسطنطنیہ اور وینس کی فوجیں بھی شامل تھیں جو ان ملکوں کی حکومتوں نے کمک کے طور پر سسلی بھیجی تھیں۔ اس کثیر التعداد متحدہ لشکر کے مقابلے میں قاضی اسد بن فرات کے پاس کل دس ہزار سوار اور پیادے تھے، کیونکہ انہوں نے کچھ فوج مازر میں چھوڑ دی تھی۔ اس موقع پر فیمی بھی اپنی فوج کے ساتھ موجود تھا، لیکن رومیوں کا عظیم الشان لشکر دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گیا اور مسلمانوں کی مختصر سی جمعیت کا ساتھ دینے میں اُس کو اپنی بربادی نظر آئی، تاہم اس نے بادل نخواستہ قاضی اسد بن [illegible] ادان پیش کیا۔ قاضی اسد بڑے مدبر اور دوراندیش تھے۔ انہوں

نے اس نازک صورتِ حال میں فیمی پر اعتماد کرنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ عین معرکۂ کارزار میں اُس کی غداری مسلمانوں کے لیے تباہ کُن ہو سکتی تھی؛ چنانچہ فیمی سے صاف کہہ دیا کہ اُنھیں اُس سے مدد لینے کی ضرورت نہیں، مجاہدینِ اسلام خود ہی رومی لشکر سے نبرد آزما ہوں گے اور اس دوران میں فیمی اور اُس کے سپاہی اپنے خیموں میں مقیم رہیں گے۔ اس کے بعد قاضی اسد نے اپنی فوج کو لڑائی کے لیے تیار ہونے کا حکم دے دیا۔

(۶)

مقام مرج میں جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں، تو قاضی اسدؒ نے بڑے عمدہ طریقے سے اپنی فوج کی صفیں مرتب کیں اور پھر عَلَم اپنے ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے۔ اس وقت اُن کا چہرہ جوشِ جہاد سے تمتما رہا تھا اور وہ سورۂ یٰسین کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو انھوں نے اپنے لشکر کے سامنے ایک پُر زور خطبہ دیا جس میں جہاد کے فضائل بیان کیے اور رومیوں کو بھگوڑے اور نامراد قرار دیا۔ ان کی ولولہ انگیز تقریر نے مسلمانوں کے دلوں میں شوقِ شہادت تیز تر کر دیا اور وہ اپنے جیوٹ امیر کے پیچھے پیچھے رجز پڑھتے ہوئے مردانہ وار رُومیوں پر ٹوٹ پڑے۔ رومی لشکر بھی آزمودہ کار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کا حملہ بڑی پامردی سے روکا، لیکن مسلمانوں کا جوش کم ہونے میں آیا نہ حملے کی شدت میں کمی آئی۔ یہاں تک کہ رومیوں کی صفیں بے ترتیب ہو گئیں۔ اب انھوں نے پُوری قوت سے مسلمانوں کے اس دستۂ فوج پر حملہ کیا جس میں قاضی اسدؒ دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ قاضی اسدؒ اور ان کے ساتھیوں نے رومیوں کو منہ توڑ جواب دے کر پیچھے ہٹا دیا، لیکن وہ بار بار اُن پر حملے کرتے تھے۔ قاضی اسدؒ ان حملوں میں زخم پہ زخم کھاتے رہے یہاں تک کہ اُن کے جس ہاتھ میں جھنڈا تھا وہ بھی زخمی ہو گیا، لیکن انھوں نے ایک لحظے کے لیے بھی پرچمِ اسلام سرنگوں نہ ہونے دیا۔ ضعیف العمر قاضی اسدؒ کی شجاعت اور پامردی نے مسلمانوں کے حوصلے دو چند کر دیئے۔ انھوں نے رومیوں پر ایسا بلا خیز حملہ کیا کہ ان کی صفیں درہم برہم ہو

گئیں اور وہ اپنے ہزاروں آدمی کٹوا کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ مسلمانوں کے ہاتھ بے شمار مالِ غنیمت آیا جس میں کثیر مقدار میں سامانِ رسد، لاتعداد مولیشی اور بہت سے قیدی بھی تھے۔ مسلمانوں کی یہ عظیم الشان فتح سسلی میں اسلامی حکومت کے قیام کی تمہید تھی۔ اس میں قاضی اسد بن فرات نے جو نمایاں کردار ادا کیا اس کی بنا پر عرب مؤرخین نے انہیں بجا طور پر فاتحِ صقلیہ (سسلی) کا خطاب دیا جو آج تک اُن کے نام کا لازمہ ہے۔ اس فتح کی خبر زیادۃ اللہ کو بھیجی گئی، تو اُس نے بے پایاں مسرت کا اظہار کیا اور خلیفہ مامون الرشید کو بھی اس کی اطلاع بھیجی۔ بغداد اس وقت سیاسی لحاظ سے عالمِ اسلام کا مرکز تھا۔ وہاں سے یہ خبر دنیا بھر کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور اُن کے لیے شادمانی کا باعث ہوئی۔

مرج کی فتح کے بعد قاضی اسدؒ نے آگے بڑھ کر اندرونِ سسلی کے متعدد قلعوں پر قبضہ کر لیا اور پھر وہ یلغار کرتے ہوئے سسلی کے دارالحکومت سرقوسہ (SYRACUSE) کے حفاظتی قلعے الکرات (کلاٹا جیرونی) تک جا پہنچے۔ الکرات کے باشندوں کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ اپنے پادریوں کی سرکردگی میں قلعے سے نکل کر قاضی اسدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر امان کے طالب ہوئے۔ قاضی اسد نے اُن کے سامنے جزیے کی شرط پیش کی جسے اُنہوں نے قبول کر لیا اور یوں مسلمانوں اور اہلِ کرات کے درمیان صلح کا معاہدہ طے پا گیا۔ اس موقع پر فیمی نے غداری کی، کیونکہ وہ اس جزیرے میں مسلمانوں کی فاتحانہ پیشقدمی سے خائف ہو گیا تھا۔ اس نے درپردہ اہلِ کرات کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا اور لڑائی کی ترغیب دی۔ اہلِ کرات نے اُس کا مشورہ قبول کر لیا اور زور شور سے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ قاضی اسدؒ کو اہلِ کرات کی بدعہدی کی اطلاع ملی، تو انہوں نے کرات کا محاصرہ کر لیا اور جزیرے کے اطراف میں فوجی دستے پھیلا دیئے، پھر سرقوسہ کے آس پاس کا علاقہ فتح کر کے صدر مقام کی طرف پیشقدمی کی اور خشکی اور سمندر دونوں طرف سے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اثنائے محاصرہ میں افریقیہ سے امدادی فوج بھی پہنچ گئی جس سے مسلمانوں کو اطمینان ہو گیا، لیکن اُن کا یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا، کیونکہ جلد ہی بلرم (پلیرمو)

سے رومی فوج اہل سرقوسہ کی امداد کے لیے آ پہنچی اور اسلامی لشکر کے جس حصے نے خشکی کی طرف سے سرقوسہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اس کو پشت کی طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ قاضی اسدؒ اس خطرناک صورتِ حال سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ انہوں نے اپنے لشکر کے اردگرد ایک وسیع خندق کھدوائی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک بہت بڑی کھائی تیار کرائی۔ یوں اسلامی لشکر حملہ آوروں کی براہ راست زد میں آنے سے بچ گیا۔ اُن لوگوں نے کئی مرتبہ خندق اور کھائی عبور کرنے کی کوشش کی، لیکن مسلمانوں نے ہر مرتبہ بے پناہ تیر باری کر کے اُن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ آخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ قاضی اسدؒ نے اب شہر کا محاصرہ اور سخت کر دیا یہاں تک کہ اہل سرقوسہ صلح پر آمادہ ہو گئے لیکن اسلامی لشکر کے بیشتر افسروں نے اُن سے صلح کرنے کی مخالفت کی۔ چنانچہ محاصرہ طول پکڑ گیا۔ اس دوران میں محصورین اور محاصرین دونوں رسد کی کمی اور حالتِ جنگ کے تسلسل سے سخت مشکلات میں مبتلا ہو گئے، لیکن قاضی اسدؒ بڑے بلند حوصلہ اور مستقل مزاج آدمی تھے وہ ان مشکلات کو خاطر میں نہ لائے اور مسلمانوں کو آخری دم تک ڈٹے رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ تاہم اُن کی تلقین کے باوجود مسلمانوں کی ایک جماعت اس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو گئی اور اُس نے ابویحییٰ احمد بن قادم کے ذریعے قاضی اسدؒ سے محاصرہ اٹھا لینے اور افریقیہ کو مراجعت کا مطالبہ کیا۔ ابویحییٰ احمد ایک ممتاز عالم دین تھے اور مالکی اور حنفی فقہ دونوں پر عبور رکھتے تھے۔ وہ اسلامی لشکر کے ساتھ سسلی آئے تھے اور کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ بدقسمتی سے وہ محاصرے کی سختیوں سے گھبرا گئے اور قاضی اسدؒ سے ایسا مطالبہ کر بیٹھے جس نے اُنہیں امتحان میں ڈال دیا۔ یہ مطالبہ ماننے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان اب تک سسلی میں اپنی سرفروشی کی بدولت جو کامیابیاں حاصل کر چکے تھے اُن سب پر پانی پھیر ڈالا جائے۔ قاضی اسدؒ کسی صورت میں بھی اپنی مہم کو اس انجام تک نہ پہنچانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ابویحییٰ کو جواب دیا: ”میں مسلمانوں کی عسکری قوت کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ موجودہ حالات افریقیہ کو مراجعت کا جواز نہیں بن سکتے۔ بفضلِ خدا ابھی اسلامی لشکر خیر و برکت سے محروم نہیں ہوا۔“

اسدؒ کے اس جواب سے ابویحییٰ اور اُن کے ہمنواؤں کی تشفی نہ ہوئی اور وہ بدستور اپنے مطالبے پر اڑے رہے۔ اُدھر قاضی اسدؒ بھی اُصول کے معاملے میں جھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ انہوں نے کھُلے لفظوں میں ابویحییٰ اور اُن کے ساتھیوں کو تنبیہ کی کہ اگر تم نے اپنی ضد ترک نہ کی، تو میں جہازوں کو جلوا دوں گا اور پھر یہ دیکھوں گا کہ تم یہاں سے کیسے بھاگتے ہو۔ ابویحییٰ اگرچہ قاضی اسدؒ کے شاگرد اور ماتحت تھے، لیکن انہوں نے بے جا ہٹ دھرمی سے کام لیا اور قاضی اسدؒ کی تنبیہ کے جواب میں گستاخانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ صاحب ''معالم الایمان'' کا بیان ہے کہ جب ابویحییٰ نے اپنے جواب میں یہ الفاظ کہے:

''اس سے بہت چھوٹے معاملے پر عثمانؓ بن عفان قتل کر دیئے گئے تھے۔''

تو قاضی اسدؒ کا حلم و تحمل قہر و غضب میں بدل گیا اور انہوں نے ایک سخت گیر فوجی جرنیل کی حیثیت اختیار کر لی، کیونکہ ابویحییٰ کا اٹھایا ہوا فتنہ تمام فوج میں بے چینی اور شورش پیدا کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ابویحییٰ کو فوراً گرفتار کرنے اور نظم و ضبط توڑنے کے جرم میں انہیں کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ اُن کے حکم کی تعمیل میں ابویحییٰ گرفتار کر لیے گئے، لیکن جب اُنہیں سزائے تازیانہ دی جانے لگی، تو قاضی اسدؒ کو اُن کے علمی مرتبے کا خیال آ گیا اور انہوں نے ہدایت کی کہ صرف چند تازیانے آہستہ آہستہ لگائے جائیں۔ ابویحییٰ کے لیے یہی سرزنش کافی ثابت ہوئی۔ وہ اور اُن کے ہمنوا اپنے مطالبے سے دست بردار ہو گئے۔ اس طرح یہ فتنہ، جو مہلک ثابت ہو سکتا تھا، قاضی اسدؒ نے اپنے عزم و قوت سے دبا کر ختم کر دیا۔

غرض سرقوسہ کا محاصرہ مسلسل جاری رہا۔ اس دوران میں اہل سرقوسہ اور مسلمانوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دفعہ اسی قسم کی ایک جھڑپ میں قاضی اسدؒ بن فرات بھی شدید زخمی ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر عین میدانِ جہاد میں ملکِ بقا کی طرف سدھار گئے۔ یہ سانحہ ربیع الآخر (۲۱۳ھ / ۸۲۸ء) کی کسی تاریخ کو پیش آیا اور سرزمین سسلی کو اُن کا مدفن بننے کا شرف حاصل ہُوا۔ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ اثنائے محاصرہ میں اسلامی لشکر میں وبا پھیل گئی اور قاضی اسدؒ نے اُسی وبا میں انتقال کیا، لیکن اس معاملے

میں ابنِ اثیرؒ کو تسامح ہوا ہے، کیونکہ دوسرے تمام ثقہ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ قاضی اسدؒ نے اُن سخت زخموں سے وفات پائی جو انھیں محاصرۂ سرقوسہ میں لگے تھے۔ اسلامی لشکر میں وبا اُن کی وفات کے بعد پھیلی تھی۔

قاضی اسد بن فراتؒ کی وفات کی خبر اہلِ افریقیہ پر بجلی بن کر گری اور ہر شخص فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا۔ امیر زیادۃ اللہ کو تو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اُس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس نے اس بزرگ صاحبِ علم اور صاحبِ سیف کی یاد تازہ رکھنے کے لیے قیروان میں ایک مسجد تعمیر کروائی جس کی پیشانی پر "اسد بن فرات" کے الفاظ کندہ کرائے۔

سسلی میں، قاضی اسد بن فراتؒ کا زمانۂ امارت صرف ایک سال اور کچھ دنوں پر محیط ہے، لیکن اس مختصر عرصے میں اس عظیم المرتبت فقیہہ، قاضی اور بہادر قائد و امیر البحر نے جس طرح جنگی بیڑوں کی قیادت کر کے فتوحات کا سکہ جمایا، وہ ابدالآباد تک اُن کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے صرف دس ہزار مجاہدوں کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ رومیوں کے ٹڈی دَل کو شکستِ فاش دی اور مازر کو دارالحکومت بنا کر جس (مسلم) حکومت کی داغ بیل ڈالی وہ بعد میں سارے سسلی پر قابض ہوئی اور تین صدیوں تک تہذیب و علوم کا گہوارہ بنی رہی۔ قاضی اسد بن فراتؒ نے اپنے عزم و ہمت اور شجاعت و بسالت کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے۔ ان کی آب و تاب آج بھی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ یورپ جاتے ہوئے سسلی سے گزرے، تو اس پر غیروں کی حکومت دیکھ کر ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اُنھیں تین صدیوں پر محیط مسلمانوں کا وہ بابرکت دورِ حکومت یاد آ گیا جس کی بنیاد قاضی اسد بن فرات نے رکھی تھی اور اُن کے جذبات نے ان اشعار کی صورت اختیار کر لی ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ

امام ابوبکر محمد بن ابی سہل احمد السرخسیؒ معروف بہ شمس الائمہ سرخسیؒ کا شمار پانچویں صدی ہجری کے سر آمدِ روزگار حنفی فقہا میں ہوتا ہے۔ اکثر اربابِ سیر نے ان کو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے نامور تلامذہ قاضی ابویوسفؒ اور امام محمد شیبانیؒ (صاحبین) کے بعد تمام فقہاء احناف سے برتر قرار دیا ہے۔ یہ درجہ علمی قابلیت کے لحاظ سے ہے ورنہ علمی پیداوار کے لحاظ سے وہ شاید سب فقہائے احناف سے آگے ہیں۔ ان کی صرف "کتاب المبسوط" ہی تیس جلدوں میں بڑی تقطیع کے چھ ہزار تین سو پینتیس (۶۳۳۵) صفحات پر محیط ہے اس کے علاوہ دوسری کئی تصانیف بھی ہیں۔ علامہ شہاب بن فضل اللہ العمریؒ نے شمس الائمہ سرخسیؒ کو اپنی کتاب "مسالک الابصار" میں "ماہِ تمام"، "فقیہ" اصولی، متکلم، مناظر اور "صدر نشین بزمِ علم" کے القاب سے یاد کیا ہے۔ علامہ عبدالقادر القرشیؒ صاحب الجواہر المضیہ نے انہیں سند، حجت اور اپنے دور کا سب سے زیادہ صاحبِ نظر عالم قرار دیا ہے۔

مولانا عبدالحئی لکھنوی نے مقدمۃ الہدایہ میں اور مولانا فقیر محمد جہلمیؒ نے حدائق الحنفیہ میں امام سرخسیؒ کا سالِ ولادت ۴۰۰ھ ۱۰-۱۰۰۹ء لکھا ہے۔ وہ خراسان کے قدیم شہر سرخس میں پیدا ہوئے جو مشہد اور مرو کے درمیان دریائے ہری رود پر واقع ہے۔ دس سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ تجارت کے سلسلہ میں بغداد آئے۔ وہاں سے بخارا گئے جہاں شمس الائمہ عبدالعزیز بن احمد حلوانی کی درسگاہ مرجعِ انام تھی۔ امام سرخسیؒ سالہا سال تک اسی درس گاہ میں شمس الائمہ حلوانی کے زیرِ تربیت رہے یہاں تک کہ جملہ علوم و فنون میں درجۂ کمال پر پہنچ گئے۔ وہاں سے فارغ التحصیل

ہو کر نکلے تو ان کے تبحّرِ علمی کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ ۴۴۸ھ/1056ء میں استاد کی وفات کے بعد ان کی مسندِ درس پر بیٹھے اور ان کے لقب شمس الائمہ کے بھی وارث قرار پائے کیونکہ شمس الائمہ حلوانیؒ کے شاگردوں میں علمی قابلیت کے اعتبار سے کوئی دوسرا ان کا ہم پایہ نہ تھا۔ فی الحقیقت وہ شمس الائمہ ثانی ہیں لیکن شمس الائمہ کا نام سن کر اہلِ علم کا ذہن امام سرخسیؒ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے جب تک کہ دوسرے صاحبِ لقب کی صراحت نہ ہو۔

چند سال کے اندر اندر شمس الائمہ سرخسیؒ کے کمالاتِ علمی اور اخلاقِ حَسَنہ نے ایک دنیا کو مسخر کر لیا اور طالبانِ علم دنیائے اسلام کے گوشے گوشے سے کھنچ کر ان کی خدمت میں آنے لگے۔ ان کی غیر معمولی ہر دلعزیزی اور مقبولیت بعض لوگوں کو گوارا نہ ہوئی اور وہ حکمرانوں کے کان ان کے خلاف بھرنے لگے یہاں تک کہ مملکتِ بخارا کے ایک قراخانی فرمانروا نے برافروختہ ہو کر انہیں گرفتار کر لیا۔ تذکرہ نگاروں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ کس حکمران نے انہیں گرفتار کیا اور ان کا جرم کیا تھا خود شمس الائمہ سرخسیؒ نے کتاب المبسوط اور بعض دوسری تصنیفات میں اپنی گرفتاری اور قید کے اسباب کی طرف مبہم اشارے کیے ہیں۔ مثلاً بادشاہ کو کلمۂ خیر کی تلقین، زندیق اور بدقماش لوگوں کی بادشاہ کے پاس ان کی جھوٹی چغلی وغیرہ۔ بعض تذکرہ نگاروں نے صرف اتنا کہا ہے کہ امام سرخسیؒ کے عہد کے حکمرانوں نے ان کو حق گوئی کی بناء پر جھوٹا مقدمہ بنا کر قید میں ڈال دیا اور بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس زمانے مالی ابتری پر قابو پانے کے لیے حکومت آئے دن نئے نئے ٹیکس عائد کرتی رہتی تھی جن سے مخلوقِ خدا سخت پریشان ہو گئی تھی۔ شمس الائمہ سرخسیؒ نے ان ٹیکسوں کے خلاف آواز بلند کی اور ان کو ناجائز قرار دے کر لوگوں سے کہا کہ ان کی ادائیگی واجب نہیں اس طرح وہ عدم ادائیگی محاصل کی تحریک کے "سرغنہ" قرار پائے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے باقاعدہ کوئی فتویٰ جاری کیا یا نہیں؟ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ کتاب المبسوط (جلد دہم) میں ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت موجود ہے وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے اکثر محصول ناجائز ہیں جو

ان کی مخالفت کرے اور ادا نہ کرے وہ ثواب کا مستحق ہے۔

قراخانی حکمران نے شمس الائمہ سرخسیؒ کو گرفتار کرنے کے بعد بخارا میں رکھنا خطرے سے خالی نہ سمجھا اس لیے اوزکند (اوزجند) کے دور دراز قلعے میں نظربند کر دیا۔ (اوزکند ماوراء النہر میں فرغانہ کے نواح میں واقع ہے) ظالم حکمران نے صرف نظربندی پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ انہیں ایک اندھے کنوئیں (یا کنواں نما تہہ خانے) میں مقید کر دیا۔ اس زمانے میں ایسے قید خانوں میں انتہائی خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ گویا شمس الائمہ سرخسیؒ حکومت وقت کے نزدیک انتہائی خطرناک مجرم تھے! امام موصوفؒ پورے گیارہ برس (اور بروایت دیگر تقریباً بارہ برس) تک نہایت صبر و استقامت کے ساتھ اس خوفناک قید کی مصیبتیں جھیلتے رہے۔ کتاب المبسوط میں انہوں نے اس قید کے بارے میں کسی کسی جگہ سرسری سا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"دنیا کے ایک دور دراز کونے میں مجھے قید کیا گیا ہے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"بیوی بچوں سے ملنے کی ممانعت ہے اور نہ کوئی کتاب منگوانے کی اجازت ہے۔"

ایک مقام پر قید خانہ کو "ملول کرنے اور تھکا دینے والی جگہ" قرار دیا ہے۔

کچھ عرصہ تو امام صاحبؒ کو قید تنہائی میں رکھا گیا اس کے بعد طلبہ کو ان کے کنوئیں (قید خانے) کی جگت (منڈیر) پر جانے کی اجازت مل گئی۔ امام صاحبؒ کا فقید المثال کارنامہ یہ ہے کہ وہ سالہا سال تک کنوئیں کے اندر سے طالبان علم کو درس دیتے رہے جو اس کی منڈیر پر بیٹھ جاتے تھے اور پہرے داروں کی نگرانی میں مظلوم استاد سے مقدور بھر استفاضہ کرتے تھے۔ امام صاحبؒ کو علمی استفسارات اور کتابی مطالب کی تشریح کے سوا کوئی بات کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن ان کی وسعت علم اور قوت حافظہ کا یہ عالم تھا کہ کوئی کتاب پاس نہ ہونے کے باوجود کئی ضخیم کتابیں نہایت صحت اور جامعیت کے ساتھ شاگردوں کو املا کرا دیں۔ ان میں سے شرح المبسوط، شرح السیر الکبیر، اور نکت زیادات الزیادات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ

کتابیں جابجا قرآن و حدیث کے حوالوں سے مملوء ہیں۔ بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اپنی ان مہتم بالشان (امالی) کتابوں کی بدولت شمس الائمہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

بالآخر رحمت الٰہی نے دستگیری کی اور ۲۰ صفر (بروایت دیگر ربیع الاوّل) ۴۸۰ھ (جمعۃ المبارک) کو شمس الائمہ سرخسیؒ کو قید و بند کی طویل مصیبت سے نجات ملی۔ رہائی کے چند دن بعد وہ مرغینان چلے گئے اور وہاں امام سیف الدین بن ابراہیم بن اسحٰق (بعض مخطوطوں کے مطابق سیف الدین الوابراہیم اسحٰق بن اسمٰعیل) کے گھر قیام کیا اور وہیں شرح سیر الکبیر کے باقی حصے کو املا کرایا اور دس دن میں اس کو مکمل کر دیا۔ قیام مرغینان کے دوران میں ہی امام سرخسیؒ نے اپنا وہ مشہور فتویٰ صادر کیا جس کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ اسی فتویٰ کی بناء پر وہ معتوب اور مقید ہوئے تھے حالانکہ یہ فتویٰ انہوں نے قید سے رہائی کے بعد دیا تھا اور والیٔ مرغینان (امیر البلد) یہ فتویٰ دیکھ کر خفا ہونے کے بجائے ان کے تبحرِ علمی کا معترف ہو گیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ والیٔ مرغینان نے اپنی اُمِ ولد لونڈیوں (وہ لونڈیاں جن کی اولاد ہو) کا اپنے خادمانِ خاص سے نکاح پڑھوا دیا تھا۔ امام سرخسیؒ نے فتویٰ دیا کہ نکاح سے قبل ان لونڈیوں کو آزاد کرنا ضروری تھا۔ والیٔ مرغینان نے اس فتویٰ کے مطابق لونڈیوں کو آزاد کر دیا اور فوراً نکاحوں کی تجدید کرائی۔

طویل قید و بند نے امام سرخسیؒ کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ کبر سنی کے عوارض اور قید کے مصائب نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ رہائی کے بعد صرف تین سال آزادی کی فضا میں سانس لینا نصیب ہوا اور ۴۸۳ھ میں تراسی سال کی عمر میں یہ آفتاب فضل و کمال ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے اپنی گرانقدر تصنیفات کے علاوہ بہت سے نامور شاگردوں کی ایک جماعت یادگار چھوڑی جنہوں نے ان کے کاموں کو آگے بڑھایا اور ان کے فیوض و برکات کو آئندہ نسلوں تک پہنچایا۔

شمس الائمہ سرخسیؒ کے علمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت سے آج تک تمام فقہائے احناف انہی کے خوشہ چیں ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱) شرح کتاب المبسوط (تیس جلدیں۔ ۶۳۳۵ صفحات) یہ کتاب الحاکم الشہید ابو الفضل محمد بن احمد المروزیؒ کی کتاب "المختصر الکافی" کی شرح ہے اور "المختصر الکافی" امام محمد شیبانیؒ (تلمیذ امام ابو حنیفہؒ) کی "کتاب المبسوط" کا خلاصہ ہے جس میں انہوں نے تکرار کو حذف کر کے طلبہ کے لیے سہولت پیدا کی۔

(۲) شرح سیر الکبیر (۳) نُکَت زیادات الزیادات (۴) اصول الفقہ۔

(۵) شرح الجامع الکبیر (۶) شرح الجامع الصغیر (۷) شرح مختصر الطحاوی۔

(۸) اشراط الساعۃ و مقامات القیامۃ (۹) شرح کتاب النفقات للخصّاف،

(۱۰) شرح ادب القاضی للخصّاف ۱۱۔ الفوائد

ان میں سے پہلی چار کتابیں چھپ چکی ہیں۔ باقی میں سے بعض کے مخطوطے مل چکے ہیں اور بعض کی تلاش جاری ہے۔

شمس الائمہ سرخسیؒ نے اپنی تصانیف میں جو مسئلہ بھی بیان کیا ہے، اس کے حکم کی دلیل بھی بیان کر دی ہے۔ انہوں نے جا بجا اپنے ملک اور اپنے زمانے کے حالات کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کی تصانیف میں کئی جگہ فارسی جملے بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی بھی جانتے تھے۔

شمس الائمہ سرخسیؒ نے اپنی وسعت علم، بے مثل قوت حافظہ، صبر و تحمل، تقویٰ، حق گوئی اور راہِ حق میں بلاکشی کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ ان کا نام ابد الآباد تک مہرِ عالم افروز کی طرح روشن رکھیں گے۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت عبداللہ بن یاسین جزولی رحمۃ اللہ علیہ

شمالی افریقہ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے، وہاں کے بلند ہمت فرمانرواؤں نے نہ صرف برِ اعظم افریقہ کی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے، بلکہ اپنے دَور کے اسلامی اندلس (اسپین و پرتگال) کی حفاظت بھی کی اور بارہا وہاں کے مسلمانوں کے سروں سے مصائب کے دَل بادل بھی دُور کیے۔ شمالی افریقہ قرنِ اوّل سے لے کر آج تک اسلام کا حلقہ بگوش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ کئی آزاد اور خود مختار ملکوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ (مراکش، تیونس، الجزائر اور لیبیا) لیکن بہر صورت یہ تمام ممالک الگ الگ بھی اسلام کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ علاقے بربری قبائل کا مسکن تھے جو مملکتی حدود سے بے نیازانہ زندگی گزارتے تھے۔ ۸۳۰ ق م میں فنیقیوں نے تیونس کے علاقے میں باقاعدہ حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا صدر مقام کارتھیج (قرطاجنہ) تھا۔ تقریباً چھ صدیوں تک یہ حکومت بڑی شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی، پھر اس کو رومیوں سے صد سالہ جنگ لڑنی پڑی جس میں بالآخر اہلِ روما کو اس سرزمین پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ پانچویں صدی عیسوی میں "ونڈال" نامی ایک وحشی قوم نے رومیوں کو شکست دے کر اس علاقے پر قبضہ کر لیا، لیکن چھٹی صدی عیسوی میں اہلِ روما نے دوبارہ اس خطے کو فتح کر لیا اور حسبِ سابق وہاں اپنی شان و شوکت کے ڈنکے بجانے لگے۔

شمالی افریقہ پر اسلام کی بارانِ رحمت کا پہلا چھینٹا اُس وقت پڑا جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت (۱۳ھ تا ۲۳ھ) میں فتحِ مصر کے فوراً ہی بعد مجاہدینِ اسلام کا سیلِ رواں شمالی افریقہ کی طرف بڑھا اور چند ماہ کے اندر اندر برقہ تک جا پہنچا۔ حضرت عثمانؓ کے

دورِ خلافت میں مسلمانوں نے طرابلس کو بھی فتح کر لیا، لیکن اس ملک پر ان کا قبضہ زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا، کیونکہ انہوں نے جونہی رومیوں سے اطاعت اور باجگزاری کا عہد لے کر طرابلس سے مراجعت کی، رومیوں نے اپنا عہد و پیمان توڑ ڈالا اور مسلمانوں کے خالی کیے ہوئے علاقوں پر پھر قبضہ کر لیا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے دورِ حکومت میں شمالی افریقہ کی طرف خاص توجہ دی اور اس خطۂ ارض کے متعدد مقامات پر پرچمِ اسلام بلند کر دیا۔ آئندہ چند سال کے اندر اندر مشہور سپہ سالار عقبہ بن نافع الفہری نے قریب قریب سارے شمالی افریقہ کو مسخر کر لیا، لیکن بدقسمتی سے وہ ۶۴ھ میں اپنے تین سو ساتھیوں سمیت دشمن کے نرغے میں آ کر شہید ہو گئے اور شمالی افریقہ کے حالات پھر دگرگوں ہو گئے۔ ۶۹ھ میں عبدالملک بن مروان نے زہیر بن قیس کی سرکردگی میں ایک لشکر شمالی افریقہ بھیجا۔ اس لشکر نے اگرچہ بربریوں کو زیر کر لیا، لیکن زہیر اور ان کے ساتھی اہلِ روما سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور شمالی افریقہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ۷۴ھ میں مسلمان پھر اس طرف متوجہ ہوئے اور چار سال کے قلیل عرصے میں از سرِ نو شمالی افریقہ کو مسخر کر لیا۔ ۹۲ھ میں اندلس بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور بنو اُمیّہ کی حکومت کے خاتمے، یعنی ۱۳۲ھ تک اس علاقے میں امویوں کی طرف سے مختلف امیر مقرر ہوتے رہے۔ اس کے بعد بنو عباس کی حکومت کا آغاز ہوا۔ ۱۳۸ھ میں ایک اموی شہزادے عبدالرحمٰن نے اندلس میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی، البتہ شمالی افریقہ پر ۱۷۳ھ تک بنو عباس کا تسلط رہا۔ اسی سال بنو ادریس نے مراکش میں اپنی آزاد مملکت قائم کر لی اور بنو عباس کے قبضے میں صرف تیونس، الجزائر اور طرابلس رہ گئے، لیکن وہاں بھی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تا آنکہ ۱۸۴ھ میں ابراہیم بن اغلب تمیمی نے خلیفہ ہارون الرشید کی اجازت سے وہاں ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی جو تاریخ میں دولتِ اغالبہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اغلبیوں کا دورِ اقبال تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ ۲۹۶ھ میں دولتِ فاطمیہ نے ان کی جگہ لے لی۔ فاطمیوں نے کچھ عرصے بعد مراکش اور مصر کو بھی فتح کر لیا۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں فاطمی حکومت میں اضمحلال کے آثار نمایاں ہوئے، تو تیونس، مراکش، الجزائر، طرابلس وغیرہ سب ایک ایک

کر کے ان کے قبضے سے نکل گئے اور جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔ پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں تقریباً سارا شمالی افریقہ طوائف الملوکی کی لپیٹ میں آگیا۔ سیاسی خلفشار کے ساتھ ساتھ بے دینی اور الحاد کا سیلاب بھی امڈ آیا اور فواحش و منکرات کی آگ نے حمیتِ دینی کو یکسر خاکستر بنا ڈالا، تاہم اس راکھ میں دبی ہوئی کچھ چنگاریاں پھر بھی باقی رہیں۔ یہ وہ اہلِ حق تھے جن کو اس مسموم ماحول نے متاثر نہیں کیا تھا اور وہ برابر جادۂ مستقیم پر گامزن تھے۔ وہ ملک کی سیاسی، معاشرتی اور دینی ابتری پر دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے، اس کے سوا وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے، کیونکہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی۔ برائی اتنی پھیل چکی تھی کہ اس کی اصلاح ان چند گنے چنے مردانِ حق کے بس سے باہر تھی۔ ان میں سے کچھ تو بددل ہو کر پڑوسی ممالک میں جا بسے تھے اور بعض اپنی جگہ رہ کر اصلاحِ احوال کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔ ایسے ہی مردانِ حق میں بربریوں کے قبیلے صنہاجہ کی ایک شاخ گدالہ (یا جدالہ) کے امیر یحییٰ بن ابراہیم بھی تھے۔

امیر یحییٰ بن ابراہیم ایک دردمند اور متدین مسلمان تھے، اہلِ مغرب کی حالت دیکھ کر وہ دن رات ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے رہتے تھے۔ ۴۲۷ھ میں انہوں نے قبیلے کی امارت اپنے بیٹے ابراہیم کے سپرد کی اور خود اپنے قبیلے کے چند ممتاز لوگوں کے ساتھ حجِ بیت اللہ کے لیے حجازِ مقدس روانہ ہو گئے۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد وہ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت میں مشغول ہو گئے۔ اثنائے سیاحت (یا واپسی کے سفر کے دوران میں) وہ تیونس کے شہر قیروان پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک نامور عالم شیخ ابو عمران موسیٰ بن ابو حجاج فاسی سے ہوئی۔ شیخ موصوف فقہ مالکی کے امامِ وقت تھے۔ قرآن، حدیث اور دوسرے علومِ دینی میں درجۂ تبحر رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نہایت عابد و زاہد اور حق گو بھی تھے۔ فواحش و منکرات کی علی الاعلان نکیر کرتے تھے اور کوئی بڑی سے بڑی شخصیت انہیں حق بات کہنے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ ان کی یہی حق گوئی اور بے باکی مغربِ اقصیٰ کے اربابِ حکومت کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی تھی اور انہوں نے شیخ موصوف کو جلاوطن کر دیا تھا۔ وہ اپنے وطن سے نکل کر قیروان آگئے تھے اور

وہاں ایک عظیم الشان درس گاہ قائم کی تھی۔ یہ درس گاہ تشنگانِ علم کے لیے چشمۂ رحمت ثابت ہوئی۔ ہزاروں لوگ اس سے فیض یاب ہوئے جن میں کئی سرآمدِ روزگار علماء میں شمار ہوئے اور اپنے اپنے علاقوں میں واپس جاکر ہدایت و اصلاح کی شمع روشن کی۔ شیخ ابوعمران مغرب کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے اور ان کی دلی تمنا تھی کہ اللہ تعالیٰ اصلاح کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ امیر یحییٰ بن ابراہیم سے ان کی ملاقات فی الحقیقت دو دردمند دلوں کی ملاقات تھی۔ دونوں کئی دن تک مغرب کے حالات کی اصلاح کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ بالآخر امیر یحییٰ نے شیخ ابوعمران سے درخواست کی کہ وہ ان کے ساتھ کوئی ایسا عالمِ دین بھیجیں جو ان کی قوم کے جاہل اور کندۂ ناتراش لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم سے بہرہ ور کرے اور ہر قسم کے نامساعد حالات کا جرأت اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرے۔ شیخ کی اپنی درس گاہ میں اس وقت ان اوصاف کا حامل کوئی شخص نہ تھا۔ انہوں نے اپنے ایک نامور شاگرد شیخ محمد دجاج بن زلو اللمطی کو جو وادی نفیس میں واقع ایک رباط (خانقاہ) میں درس و تدریس اور تبلیغ و ہدایت کا کام انجام دیتے تھے، ایک خط لکھ دیا کہ وہ اپنی رباط سے مطلوبہ اوصاف کے حامل کسی شخص کو امیر یحییٰ کے ساتھ بھیج دیں، چنانچہ ۴۳۰ھ میں امیر یحییٰ شیخ دجاج کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنے عظیم المرتبت استاد کا خط پڑھ کر اسے چوما اور کہا کہ میں اپنے استاذِ محترم کے حکم کی تعمیل بہ دل و جان کروں گا۔ انہوں نے اپنے ایک شاگرد عبداللہ بن یاسین جزولی کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا اور انہیں اپنی پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ امیر یحییٰ کے ساتھ مغرب روانہ کر دیا۔

ابو محمد عبداللہ بن یاسین مراکش کے صحرائے سوس سے متصلہ علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی والدہ جزولہ قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں جو مراکش اور صحرا کی حدود پر آباد تھا، اسی نسبت سے وہ بھی جزولی مشہور ہو گئے تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں تحصیلِ علم کے لیے اندلس گئے اور سات سال سے زیادہ عرصے تک قرطبہ میں قیام کیا۔ اس دوران میں انہوں

نے وہاں کے نامور علما سے اکتسابِ علم کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے وطن کو مراجعت کی اور سُوس ہی کے یگانۂ روزگار عالم شیخ محمّد وجاج بن زلو اللمطی کی شاگردی اختیار کی۔ تھوڑے سے ہی عرصے میں انہوں نے تمام دینی علوم میں درجۂ تبحرّ حاصل کر لیا اور اپنی ذہانت و فطانت اور اعلیٰ سیرت و کردار کی بدولت استاد کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ یہی سبب تھا کہ شیخ وجاج نے مغرب میں تبلیغ و اصلاح کے عظیم کام کے لیے انہیں منتخب کیا۔ عبداللہ بن یاسین حقیقی معنوں میں اس کام کے اہل تھے۔ وہ نہ صرف ایک جید عالم تھے، بلکہ زہد و اتقا میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ جذبۂ جہاد سے بھی سرشار تھے۔ ان اوصاف کے علاوہ ان کو بربری زبان پر زبردست عبور حاصل تھا اور وہ مختلف بربری قبائل کی عادات و خصائل سے بھی خوب واقف تھے۔ انہوں نے مغرب پہنچ کر بڑی تندہی سے دعوت و اصلاح کا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے امیر یحییٰ نے خود ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر ان کی مستقل معیت اختیار کر لی۔ ابن یاسینؒ مختلف قبائل کے پاس جاتے اور انہیں قرآن و سُنّت کی تعلیم دیتے، دین کے احکام سمجھاتے اور منکرات و بدعات کو ترک کرنے کی ہدایت کرتے۔ ان قبائل کے امرا اور عوام کے عقائد اور اعمال میں حد درجہ بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اسلام کا نام تو جانتے تھے، لیکن اس کی حقیقت سے بالکل ناآشنا تھے۔ ابنِ یاسینؒ نے جہاں عوام کے عقائد، اعمال اور اخلاق کی درستی کی طرف توجہ کی، وہاں انہوں نے امراء کو بھی راہِ راست پر لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ یہ امراء اپنے محکوموں پر بے پناہ مظالم ڈھاتے تھے اور ان کے ساتھ حیوانوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ ابنِ یاسینؒ اس تاریک ماحول میں ایک شمعِ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ان لوگوں کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ پر کاربند ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ اُمراء کو خلفائے راشدینؓ کا طرزِ عمل اپنانے کی ہدایت کرتے اور ہر قسم کے استحصال، لوٹ کھسوٹ اور حرام خوری سے منع کرتے۔ یہ لوگ جو گلے گلے تک گمراہی کی دلدل میں دھنس چکے تھے، ابن یاسینؒ کی دعوت و تبلیغ سے بھڑک اٹھے اور ان کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنے لگے۔ ان بدبختوں نے ابن یاسینؒ کو جسمانی اذیتیں پہنچانے سے بھی گریز نہ کیا تاہم امیر یحییٰ کے اثر و رسوخ اور حمایت کی وجہ سے ان کی جان محفوظ رہی۔ بدقسمتی سے اسی

زمانے میں امیر یحییٰ وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ابنِ یاسینؒ کی مخالفت بہت بڑھ گئی اور مشتعل قبائل نے ان پر جینا دوبھر کر دیا۔ ایسے حالات میں تبلیغ و اصلاح کا کام مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن تھا، چنانچہ ابنِ یاسینؒ سنّتِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے اس مقام سے ہجرت کر کے زیریں سینیگال کے ایک جزیرے نائیجر میں مقیم ہو گئے۔ ان کا ساتھ صرف سات آدمیوں نے دیا جو دل و جان سے ان کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ ان میں قبیلہ لمتونہ کے ایک بااثر اور دیندار رئیس یحییٰ بن عمر بھی تھے۔ وہ آگے چل کر ابنِ یاسینؒ کے نہایت قوی دست و بازو بنے۔

ابنِ یاسینؒ نے نائیجر میں ایک رباط (خانقاہ) کی بنیاد رکھی، اسے انہوں نے اور ان کے رفقاء نے اپنا مرکز بنایا اور اس میں بیٹھ کر کامل یکسوئی کے ساتھ عبادت اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اسی رباط کی نسبت سے ابنِ یاسینؒ کی دعوت قبول کرنے والے "مرابطین" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اس رباط نے شمالی افریقہ میں کیا کارنامہ سرانجام دیا، اس کی تصویر ایک عرب ادیب سعید اعراب نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"ابنِ یاسینؒ کی یہ رباط گویا ایک منارۂ نور تھی جس کی ضیاء پاشی نے حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ظلمت بدوش صحرا کو منور کر دیا۔ خانقاہ کے مکینوں کے علم و فضل، اخلاص فی الدین اور زہد و ورع کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آ کر ابنِ یاسینؒ کی جماعت میں شامل ہونے لگے۔ اس کے علاوہ ابنِ یاسینؒ نے مختلف قبیلوں میں اپنے تبلیغی وفود بھیجے جو وہاں جا کر ہمہ تن درس و تدریس، اصلاح و ارشاد اور دعوت الی اللہ میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح ابنِ یاسین کی جماعت روز بروز بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ اس کی تعداد ایک ہزار سے اوپر پہنچ گئی۔ جب ان کی حیثیت مضبوط ہو گئی، تو انہوں نے ارادہ کر لیا کہ اب برائی کے خلاف جہاد بالسیف بھی کریں گے، لیکن اس کے لیے بڑی تیاری، اتحاد و تنظیم اور سخت مشق کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ ارکانِ جماعت کے لیے لازم تھا کہ وہ قوتِ ایمانی، خلوص، سخت کوشی اور زہد و تقویٰ جیسے اوصاف کے حامل ہوں۔ یہ سب باتیں ابنِ یاسین کے پیشِ نظر تھیں۔ چنانچہ وہ اس وقت تک کسی شخص کو جماعتِ مرابطین

میں شامل نہ کرتے جب تک وہ اسلام سے قولاً وفعلاً کامل وفاداری کا عہد نہ کرتا، اپنا تزکیۂ نفس نہ کر لیتا اور اپنی گزشتہ زندگی کی لغزشوں کا محاسبہ نہ کر لیتا۔ جماعتِ مرابطین میں شامل ہونے کے ہر خواہشمند سے ان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور سابقہ زندگی کے گناہوں کے لیے اپنے اوپر حد جاری کرائے۔ اگر وہ یہ مطالبہ مان لیتا، تو پھر اس پر حد قائم کی جاتی۔ اس میں خاص اور عام یا امیر اور غریب میں مطلق کوئی امتیاز نہ روا رکھا جاتا۔ جو شخص برضا و رغبت اس حد کو اپنے اوپر جاری کروا لیتا، اسے ابنِ یاسینؒ اپنی دعوت و تحریک کی مشقتیں برداشت کرنے کا اہل قرار دیتے اور اس کی تعلیم و تربیت کا ذمہ لیتے۔ وہ اسے قرآن و حدیث پڑھاتے اور احکامِ دین کی تعلیم دیتے۔ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی اور اسے لہو و لعب کا کوئی موقع نہ دیا جاتا۔ مرابطین کو نمازِ باجماعت پڑھنے پر مجبور کیا جاتا۔ جو جماعت ترک کرنے کا مرتکب ہوتا، اسے پانچ کوڑے مارے جاتے۔ ہر نمازِ باجماعت کے ساتھ ایک اور نماز ادا کی جاتی جو پہلی فوت شدہ نمازوں کی قضا کے طور پر محسوب ہوتی۔ جو مسجد میں شور کرتا، اُسے اس کی سزا ملتی۔ اسی طرح اور بھی سزائیں مقرر تھیں جو زیادہ تر احکامِ فقہ کے مطابق تھیں۔ یہ سب اس لیے تھا کہ ابنِ یاسینؒ اپنی جاہل قوم کو تہذیب سکھانا چاہتے تھے اور اسے انتشار اور اخلاقی آوارگی سے بچا کر اسلام کا سچا پیرو بنانا چاہتے تھے۔"

مختلف مؤرخین نے ابنِ یاسینؒ کی خانقاہ کے جو حالات و کوائف بیان کیے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خانقاہ کے قیام سے ان کا مقصد تارک الدنیا راہبوں کی کوئی جماعت تیار کرنا نہ تھا، بلکہ فی الحقیقت وہ اپنے رفقا کو اصحابِ صُفّہؓ کے طریق پر گامزن کر کے ایک عظیم مقصد یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار کر رہے تھے۔ صحرائی قبائل میں ایک تو وہ قبائل تھے جو اگرچہ مسلمان کہلاتے تھے، لیکن ان کے عقائد اور اعمال مشرکین اور کفار سے بھی بدتر تھے۔ دوسرے قبائل کھلم کھلا بُت پرست اور کافر تھے۔ ان قبائل کے درمیان اپنے طویل قیام کے دوران میں ابنِ یاسینؒ بخوبی سمجھ گئے تھے کہ ؎

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

سالہا سال کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں صرف گنتی کے چند افراد کے ہدایت قبول کرنے

کا مطلب یہ تھا کہ یہ بدمزاج اور مغرور قبائل صرف قوت کی زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ نائیجر کی خانقاہ ابنِ یاسین ؒ نے اسی قوت کی فراہمی کے لیے قائم کی تھی۔ جب انہیں یہ قوت میسر آ گئی، تو وہ ع

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

پر عمل پیرا ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ایک ہزار تربیت یافتہ مجاہدین کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"تمہاری تعداد اب کافی ہو گئی ہے۔ تم اللہ کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہاری اصلاح کی اور تمہیں راہِ ہدایت پر چلنے کی توفیق دی۔ اگر تم نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا، تو تمہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جانوں کی بازی لگا کر جہاد کا آغاز کیا جائے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

سب مرابطین نے بیک آواز کہا: "ہم حاضر ہیں —— ہم حاضر ہیں۔ اگر اللہ کی راہ میں ہمیں اپنے اعزہ واقارب کے خلاف بھی تلوار اٹھانی پڑی، تو ہم اس سے ہرگز دریغ نہیں کریں گے۔"

یہ جواب سن کر ابنِ یاسین ؒ بشاش ہو گئے۔ انہوں نے بصد تضرع مجاہدین کی فتح و نصرت کے لیے دعا کی اور پھر ان کو ساتھ لے کر سب سے پہلے قبیلہ جدالہ میں پہنچے۔ یہ ایک بڑا قبیلہ تھا اور اہلِ قبیلہ کو اپنی کثرتِ تعداد پر بڑا ناز تھا۔ ابنِ یاسین ؒ نے بڑی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ ان لوگوں کو راہِ ہدایت پر چلنے کی تلقین کی، لیکن انہوں نے بڑی حقارت کے ساتھ ان کی دعوت کو رد کر دیا۔ اب ان کے خلاف لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مرابطی سرفروشوں نے ایک ہی ہلے میں ان کے سارے کس بل نکال دیے اور انہیں اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ جدالہ کے بعد لمتونہ کی باری آئی۔ یہ ایک طاقتور اور جنگجو قبیلہ تھا۔ اس کے دو سردار یحییٰ بن عمر اور ابوبکر بن عمر اگرچہ شروع سے ابنِ یاسین ؒ کے ساتھ تھے لیکن لمتونیوں نے بھی مسلح مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ پرجوش مرابطیوں نے ان کو

بھی جلد ہی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ سچے دل سے ابن یاسینؒ کی تحریک اصلاح و جہاد میں شامل ہو گئے اور اس کے بازوئے شمشیر زن ثابت ہوئے۔

علامہ ابن خلکان کا بیان ہے کہ لمتونی اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھا کرتے تھے، اس لیے ان کو ملثمین (نقاب پوش) کہا جاتا تھا۔ چونکہ بعد میں مرابطین کی عنان قیادت لمتونیوں کے ہاتھ میں آ گئی، اس لیے مرابطین کو ملثمین بھی کہنے لگے۔

مشہور مستشرق پروفیسر فلپ۔کے حتی نے اپنی کتاب "ہسٹری آف عربز" میں مرابطین یا ملثمین کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"دراصل مرابطین کی جماعت ایک مذہبی اور سیاسی برادری تھی جس کو گیارہویں صدی (عیسوی) کے وسط میں ایک پاکباز شخص (ابن یاسینؒ) نے قائم کیا تھا۔ رباط کی مناسبت سے یہ مرابطین کہلاتے تھے۔ رباط ایک قلعہ بند خانقاہ تھی جو زیریں سینیگال کے قریب ایک جزیرے میں واقع تھی۔ پہلے مریدین یا اخوان زیادہ تر قبیلہ لمسارے سے تعلق رکھتے تھے جو قبیلہ صنہاجہ کی ایک شاخ تھا اور جس کے افراد صحرا کے بنجر علاقوں میں خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے اور جیسا کہ ان کے اخلاف جنوبی صحرا کے طوارق آج تک اس پر عامل ہیں، وہ آنکھوں کے نیچے کے حصے کو نقاب سے ڈھانکتے تھے۔ ان کے مردوں میں یہ عجیب رسم دوسرے نام یعنی ملثمین (نقاب پوش) کا باعث بنی۔ ایک ہزار مجاہد درویشوں سے شروع ہو کر ان اخوان نے چند ہی برسوں میں دوسرے صحرائی قبائل میں بھی اسلام پھیلایا اور شمال مغربی افریقہ اور اسپین کے حکمران بن گئے۔ ان کے واقعات تاریخ اسلام میں ایک اور مثال اس امر کی پیش کرتے ہیں کہ جب مذہبی دعوت کے ساتھ فوجی قوت بھی شریک ہو جائے، تو اس کے کیا ثمرات ہوتے ہیں۔"

جدالہ اور لمتونہ کے بعد دوسرے قبائل بھی ایک ایک کر کے ابن یاسینؒ کے حلقۂ اطاعت میں آ گئے۔ اس طرح ابن یاسینؒ کے پاس ہزاروں سرفروشوں پر مشتمل ایک جرار لشکر جمع ہو گیا۔ یہ لوگ بڑے پکے اور مخلص مسلمان تھے اور قرن اول کے مجاہدین اسلام کی طرح ان کے

سینوں میں بھی اسلام کی خاطر کٹ مرنے کا جذبہ موجزن تھا۔ ابن یاسینؒ کی دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں ان لوگوں میں ایسی باہمی اخوت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ خود ابن یاسینؒ ایک درویش صفت انسان تھے۔ ان کے استغنا، سادگی، زہد واتقا اور ایثار وخلوص کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ انہوں نے یحییٰ بن عمر لمتونی کو مرابطین کا امیر مقرر کیا تھا اور خود ایک عام سپاہی کی طرح جہاد میں حصہ لیتے تھے، لیکن مرابطین کا بچہ بچہ ان کی جلالت قدر کا معترف اور مداح تھا اور ان کے ایک اشارے پر جان قربان کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا تھا۔ فی الحقیقت وہ مرابطین کے دلوں پر حکومت کرتے تھے اور امیر المرابطین یحییٰ بن عمر ان کی اجازت اور مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

۴۴۷ھ / 1054ء میں سلجماسہ اور درعہ کے فقہانے ابن یاسینؒ اور یحییٰ بن عمر کے پاس پیام بھیجا کہ یہاں کے امرا سخت فاسق اور بدعتی ہوگئے ہیں اور مخلوق خدا ان کے ظلم ستم سے عاجز آگئی ہے، خدا کے لیے آپ ہمیں ان سے نجات دلائیں۔ یحییٰ اور ابن یاسینؒ نے ان کی دعوت بلا تامل قبول کرلی اور ایک لشکر گراں لے کر سلجماسہ پر یلغار کردی۔ سلجماسہ کے حکمران مسعود بن وانودن المغروی نے مجاہدین کی زبردست مزاحمت کی، لیکن جذبۂ جہاد سے سرشار مجاہدین نے اس کی فوج کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور وہ خود بھی لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس طرح وادی الدرعہ اور سلجماسہ پر مرابطین کا قبضہ ہوگیا۔ ابن یاسینؒ نے چند دن وہاں قیام کیا اور اس عرصے میں وہاں احکام شرع کو مکمل طور پر نافذ کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے وطن کو معاودت کی۔

۴۴۸ھ / 1055ء میں امیر یحییٰ بن عمر نے وفات پائی تو ابن یاسینؒ نے ان کی جگہ ان کے بھائی ابوبکر بن عمر کو مرابطین کا حکمران اور سپہ سالار مقرر کیا۔ وہ ایک پرجوش مجاہد اور نہایت پرہیز گار آدمی تھا۔ اس نے بیک وقت شمال اور جنوب دونوں طرف اپنی پیشقدمی جاری رکھی اور اپنی فتوحات کے سلسلے کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا گیا۔ اسی سال خبر ملی کہ گھانا میں بت پرستوں نے سخت طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے اور شمالی گھانا کا وہ علاقہ جس پر کچھ عرصہ پہلے مسلمان قابض ہوگئے تھے، اس پر پھر بت پرستوں کا استیلا ہوگیا ہے۔ ابوبکر

بن عمر طوفانِ برق و باد کی طرح گھانا کی طرف بڑھا اور کئی زور دار معرکوں کے بعد بُت پرستوں کا سر کچل کر گھانا پر پرچم اسلام بلند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خطہ سُوس، تارودنت، اغمات وغیرہ بھی یکے بعد دیگرے فتح کر لیے۔ یہ ساری فتوحات ابنِ یاسینؒ کی رہنمائی میں ہوئیں۔ تسخیر و توسیع کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ جو قبیلے ان کی اطاعت میں آتے، وہ ان سے کتاب و سُنت کی فرمانبرداری کا حلف لیتے۔ اس طرح وہ قبائلِ ملثمین کی ایک ایسی وحدت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کی اساس احیائے دین اور سربلندی اسلام تھی۔ اب وہ صرف صحرا میں نہیں بلکہ پورے مغرب میں ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ مراکشی مؤرخ سعید اعراب لکھتے ہیں:

"مرابطین ابنِ یاسینؒ کا بڑا احترام کرتے تھے اور انہیں ولی کا درجہ دیتے تھے۔ وہ ان کے فتاویٰ کو حفظ کرتے اور ان پر عمل کرتے۔ ابنِ یاسینؒ نے ان تمام ظالمانہ محصولوں کو منسوخ کر دیا جن کے ذریعے حاکم اور والی عوام کا خون چوستے تھے۔ انہوں نے صرف قرآن و سُنت کے تجویز کردہ زکوٰۃ اور عشر کے محصول عائد کیے۔ انہوں نے بیت المال بھی قائم کیا جس کی آمد و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ بیت المال سے علماء، قاضیوں اور محتاجوں کی مدد بھی کی جاتی تھی۔ دعوت و اصلاح کے ابتدائی دور کے بعد ابنِ یاسینؒ نے مختلف قبائل کے مجاہدین کو ایک باقاعدہ فوج کی صورت میں منظم کر دیا تھا اور اسے ہدایت دے رکھی تھی کہ جس علاقے پر قبضہ کرے، وہاں نہایت سختی کے ساتھ احکامِ شریعت نافذ کرے۔ خود ابنِ یاسینؒ ایک نہایت جری اور نڈر مجاہد تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جب ان کا لشکر میدانِ جنگ میں اترتا، تو وہ آگے آگے ہوتے اور ان کے پیچھے پیچھے سپہ سالار اور دوسرے امیر ہوتے۔ اس طرح ہر معرکے کی قیادت وہ بہ نفسِ نفیس کرتے، اپنے لشکر کو دادِ شجاعت دیتے، اس کا حوصلہ بلند کرتے اور لڑائی کے لیے اُبھارتے تھے۔"

۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں ابنِ یاسینؒ نے برغواطہ کی طرف توجہ کی جہاں ایک جھوٹے مدعیٔ نبوت

صالح بن طریف کے پیروؤں نے بڑا زور پکڑ لیا تھا اور اپنے مقبوضات بحرِ اوقیانوس کے ساحلی علاقوں میں دور دور تک وسیع کر لیے تھے۔ صالح بن طریف ایک یہودی الاصل شخص تھا۔ وہ پہلی صدی ہجری کے اواخر میں اندلس میں پیدا ہوا۔ عہدِ شباب میں مشرق کا رخ کیا اور عبید اللہ معتزلی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ پھر جادو اور شعبدہ بازی میں دستگاہ حاصل کی۔ وہاں سے نہایت عسرت اور ناداری کے عالم میں تامستا پہنچا جو مغربِ اقصیٰ میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ وہاں کے جنگجو بربری باشندے سخت جاہل اور سادہ لوح تھے۔ صالح ایک مکار شخص تھا۔ وہ ان لوگوں میں گھل مل گیا اور ان کی زبان پر عبور حاصل کر کے اپنی شعبدہ بازیوں سے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ۱۲۵ھ میں اس بدبخت نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنا ایک من گھڑت قرآن لوگوں کے سامنے پیش کیا جس میں اسّی سورتیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے نام یہ تھے: سورۂ غرائب الدنیا، سورۂ جمل، سورۂ ہاروت و ماروت، سورۂ ابلیس، سورۂ فرعون، سورۂ دیک، سورۃ الاسباط، سورۂ آدم —— ان نام نہاد سورتوں کی زبان نہایت بے ڈھنگی اور مضحکہ خیز تھی۔ وہ اپنے آپ کو مہدئ اکبر بھی کہتا تھا اور "واربا" بھی جس کے معنی بربری زبان میں "خاتم النبیین" کے ہیں۔ اس نے اپنا لقب صالح المومنین قرار دیا تھا اور ایک عجیب و غریب شریعت وضع کر کے اپنے پیروؤں میں نافذ کر دی تھی۔ اس شریعت کی رو سے چچا کی بیٹی کے سوا ہر عورت سے نکاح جائز تھا اور بیویوں کی تعداد پر کوئی قید نہ تھی۔ نماز اشاروں سے پڑھی جاتی تھی۔ البتہ آخری رکعت کے اخیر میں پانچ سجدے کیے جاتے تھے۔ غسلِ جنابت صرف زنا کے بعد ضروری تھا۔ مرغ کا گوشت حرام تھا اور چوری کی سزا موت تھی۔ ۲۱ محرم کو ہر شخص پر قربانی واجب تھی۔ غرض اسی قسم کی بے شمار خرافات کا نام اس نے شریعت رکھ دیا تھا۔ اس شخص نے چند سال کے اندر اندر زبردست طاقت حاصل کر لی اور بربریوں کا دینی و دنیاوی فرمانروا بن گیا۔ ۱۷۴ھ میں وہ اپنے بیٹے الیاس کو اپنا جانشین بنا کر گوشہ نشین ہو گیا اور کچھ عرصے بعد مر گیا۔ الیاس نے ۲۲۴ھ تک حکومت کی۔ اس کے بعد یونس، ابو غفیر محمد بن معاذ ملک، ابوالانصار عبداللہ، ابو منصور عیسیٰ اور ابو حفص عبداللہ یکے بعد دیگرے

برغواطہ کے حکمران بنے۔ ابوحفص عبداللہ کے عہد میں برغواطہ کے شجر اقبال کو گھن لگ گیا اور تا متاہم مسلمانوں نے لگاتار حملے شروع کر دیئے۔ اس طرح برغواطی حکمرانوں کے قصرِ اقتدار میں دراڑیں پڑ گئیں، لیکن وہ پوری طرح ختم نہ ہوئے۔ جونہی مجاہدینِ اسلام واپس جاتے، وہ پھر پرپرزے نکال لیتے تھے۔ ۴۵۱ھ/1059ء میں ابنِ یاسینؒ نے پہلی بار ان کا مکمل استیصال کرنے کی ٹھانی اور اسی مقصد کے لیے برغواطہ پر چڑھائی کی۔

برغواطہ پر حملے سے ابنِ یاسینؒ کا مقصد کوئی علاقہ فتح کرنا نہیں تھا، بلکہ وہ صالح بن طریف کے مذہب پر کاربند گمراہ اور سرکش بربریوں کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف زبان سے اپنے فاسد عقائد کی تبلیغ کرتے تھے بلکہ صحیح العقیدہ مسلمانوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ ابنِ یاسینؒ نے برغواطہ پر حملہ کیا، تو ان کے لشکر کی قیادت ابوبکر بن عمر اور ابوبکر کے چچازاد بھائی یوسف بن تاشفین کے ہاتھ میں تھی، تاہم ابنِ یاسینؒ معمول کے مطابق ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ برغواطی بربروں نے مرابطی مجاہدین کا جم کر مقابلہ کیا اور قدم قدم پر اپنی لاشیں بچھا کر اہلِ حق کے کارواں کو روکنے کی کوشش کی۔ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۴۵۱ھ/1059ء کو کریفلہ (یا زعیر) کے مقام پر اسی سلسلے کے ایک خونریز معرکے میں ابنِ یاسینؒ مردانہ وار لڑتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔ ان کا خونِ شہادت رائیگاں نہیں گیا، امیر المرابطین ابوبکر بن عمر نے ان کے چھوڑے ہوئے کام کو برابر جاری رکھا اور چند ماہ کے اندر برغواطہ کے بدمذہب بربریوں کو خاکِ نامرادی چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ مشہور مسلمان فاتح یوسف بن تاشفین مرابطی اسی ابوبکر بن عمر کا جانشین تھا۔ اس کے عہد میں تحریکِ مرابطین جس کی بنیاد ابنِ یاسینؒ جیسے مردِ درویش نے رکھی تھی، عروج و اقبال کی انتہائی منزل تک پہنچ گئی۔ اس نے نہ صرف مغرب وسطیٰ و اقصیٰ کے وسیع علاقوں پر مرابطین کا اقتدار قائم کر دیا، بلکہ معرکۂ زلاقہ میں عیسائیوں کی زبردست قوت کو پاش پاش کر کے اندلس پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ ابنِ یاسینؒ ہی کے فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ یوسف بن تاشفین ایک بیدار مغز اور قابل حکمران ہونے کے ساتھ نہایت خدا ترس، سادہ مزاج، پابندِ شرع، متقی، عادل اور کشادہ دست مسلمان تھا۔ اس کی سلطنت کا رقبہ بنو امیہ اور بنو عباس کی مشترکہ سلطنتوں

کے برابر تھا۔ ہر جمعے کو تین لاکھ مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور تیرہ بادشاہ اس کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ امام یافعیؒ نے اس کی نسبت لکھا ہے: کان اکبر ملوک الدنیا فی عصرہ۔ وہ دنیا کے بادشاہوں میں اپنے عہد کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔

عبداللہ بن یاسینؒ جن کی سادہ سی قبر آج بھی زعیر کے مقام پر موجود ہے، بلا شبہ ان مصلحینِ اُمت میں سے ہیں جنہوں نے اپنے علم و عمل، اصلاح و ارشاد اور زُہد و تقویٰ کی بدولت لاکھوں بندگانِ خدا کو صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا اور ایک ایسی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کا مقصودِ حقیقی، اسلام کی سربلندی، کتاب و سُنّت پر عمل، معاشرے کی اصلاح، مفاسد کا خاتمہ، نیکیوں کی ترویج اور علوم و معارف کی نشر و اشاعت تھا۔ وہ اگر اپنے دَور کے مجدد نہیں، تو کم از کم تاریخ اسلام کی ایک مہتم بالشان شخصیت ضرور ہیں، ایسی شخصیت کہ جس پر ملتِ اسلامیہ بجا طور پر ناز کر سکتی ہے —— ابن یاسینؒ کی برپا کی ہوئی دعوتِ الی اللہ (اسلام کی طرف لوٹو) اور تحریکِ پاکستان میں ایک گونہ مماثلت نظر آتی ہے سلطنتِ مرابطین کی تاسیس میں جو جذبہ کارفرما تھا، بعینہٖ وہی جذبہ مملکتِ خداداد پاکستان کی اساس تھا، لیکن جہاں مرابطین نے اپنے اخلاصِ عمل کی بدولت ہفت افلاک کی رفعتوں کو چھو لیا، وہاں پاکستان کے فرزندانِ اسلام، نظریۂ پاکستان کو فراموش کر کے جس المناک صورتِ حال سے دوچار ہوئے، وہ عبرت کا مقام ہے۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار۔

اب بھی وقت ہے کہ ہم برائے نام نہیں، بلکہ حقیقی اسلام کی طرف لوٹیں اور اپنی زندگیوں کو کتاب و سُنّت کے سانچے میں ڈھالیں، ورنہ (خاکم بدہن)

"ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں"

ابو المعالی امام الحرمین عبد الملک جوینیؒ

امام الحرمین، ضیاء الدین ابو المعالی عبد الملک بن شیخ ابو محمد عبد اللہ بن ابو یعقوب یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن حَیّویہ جُوَینی کا شمار سلجوقی دور کے سر آمد روز گار علماء میں ہوتا ہے۔

۱۸ محرم ۴۱۹ھ ۱۰۲۸ء کو قصبہ جوین میں پیدا ہوئے۔ خاندان مدتوں سے علم و فضل کا مرکز تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، اُن کی وفات کے بعد نیشاپور جا کر مدرسہ بیہقیہ میں داخل ہو گئے اور وہاں کے مدرسِ اعظم شیخ ابو القاسم اسکافی کے شاگرد ہوئے اور علم اصول میں کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد بغداد گئے اور وہاں کے نامور علماء کے فیضِ صحبت سے تمام علوم متداولہ میں درجۂ تبحّر حاصل کیا۔ بغداد سے واپس آکر نیشاپور میں مسندِ درس و افتاء پر بیٹھے، تھوڑی ہی مدت میں ان کے علم و فضل کا چرچا ہر طرف پھیل گیا۔ اسی زمانے میں وزیر عمید الملک کندری کی تحریک سے سلطان طغرل بیگ نے حکم دے دیا کہ مساجد میں امام ابو الحسن اشعری اور اُن کے متبعین پر خطبوں میں لعنت پڑھی جائے۔ امام الحرمینؒ سلسلۂ اشعریہ کے حامی تھے۔ انھوں نے اس حکم کو ناجائز قرار دیا اس پر عمید الملک نے اُن کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ امام موصوف راتوں رات کرمان کے راستے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کئی سال تک ان کی مسندِ درس و افتا ملجائے عام بنی رہی اور عالم اسلام میں وہ امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ سلطان الپ ارسلان کے عہد میں عمید الملک کُندری کے قتل کے بعد جب خواجہ نظام الملک طوسی وزیر مقرر ہوا تو اس نے اشعریوں پر لعنت پڑھنے کا حکم منسوخ کر دیا اور امام الحرمین حجازِ مقدس سے واپس نیشاپور آ گئے۔ خواجہ نظام الملک نے ان کا حد سے زیادہ اعزاز و اکرام کیا اور نیشاپور میں ان کے لیے ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر

کرایا جو "نظامیہ نیشاپور" کے نام سے مشہور ہوا۔ امام الحرمینؒ اسی مدرسے میں مدرسِ اعظم کی حیثیت سے اخیر تک درس دیتے رہے۔ درس و تدریس کے علاوہ وہ حکومت کے تمام مذہبی صیغوں کے افسر بھی تھے اور وعظ، خطابت، امامت اور اوقاف انہیں کے سپرد تھے۔ سحرالبیان خطیب تھے اور ان کی مجلسِ وعظ میں بڑے بڑے نامور علماء حاضر ہوتے تھے۔ کبھی خواجہ نظام الملک کے دربار میں جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ اپنی مسند سے اٹھ کر استقبال کرتا۔ حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ بادشاہانِ وقت تک کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سلطان طغرل کے حکم کے خلاف فتویٰ جاری کرنے کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ سلطان ملک شاہ کے عہد میں پیش آیا۔ سلطان نے ایک بار انتیس رمضان المبارک کو کچھ غیر ثقہ لوگوں کی شہادت پر حکم جاری کر دیا کہ دوسرے دن عید ہوگی۔ چونکہ سلطان کا حکم شرعی تقاضوں کے مطابق نہیں تھا، امام الحرمینؒ نے اعلان کرا دیا کہ سلطان کا حکم غلط ہے اور کل روزہ ہوگا۔ اس سے بڑی سنگین صورت حال پیدا ہوگئی لیکن بالآخر سلطان کو اپنی غلطی تسلیم کرنی پڑی اور اس نے اعلان کرا دیا کہ میرا حکم غلط تھا اور امام الحرمین کا فتویٰ صحیح ہے۔[ا]

امام الحرمینؒ کا حلقۂ درس بڑا وسیع تھا اس میں چار سو طلبہ تعلیم پاتے تھے ان کے شاگردوں میں حجۃ الاسلام امام غزالیؒ، کیا ہراسیؒ اور احمد بن محمد خوافیؒ جیسی یگانۂ روزگار شخصیتیں بھی شامل تھیں۔

امام الحرمینؒ نے ۲۵ ربیع الآخر ۴۷۸ھ (۱۰۸۵ء) کو بعد نمازِ عشاء وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات پر ماتم کا جو منظر قائم کیا گیا، مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس دن نیشاپور کے تمام بازار بند ہوگئے۔ جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا۔ ان کے شاگردوں نے اپنے قلم توڑ دیئے اور دواتیں پھوڑ دیں۔ سال بھر کے لیے ممالک محروسہ سلجوقیہ کے تمام مدارس بند کر دیئے گئے اس دوران میں طلبہ ملک میں گھوم کر امام الحرمین کی وفات پر نوحہ کرتے پھرتے تھے اور شعراء کے مرثیوں کی تو کوئی حد ہی نہ رہی تھی۔

[ا] اس واقعہ کی تفصیل اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ بیان کی جا چکی ہے۔

امام الحرمینؒ نے اپنی زندگی میں بیشمار کتابیں تصنیف کیں۔ چند کے نام یہ ہیں:
کتاب البرہان فی اصول الفقہ، کتاب الورقات فی اصول الفقہ، تلخیص التقریب، مدارک العقول، غیاث الامم، غنیۃ المسترشدین، عقیدہ النظامیہ، نہایۃ المطلب، شامل، ارشاد، مغیث الخلق وغیرہ۔

علامہ سبکیؒ نے پہلی دو تصانیف کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ جوینیؒ کی تصانیف کا سمجھنا کرامت سے کم نہیں۔ افسوس کہ امام الحرمین جوینیؒ کی ایک دو کتابوں کے سوا باقی نایاب ہیں۔

شیخ العصر علامہ ابو اسحاق شیرازیؒ

ابو اسحٰق ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی الملقب بہ جمال الدین ۳۹۳ھ میں فیروز آباد (صوبۂ فارس کے ایک قصبہ) میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی شیراز چلے گئے جو اس وقت ایک عظیم الشان علمی مرکز تھا۔ شیخ نے شیراز کے تمام نامور علماء سے علم حاصل کیا۔ اُن کے اساتذہ میں ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بیضاوی اور ابو احمد عبدالوہاب جیسے یگانۂ روزگار علماء بھی شامل تھے۔ شیراز سے فارغ التحصیل ہو کر بصرے گئے اور وہاں کے مشاہیر علماء سے کسب فیض کیا، وہاں سے بغداد گئے اور علامۂ زماں قاضی ابو الطیب طبری سے تمام علوم کی تکمیل کی۔ جلد ہی ان کے فضل و کمال کی شہرت ہر طرف پھیل گئی اور وہ تمام عالمِ اسلام میں شیخ الشیوخ اور استادِ کل کی حیثیت سے تسلیم کیے گئے۔ فقہ شافعی۔ حدیث اور علمِ کلام میں ان کو جو بصیرت حاصل تھی اس کی بناء پر علمائے عصر انہیں اپنا امام کہتے تھے۔ بے حد عبادت گزار، نیک طینت اور متقی تھے، کثرتِ ذکر اور زہد و ورع کی وجہ سے طبقہ صوفیہ میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔

علامہ ابن خلکانؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"وَكَانَ فِي غَايَةٍ مِنَ الْوَرَعِ وَالتَّشَدُّدِ فِي الدِّيْنِ"

(یعنی وہ غایت درجہ کے پرہیزگار اور دین کے معاملہ میں بہت سخت تھے)

علامہ ابو اسحاقؒ کے علمی مرتبہ کا اندازہ صرف اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۴۵۹ھ ۱۰۶۷ء میں جب بغداد کے مشہورِ عالم مدرسہ نظامیہ کا آغاز ہوا تو اس کے اولین استاد یا شیخ الجامعہ (پرنسپل) کی حیثیت سے علامہ ابو اسحاقؒ ہی کو منتخب کیا گیا۔ یہ کوئی معمولی منصب نہیں تھا۔ علامہ شبلیؒ نے "الغزالی" میں لکھا ہے کہ "مدرسہ نظامیہ کی مدرسی کا منصب ایسا

عظیم الشان رتبہ تھا کہ بڑے بڑے اہلِ کمال نے اس کی آرزو میں عمریں صرف کر دیں اور یہ حسرت دل کی دل ہی میں لے گئے۔" فخر الاسلام شاشی (محمد بن احمد) جو بہت بڑے پایہ کے فاضل تھے جب ۵۰۵ھ میں نظامیہ کے مدرس مقرر ہوئے اور مسندِ درس پر جا کر بیٹھے تو بے اختیار ان پر رقت طاری ہوئی بار بار یہ شعر پڑھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

خلت الدیار فسدت غیر مسوّد ومن الشقاء تفردی بالسودد

(ملک بڑوں سے خالی ہو گیا تو میں ہی سردار بنا اور میرا سردار بننا درحقیقت ملک کی بدنصیبی ہے)

علامہ نے مدرسہ نظامیہ میں درس و تدریس کی حامی تو بھر لی لیکن تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جب مدرسہ کی رسمِ افتتاح ادا کرنے کے لیے جا رہے تھے تو راستہ میں ایک لڑکے نے کہہ دیا کہ "اے شیخ کیا آپ اس مدرسہ میں درس دیں گے جو غصب کی ہوئی زمین پر تعمیر ہوا ہے" بس اتنا سنتے ہی کہیں روپوش ہو گئے۔ ادھر رسمِ افتتاح دیکھنے کے لیے سارا بغداد امنڈ آیا تھا اور لوگ بڑی بیتابی سے علامہ کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے۔ جب انتظار کرتے کرتے دوپہر کا وقت ہو گیا اور علامہ نہ آئے تو مجبور ہو کر انہوں نے امام ابونصر بن صباغ[1] سے درخواست کی کہ وہ مسندِ درس پر رونق افروز ہوں اور پہلا درس دے کر مدرسہ کا افتتاح فرمائیں۔ امام ابونصرؒ نے لوگوں کی خواہش پوری کر دی اور پھر بیس دن تک مدرسہ میں مسلسل درس دیتے رہے۔ اس اثنا میں ابومنصور بن یوسف اور عمید ابوسعد نے، جو اعیانِ بغداد میں سے تھے، تحقیقات کر کے علامہ ابواسحاق کو یقین دلا دیا کہ مدرسہ مغصوبہ اراضی پر تعمیر نہیں ہوا۔ چنانچہ وہ بیس دن کے بعد مدرسہ تشریف لے گئے اور امام ابونصر کی جگہ درس و تدریس کا کام سنبھال لیا۔

علامہ ابواسحاقؒ کو خواص اور عوام سبھی بیحد محترم جانتے تھے۔ ۴۶۷ھ / ۱۰۷۴ء میں

---

[1] امام ابونصر عبدالسید بن محمد المعروف بہ ابن صباغ مشہور فقیہ و محدث تھے اور علامہ ابواسحٰق کے ہمعصر تھے۔ رسمِ افتتاح دیکھنے کے لیے وہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے یہ محض اتفاق تھا کہ یہ رسم انہیں خود ادا کرنی پڑی۔

خلیفہ قائم بامر اللہ نے وفات پائی تو اس کی جانشینی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ علامہ نے المقتدی بامر اللہ کے حق میں رائے دی۔ سب نے ان کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور المقتدی مسندِ خلافت پر بیٹھ گیا۔ وہ علامہ کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ سنہ ۴۷۵ھ / ۱۰۸۲ء میں جب اسے سلطان ملک شاہ کے پاس سفارت بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو اس مہتم بالشان خدمت کے لیے اس کی نظر علامہ ابو اسحاق ہی پر پڑی۔ مؤرخین نے اس سفارت کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے[1]۔ علامہ کے ہمراہ اس سفارت میں امام ابوبکر شاشیؒ اور کئی دوسرے نامور علماء بھی تھے۔ جب علامہ بغداد سے روانہ ہوئے تو سارے عالمِ اسلام میں غلغلہ پڑ گیا۔ جس جس شہر سے وہ گزرتے تھے شہر کا شہر ان کے استقبال کے لیے امنڈ پڑتا تھا۔ ہر ہر پیشہ والے اپنے اپنے پیشوں کی مناسبت سے علامہ کی سواری پر چیزیں نچھاور کرتے تھے۔ صراف اگر روپے اور اشرفیاں ان کے قدموں پر نثار کرتے تھے تو نانبائی اور حلوائی روٹیاں اور مٹھائیاں لٹا رہے تھے حد یہ کہ کفش دوز سینکڑوں جوتیاں بچوں کے پاؤں کی بنا کر ساتھ لاتے تھے اور علامہ کے قدموں پر نثار کر دیتے تھے۔ کثرتِ ازدحام کا یہ عالم تھا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ لوگ علامہ کی رکاب کو چھوتے تھے اور ان کے گھوڑے کے قدم کی مٹی تبرکاً اٹھا لیتے تھے۔ غرض ہر جگہ ایک جشن کا سماں تھا اور لوگ جوشِ مسرت میں دیوانے ہو گئے تھے۔ علامہ اس جوشِ مسرت کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے اور دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کی تحمید و تمجید کر رہے تھے۔ جب یہ سفارت نیشاپور (یا اصفہان) پہنچی تو سارا شہر خیر مقدم کے لیے باہر آ گیا۔ خود امام الحرمین جوینیؒ علامہ کا غاشیہ اپنے کندھوں پر رکھ کر ان کی رکاب میں چلے۔

سلطان ملک شاہ نے خاص دربار منعقد کر کے علامہ کو بلا بھیجا۔ جب وہ دربار میں تشریف لائے تو ملک شاہ نے ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی۔ علامہ جس مقصد کے لیے سفیر

---

[1] ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ سلطان ملک شاہ اس زمانے میں نیشاپور میں مقیم تھا اور یہ سفارت نیشاپور گئی لیکن ابن خلدون کی روایت کہ یہ سفارت اصفہان گئی۔

ہو کر آئے تھے انہوں نے اسے نہایت احسن طریقے سے سلطان کے سامنے پیش کیا اور سلطان نے ان کی تمام باتیں خوشدلی سے مان لیں۔ خواجہ نظام الملک نے سلطان سے بھی بڑھ کر علّامہ کی تعظیم و تکریم کی جب تک علّامہ کا وہاں قیام رہا وہ اکثر خواجہ کے ہاں تشریف لے جاتے تھے۔ خواجہ اپنی مسند سے اُٹھ کر استقبال کرتا تھا اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ کرتا تھا۔ خواجہ کے دربار میں دوسرے علماء سے بھی علمی گفتگو اور مناظرے ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب انہوں نے بغداد واپس جانے کی تیاری کی تو سلطان اور اعیانِ سلطنت نے انہیں نہایت احترام سے رخصت کیا۔

علّامہ بڑے عالی ظرف اور بلند حوصلہ آدمی تھے۔ امامِ وقت تھے لیکن دینی معاملات میں کبھی بیجا ضد نہیں کرتے تھے اگر کسی مسئلہ میں اپنی غلطی واضح ہو جاتی تو اس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی استفتا کے جواب میں کوئی غلط بات لکھ گئے۔ امام ابنِ صبّاغ ؒ نے ان کا فتویٰ دیکھا تو فوراً غلطی کی نشاندہی کی اور اسے نظرِ ثانی کے لیے علّامہ کے پاس واپس بھیج دیا۔ علّامہ نے غور کیا تو ابنِ صبّاغ ؒ کی رائے درست معلوم ہوئی۔ اپنے قلم سے فتوے کی تصحیح کی اور اس کے نیچے یہ عبارت بھی لکھ دی:

"اَلْحَقُّ مَا قَالَهُ الشَّيْخُ بْنِ صَبَّاغ وَ اَبُوْ اِسْحٰق مُخْطِئٌ"

یعنی ابن صباغ نے درست کہا ہے اور ابو اسحٰق غلطی پر ہے۔

حق گوئی میں بھی نہایت جری اور بیباک تھے۔ بیجا خوشامد سے نفرت تھی۔ خواجہ نظام الملک نے ایک دفعہ ایک محضر تیار کیا جس میں لکھا تھا کہ نظام الملک نے کبھی کوئی ظلم اور زیادتی نہیں کی ہے ۔۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ علماء امراء اور عوام ہر طبقے کے زیادہ سے زیادہ لوگوں سے اس محضر پر دستخط کرالے تاکہ آخرت میں یہ اس کے کام آئے۔ بہت سے علماء اور دوسرے لوگوں نے اس پر اپنے تصدیقی دستخط کر دیئے لیکن جب یہ محضر علّامہ ابو اسحٰق ؒ کے پاس پہنچا تو انہوں نے بلا جھجک اس پر یہ الفاظ لکھ دیئے:

"خَيْرُ الظَّلَمَةِ حَسَنٌ"

یعنی سب ظالموں میں حسن (خواجہ نظام الملک کا اصلی نام) اچھا ہے۔

جب خواجہ نے علامہ کی تحریر دیکھی تو بے اختیار رونے لگا اور کہا کہ واللہ ابواسحٰقؒ سے بڑھ کر کسی عالم نے سچ نہیں لکھا۔

علامہ ابواسحٰق پہلی بار ۴۵۹ھ / ۱۰۶۷ء میں مدرسہ نظامیہ بغداد سے متعلق ہوئے اور عرصہ تک درس دیتے رہے۔ پھر ان کی بعض دوسری مصروفیات کی وجہ سے کچھ مدت کے لیے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ دوبارہ ۴۷۶ھ / ۱۰۸۳ء میں مدرس مقرر ہوئے لیکن اس مرتبہ زیادہ دیر یہ خدمت انجام نہ دے سکے کیونکہ اسی سال ان کا آخری وقت آپہنچا اور ۲۱ جمادی الاولیٰ ۴۷۶ھ / ۱۰۸۳ء کی رات کو واصل بحق ہو گئے۔ ان کی وفات کی خبر سن کر سارے بغداد میں حشر برپا ہوگیا اور لوگ جوق در جوق جنازہ میں شریک ہوئے۔ دو مرتبہ نماز ہوئی جس میں خلیفہ مقتدی بامر اللہ اور تمام اکابر سلطنت بھی شریک ہوئے۔ "باب آب زر" میں سپرد خاک کیے گئے۔ عالم اسلام میں ان کی وفات کی خبر مشتہر ہوئی تو لوگوں نے سخت رنج اور دکھ کا اظہار کیا اور شاعروں نے بڑے پُر درد مرثیے لکھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خواجہ موید الملک بن خواجہ نظام الملک نے علامہ کے سوگ میں مدرسہ نظامیہ بغداد تین دن کے لیے بند کر دیا۔ جب نظام الملک نے سنا تو بیٹے پر ناراض ہوا کہ علامہ جیسی شخصیت کے سوگ میں مدرسہ کو ایک سال تک بند رکھنا چاہیے تھا۔

علامہ نے بہت سی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

طبقات الفقہا۔ المہذب فی المذہب۔ تنبیہ فی فروع الشافعیہ۔ لمع۔ تبصرہ۔ النکت۔ المعونہ۔ التلخیص۔

علامہ نے کوئی صلبی اولاد نہیں چھوڑی البتہ معنوی اولاد کی صورت میں ان کے ہزاروں شاگرد موجود تھے جن میں سے بعض کا شمار اپنے دور کے اکابر علماء میں ہوا۔

شیخ الاسلام امام عزّالدین دمشقیؒ

①

مجاہدِ کبیر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ فاتح بیت المقدس ملتِ اسلامیہ کا وہ مایۂ ناز فرزندِ جلیل ہے، جس کے مجاہدانہ کارناموں سے تاریخ اسلام کے اوراق آج تک جگمگا رہے ہیں اور تا ابد جگمگاتے رہیں گے۔ سلطان موصوف جہاں اسلام کا ایک سرفروش سپاہی تھا وہاں علماء و مشائخ کی قدر دانی اور دینی علوم و معارف کی ترویج و اشاعت سے بھی بے انتہا شغف رکھتا تھا۔ یہ اسی کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں جا بجا دینی مدارس کے قیام، علوم دینی کی تحصیل اور ان میں کمال پیدا کرنے کا عمومی رجحان پیدا ہوا۔ اسی دَور میں متعدد ایسی عظیم المرتبت شخصیتیں منظرِ عام پر آئیں جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں لومۃ لائم سے بے نیاز ہو کر دعوت و اصلاح کا عظیم الشان فریضہ انجام دیا اور حکومتِ وقت اور زمانہ کی غلط روش کا نہایت جرأت اور ہمت سے مقابلہ کیا۔ شیخ الاسلام امام عزّالدین دمشقیؒ کا شمار علماءِ حق کی اسی مقدّس جماعت میں ہوتا ہے۔ وہ علم و فضل، زہد و ورع، حق گوئی و بے باکی اور جرأت و استقامت کے اعتبار سے حقیقی معنوں میں شیخ الاسلام اور قرونِ اولیٰ کی ایک نادرۂ روزگار یادگار تھے۔

امام عزّالدینؒ بن عبدالسلام ۵۷۸ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے اور اُس دَور کے سرآمدِ روزگار علماء سے تعلیم حاصل کی ان میں علامہ سیف الدین آمدیؒ، حافظ ابو محمد القاسمؒ اور فخر الدین بن عساکرؒ جیسے اکابر علماء شامل تھے۔ انہوں نے سنِ بلوغت کو پہنچنے سے پہلے ہی قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم دینی میں درجۂ تبحّر حاصل کر لیا اور پھر چند سال کے اندر اندر ان کی شمیمِ علم کی عطر بیزیوں سے تمام عالمِ اسلام مہک اٹھا اور

ان کو "سلطان العلماء" اور امامِ وقت تسلیم کیا گیا۔ ان کے ہم عصر علامہ شیخ جمال الدین بن حاجبؒ (متوفی ۶۴۶ھ) کا قول ہے کہ فقہ میں عزالدین بن عبدالسلام کا پایہ حجۃ الاسلام امام محمد غزالیؒ کے برابر ہے۔ حافظ الذہبیؒ (متوفی ۷۴۸ھ) "کتاب العبر" میں لکھتے ہیں کہ:

"عزالدین علمِ فقہ اور زہد و ورع میں درجۂ کمال پر پہنچے ہوئے تھے اور درجۂ اجتہاد اُن کے رتبہ کے لائق تھا۔"

۲

امام عزالدینؒ کئی سال تک دمشق کے زاویۂ غزالیہ میں درس دیتے رہے اس کے ساتھ ہی وہ جامع اُموی میں خطابت اور امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ الملک الکامل فرمانروائے شام نے ان کو دمشق کا عہدۂ قضا باصرار پیش کیا لیکن انہوں نے اس عہدہ سے بیزاری ظاہر کی البتہ خلیفۂ بغداد کے دربار میں شام کی ایوبی حکومت کا سفیر بننا قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دینے کے بعد دمشق واپس آ گئے اور حسبِ سابق درس و افتاء اور وعظ و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ عوام کے اصرار پر انہوں نے دمشق کا عہدۂ قضا بھی قبول کر لیا۔

امام عزالدینؒ بڑے خوددار، باوقار اور بارعب بزرگ تھے اور اپنے تبحرِ علمی زہد و ریاضت اور حق گوئی کی بنا پر شام کی سب سے بڑی دینی شخصیت متصوّر ہوتے تھے یہاں تک کہ سلاطینِ وقت بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ درباد داری کے جھنجھٹوں سے بالکل آزاد تھے اور بادشاہوں کے درباروں میں حاضری دینا ان کو قطعاً پسند نہیں تھا البتہ کبھی کسی حکمران نے بغرضِ مشاورت ان سے تشریف لانے کی درخواست کی تو تشریف لے گئے اور اس کو صحیح مشورہ دیا۔ انہوں نے اس بات کی کبھی پروا نہ کی کہ ان کا مشورہ بلانے والے حکمران کو پسند آتا ہے یا نہیں کیونکہ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ مسلمانوں اور حکمران کی خیر خواہی ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ الملک الاشرف اور الملک الکامل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اسی زمانے میں الملک الاشرف شدید علیل ہو گیا۔ اس نے اپنے سب سے بڑے

عہدے دار کو امام عزالدینؒ کی خدمت میں یہ پیغام دے کر بھیجا کہ الملک الاشرف آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے اور عیادت و دعا کی درخواست کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو کوئی نصیحت فرمائیں جو آخرت میں اس کے کام آسکے۔

امام موصوف کو یہ پیغام ملا تو باوجود اس کے کہ ایک دفعہ الملک الاشرف ان سے بدسلوکی کر چکا تھا، انہوں نے فرمایا، عیادت ایک افضل عبادت ہے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر ضرور عمل کروں گا۔ چنانچہ وہ الملک الاشرف کے پاس تشریف لے گئے سلطان ان کی تشریف آوری سے بہت خوش ہوا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اپنے کردہ ناکردہ گناہوں کی معافی چاہی اور دعا و نصیحت کی درخواست کی۔ شیخؒ نے فرمایا، جہاں تک معاف کرنے کا تعلق ہے تو میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں باقی رہی دعا تو میں عادل بادشاہ کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہوں، رہی نصیحت تو وہ یہ ہے کہ آپ الملک الکامل سے پنجہ آزمائی کرنے کے بجائے خدا کے دشمن تاتاریوں سے نبرد آزما ہوں جنہوں نے اسلامی ممالک پر یلغار کر رکھی ہے۔ تاتاریوں کو اس بات سے شہ ملی ہے کہ آپ ان کی طرف سے غافل ہیں اور اپنے بھائیوں کے سینوں کو اپنے نیزوں کا ہدف بنا رکھا ہے اگر اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرماتا ہے تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ کے نامۂ اعمال میں یہ سعادت لکھی جائے۔

الملک الاشرف شیخ کی تقریر سے بڑا متاثر ہوا اور کہا، اللہ تعالیٰ اس مخلصانہ نصیحت کا آپ کو اجر عطا کرے اور اپنے فضل و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی معیت نصیب کرے۔

پھر اس نے خزانچی کو حکم دیا کہ ایک ہزار درہم شیخؒ کی نذر کیے جائیں لیکن شیخ نے یہ رقم قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا، میری یہ ملاقات صرف اللہ کی رضا کے لیے تھی میں اس میں دنیا کی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر الملک الاشرف نے اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رخ الملک الکامل کے بجائے تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے قیصرہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالے تاکہ تاتاریوں پر ضرب لگائی

جا سکے۔ سلطان کے اس اقدام سے مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سب لوگ امام عزالدینؒ کو دعائیں دینے لگے کہ انہوں نے سلطان کا ذہن بدل ڈالا۔

(۳)

الملک الاشرف کے جانشین الملک الصالح اسمٰعیل والیٔ دمشق نے ۶۳۷ھ میں اپنے حریف الملک الصالح نجم الدین ایوب شاہ مصر کے خلاف فرنگیوں سے دوستانہ معاہدہ کر لیا اور ان کو نہ صرف صیداء، شتیف اور چند دوسرے قلعوں کا پروانہ لکھ دیا بلکہ کھلے بندوں دمشق میں گھومنے پھرنے کی اجازت بھی دے دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگی بے دھڑک دمشق میں داخل ہوتے تھے اور یہاں سے ہتھیار خرید کرلے جاتے تھے۔ امام عزالدینؒ کو اسمٰعیل کی بے حمیتی سے سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے فتویٰ جاری کر دیا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا حرام ہے کیونکہ وہ اسلام کے دشمن ہیں اور یہی ہتھیار مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خطبہ سے بادشاہ الملک الصالح اسمٰعیل کا نام خارج کر دیا اور اس کے لیے دعا ترک کر دی اس کے بجائے وہ خطبہ سے فارغ ہو کر بڑے جوش اور تضرع کے ساتھ یہ دعا مانگتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ وَاجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔

(اے اللہ! اسلام اور دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں کی مدد اور نصرت فرما اور اعدائے اسلام کو ذلیل فرما اور ہمیں ایسے بے دین گروہ سے بچا)

الملک الصالح اسمٰعیل کو ان واقعات کی خبر ہوئی تو وہ سخت غضبناک ہوا اور شیخ کو عہدہ قضا اور دوسرے دینی مناصب سے معزول کر دیا۔ اسمٰعیل کی ناراضی کے باوجود شیخؒ اپنے موقف پر برابر ڈٹے رہے لیکن جب اسمٰعیل کی بے حمیتی میں المنصور ابراہیم والیٔ حمص بھی شریک ہو گیا اور دمشق و حمص کے مسلمانوں کی بے بسی حد سے گزر گئی تو شیخ سخت بددل ہوئے اور انہوں نے دمشق کی سکونت ترک کر کے مصر جانے کا عزم کیا لوگوں

کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو ان میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ چنانچہ امراء اور اکابرِ شہر کا ایک وفد شیخ رح کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ آپ مصر جانے کا ارادہ ترک کر دیں ہم والیٔ دمشق کو راضی کر لیں گے، آپ صرف اتنا کریں کہ ملک اسمٰعیل کے پاس جا کر اس کی دست بوسی کر لیں۔ شیخ رح نے فرمایا:

"صاحبو! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس آفت سے آزاد رکھا ہے جس میں تم گرفتار ہو۔ لوگو تم کسی اور عالم میں ہو اور میں کسی اور عالم میں۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ امام عزالدین رح نے یہ جواب بادشاہ کے اُس قاصد کو دیا تھا جو اس کا یہ پیغام لایا تھا کہ آپ دربار میں حاضر ہو جائیں تو آپ کو سابقہ خدمات و مناصب پر پورے اعزازات کے ساتھ بحال کر دیا جائے گا — قاصد نے اس پیغام کے ساتھ اپنی طرف سے انہیں، بادشاہ سے اظہارِ نیازمندی کے لیے اس کی دست بوسی کرنے کا مشورہ دیا۔ جب اس نے واپس جا کر بادشاہ کو شیخ کے جواب سے آگاہ کیا تو اس نے حکم دیا کہ شیخ کو گرفتار کر لیا جائے اور انہیں میرے خیمے کے پہلو میں ایک دوسرے خیمے میں محبوس رکھا جائے۔ اس زمانے میں اسمٰعیل نے والیٔ حمص اور فرنگیوں کی معیت میں بیت المقدس میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا اور مصر پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ شیخ نظر بندی کی حالت میں ہر وقت قرآنِ حکیم کی تلاوت میں مصروف رہتے اور بادشاہ کے کان میں اکثر تلاوت کی آواز پڑتی رہتی۔ ایک دن فرنگیوں کا سردار بادشاہ سے ملنے آیا۔ اس وقت شیخ باآوازِ بلند تلاوت کر رہے تھے۔ بادشاہ نے فرنگی قائد سے پوچھا، جانتے ہو یہ کون قرآن پڑھ رہا ہے؟ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بادشاہ نے بڑے فخر سے کہا، یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے اور میں نے اسے اس لیے نظر بند کیا ہے کہ یہ فلاں فلاں قلعے تمہیں دینے کے خلاف تھا۔ میں نے اسے دوسرے عہدوں سے بھی معزول کر دیا ہے۔ عیسائی قائد نے بادشاہ کی باتیں سن کر بے ساختہ کہا، اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے۔

چند دن بعد مصری افواج نے اسمٰعیل اور اس کے حلیفوں کو شکست دے کر شام پر قبضہ کر لیا اور امام عزالدین صحیح وسلامت مصر تشریف لے گئے۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ اسمٰعیل کی شکست سے پہلے ہی مصر چلے گئے تھے۔

(۴)

والیٔ مصر الملک الصالح نجم الدین ایوب نے امام عزالدین کے مصر تشریف لانے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس نے امام موصوفؒ کو مصر کا قاضی القضاۃ اور محکمۂ اوقاف کا سربراہ مقرر کیا اور ساتھ ہی جامع عمروؓ بن العاص کی خطابت بھی ان کے سپرد کی۔ سلطان نے جب مدرسۂ صالحیہ کی بنیاد رکھی تو شیخ کو اس مدرسہ کا استاذِ اعلیٰ (پرنسپل) مقرر کیا۔ دوسرے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ وہ اس منصب کی ذمہ داری بھی پورے انہماک سے نباہتے تھے۔ نجم الدین ایوب اگرچہ اسمٰعیل والیٔ دمشق کو شکست دے کر ولایتِ شام کو بھی اپنے حیطۂ اقتدار میں لا چکا تھا لیکن شیخؒ نے دمشق واپس جانا پسند نہ کیا اور مصر ہی میں مقیم رہ کر بندگانِ خدا کو مستفیض کرتے رہے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنا شیوۂ حق گوئی قائم رکھا اور کسی دینی معاملہ میں کبھی مداہنت یا سکوتِ مصلحت آمیز سے کام نہ لیا۔

ایک دفعہ سلطانی حاجب امیر فخر الدین نے ایک مسجد کی چھت پر طبل خانے کی عمارت بنوائی جس میں نوبت بجائی جاتی تھی۔ شیخ کو علم ہوا تو انہوں نے بحیثیت قاضی و مہتمم مساجد اس عمارت کو فوراً گرانے کا حکم دیا اور امیر فخر الدین کو اس کی تعمیر کے جرم میں ساقط الشہادۃ قرار دیا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے عہدۂ قضا سے استعفا دے دیا، اور عدالت سے اٹھ کر گھر آ گئے۔ ملک الصالح کو خبر ہوئی تو اس نے خود جا کر بالاخانہ کو منہدم کروا دیا اور شیخ کو راضی کر کے دوبارہ مسندِ عدالت پر لایا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ سلطان نے عہدۂ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر بوجوہ مناسب نہ سمجھا تاہم اس کی نگاہ میں ان کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔ اُدھر امیر فخر الدین کا خیال تھا کہ اس کے ساقط الشہادۃ ہونے کے بارے میں شیخ کے اعلان کا اس پر کیا اثر پڑ سکتا ہے لیکن

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی زمانے میں سلطانِ مصر نے خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ کے پاس ایک سفارت بھیجی۔ سفیر نے خلیفہ کی خدمت میں باریاب ہو کر سلطان مصر کا پیغام دیا تو اس نے پوچھا، یہ پیغام تم نے خود سلطان کی زبانی سنا ہے یا کسی اور سے؟ اس نے کہا میں نے یہ پیغام صاحب سلطانی امیر فخرالدین کی زبانی سنا ہے۔ خلیفہ نے فوراً کہا:

"فخرالدین کی زبان کا کہا ہوا معتبر نہیں کیونکہ شیخ عزالدین نے اس کو ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے۔"

چنانچہ سفیر مصر واپس آیا اور براہِ راست سلطان سے پیغام لے کر دوبارہ بغداد گیا۔ اب خلیفہ نے یہ پیغام قبول کر لیا۔

ایک دفعہ الملک الصالح پورے تزک و احتشام کے ساتھ دربار میں بیٹھا تھا کہ شیخ وہاں پہنچے اور بڑے جاہ و جلال کے ساتھ بادشاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے ایوب! تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں سلطنت اس لیے دی تھی کہ اس میں آزادی سے شراب پی جائے؟"

بادشاہ نے پوچھا: "کیا مطلب؟"

شیخ نے فرمایا: "فلاں جگہ شراب آزادی سے بک رہی ہے اور دوسرے فواحشات و منکرات ہو رہے ہیں اور تمہیں خبر ہی نہیں۔"

بادشاہ نے کہا: "یہ سب کچھ میرے والد کے زمانے سے ہو رہا ہے، میرا اس میں کچھ دخل نہیں۔"

شیخ نے کڑک کر فرمایا: "تو پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جو بت پرستی اور فواحش و منکرات سے باز آنے کی تلقین کے جواب میں کہا کرتے تھے کہ یہ سب کچھ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے ہوتا چلا آرہا ہے۔"

بادشاہ یہ سن کر تھرا اٹھا اور اس نے اسی وقت شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کر دیا۔ شیخؒ اپنی قیامگاہ پر واپس آئے تو ایک شاگرد نے پوچھا، حضرت آپ نے بھرے دربار میں بادشاہ کو اس طرح ٹوکا، کیا آپ کو کچھ خوف محسوس نہیں ہوا؟

شیخؒ نے فرمایا: "بادشاہ کی شان و شوکت اور لوگوں کو اس کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ تکبّر کا شکار نہ ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ اس کا علاج میرے نزدیک یہی تھا کہ اس کو بھرے دربار میں اس کی کوتاہی پر متنبّہ کیا جائے۔ اس وقت ہیبتِ الٰہی مجھ پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ بادشاہ مجھ کو ایک بلّی سے بھی حقیر معلوم ہوتا تھا۔"

اس قسم کے متعدد واقعات شیخ کے صحیفہ مسیات کی زینت ہیں۔ فی الحقیقت وہ ایک منارۂ نور تھے جس کی ضیا پاشیوں نے مسلمانانِ شام و مصر کے قلوب کو برسوں تک منوّر رکھا۔ مسلمانوں پر جب کبھی اعدائے اسلام کی یورش ہوئی، شیخ کی ذاتِ بابرکات نے ہمیشہ ان کے لیے ایک مضبوط ڈھال کا کام دیا کیونکہ ان کے ولولہ انگیز مواعظ و خطبات مسلمانوں کے دلوں میں شوقِ جہاد کے شعلے بھڑکا دیتے تھے اور وہ دشمن کے مقابلے میں جان کی بازی لگا دیتے تھے۔

ایک دفعہ فرنگی فوجیں یلغار کرتی ہوئی مصر کے شہر منصورہ تک پہنچ گئیں۔ شیخؒ نے اپنے پُرتاثیر خطبات سے مسلمانوں کی غیرتِ دینی کو اس طرح بیدار کیا کہ وہ دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے اور اس کو عبرتناک شکست دی۔

ایک مرتبہ تاتاریوں کی یورش مصر کے قریب آ پہنچی اور اہلِ مصر پر ہیبت طاری ہو گئی۔ شیخ نے دارالحکومت کے لوگوں کو جمع کر کے ان کے سامنے ایک ولولہ انگیز خطبہ دیا جس میں اسلاف کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کا ذکر کر کے فرمایا، تم اللہ کا نام لے کر میدان میں نکلو، فتح کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا، میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے میں تاجروں سے قرض لینا چاہتا ہوں۔ شیخؒ نے فرمایا، پہلے اپنے محل کے جواہرات اور اپنی بیگمات کے زیورات نکالو اور ارکینِ سلطنت و امرائے دربار بھی اپنی اپنی بیگمات کے وہ زیورات پیش کریں جو ضرورت سے زیادہ ہیں۔ ان کے سکے ڈھلوائے جائیں اور فوج میں تقسیم کیے جائیں۔ بادشاہ نے اسی کے مطابق عمل کیا جس سے لشکر کے حوصلے بلند ہو گئے اور اس نے تاتاریوں کو تباہ کن شکست دے کر پیچھے دھکیل دیا۔

⑤

امام عزالدینؒ فتویٰ دینے میں بہت محتاط تھے اور جب تک کسی مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا نہایت غور و فکر سے جائزہ نہیں لے لیتے تھے فتویٰ صادر نہیں کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک شخص نے خواب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ حضورؐ نے اس سے فرمایا کہ فلاں جگہ جاؤ اور زمین کھودو وہاں خزانہ ہے وہ تم لے لو اور اس میں سے پانچواں حصہ بھی (جو حکمِ شریعت کے مطابق مدفون خزانے کی زکوٰۃ ہوتی ہے) تمہارے ذمہ نہیں۔

صبح ہوئی تو وہ شخص اس مقام پر پہنچا زمین کھودی تو وہاں سے خزانہ مل گیا۔ اب اس شخص نے علماءِ وقت سے استفتا کیا کہ حکمِ شریعت کے مطابق مجھے اس میں سے پانچواں حصہ صدقہ کرنا چاہیے لیکن خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ تمہارے ذمہ نہیں۔ اب میں کیا کروں؟

عموماً علماء نے فتویٰ دیا کہ حضورؐ نے یہ حکمِ شرعی تمہارے حق میں ساقط فرما دیا ہے۔ اب تمہارے ذمہ اس کا خمس واجب الادا نہیں ہے۔ لیکن امام عزالدینؒ نے فرمایا کہ نہیں اس شخص کو خزانہ کا پانچواں حصہ نکالنا چاہیے۔ (بنظرِ احتیاط) کیونکہ خواب میں اس نے جو کچھ سنا ہے اس کا درجہ زیادہ سے زیادہ اس حدیث کے برابر ہوگا جو صحیح اسناد کے ساتھ روایت کی گئی ہو لیکن یہاں اس سے زیادہ اصح روایت اس کی معارض ہے کیونکہ صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیث میں ہے:

"فی الرکاز الخمس"

اور یہ حدیث یقیناً اس خواب کی حدیث سے اصح ہے اور جب صحیح و اصح میں تعارض ہو تو عمل اصح پر کیا جائے گا۔

(سراج المنیر شرح جامع صغیر عزیزیؒ)

(۶)

ایوبیوں کے بعد مملوک برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے بھی امام عز الدینؒ کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہ کی اور وہ بدستور مصر کی سب سے بلند دینی شخصیت تسلیم کیے جاتے رہے۔ ۶۵۸ھ میں الملک الظاہر سلطان رکن الدین بیبرس نے تختِ حکومت پر قدم رکھا تو شیخؒ اسّی برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور برابر اہلِ مصر کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے۔ اس سے پہلے صلیبیوں اور تاتاریوں سے معرکہ آرائیوں کے دوران میں بیبرس نے جو نمایاں کارنامے انجام دیئے تھے ان کی بناء پر وہ شیخؒ کی دلی دعاؤں کا مستحق بن گیا تھا۔ چنانچہ شیخؒ نے اس کے سریر آرائے حکومت ہوتے کا خیر مقدم کیا۔ سلطان پہلے ہی شیخؒ کا عقیدت مند تھا اب وہ ان کا پہلے سے کہیں زیادہ احترام کرنے لگا یہاں تک کہ کوئی کام ان سے مشورہ لیے بغیر نہ کرتا تھا۔ ۶۶۰ھ میں اس نے مصر میں خلافتِ عباسیہ کا احیاء کیا تو جب تک شیخؒ نے نئے خلیفہ المستنصر باللہ کی بیعت نہ کی کسی دوسرے نے اس کی بیعت کے لیے ہاتھ آگے نہ بڑھایا

امام عز الدینؒ نے ۶۶۲ھ میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر چوراسی برس کی تھی۔ ان کی موت کی خبر سن کر سارے عالمِ اسلام میں کہرام مچ گیا۔ الملک الظاہر بیبرس بھی کئی دن تک ان کی موت کے صدمے سے نڈھال رہا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ شیخ عز الدین کی زندگی میں حکومت کے سربراہ وہی تھے۔ ان کی وفات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک پہاڑ میرے سر پر رکھ دیا گیا ہے۔ حقیقت میں میری حکومت ان کی موت کے بعد شروع ہوئی۔

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت شمس تبریزیؒ

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نشد

①

ملتان میں ایک مزار حضرت شمس تبریزیؒ کے نام سے منسوب ہے یورپین مؤرخین اسے حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے مرشد شمس تبریزی کا مزار بتاتے ہیں اور عوام میں بھی یہی خیال مشہور ہو گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملتان والے شمس تبریزی اور ہیں اور مولانا رومؒ کے مرشد شمس تبریزیؒ اور۔ ملتانی شمس کو تین سو برس کا عرصہ گزرا ہے اور مرشد مولانا رومؒ شمس تبریزیؒ ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ شمس تبریزیؒ سے متعلق اپنے ایک مضمون میں خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم یوں رقمطراز ہیں کہ

"ملتانی شمس تبریزی کو تین سو برس کا عرصہ گزرا۔ یہ اسمٰعیلی فرقہ کے داعی بن کر ہندوستان میں آئے۔ ان کے ہمراہ دو شخص اور تھے۔ ایک کا نام پیر صدر الدین تھا اور دوسرے کا پیر امام الدین۔ صدر الدین نے اضلاع سندھ و بمبئی میں دعوت شروع کی، اور امام الدین نے گجرات و کاٹھیاواڑ میں۔ شمس الدین سیدھے پنجاب چلے آئے اور یہاں اپنا مشن جاری کیا۔ سندھ و بمبئی میں جس قدر آغا خانی خوجے ہیں وہ سب صدر الدین کی کوشش سے مسلمان ہو کر آغا خانی (اسمٰعیلی) جماعت میں شامل ہوئے ہیں۔ امام الدین نے اوّل اوّل تو بحیثیت اسمٰعیلی داعی کے کام کیا مگر چند روز کے بعد خود مختار ہو کر اپنا ایک علیحدہ طریقہ امام شاہی جاری کر دیا۔

شمس الدین تبریزی نے جن کا مزار ملتان میں ہے پنجاب کے کہاروں اور سناروں میں اپنا طریقہ رائج کیا اور ان لوگوں کو شمسی ہندو کا لقب دیا۔ یہ شمسی ہندو براہ راست آغا خاں کے معتقد بنائے گئے ہیں اور سالانہ نذرونیاز اب تک آغا خاں ہی کو دیتے ہیں۔ ان کی تعداد تین لاکھ کے قریب ہو یہ پنجاب میں ہے۔

ملتانی شمس تبریزی نے کن طریقوں سے اپنا عقیدہ پھیلایا اور کیسے کیسے عجیب و غریب واقعات عوام کی زبانوں پر ان کی نسبت مشہور ہیں ان کے لکھنے کو ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ بالفعل یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت شمس تبریزی کو اسمٰعیلی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اسمٰعیلی شمس تبریز ملتان میں اور مولانا والے شمس تبریز سے سینکڑوں برس بعد ہوئے ہیں۔

ملتانی شمس تبریزی کی نسبت یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ معتبر ذرائع سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ پنجابی سوداگروں کے بزرگ بھی انہیں شمس کی کوشش سے مسلمان ہوئے تھے۔ شمس تبریز ملتانی کی تحریک سے ان میں اسلامی میلان پیدا ہوا اور مابعد کے فقراء نے اس میلان کو استوار کر دیا۔ اگر شمسی ہندوؤں کے لیے بھی کوشش کی جاتی تو آج وہ ادھر حالت میں نہ رہتے۔ کہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ اب بھی مشائخ و فقراء کو موقع ہے کہ وہ اس ضروری کام کی جانب توجہ کریں۔"

(نظام المشائخ دہلی ستمبر ۱۹۱۰ء)

(۲)

شمس تبریز گر خدا خواہی　　خوش بخواں لا الہ الا اللہ

صاحبِ مثنوی مولینا جلال الدین رومیؒ کے مرشد گرامی حضرت شیخ شمس الدین محمد تبریزیؒ کو دنیائے تصوف میں لازوال شہرت حاصل ہے۔ وہ ساتویں صدی ہجری کے مشائخ کبار سے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کو شیخ الاسلام، مرجع خاص و عام، قطب المحققین، امام السالکین،

برہانِ راہِ طریقت، شاہِ میدانِ حقیقت، ہادیٔ راہِ یقین وغیرہ جیسے عظیم القاب سے یاد کیا ہے۔

حضرت شمس تبریزیؒ کی زندگی کے گرد عجیب و غریب روایات کا ایسا تانا بانا بنا ہوا ہے کہ اصل حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ تاہم مختلف تذکروں میں ان کے جو حالات درج ہیں ان کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت شمس تبریزی کا اصلی نام شمس الدین محمد تھا۔ تذکرہ دولت شاہ کی روایت کے مطابق ان کے والد کا نام "خاوند جلال الدین"[1] تھا۔ جو فرقہ اسمٰعیلیہ (ملاحدۂ باطنیہ) "کیا بزرگ" کی اولاد سے تھے۔ انہوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا اور ملاحدہ کی تمام کتب و رسائل کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ انہوں نے تحصیلِ علم کے لیے اپنے فرزند کو تبریز بھیجا۔

بعض دوسری روایات میں ہے کہ شمس تبریزی "کیا بزرگ" کے خاندان سے نہیں تھے۔ بلکہ خاص تبریز کے رہنے والے تھے اور ان کے والد کا نام علی بن مالک تھا جو بزازی کا پیشہ کرتے تھے۔

علومِ ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت شمس مرشدِ کامل کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ یہ مرشد انہیں بابا کمال جندیؒ کی ذات میں مل گیا۔ بعض نے ان کے مرشد کا نام شیخ الشیوخ عارف رکن الدین سنجابیؒ اور شیخ ابوبکر سلہ باف تبریزی بھی لکھا ہے۔ مرشد نے انہیں راہِ سلوک کی تمام منازل طے کرا کر درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ حضرت شمس تبریزیؒ اپنی زندگی کے اس دور کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> "اس وقت میں عشقِ رسولؐ میں اس قدر محو تھا کہ کئی کئی دن کا فاقہ گزر جاتا اور مجھے مطلق بھوک محسوس نہ ہوتی۔ کبھی میرے والدین اور عزیز و اقارب مجھے کچھ دینا چاہتے تو میں اشارے سے منع کر دیتا تھا۔"

---

[1] "سوانح مولوی روم" میں علامہ شبلیؒ نے حضرت شمس تبریزیؒ کے والد کا نام علاؤ الدین لکھا ہے۔

علومِ باطنی میں تکمیل کے بعد شمس تبریزیؒ نے سیاحت اختیار کی۔ ان کا لباس محض ایک سیاہ کمبل ہوتا تھا۔ جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے سارا وقت یادِ الٰہی میں گزارتے۔ گزراوقات کے لیے کسی وقت چند ازاربند بُن لیتے اور انہیں فروخت کر دیتے۔ اپنی طویل سیاحت کے دوران میں وہ مختلف ممالک میں گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مرشد بابا کمال جندیؒ بغداد میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ شمس تبریزیؒ بغداد میں ایک مدّت تک ان کی خدمت میں مقیم رہے۔ یہاں ان کی حضرت خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے مریدِ خاص اور داماد صوفی شاعر شیخ فخرالدین عراقیؒ سے خوب صحبتیں رہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت شمس تبریزیؒ ہمیشہ ایک ایسے ظرف والے مرید کی جستجو میں رہتے تھے جو ان کی صحبت کا متحمل ہو سکے۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں نہایت خشوع وخضوع سے ایک ایسے مرید کے ملنے کی دُعا مانگی۔ الہام ہوا کہ روم جاؤ وہاں تمہاری مراد برآئے گی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق وہ اپنے مرشد کے حکم سے ایک دل سوختہ کو گرم کرنے کے لیے روم کی طرف روانہ ہوئے۔

(۳)

حضرت شمس تبریزیؒ اشارۂ غیبی یا مرشد کے حکم کے مطابق سیدھے ارضِ روم کے مرکزی شہر قونیہ پہنچے۔ اور وہاں شکر فروشوں کی سرائے میں قیام کیا۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کو ان کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا۔ تو علماء و فضلاء اور اپنے شاگردوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی ملاقات کے لیے چلے۔ شمسؒ سرائے کے باہر ایک چبوترے پر بیٹھے تھے۔ ان کی نظر مولانا رومؒ پر پڑی تو سمجھ گئے کہ یہی وہ دل سوختہ ہے جس کی نسبت مجھے اشارہ ہوا ہے۔ دونوں بزرگ بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ملے۔ دورانِ گفتگو میں حضرت شمسؒ نے مولانا رومؒ سے فرمایا کہ "شیخ بایزید بسطامیؒ کو ایک طرف تو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی پابندی کا یہ التزام تھا کہ ساری عمر میں انہوں نے خربوزہ اس خیال سے نہیں کھایا کہ معلوم نہیں کہ حضورؐ نے اس کو کس طرح کھایا ہے لیکن دوسری طرف وہی بایزید بسطامیؒ اپنی نسبت فرماتے تھے" سبحانی ما اعظم شانی " یعنی اللہ اکبر

میری شان بہت بڑی ہے۔ حالانکہ خود سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم جو باعث تکوین روزگار ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں دن میں ستر بار استغفار کرتا ہوں۔ آپ حضرت بایزید کی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کی کیا توجیہ کرتے ہیں۔"

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ اس سوال کی ہیبت سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہفت افلاک ایک دوسرے سے جدا ہو کر زمین پر گر پڑے ہیں اور ایک شعلہ میرے دل سے نکل کر دماغ تک پہنچا ہے اور دھواں میرے سر سے نکل کر عرش تک جا رہا ہے۔ تاہم میں نے دل کڑا کر کے جواب دیا کہ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و اولیاء کے سردار ہیں ان کے سامنے حضرت بایزید بسطامیؒ کی کیا ہستی ہے۔ فی الحقیقت حضرت بایزیدؒ کی پیاس ایک یا دو گھونٹ کی محتاج تھی وہ اسی سے بجھ گئی اور وہ ایک خاص مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ اس مقام کی رفعتِ شان ان کی زبان سے سبحانی ما اعظم شانی جیسے الفاظ نکلوا دیتی تھی لیکن خیر البشر احمد مجتبیٰؐ کے مقامِ رفیع کے سامنے حضرت بایزیدؒ کے مقام کی کیا حقیقت ہے۔ حضورؐ تو جوں جوں معرفت و حقیقت کا پانی پیتے تھے تشنگی بڑھتی جاتی تھی۔ حضورؐ کی عظمت و شان کی کوئی حد نہ تھی۔ آپ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کا مصداق تھے۔ جب حضورؐ ایک منزل سے دوسری منزل پر پہنچتے تو پہلی منزل اس قدر پست نظر آتی تھی کہ آپ اس سے استغفار کرتے تھے۔

یہ جواب سن کر حضرت شمس تبریزیؒ کو یقین ہو گیا کہ مولانا ان کا مرید بننے کی پوری پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مولانا رومؒ کو سینے سے لگا لیا اور اپنے فیوض باطنی سے اس طرح نوازا کہ ان کی حالت میں تغیرِ عظیم پیدا ہو گیا اور وہ "قال" سے "حال" میں آ گئے۔

حضرت شمس تبریزیؒ اور مولانا رومؒ کی پہلی ملاقات کی نسبت دو روایتیں اور ہیں۔ ایک یہ کہ مولانا رومؒ جب علماء و فضلاء کے ایک جم غفیر کے ہمراہ حضرت شمسؒ کی قیام گاہ پر پہنچے تو انہوں نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور پوچھا:

"مولانا مجاہدہ و ریاضت کا مقصود کیا ہے؟"

مولانا نے فرمایا: "خدا اور رسول کے احکام کی پابندی"

؎ شریعت را مقدم دار اکنوں حقیقت از شریعت نیست بیروں

حضرت شمسؒ نے فرمایا: "یہ تو عام بات ہے۔ اصل مقصد بتاؤ؟"

مولانا نے کہا۔ "مجھے تو اس کے سوا اور کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔"

حضرت شمسؒ نے فرمایا: "اس کا مقصد یہ ہے کہ تم کو منزل تک پہنچا دے۔ اس کے بعد حکیم سنائیؒ کا یہ شعر پڑھا ؎

علم کز تو ترا نہ بستاند جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا رومؒ حضرت شمس تبریزؒ کے ارشادات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ مولانا رومؒ ایک دن ایک حوض کے کنارے بیٹھے تھے۔ پاس ہی کچھ کتابیں رکھی تھیں۔ حضرت شمسؒ پھرتے پھراتے ادھر آ نکلے اور مولانا سے پوچھا:

"یہ کیسی کتابیں ہیں؟"

مولاناؒ نے فرمایا: "یہ قیل و قال کا سامان ہے۔ آپ کو اس سے کیا سروکار؟"

حضرت شمس تبریزیؒ نے معاً ساری کتابیں اٹھا کر اس حوض میں پھینک دیں۔ مولانا رومؒ کتابوں کو اس طرح ضائع ہوتے دیکھ کر نہایت دلگیر ہوئے اور متاسفانہ لہجہ میں فرمایا: "آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ ایسی نادر و نایاب کتابوں کو برباد کر دیا۔ ان میں علم و حکمت کے نایاب موتی بکھرے پڑے تھے۔"

شمس تبریزؒ مولانا رومؒ کا غیظ و غضب اور رنج و الم دیکھ کر مسکرا دیئے اور پھر حوض میں ہاتھ ڈال کر ساری کتابیں باہر نکال دیں۔ ان کا ایک ورق تک نہیں بھیگا تھا اور پانی میں ڈالنے سے پہلے کی طرح خشک تھیں۔

مولانا رومؒ یہ واقعہ دیکھ کر دم بخود ہو گئے اور کہنے لگے:

"یہ عجیب معاملہ ہے۔"

حضرت شمس تبریزؒ نے فرمایا:

"مولانا یہ حال کی باتیں ہیں۔ تم کو ان سے کیا سروکار۔"

مولانا رومؒ نے بے اختیار حضرت شمسؒ کے قدم چوم لیے اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی[1]

(۴)

حضرت شمس تبریزیؒ سے بیعت کے بعد مولانا رومؒ نے اپنے تمام اشغال ترک کر دیئے۔ مرشد کے ساتھ انہیں ایسا حسنِ عقیدت اور اخلاص پیدا ہوا کہ ہر وقت ان کی خدمت میں رہنے لگے۔ درس و تدریس اور وعظ دارشاد کو یکسر موقوف کر دیا۔ اس عالم میں انہوں نے حضرت شمسؒ کے ساتھ ایک حجرہ میں باختلافِ روایت چھ ماہ یا تین ماہ تک چلّہ کشی کی اس عرصہ میں مرشد اور مرید دونوں صائم رہے۔ حجرہ میں سوائے شیخ صلاح الدین زرکوبؒ[2] کے اور کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ حضرت شمسؒ کی صحبت سے پہلے مولینا رومؒ کو سماع سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اب مرشد کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ سماع سے حد درجہ کا شغف پیدا ہو گیا۔ مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں انہوں نے لوگوں سے گفتگو بھی ترک کر دی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں حضرت شمسؒ کے خلاف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کوئی انہیں ساحر کہتا اور کوئی گمراہ اور دیوانہ۔ یہاں تک کہ مولانا کے خاص شاگرد اور مرید بھی حضرت شمسؒ سے برہم ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی طرف سے مولانا کی بے توجہی کا باعث صرف شمسؒ کا وجود ہے۔ اگر وہ یہاں سے چلے جائیں تو وہ پھر مولانا کی صحبتوں سے مستفیض ہوں گے۔ حضرت شمسؒ کو لوگوں کی برہمی کا

---

[1] سوانح مولوی رومؒ میں علامہ شبلیؒ نے ان دونوں روایتوں کو صحیح ماننے سے انکار کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ یہ روایتیں نہایت مستند کتابوں میں درج ہیں۔

[2] شیخ صلاح الدین زرکوبؒ مولانا رومؒ کے ہمعصر تھے۔ وہ مولینا رومؒ کے استاد سید برہان الدین محقق کے شاگرد تھے اور مقامِ ولایت پر فائز تھے۔ مولانا رومؒ اور ان کے درمیان شروع ہی سے رشتۂ اخلاص و مودت تھا۔ شمس تبریزیؒ کی گمشدگی کے بعد وہی مولینا روم کے محرم راز اور رفیق تھے۔ مولانا نے اپنے متعدد اشعار میں شیخ صلاح الدین کا ذکر نہایت محبت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ شیخ زرکوبؒ کی وفات پر مولانا نے نہایت پُر درد مرثیے اور غزلیں کہیں۔

حال معلوم ہوا تو ایک دن وہ چپکے سے قونیہ کی سکونت ترک کرکے دمشق چلے گئے۔
مولانا کے لیے مرشد کی جدائی نا قابلِ برداشت ثابت ہوئی۔ انہوں نے مریدوں شاگردوں اور دوسرے لوگوں سے یکسر قطع تعلق کر لیا۔ اور گوشۂ تنہائی میں دن رات فراقِ مرشد میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپا کرتے۔
اس زمانہ میں انہوں نے حضرت شمسؒ کی یاد میں ایسے پُر درد اشعار کہے جنہیں سُن کر پتھروں کا کلیجا بھی پانی ہو جاتا تھا۔ عرصۂ دراز کے بعد حضرت شمسؒ نے مولانا کو دمشق سے خط لکھا۔ اس خط نے مولانا کی آتشِ شوق و محبت کو اور بھڑکا دیا اور ان کی حالت دگرگوں ہو گئی۔
قونیہ کے لوگ اب سخت نادم اور پشیمان ہوئے۔ جو کچھ انہوں نے سوچا تھا نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ جن لوگوں نے حضرت شمسؒ کی مخالفت میں خاص حصہ لیا تھا وہ دست بستہ مولانا روم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عفوِ تقصیر کے خواہاں ہوئے۔ اور بقول سلطان ولد (پسر مولانا روم) یوں گویا ہوئے۔

ہمہ گریاں بہ توبہ گفتہ کہ وائے | عفوِ ما کن ازیں گناہ خدائے
قدر او از عمیٰ ندانستیم | کہ بدو پیشوا ندانستیم
توبہ ہا مے کنیم رحمت کن | گر دگر ایں کنیم لعنت کُن

مولانا نے فرمایا کہ میرے دل کو صرف اسی صورت میں قرار آ سکتا ہے کہ تم لوگ دمشق جا کر حضرت شمسؒ سے معافی مانگو اور نہایت عزت و احترام سے انہیں قونیہ لاؤ۔
مولانا کی خواہش کے مطابق بیس آدمیوں کا ایک قافلہ سلطان ولد کی سرکردگی میں حضرت شمس کو لانے کے لیے عازمِ دمشق ہوا۔ مولانا نے شمسؒ کے نام ایک منظوم خط لکھا اور سلطان ولد کو ہدایت دی کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے حضرت شمسؒ کی خدمت میں پیش کریں۔ اس منظوم خط کے پُرسوز اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

بہ خدائیکہ در ازل بودہ ست | حی و دانا و قادر و قیوم
نور او شمعہائے عشق افروخت | تا بشد صد ہزار سر معلوم

از یکے حکم او جہاں پر شد — عاشق و عشق حاکم و محکوم
در طلسماتِ شمس تبریزی — گشت گنج عجائبش مکتوم
کہ ازاں دم کہ تو سفر کردی — از حلاوت جدا شدیم چو موم
ہمہ شب ہمچو شمع مے سوزیم — ز آتشے جفت و انگبیں محروم
در فراق جمال تو مارا — جسم ویران و جان ہمچوں بوم
آں عناں را بدیں طرف برتاب — زفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال — ہمچوں شیطاں طرب شدہ مرجوم
یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد — تا رسد آں بہ مشرقہ مفہوم
پس بذوقِ سماعِ نامۂ تو! — غزلے پنج و شش بشد منظوم
شام از نورِ صبح روشن باد — اے بتو فخر شام وارمن و روم

اس خط کے ساتھ ایک غزل بھی لکھ کر بھیجی اور ایک ہزار دینار سرخ حضرت شمسؒ کی نذر کے لیے بھیجے۔ یہ قافلہ دمشق جاکر حضرت شمسؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مولانا روم کا خط، غزل اور نذر پیش کی۔

حضرت شمسؒ نے مسکرا کر فرمایا: ع

بہ دام و دانہ نگیرند مرغ دانا را

پھر فرمایا: "مولانا کا خط ہی کافی ہے اس نذر کی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد اس قافلہ کو چند دن اپنے پاس مہمان رکھا اور پھر سب کو ساتھ لے کر قونیہ کے لیے روانہ ہوئے۔ سلطان ولد ان کی سواری کے ساتھ پا پیادہ قونیہ تک آئے۔ مولانا کو ان کی تشریف آوری کی اطلاع ملی تو انہوں نے اپنے تمام مریدوں، شاگردوں اور دوستوں کو ساتھ لیا اور شہر سے باہر جاکر نہایت دھوم دھام سے حضرت شمسؒ کا استقبال کیا۔ کہتے ہیں کہ اس دن قونیہ مردوں سے خالی ہوگیا تھا۔ مولانا روم اور حضرت شمسؒ دیر تک بغل گیر رہے۔ دونوں کی آنکھوں سے اشکِ مسرت رواں تھے۔ اس کے بعد قوال اور خدام غزلیں گاتے اور چرخ لگاتے شہر کی طرف روانہ ہوئے ؎

عالم از تو زندہ گشت و بر فروز
اے عجب آں روز روز افروز روز

حضرت شمسؒ کی مراجعت سے مولانا رومؒ کو گویا حیاتِ تازہ مل گئی پھر وہی راز و نیاز کی صحبتیں گرم ہو گئیں۔

(۵)

مولانا رومؒ نے کیمیا خاتون نامی ایک لڑکی پالی تھی۔ انہوں نے اس لڑکی کا نکاح حضرت شمسؒ سے کرا دیا اور اپنے مکان کے سامنے حضرت شمسؒ اور ان کی زوجہ کے لیے ایک خیمہ نصب کرا دیا۔ مولانا رومؒ کے ایک صاحبزادے علاؤالدین محمد حضرت شمسؒ سے خار کھاتے تھے۔ وہ جب مولانا سے ملنے آتے تو خواہ مخواہ اس خیمہ کے اندر سے ہو کر گزرتے حضرت شمسؒ کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزرتی۔ انہوں نے علاؤالدین محمد کو تنبیہ کی کہ اس حرکت سے باز رہیں۔ اس پر وہ حضرت شمسؒ کے سخت دشمن بن گئے اور دوسرے لوگوں کو بھی ان کے خلاف بھڑکایا۔ حاسدانِ تیرہ بخت میں حضرت شمسؒ کے خلاف پھر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وہ لوگ حضرت شمسؒ کے سامنے بھی گستاخیاں کرنے لگے۔ مولانا اس صورتِ حال سے سخت آزردہ ہوئے۔

مندرجہ ذیل شعر ان کی دلی کیفیت کے آئینہ دار ہیں ؎

باز گستاخاں ادب بگذاشتند　　تخم کفران و حسدہا کاشتند
خویش را کشتند و کشتند از ہوس　　آنچہ کشتند آں چناں بر داشتند

جب حضرت شمسؒ کے خلاف مخالفت کی آگ خوب بھڑک اٹھی تو ایک دن وہ دفعتًہ غائب ہو گئے۔ ہر چند ان کی تلاش کی گئی لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر مولینا اپنے چند خاص مریدوں کے ہمراہ مرشد کی تلاش میں دمشق تشریف لے گئے۔ ایک مدت تک وہاں مقیم رہے۔ صبح و شام حضرت شمسؒ کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اس عرصہ میں انہوں نے پر درد فراقیہ اشعار کہے۔ مثلًا ؎

خبر رسید بشام است شمس تبریزیؒ　　چہ صبح ہا کہ نماید اگر بشام رود

یا ہے

ما عاشق و سرگشتہ و شیدائے دمشقیم　　　جاں دادہ و دل بستہ سودائے دمشقیم

اہل قونیہ مولانا رومؒ کی غیر حاضری سے سخت مضطرب تھے۔ آخر انہوں نے ایک محضر نامہ تیار کیا اور ایک وفد مولانا کو بلانے دمشق بھیجا۔ مولینا ان لوگوں کی منت وسماجت اور اصرار سے مجبور ہو کر واپس قونیہ تشریف لے آئے۔

حضرت شمسؒ کو اس واقعہ کے بعد پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ ان کی گم شدگی آج تک اسرار کے دھندلکوں میں مستور ہے۔ لیکن اکثر تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ حضرت شمسؒ کو بعض حاسدوں نے موقع پا کر شہید کر ڈالا اور ان کی نعش غائب کر دی۔

مولانا جامیؒ نے "نفحات الانس" میں لکھا ہے کہ حضرت شمسؒ کو مولانا کے صاحبزادے علاؤالدین محمد نے شہید کیا۔ مولانا کو بھی اس پر شک ہو گیا تھا چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب وہ سخت بیمار ہو کر فوت ہو گیا تو مولانا نہ تو اس کی عیادت کے لیے گئے اور نہ اس کے جنازے میں شرکت کی۔ حضرت شمسؒ کی شہادت یا گمشدگی کا واقعہ ۶۴۵ھ میں پیش آیا۔

"مراۃ جہاں نما" میں ان کی تاریخ وفات (یا گمشدگی) اس طرح درج ہے ؎

ز بعد آہ شمس الدین و الحق　　　دگر تاریخ شد بود او ز تبریز
۶۴۵

ایک دیوان جس میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہیں شمس تبریزیؒ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مسٹر آر۔ اے نکلسن نے اس دیوان کی بہت سی غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اہل یورپ اس دیوان کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یورپ کی کئی دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں لیکن محققین کے نزدیک یہ دیوان فی الحقیقت مولانا رومؒ کا کلام ہے۔ مولانا نے مرشد سے والہانہ محبت کی وجہ سے مقطع میں جگہ جگہ ان کا نام لیا ہے۔ اس لیے لوگ غلطی سے اسے حضرت شمس تبریزیؒ کا کلام سمجھنے لگے۔

مولانا جلال الدّین محمّد رُومی رحمۃ اللہ علیہ

"تاریخِ اسلام میں جن شخصیتوں نے عالمِ اسلام پر بہت گہرا اور دیرپا اثر ڈالا ہے اور افکار و خیالات، علم و ادب اور قلب و دماغ کو صدیوں متاثر رکھا ہے، ان میں مولانا جلال الدین رومیؒ کا خاص مقام ہے۔ ان کی زندۂ جاوید "مثنوی" درحقیقت ساتویں صدی کے عقلی بحران کے خلاف قلب و روح کی ایک دلکش صدائے احتجاج ہے۔ وہ صرف تصوّف کی کتاب نہیں ہے (جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے) بلکہ علمِ کلام کی ایک مجتہدانہ تصنیف ہے بلکہ نئے علمِ کلام اور نئے طرزِ استدلال کی بنیاد ہے جو متکلمین کے علمِ کلام کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دلنشین اور یقین آفریں ہے اور اس سے اسلامی فکر و ادب میں نئے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔"

(سیّد ابوالحسن علی ندوی)

نام و لقب نام محمد لقب جلال الدّین اور عرف مولانائے روم تھا۔

جائے ولادت مولانا رومؒ کی جائے ولادت بالاتفاق بلخ ہے۔

سالِ ولادت مولانا کا سالِ ولادت تمام تذکرہ نگاروں نے ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۸ء لکھا ہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ اس سال ۶ ربیع الاوّل کو پیدا ہوئے۔

خاندان مولانا رومؒ کا شجرۂ نسب سات واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

ابوبکر صدیق رض
|
عبدالرحمن رض
|
عبداللہ
|
مسیّب
|
قاسم
|
احمد
|
جلال الدین حسین خطیب البلخی
|
بہاؤالدین محمد
|
جلال الدین محمد (مولانا روم ؒ)

مولانا روم ؒ کے والد کا نام بھی محمد تھا اور لقب بہاؤالدین۔ ان کا وطن بلخ تھا۔ اپنے علم و فضل اور تقوے کی وجہ سے ان کا شمار اس دور کے سر آمد روزگار پیشوایانِ دین میں ہوتا تھا۔ بہاؤالدین کی والدہ سلطان محمد خوارزم شاہ کی بیٹی تھی[1]۔ اس لحاظ سے مولانا روم ؒ کے خون میں شاہی خون بھی شامل ہو گیا تھا۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مولانا کے دادا حسین بھی ایک صاحبِ حال بزرگ تھے اور یہی وجہ تھی کہ سلطان محمد خوارزم شاہ جیسے پُر ہیبت اور صاحبِ جاہ و جلال بادشاہ نے ان کو اپنا داماد بنانے میں فخر محسوس کیا۔ مولانا بہاؤالدین ؒ ایک سحر البیان خطیب تھے۔ سلطان محمد خوارزم شاہ یوں تو مولانا بہاؤالدین ؒ کا معتقد تھا اور گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا لیکن عوام الناس میں ان کی بے پناہ مقبولیت کو دیکھ کر اس کے دل میں کچھ بدظنی سی پیدا ہو گئی۔ مولانا اس کے وسوسہ کو بھانپ گئے اور بلخ سے ہجرت کر کے ۶۱۰ھ میں نیشاپور پہنچے

---

[1] محمد خوارزم شاہ بڑا با اقتدار بادشاہ تھا۔ خراسان سے لے کر ایران، ماوراء النہر، کاشغر اور عراق تک اس کے زیرِ نگین تھے۔ بدقسمتی سے اس نے ۶۱۶ھ میں تاتاریوں سے شکست کھائی اور بالآخر ناکامی کی حالت میں ۶۱۷ھ میں وفات پائی۔

اور پھر وہاں سے بغداد تشریف لے گئے۔ وہاں مدتوں قیام رہا اور ہزارہا لوگ ان کے علم و فضل سے مستفیض ہوئے۔ چند سال بعد ان کا دل بغداد سے اچاٹ ہو گیا اور وہاں سے براہِ حجاز شام و زنجان "آق شہر" پہنچے۔ یہاں ایک سال قیام کیا اور پھر لارندہ جا کر سکونت اختیار کر لی۔ وہاں ان کے قیام کو سات برس گزر گئے تو ارض روم (ایشیائے کوچک) کے سلجوقی فرمانروا علاؤالدین کیقباد نے ان کو باصرار قونیہ آنے کی دعوت دی۔ شیخ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور لارندہ سے قونیہ کو روانہ ہوئے۔ قونیہ کے باہر سلطان علاؤالدین کیقباد نے بڑی شان و شوکت اور گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان کے گھوڑے کے ساتھ پیادہ پا چل کر شہر کے اندر لایا پھر ایک عظیم الشان مکان ان کی رہائش کے لیے وقف کر دیا اور آرام و فراغت کے تمام لوازم مہیا کر دیئے۔ سلطان اکثر مولینا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور فیض صحبت اٹھاتا تھا۔ جب شیخ بہاؤالدینؒ کو قونیہ میں قیام کیے تین برس گزر گئے تو وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور ۱۸ ربیع الثانی ۶۲۸ھ کو جمعہ کے دن داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت مولانا رومؒ کی عمر چوبیس برس کی تھی۔ چھ سات برس پہلے جب وہ اپنے والد کے ساتھ لارندہ میں مقیم تھے، ان کی شادی ہو چکی تھی۔ بیوی کا نام گرا خاتون تھا جو لارندہ کے ایک معزز امیر خواجہ شرف الدین سمرقندی کی صاحبزادی تھیں۔ ایک سال بعد ان کے بطن سے مولانا کے فرزند سلطان ولد پیدا ہوئے۔ گویا والد کی وفات کے وقت مولانا رومؒ عیالدار ہو چکے تھے۔

تعلیم و تربیت مولانا رومؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے عظیم المرتبت والد شیخ بہاؤالدینؒ سے حاصل کی۔ پھر والد نے مولانا کو اپنے ایک مرید سید برہان الدین محقق ترمذیؒ کے سپرد کر دیا۔ وہ ایک بلند پایہ عالم اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ انہوں نے چند سال کے اندر اندر مولانا کو تمام علوم و فنون میں طاق کر دیا۔

شیخ بہاؤالدینؒ نے جس سال وفات پائی اس سے اگلے سال ۶۲۹ھ میں مولانا رومؒ حلب اور دمشق تشریف لے گئے جو اس زمانے میں ہر قسم کے علوم و فنون کے مرکز

تھے۔ مولانا وہاں کئی برس تک مقیم رہ کر تحصیلِ علم کرتے رہے یہانتک کہ قرآن، حدیث، تفسیر، معقول، منطق، فلسفہ اور دوسرے تمام علوم میں درجۂ کمال تک پہنچ گئے۔ تکمیلِ علوم کے بعد مولانا وطن واپس تشریف لائے۔ ان کے استاد سیّد برہان الدینؒ بھی اپنے وطن ترمذ سے قونیہ آ گئے تھے۔ انہوں نے مولانا کو سینے سے لگا لیا اور پھر نو برس تک ان کو طریقت اور سلوک کی تعلیم دیتے رہے۔ بعض تذکروں میں ہے کہ مولانا ان کے حلقۂ ارادت میں بھی داخل ہو گئے تھے۔ تاہم ان پر ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا۔ سماع سے پرہیز کرتے تھے اور اپنا اکثر وقت درس و تدریس، وعظ و ہدایت اور فتوے نویسی میں صرف کرتے تھے۔ تا آنکہ ان کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔

شمس تبریزیؒ سے ملاقات

۶۴۲ھ میں حسنِ اتفاق سے حضرت شمس تبریزیؒ قونیہ تشریف لائے۔ مولانا رومؒ کی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک حجرہ میں مولانا کی چلّہ کشی، حضرت شمس تبریزیؒ کا قونیہ چھوڑ کر دمشق چلے جانا، دمشق سے ان کی قونیہ کو واپسی اور دائمی مفارقت۔ یہ سب حالات حضرت شمس تبریزیؒ کے تذکرہ میں بیان کر دیئے گئے ہیں ـــــ یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

صلاح الدین زرکوبؒ کی رفاقت

حضرت شمسؒ کے بعد مولانا نے شیخ صلاح الدین زرکوبؒ کو اپنا محرمِ راز اور رفیقِ خاص بنا لیا۔ وہ ابتدا سے صاحبِ حال تھے اور مولانا کے پیر بھائی تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ اپنی دکان میں چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے کہ مولانا دکان کے سامنے سے گزرے۔ ہتھوڑی کی آواز نے ان پر سماع کا اثر کیا اور وہ بے خود ہو کر وہیں رقص کرنے لگے۔ گھنٹوں یہ کیفیت جاری رہی۔ پھر شیخ زرکوبؒ دکان سے باہر نکل آئے۔ مولانا ان سے بغل گیر ہو گئے اور عالمِ بے خودی میں دن ڈھلنے تک یہ شعر پڑھتے رہے ؎

یکے گنجے پدید آمد درآں دکانِ زرکوبی　　زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہے خوبی

شیخ زرکوبؒ نے اسی وقت ساری دکان لٹوا دی اور اپنے آپ کو ہمہ تن مولانا

کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ اس دن کے بعد وہ مرتے دم تک دکان پر نہ بیٹھے اور مسلسل دس برس تک مولانا کے ہم جلیس و ہمراز رہے۔ اس دوران میں مولانا نے اپنے صاحبزادے سلطان ولد کا عقد شیخ صلاح الدین کی صاحب زادی سے کر دیا اور اس طرح ان دونوں میں سمدھیانے کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ ۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء میں حضرت زرکوبؒ دنیائے فانی سے عالمِ بقا کو سدھارے۔ مولانا کو ان کی وفات پر سخت صدمہ پہنچا۔ اسی حالت میں ایک دلدوز غزل لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

اے ز ہجراں در فراقت آسماں بگریستہ
دل میانِ خون نشستہ عقل و جاں بگریستہ
چوں بعالم نیست یک کس مر مکانت را عوض
در عزائے تو مکان و لامکاں بگریستہ
جبرئیل و قدسیاں را بال و پر ازرق شدہ
انبیاء و اولیا را دیدگاں بگریستہ

مولانا سر برہنہ ہو کر بچوں کی طرح ڈاڑھیں مار مار کر روتے۔ جنازہ اٹھا تو قوالوں کی آٹھ جوڑیاں اس کے آگے سماع کر رہی تھیں اور مولانا عالمِ وجد میں چرخ لگاتے اس کے ساتھ جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے محبوب رفیق کو شیخ بہاؤ الدینؒ کی قبر کے پہلو میں دفن کیا اور کئی دن تک سخت ملول و محزون رہے۔

شیخ حسام الدین چلپیؒ کی رفاقت

شیخ زرکوبؒ کی وفات کے بعد مولانا کو پھر ایک ایسے محرمِ راز اور رفیقِ خاص کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں ان کو شمس تبریزؒ کا جلوہ نظر آئے۔ ایسا محرمِ راز اُن کو شیخ حسام الدین حسنؒ بن محمد بن حسن چلپی کی صورت میں مل گیا۔ شیخ حسام الدین چلپیؒ پہلے ہی مولانا کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ شیخ زرکوبؒ کے بعد مولانا نے ان اپنا خاص ہمدم و ہمراز بنا لیا۔ انہوں نے بھی پورے دس برس تک اس تندہی اور حسنِ عقیدت کے ساتھ مولانا کی خدمت کی کہ دونوں یک جان دو قالب ہو گئے۔ شیخ چلپیؒ مولانا کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ دس برس میں انہوں نے

ایک مرتبہ بھی مولانا کے وضو خانہ میں وضو نہیں کیا۔ گرمی ہو یا جاڑا، آندھی ہو یا طوفان وہ ہمیشہ گھر جاکر وضو کر آتے۔ یہ شیخ حسام الدین چلپیؒ ہی کی تحریک اور ترغیب تھی جس نے مولانا کو اپنی شہرۂ آفاق مثنوی کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ مثنوی شریف میں مولانا نے جابجا حسام الدین کا ذکر بڑے حسین انداز میں کیا ہے مثلاً:

اے ضیاء الحق حسام الدین توئی　　کہ گزشت از مہ نبودت مثنوی
ہمتِ عالی تو اے مرتجیٰ　　می کشید ایں را خدا داند کجا
گردنِ ایں مثنوی را بستہٗ　　می کشی آنسو کہ تو دانستہٗ
زاں ضیاء گفتم حسام الدین ترا　　کہ تو خورشیدی وایں دو وصفہا
شمس را قرآں ضیا خواند اے پدر　　واں قمر را نور خواند ایں را نگر
ہمچناں مقصود من زین مثنوی　　اے ضیاء الحق حسام الدین توئی
شہ حسام الدین کہ نورِ انجم است　　طالبِ آغاز سفرِ پنجم است

اے حیات دل حسام الدین بسی　　میل می جوشد بہ قسم سادسی
پیش کش می آرمت اے معنوی　　قسم سادس در تمام مثنوی

اے ضیاء الحق حسام الدین فرید　　دولتت پائندہ نصرت برمزید

علالت اور وفات

۶۷۲ھ میں مولانا شدید بیمار ہو گئے۔ اچھے سے اچھے طبیبوں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

لوگ جب ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے تو پوچھا کہ آپ کی نمازِ جنازہ کون پڑھائے گا؟ فرمایا مولانا صدر الدین —— وہ شیخ محی الدین اکبر (ابنِ عربی) کے شاگرد اور علم و فضل کے اعتبار سے نہ صرف قونیہ بلکہ روم و شام کے تمام علماء میں یگانہ مانے جاتے تھے۔ جانشین کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا حسام الدین چلپی

میری جگہ سنبھالے گا۔ یہ وصیتیں کر کے ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ کی شام کو واصل بحق ہوئے۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

مولانا کی رحلت کی خبر اہل قونیہ پر بجلی بن کر گری۔ گھر گھر میں ماتم برپا ہو گیا۔ صبح کو جنازہ اٹھا تو انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس کے ساتھ تھا۔ اس میں ارض روم کا فرمانروا، امرائے سلطنت، جوان، بوڑھے، عالم، جاہل، اغنیاء، فقراء ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ حد یہ کہ یہود اور نصاریٰ بھی توریت اور انجیل کی آیتیں پڑھتے اور گریہ وزاری کرتے جنازہ کے ساتھ تھے۔ ایک طرف قوالوں کی بیس جوڑیاں سماع میں مشغول تھیں تو دوسری طرف بے شمار حفاظ اور قراء قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے جنازہ کے ساتھ آگے چل رہے تھے۔ راستے میں تابوت کا صندوق کئی بار بدلنا پڑا اور اس کے تختے تبرک کے طور پر تقسیم کیے گئے۔ جنازہ صبح چلا تھا لیکن شام تک بمشکل قبرستان تک پہنچ سکا۔ حسب وصیت شیخ صدر الدینؒ نماز جنازہ پڑھانے کھڑے ہوئے لیکن فرط الم سے غش کھا کر گر پڑے اور قاضی سراج الدینؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تدفین کے بعد مزار پر چالیس دن تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔

سات صدیاں گزر چکی ہیں لیکن مزار مبارک آج تک قونیہ میں مرجع خاص و عام ہے۔ مولانا کے فرزند سلطان ولد نے اپنے عظیم المرتبت والد کی وفات اور جنازہ کی مختصر کیفیت ان اشعار میں بیان کی ہے۔

پنجم ماہ در جماد آخر — بود نقلاں آں شہ فاخر
سال ہفتاد و دو بُدہ بعدد — شش صد از عہد حضرت احمدؐ
چشم زخمی چناں رسید آں دم — گشت نالاں فلک دراں ماتم
مردم شہر از صغیر و کبیر — ہمہ اندر فغاں آہ و نفیر
دہیہان ہم ز رومی و اتراک — کردہ از درد او گریباں چاک
بہ جنازہ ہمہ شدہ حاضر — از سر مہر عشق نے پے بر
کردہ او را مسیحیاں معبود — دیدہ او را جہود خوب چو ہود

عیسوی گفت اوست عیسیٰ ما　　موسوی گفت اوست موسیٰ ما
ہمہ کردہ زغم گریباں چاک　　ہمہ از سوز کردہ بر سر خاک
ہمچناں ایں کشید تا چہل روز　　ہیچ ساکن نشد مے تف وسوز
بعد چہل روز سوئے خانہ شدند　　ہمہ مشغول ایں افسانہ شدند

اولاد مولانا کے دو فرزند تھے سلطان ولد اور علاؤ الدین محمد۔ مؤخر الذکر کا نام حضرت شمس تبریزیؒ کے قاتلوں میں لیا جاتا ہے۔ وہ مولانا کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ سلطان ولدؒ علوم ظاہری و باطنی میں درجۂ کمال پر پہنچے ہوئے تھے مولانا کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شیخ حسام الدین چلپیؒ مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ جب انہوں نے ۶۸۴ھ میں وفات پائی تو سلطان ولدؒ اتفاق عام سے پدر بزرگوار کے جانشین بنے۔ پورے اٹھائیس سال مخلوق خدا کو فیض پہنچانے کے بعد انہوں نے ۷۱۲ھ میں بعمر چھیانوے برس پیک اجل کو لبیک کہا۔ ان کے چار بیٹے تھے چلپی عابد چلپی زاہد، چلپی واجد۔ فرزند اکبر چلپی عارف مولانا روم کی زندگی ہی میں پیدا ہوئے تھے اور مولانا کو بے حد عزیز تھے۔ سلطان ولدؒ کی وفات کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے۔ ان کے بعد چلپی عابدؒ مسندِ خلافت پر رونق افروز ہوئے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

مولانا کا روحانی سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہ جلالیہ اور مولویہ کے نام سے مشہور ہے۔

تصانیف

تذکرہ نگاروں نے مولانا رومؒ کی تین تصانیف کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

۱۔ **دیوان** —— اس میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہیں۔ اس کو لوگوں نے غلطی سے شمس تبریزؒ سے منسوب کر دیا ہے۔

۲۔ **مثنوی** —— اس کے چھ دفتر ہیں۔ بقول مولانا شبلیؒ یہی وہ کتاب ہے جس نے مولانا کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ایران کی تمام تصنیفات کو دبا لیا ہے۔ اس مثنوی کو دنیائے تصوف میں جو بے مثال مقام حاصل ہے وہ ارباب فکر و نظر سے مخفی نہیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے بے شمار ترجمے اور شرحیں لکھی جا چکی

ہیں اور سینکڑوں سال سے اس کے جذب وگداز اور تاثیر نے دلوں کو مسخر کر رکھا ہے۔ مولانا رومؒ سراپا عشق تھے اور ان کے کلام میں اوّل تا آخر عشق ہی کا پیغام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان کا دل عشق سے خالی ہے تو وہ انسان نہیں پتھر کا بت ہے، اور اگر کوئی قوم عشق سے تہی دامن ہے تو وہ محض راکھ کا ڈھیر ہے۔ انہوں نے اپنے پیغام کو حکایتوں اور تمثیلوں کے پیرائے میں اس خوبی سے سمویا ہے کہ اہلِ دل پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ تصوف اور اخلاق و نفسیات کے دقیق مسائل اور اسرار و رموز کا ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ علامہ شبلیؒ سوانح مولانا رومؒ میں لکھتے ہیں:

"فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم و نثر میں لکھی گئی ہیں کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فارسی پر موقوف نہیں اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتہ لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر علماء اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام اور کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ (مصرعہ) "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔"

مثنوی مولانا رومؒ میں اس سے پہلے لکھی گئی کتابوں کی طرح کوئی ترتیب و تبویب نہیں ہے اور مختلف حکایات و قصص کو اخلاق و تصوف کے جداگانہ عنوان قائم کر کے قلمبند نہیں کیا گیا۔ لوگوں نے اس پر طرح طرح کے اعتراض کیے اور یہاں تک کہا کہ اس میں محض سفلانہ قصے بھر دیئے ہیں۔ مولانا رومؒ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ قصص و حکایات نفسِ مضمون اور مقصودِ کلام نہیں ہیں بلکہ ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ جو لوگ تصوف کے باریک مسائل اور روکھے پھیکے علمی مضامین کی طرف عام حالات میں متوجہ نہیں ہوتے وہ ان دلچسپ حکایات، مطائبات و محاضرات کی کشش سے اس طرف توجہ کریں اور ان کے کلام و پیغام کے مغز اور حقیقت کو سمجھیں۔ جو لوگ

ان کو محض تفریح اور وقت گزاری کے لیے پڑھیں گے اُن کو کچھ فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اس حقیقت کو مولانا رومؒ اس طرح بیان کرتے ہیں:

یا پنداری کہ حرفِ مثنوی
چوں بخوانی رائگانش بشنوی
یا کلامِ حکمت و سرِّ نہاں
اندر آید سہل در گوشِ کہاں
اندر آید لیک چوں افسانہا
پوست بنماید نہ مغزِ دانہا
در سر و رو در کشیدہ چادرے
رو نہاں کردہ ز چشمت دلبرے
شاہنامہ یا کلیلہ پیشِ تو
ہمچناں باشد کہ قرآں از عتو
فرق آنگہ باشد از حق و مجاز
کہ کند کحلِ عنایت چشم باز
ورنہ پشک و مشک پیشِ اخشمے
ہر دو یکساں است چوں نبود شمے
خویشتن مشغول کردن از ملال
باشدش قصہ از کلامِ ذوالجلال
کاتش وسواس را و غصہ را
زاں سخن بنشاند و سازد دوا
بہرِ ایں مقدار آتش شاندن
آبِ پاک و بول یکساں شد بفن

کیا تو سمجھتا ہے کہ مثنوی کے پڑھتے وقت تجھ کو کچھ غور نہیں کرنا چاہیے اور محض اس کے الفاظ کو دہرا لینا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص پُر حکمت کلام اور مخفی بھید کو سرسری طور پر پڑھ کر سمجھ لے ہاں سمجھ تو لے گا لیکن محض قصے کہانی کی طرح۔ اس کو صرف چھلکا ہی حاصل ہوگا اور مغز اور دانوں سے محروم رہے گا۔ اس کو محبوب کی جھلک تو ضرور نظر آئے گی لیکن اس طرح کہ اس کا چہرہ چھپا ہوا ہوگا۔ اے سرکش تیرے نزدیک تو شاہنامہ یا کلیلہ دمنہ بھی ویسے ہی ہیں جیسا قرآن۔

لیکن حقیقت اور مجاز کا فرق تجھ کو اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب سرمۂ عنایت تیری چشمِ بصیرت کو صاف کر چکا ہو۔ اس کے نزدیک مینگنیاں اور مشک دونوں یکساں ہیں۔ ایسے لوگ کلامِ الٰہی کو محض دِل کے بہلاوے کے طور پر پڑھتے ہیں۔ کچھ اور نہ پڑھا قرآن کھول لیا، جب مقصد یہ ہو کہ تفریح حاصل کی جائے اور وقتی افکار سے نجات حاصل کی جائے تو آگ بجھانے کے لیے خواہ پاک پانی ہو یا گندہ پیشاب دونوں یکساں ہیں۔

مثنوی میں جو حکایات بیان ہوئی ان میں سے اکثر "حکایت در حکایت" اور

"مسائل در مسائل" کی سلک مروارید میں پروئی ہوئی ہیں۔

اِن حکایات میں درسِ اخلاق بھی ہے اور مزاح کی چاشنی بھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر ایک حکایت میں تصوّف اور عشق کا کوئی نہ کوئی نکتہ بھی ضرور پوشیدہ ہے۔ ان حکایات کی حقیقت اصل میں یہ ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مثنوی میں ایک خاص پیغام جو مولانا رومؒ نے ملتِ اسلامیہ کو دیا ہے، یہ ہے کہ رہبانیت اور ترکِ دنیا اسلام کی روح کے منافی ہے، مسلمان کو سراپا عمل ہونا چاہیے کیونکہ کسب و جہد اور سعی و عمل سنتِ انبیاء و اولیاء اور خدا کی مرضی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

جہد می کن تا توانی اے فتیٰ　　در طریقِ انبیاء و اولیاء
چیست غافل؟ از خدا غافل بدن　　نے قماش و نقرہ و فرزند و زن
مال را گر بہرِ دیں باشی حمول　　نعم مال صالح گفت آں رسولؐ

جہد حق است و دوا حق است و درد
منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

گفت پیغمبرؐ بآوازِ بلند　　با توکل زانوئے اشتر بہ بند
رمزِ الکاسب حبیب اللہ، شنو　　از توکل در کسب کاہل مشو
رو توکل کن تو با کسب اے عمو　　جہد می کن، کسب می کن مو بمو!
جہد کن جدّے نما تا وارہی　　ورنہ تو از جہدش بمانی ابلہی

گر توکل می کنی در کار کن!　　کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

یعنی توکل کا مطلب یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے اور نتیجہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جائے۔

۳۔ فیہ ما فیہ —— یہ کتاب مولانا کے ان خطوط وارشادات کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً وزیرِ سلطنت معین الدین پروانہ کے نام لکھے اور جن کو بعد میں مولانا کے فرزند سلطان ولدؒ نے مرتب کیا۔

ان کے علاوہ مولانا کے ایک سو چالیس خطوط کا مجموعہ "خطوط رومی" کے نام سے اور آپ کے ان اقوال ومواعظ کا مجموعہ جو آپ نے شمسؒ کی ملاقات سے پہلے وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائے تھے، "مجالس سبعہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مؤخر الذکر کتاب کے تین حصے ہیں۔

علم وفضل مولانا علم وفضل کے بحرِ زخّار تھے۔ راہِ فقر اختیار کرنے سے پہلے ان کے درس وافتا اور وعظ وارشاد کا ایک دنیا میں غلغلہ پڑا ہوا تھا۔ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ، مناظرہ غرض کوئی علم ایسا نہ تھا جس پر ان کو عبورِ کامل حاصل نہ ہو۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے علم وفضل کے بارے میں بے شمار واقعات لکھے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق دو تین یہاں درج کیے جاتے ہیں:

ایک دفعہ جمعۃ المبارک کے دن مولانا نے اپنے وعظ میں قرآنِ حکیم کی چند آیتوں کی تفسیر بیان کرنی شروع کی۔ ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حاضرین میں ایک فقیہ بھی تھے جن کو اپنی علمی قابلیت پر بڑا گھمنڈ تھا انہوں نے برسرِ عام کہا کہ چند آیتیں پہلے سے مخصوص کرلی جاتی ہیں اور انہیں کی تفسیر یہاں بیان کردی جاتی ہے۔ احسن طریقہ تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا کوئی حصہ بھی پڑھا جائے اس کی تفسیر برجستہ بیان کی جائے۔

مولانا نے فرمایا آپ کوئی سورۃ پڑھیے میں اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں فقیہ نے سورۂ والضحیٰ پڑھی۔ مولانا نے اس سورہ کے دقائق اور نکات بیان کیے تو صرف والضحیٰ کی داؤ کی تفسیر بیان کرتے کرتے شام ہوگئی۔ تمام حاضرین مولانا کی علمی بصیرت پر سر دھننے لگے۔ فقیہ صاحب کی یہ حالت ہوئی کہ عالمِ بیخودی میں اپنا

گریبان چاک کر ڈالا اور مولانا کے قدموں پر گر پڑے۔

ایک دفعہ مولانا نے کسی مسئلہ میں فتویٰ لکھا تو قونیہ کے ایک نامور عالم مولانا شمس الدین ماردنی نے یہ کہہ کر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ بے سند معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے سُنا تو کہلا بھیجا کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ مسئلہ درج ہے۔ لوگوں نے تحقیق کی تو فی الواقع یہ مسئلہ وہاں موجود تھا۔

ایک دن ایک شخص نے سوال کیا کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم کی مٹی کو خود خمیر کیا۔ مٹی میں گھاس بھی ملائی یا نہیں۔ فرمایا اس کا جواب مجھ سے کیا پوچھتے ہو، قرآن حکیم ہی سے پوچھو جس میں فرمایا گیا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ انسان کا خمیر محض مٹی اور پانی سے تھا۔

اخلاق و عادات

مولانا کا صحیفۂ اخلاق ایسے پاکیزہ اور دلآویز پھولوں سے مزین تھا کہ جن کی خوشبو سے روح تازہ ہوتی تھی۔ ان کا زہد و قناعت، انکسار، تواضع، شب بیداری، توکل علی اللہ، حلم و تحمل، جود و سخا، حق گوئی، اکلِ حلال، ایثار، شیریں کلامی، مخلوقِ خدا سے محبت اور دوسرے اوصافِ حمیدہ مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے ان کے اخلاقِ حسنہ اور عاداتِ پسندیدہ کے بارے میں بیسیوں واقعات لکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا کی ریاضت اور مجاہدہ کی یہ کیفیت تھی کہ ساری ساری رات عبادت کرتے گزر جاتی تھی۔ ان کے خدام کا بیان ہے کہ انھوں نے برسوں مولانا کو کبھی شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا۔ اکثر مسلسل روزے رکھتے تھے اور دو دو تین تین ہفتے کچھ نہ کھاتے تھے۔ نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ رُو ہو جاتے اور خشیت الٰہی سے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ نماز میں استغراق کا یہ عالم تھا کہ عشاء کی نیت باندھی اور دو رکعتوں میں ساری رات بیت گئی۔ کئی دفعہ نماز میں گریہ طاری ہو جاتا اور ساری ریش مبارک اور کپڑے آنسوؤں سے بھیگ جاتے تھے۔

بادشاہ اور امراء اکثر نقدی اور تحائف بھیجتے رہتے تھے لیکن مولانا اپنے پاس

کوئی چیز نہ رکھتے تھے اور سب کچھ شیخ صلاح الدین زرکوبؒ یا شیخ حسام الدین چلپیؒ کے ہاں بھجوا دیتے تھے کہ راہِ خدا میں صرف کر دیں۔ ان کے در سے کوئی سائل کبھی محروم نہ جاتا تھا۔ اگر کوئی اور چیز پاس نہ ہوتی تو اپنی عبا یا کرتہ یا جو کپڑا بدن پر ہوتا وہی اتار کر اس کو دے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک تاجر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کثیر مال اور تحائف مولانا کی خدمت میں پیش کیے کہ اپنے تصرف میں لائیں۔ مولانا نے فرمایا بھائی نہ تو میرے آقا و مولیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دنیوی سامان تھا اور نہ مجھے دنیا پسند ہے۔ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہو۔ بہتر یہ ہے کہ اس مال کو اپنے ہاتھ سے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دو اور مجھ کو اور میرے دوستوں کو اس تکلیف سے معاف کرو۔

مولانا نے ایک دفعہ اپنے چند خادم وزیرِ سلطنت معین الدین پروانہ کے پاس کسی کام کے لیے بھیجے۔ جب وہ واپس آئے تو معین الدین کے عالی شان مکانات اور پُرتکلف کھانوں کی بے حد تعریف کی۔ مولانا نے ایک آہ بھر کر فرمایا:

"اے غافلو! دنیا کی غلاظت اور فنا ہو جانے والی عمارتوں کی اس قدر تعریف کر رہے ہو تمہیں شرم نہیں آتی۔" ؎

اے بدیدہ لوتِ ہائے چرب خیز
فضلۂ او را بہ بیں در آب ریز

خدام بڑے شرمندہ ہوئے اور پھر کبھی انہوں نے مولانا کے سامنے دنیاوی چیزوں کی تعریف نہیں کی۔

ایک دفعہ مولانا سماع سُن رہے تھے۔ ایک شخص عالمِ وجد میں بار بار مولانا سے جا ٹکراتا۔ لوگوں نے اس کو بزور مولانا کے پاس سے اٹھا کر دور بٹھا دیا۔ آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: "شراب تو اس نے پی ہے اور بدمستی تم کرتے ہو۔"

ایک دن مولانا کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ او لعین! اگر تو ایک کہے گا تو میں دس سناؤں گا ——— مولانا نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائی

جو کچھ کہنا چاہتے ہو مجھ کو کہہ لو۔ مجھ کو اگر ہزار سناؤ گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔ دونوں بہت شرمندہ ہوئے اور آپس میں بغل گیر ہو گئے۔

ایک دفعہ آپ کی اہلیہ نے اپنی لونڈی کو سزا دی۔ مولانا کو علم ہوا تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ سب آدمی ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں۔ کوئی شخص خدا کے سوا کسی کا غلام نہیں۔ آپ کی اہلیہ نے اسی وقت اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔

مولانا کو اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ گو حکومت کی طرف سے آپ کو کوئی ذمہ داری نہیں سونپی گئی تھی لیکن آپ اس کے معاوضہ میں فتوے لکھا کرتے تھے۔ خدام کو تاکید کر رکھی تھی کہ رات ہو یا دن کوئی فتویٰ پوچھنے آئے تو مجھ کو ضرور اطلاع دو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدر الدین قونوی کو ہزاروں روپے ماہوار وظیفہ ملتا ہے اور آپ کو صرف پندرہ دینار۔ یہ انصاف سے بعید ہے۔

فرمایا کہ شیخ کے اخراجات بھی بہت ہیں اور یہ بعید از انصاف نہ ہوگا کہ میرے پندرہ دینار بھی ان کو دے دیئے جائیں۔

مولانا بادشاہوں اور امراء کے درباروں اور مجلسوں میں جانے سے سخت احتراز کرتے تھے۔ البتہ وہ آپ کے آستانہ پر حاضر ہوتے تو حسنِ خلق کی وجہ سے مل لیتے تھے۔

نمونۂ کلام

روغن اندر دوغ باشد چوں عدم — دوغ در ہستی برآوردہ علم
نیست را بنمود ہست آں محتشم — ہست را بنمود بر شکل عدم
دست پنہاں و قلم بیں خط گذار — اسپ در جولاں و ناپیدا سوار
بحر را پوشید کف کرد آشکار — باد را پوشید و بنمودت غبار
خاک را بینی بہ بالا اے علیل — باد را نہ جز بہ تعریف دلیل
تیر پیدا بیں و ناپیدا کماں — جانہا پیدا و پنہاں جانِ جان

عاشقاں را ہر نفس سوزیدنی است
بر دۂ ویراں خراج عشر نیست
در درونِ کعبہ رسمِ قبلہ نیست
چہ غم از غواص را پاچلہ نیست
ملتِ عشق از ہمہ دینہا جداست
عاشقاں را مذہب و ملت خداست

ہمیشہ ایں چنیں مجنوں نبودم
زعقل و عافیت بیروں نبودم
چو تو غافل بدم من نیز روزے
چنیں دیوانہ و مفتوں نبودم
چو چشمِ دلبراں صیاد بودم
مثالِ دل میاں خوں نبودم
دریں بودم کہ دل چوں ست جاں چوں
چنیں حیراں آں بیچوں نبودم
تو بارے عاشقی بنگر بیندیش
کز اول چوں بدم اکنوں نبودم
ہمی جستم فزونے بر ہمہ کس
چو مہ در کاہش اے میموں نبودم
چو گنجے از زمیں بیروں فتادم
کہ گنجے بودم و قاروں نبودم

زخاکِ من اگر گندم برآید
از و گرنان پزی مستی فزاید
شود دیوانہ سازندہ پزندہ
تنور ش بیت مستانہ سراید
میا بے دف بگورم اے برادر
کہ در بزمِ خدا غمگیں نشاید
منم مست و مرا اصل از مے عشق
مگو از من بجز مستی چہ آید

رعد مطرب برق مشعل ابر ساقی آب مے
باغ مست و زاغ مست و غنچہ مست و خار مست
آسمانا چند گردی گردشِ عنصر بہ بیں!
خاک مست و آب مست و باد مست و نار مست
حالِ صورت ایں چنیں و حالِ معنی خود مپرس
نفس و عقل و روح مست و دائما اسرار مست

از تقاضا ہائے مستاں و ز نفیرِ عاشقاں
در شفاعت ہو بہوئے احمدِ مختارؐ مست
او سرست و ما چو دستار اندر پیچیدہ ایم
از شراب ایں سر ہمہ گرد و سر و دستار مست
از جلالِ قدس او شیدا ابوبکرؓ و عمرؓ
باز عثمانؓ از جمال و حیدرِؓ کرار مست
شمس تبریزیؒ درآید در دلم بزمے نہاد
از شرابِ عشقِ حق بنگر در و دیوار مست
من خمش گردم چو در من کشت مستی آشکار
باد پیمائد چو گوید ہر سخن بسیار مست

باز شہدے با شکر آمیختہ
عاشقاں با ہم دگر آمیختہ
روز و شب را از میاں برداشتند
آفتابے با قمر آمیختہ
رنگِ معشوقاں و رنگِ عاشقاں
جملہ ہمچو سیم و زر آمیختہ
چوں بہار سرمدے حق رسید
شاخِ خشک و شاخِ تر آمیختہ
زاں عجب تر آنکہ اندر ہر دمے
ایں اماں چوں با خطر آمیختہ

از من دو سہ سخن شنو اندر بیانِ عشق
گرچہ مرا ز عشق سر گفت و گوے نیست
اکنوں بدانکہ عشق ہم اول ہم آخر ست
زاں سو نظر مکن کہ ازاں سوئے سوئے نیست
ایں عشق مے فروش قیامت ہمی کند
زاں بادہ کہ در خور خم و سبوئے نیست

سلطان الپ ارسلان سلجوقی

۱

سلجوقیوں کا ظہور اور عروج تاریخ اسلام کا ایک درخشاں باب ہے۔ وہ صفحہ تاریخ پر اس وقت نمودار ہوئے جب خلافت عباسیہ کے شجرِ اقبال کو گھن لگ چکا تھا۔ سلجوقی خلفائے عباسیہ کے پشتیبان بن گئے۔ انہوں نے نہ صرف عباسی خلافت کو مٹنے سے بچالیا بلکہ ایک بار پھر دنیا میں مسلمانوں کی عظمت و سطوت کا سکہ بٹھا دیا۔ وہ جہاں اسلام کے بازوئے شمشیر زن ثابت ہوئے وہاں انہوں نے تہذیب، تمدن اور علم و ہنر کی ایسی شمعیں بھی روشن کیں کہ سارا جہان ان سے منور ہو گیا۔ سلجوقی فرمانرواؤں میں سلطان طغرل بیگ، سلطان الپ ارسلان اور اس کے فرزند ملک شاہ کو تاریخ میں لازوال شہرت حاصل ہے۔ ان تینوں میں الپ ارسلان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے سلطان طغرل بیگ کی تاسیس کی ہوئی سلجوقی سلطنت کی بنیادیں اتنی مضبوط کر دیں کہ دنیا میں صدیوں تک عہدِ سلاجقہ کے سیاسی اور تمدنی اثرات محسوس کیے جاتے رہے۔

سلطان الپ ارسلان کے خاندان کا تعلق وسطِ ایشیا کے غز ترکوں کے ایک قبیلے سے تھا جو چوتھی صدی ہجری کے وسط میں یا اس سے کچھ پہلے مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔ قبولِ اسلام سے قبل وسطِ ایشیا کے ترک قبائل عام طور پر خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ قرنِ اوّل اور قرنِ دوم کے مسلمانوں کی عالمگیر فتوحات کے زمانے میں اسلامی مقبوضات کی سرحدیں ترکوں کی بود و باش کے علاقوں سے جا ملیں۔ چنانچہ مسلمان تاجروں سے ان لوگوں کا اکثر میل جول رہنے لگا۔ انہیں کے زیرِ اثر ترکوں میں آہستہ آہستہ اسلام پھیلنا شروع ہو گیا اور وہ تہذیب کے سانچے میں ڈھلنے لگے۔ ترکوں کا جو قبیلہ اسلام قبول کرتا وہ اسلامی سلطنت کی سرحدوں پر بس جاتا۔ ان لوگوں کو عام طور پر ترکمان کہا

جاتا تھا۔ غز ترکوں کے ایک قبیلے نے چوتھی صدی ہجری کے وسط میں یا اس سے کچھ پہلے اپنے وطن سے ہجرت کر کے ماوراء النہر کا رُخ کیا اور وہاں پہنچ کر نواحِ جند میں اقامت اختیار کرلی۔ یہاں کچھ عرصے کے بعد یہ قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس قبیلے کا سردار سلجوق بن دقاق (یا تقاق) تھا۔ یہی سلجوق سلطان الپ ارسلان کا مورثِ اعلیٰ تھا اور اسی کے نام کی نسبت سے اس کے خاندان اور نسل کو سلجوقی، آلِ سلجوق، سلاجقہ یا سلاجیق کہا جاتا ہے۔ سلجوق ایک مردِ مجاہد تھا۔ جب کبھی وحشی ترک اس کے علاقے کی طرف بڑھتے وہ ان کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا اور اپنے کافر بھائی بندوں سے لڑ بھڑ کر مسلمانوں کا مال و جان بچا لیتا۔

(۲)

سلجوق کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اسرائیل (ارسلان) نے تیس بتیس برس تک ماوراء النہر کے سلجوقی ترکوں کی قیادت کی اور ان لڑائیوں میں نمایاں حصہ لیا جو سامانیوں، الک خانیوں اور غزنویوں میں ہو رہی تھیں۔ ۴۱۶ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اسرائیل کو گرفتار کر کے قلعۂ کالنجر (ہندوستان) میں قید کر دیا۔ جہاں اس نے سات سال بعد ۴۲۳ھ میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا قتلمش غزنویوں سے بچتا بچاتا اپنے عزیزوں کے پاس بخارا پہنچ گیا۔ یہی قتلمش سلاجقۂ روم کا مورثِ اعلیٰ ہے جو ۷۰۰ھ تک ایشیائے کوچک کے حکمران رہے اور پھر ترکانِ عثمانی ان کے جانشین بنے۔

سلجوق کا دوسرا بیٹا میکائیل غالباً اس کی زندگی ہی میں کسی جنگ میں مارا گیا تھا مگر اپنے پیچھے طغرل بیگ اور چغری بیگ داؤد دو نامور بیٹے چھوڑ گیا تھا۔ سلجوق کی وفات کے بعد سلجوقی دو گروہوں میں بٹ گئے تھے ایک گروہ نے اسرائیل کو اپنا سردار بنا لیا تھا اور دوسرے نے طغرل بیگ اور چغری بیگ داؤد کو۔ آئندہ تیس بتیس برس برس جہاں اسرائیل ماوراء النہر کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیتا رہا وہاں طغرل بیگ اور چغری بیگ داؤد اپنے ساتھی قبائل کے ساتھ نواحِ جند میں خاموشی سے زندگی گزارتے رہے۔

جب تک سلطان محمود غزنویؒ زندہ رہا اس کی بے پناہ فوجی قوت اور تدبر کے سامنے سلجوقیوں کے کسی گروہ کو سر اٹھانے کی ہمت نہ پڑی یہاں تک کہ انہوں نے اسرائیل کی گرفتاری اور قید کا کڑوا گھونٹ بھی طوعاً وکرہاً پی لیا لیکن جونہی سلطان محمود نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی سلجوقیوں نے اس کے جانشین سلطان مسعود کے خلاف اپنی تگ و تاز کا آغاز کر دیا۔ مسعود اپنے عظیم باپ کی خوبیوں سے عاری تھا اس لیے وہ اپنی وسیع وعریض سلطنت کو نہ سنبھال سکا۔ کئی سال تک غزنویوں اور سلجوقیوں کے مابین لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی غزنویوں کو ہزیمت ہوئی اور کبھی سلجوقیوں کو۔ بالآخر ۴۳۱ھ میں طغرل بیگ اور چغری بیگ داؤد نے سرخس اور مرو کے درمیان ایک خونریز جنگ میں مسعود غزنوی کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے نتیجے میں غزنوی سلطنت اپنے مشرقی علاقوں (غزنین پنجاب وغیرہ) میں سمٹ کر رہ گئی اور سلجوقی خراسان کی قسمت کے مالک بن گئے۔

(۲)

خراسان کی فتح کے بعد سلجوقیوں کی جہانبانی اور کشور کشائی کا دور شروع ہو گیا اور ان کے تمام گروہوں نے طغرل کو اپنا سربراہ یا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اُس نے ایک طرف تو ترکستان اور ماوراء النہر کے حکمرانوں کو فتح نامے لکھے اور دوسری طرف سفیر ابو اسحاق فقاعی کے ہاتھ خلیفۂ بغداد القائم بامر اللہ کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجی جس میں اس کو اپنی فتح کی خبر دی اور ساتھ ہی خراسان کی سندِ حکومت عطا کرنے کی استدعا کی۔ خلیفہ نے یہ عرضداشت ملنے پر خوشی کا اظہار کیا اور طغرل کو نہ صرف سندِ حکومت عطا کی — بلکہ "رکن الدین" کا خطاب بھی مرحمت فرمایا۔ طغرل اور چغری بیگ داؤد، دونوں بھائیوں میں کمال درجے کا اتحاد تھا اور دونوں ایک دوسرے کے دست و بازو تھے۔ چھوٹا بھائی چغری بیگ داؤد زندگی بھر بڑے بھائی طغرل کا مطیع اور فرمانبردار رہا۔ طغرل نے اس کو خراسان کے بالائی علاقے کا حکمران بنا دیا اور مشرقی وشمال کے علاقے اس کی جنگی سرگرمیوں کے لیے مخصوص کر دیئے۔ چغری بیگ داؤد نے مرو کو اپنا دارالحکومت بنایا اور دو تین سال

کے اندر اندر بلخ اور خوارزم کو بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کو اپنے داخلی اور خارجی امور میں مکمل آزادی حاصل تھی تاہم وہ طغرل کو اپنا سربراہِ اعلیٰ تسلیم کرتا تھا۔ یہی چغری بیگ داؤد سلطان الپ ارسلان کا باپ تھا۔

طغرل نے دولتِ سلجوقیہ کے سربراہ کی حیثیت سے نیشاپور کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس نے ایک طرف تو چغری بیگ کو اس کی جنگی مہموں میں مدد دی اور دوسری طرف خود دہستان، جرجان، طبرستان اور جبال کے صوبے فتح کر کے وہاں اپنا خطبہ جاری کر دیا۔ اس کے برادرِ مادری ابراہیم بن اینال نے رے اور ہمدان کے علاقے فتح کر کے سلجوقی سلطنت میں شامل کر دیئے۔ اس طرح ۴۳۴ھ / ۱۰۴۲ء کے اخیر تک طغرل کے حدودِ سلطنت دولتِ بویہیہ کے حدود سے جا ملے۔ بویہی یا دیلمی خاندان گزشتہ ایک صدی سے فارس، عراق، اہواز، کرمان، اور اصفہان وغیرہ پر حکومت کر رہا تھا، خود قلبِ اسلام بغداد پر دیالمہ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ خلیفۂ عباسی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا اور اس کی حیثیت ایک معزز وظیفہ خوار سے زیادہ نہ تھی۔ دیلمی حکمرانوں نے پہلے سلطان اور پھر شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ خطبہ میں خلیفہ کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا تھا بلکہ سکہ پر بھی ان کا نام ہوتا تھا۔ چونکہ یہ لوگ شیعہ تھے اس لیے ان کے عہد میں ایران اور عراق وغیرہ میں مذہب اثنا عشری کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ خاندان بویہ کے حکمرانوں میں معزّ الدولہ کے بھتیجے عضدالدولہ (متوفی ۳۷۲ھ / ۹۸۲ء) نے سب سے زیادہ ناموری حاصل کی۔ وہ ایک علم دوست اور عادل حکمران تھا اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں بیحد دلچسپی رکھتا تھا۔ عضدالدولہ کے بعد اس کے جانشینوں کی باہمی آویزش نے اس خاندان کو روبہ زوال کر دیا۔ تاہم طغرل کے عروج کے وقت ان میں اتنی طاقت ضرور تھی کہ سلجوقیوں سے نبرد آزما ہو سکیں۔ دونوں طاقتوں کی سرحدوں کے اتصال کے بعد ان کے مابین تصادم کا شدید امکان پیدا ہو گیا۔ لیکن اس موقعہ پر خلیفۂ بغداد قائم بامراللہ نے مداخلت کی اور اپنے اثر و رسوخ کو بروئے کار لا کر دیلمی حکمرانوں اور سلطان طغرل کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرا دیئے۔ تاہم یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہی اور سلجوقی اور

دیلمی افواج کے درمیان وقتاً فوقتاً جھڑپیں ہونے لگیں، ان میں سلجوقیوں کو بالعموم غلبہ حاصل ہوتا تھا۔ دیلمی حکمران ابوکالیجار نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی تو اس کے بیٹوں کے درمیان جنگِ اقتدار شروع ہوگئی۔ طغرل نے دیلمیوں کی خانہ جنگی سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور اصفہان، کردستان وغیرہ پر قبضہ کر کے فارس اور عراق پر چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔

ابوکالیجار کے دو بیٹوں ابومنصور فلاستون اور ابوعلی کیخسرو نے طغرل کی اطاعت قبول کر لی البتہ تیسرے بیٹے ابونصر خسرو فیروز نے "الملک الرحیم" کا لقب اختیار کر کے دیلمی سلطنت کا سربراہ یا بادشاہ بننے کا اعلان کر دیا۔ گو اس کا دائرۂ اقتدار فارس، خوزستان اور عراق تک محدود تھا اور ان صوبوں میں بھی سخت بدنظمی اور انتشار کا دور دورہ تھا پھر بھی وہ دارالخلافت بغداد پر متصرف ہونے کی وجہ سے دنیائے اسلام میں خاصی اہمیت رکھتا تھا۔

۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء میں طغرل نے بغداد کی طرف توجہ کی اس سے پہلے ۴۴۶ھ / ۱۰۵۴ء میں وہ آذربائیجان، شیراز، جنزہ، موصل، دیار بکر وغیرہ کو اپنے حلقۂ اطاعت میں لا چکا تھا اور آرمینیہ میں داخل ہو کر ارضِ روم تک کے علاقے کو تاخت و تاراج کر کے واپس آیا تھا۔ ۲۵ رمضان المبارک ۴۴۷ھ / ۱۰۵۵ء کو وہ ایک جرار لشکر کے ساتھ بغداد میں داخل ہو گیا۔ خلیفہ کی طرف سے تمام عمائدِ سلطنت، قاضی القضاۃ اور اشرافِ بغداد یہاں تک کہ دیلمی امراء نے بھی اس کا شاندار استقبال کیا۔ طغرل نے باب الشماسیہ پر قیام کیا۔ قیامِ بغداد کے دوران میں بدقسمتی سے اس کی فوج کے چند سپاہی کسی غلط فہمی کی بناء پر بغداد کے شہریوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ طغرل کو شبہ ہوا کہ یہ سب کچھ ملک الرحیم کے اشارے سے ہوا ہے چنانچہ اس نے ملک الرحیم اور اس کے امراء کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا۔ دیلمی امراء کو تو اس نے بعد میں خلیفہ کی سفارش پر رہا کر دیا لیکن ملک الرحیم کو نہ چھوڑا۔ اس طرح آلِ بویہ یا دیالمہ کا آفتابِ اقتدار ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور طغرل نے ان کے تمام مقبوضات (بشمول بغداد) کو اپنی سلطنت میں ضم کر لیا یا اپنے حلقۂ اثر و اقتدار میں شامل کر لیا۔

طغرل نے بغداد میں تیرہ ماہ قیام کیا اور اس دوران میں اپنی بھتیجی خدیجہ ارسلان خاتون (دختر چغری بیگ داؤد) کا نکاح خلیفہ قائم بامر اللہ سے کر دیا اس طرح سلطان اور

خاندانِ خلافت میں رشتۂ مصاہرت قائم ہوگیا۔

(۴)

اسی زمانے میں دیلمیوں کے ایک امیر بساسیری[1] نے سلجوقیوں کے خلاف شورش برپا کردی۔ طغرل کے ورودِ بغداد سے پہلے بھی وہ خلیفہ اور وزیر سلطنت رئیس الرؤساء کو سخت پریشان کر چکا تھا۔ بغداد پر طغرل کے تسلط کے بعد وہ الرحبہ (شام) چلا گیا اور فاطمی خلیفۂ مصر المستنصر باللہ کی اطاعت قبول کر کے ایک زبردست فوج تیار کر لی۔ امیرانِ عرب نور الدولہ دبیس بن مزید اور قریش بن بدران بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ انہوں نے شوال ۴۴۸ھ / ۱۰۵۶ء میں طغرل کے ابن عم قتلمش والئ موصل و دیارِ بکر کو سنجار کے مقام پر شکست دے کر اس کے مقبوضات پر قبضہ کر لیا اور بساسیری نے وہاں فاطمی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا۔ طغرل کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو وہ ۱۰ ذیقعدہ ۴۴۸ھ / ۱۰۵۶ء کو بغداد سے موصل کی طرف روانہ ہوا۔ بساسیری اس کے موصل پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ کر پھر الرحبہ چلا گیا اور نور الدولہ اور قریش بن بدران نے طغرل کی اطاعت قبول کر لی۔ طغرل نے موصل، سنجار، دیارِ بکر، اور جزیرہ ابنِ عمر فتح کر کے ان کو اپنے مادری بھائی ابراہیم بن اینال کے سپرد کیا اور ذیقعدہ ۴۴۹ھ / ۱۰۵۷ء میں دوبارہ بغداد میں داخل ہوا۔ ۲۵ ذیقعدہ کو اس نے خلیفہ سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ بارگاہِ خلافت سے اس کو "الملک المشرق والمغرب" کا خطاب مرحمت ہوا اور اس نے ۵۰ ہزار دینار نقد اور بیشمار بیش قیمت تحائف خلیفہ کی نذر کیے۔

---

[1] بساسیری کا نام ارسلان اور کنیت ابو الحرث تھی وہ خود شہر بساء کا رہنے والا تھا یا بساء کے رہنے والے کسی سوداگر کا غلام تھا اسی نسبت سے بساسیری مشہور ہوا۔ اس کو بہاؤ الدولہ بن عضد الدولہ دیلمی نے خرید کر اپنے خاص غلاموں میں شامل کر لیا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک اچھے جرنیل اور بلند پایہ مدبر کی شہرت حاصل کر لی تھی۔ ابو کالیجار اور ملک الرحیم کے زمانے میں اس نے بڑا عروج حاصل کیا۔ یہاں تک کہ عراق اور خوزستان کے منبروں پر خطبہ میں اس کا نام بھی لیا جاتا تھا اور خلیفہ قائم اس کو ترکوں کا سردارِ اعلیٰ بنانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

۴۵۱ھ / 1059ء میں طغرل کو دو عظیم سانحوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پہلا سانحہ تو اس کے برادرِ اصغر چغری بیگ داؤد کا انتقال تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں طغرل کا دست و بازو تھا اور اس کی وفات سے سلطان کو بے پناہ دکھ ہوا۔ دوسرا سانحہ یہ تھا کہ طغرل کے مادری بھائی ابراہیم بن اینال نے ایک زبردست فوج جمع کر کے اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان کے پاس اس وقت تھوڑی سی فوج تھی جس کی ابراہیم کے لشکرِ گراں کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔ طغرل کے لیے یہ بڑی نازک گھڑی تھی لیکن اللہ نے اس کی مدد کی اور عین وقت پر اس کے بھتیجے الپ ارسلان، یاقوتی اور قاورد بیگ (پسرانِ چغری بیگ داؤد) اپنی فوجیں لے کر اس کی مدد کے لیے آ پہنچے۔ جمادی الآخر ۴۵۱ھ میں رَے کے قریب ابراہیم اور طغرل کی فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا جس میں ابراہیم کو شکست فاش ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر طغرل کے سامنے آیا۔ ابراہیم اس سے پہلے بھی ایک دو موقعوں پر سرکشی کا مظاہرہ کر چکا تھا لیکن طغرل نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اب کی بار وہ معافی کا مستحق نہ سمجھا گیا اور طغرل کے حکم سے اس کو پھانسی دے دی گئی۔

۵

جس زمانے میں طغرل، ابراہیم اینال کے قضیے میں الجھا ہوا تھا، بساسیری کی باسی کڑھی میں اُبال آیا اور اس نے میدان خالی دیکھ کر بغداد پر حملہ کر دیا۔ خلیفہ بیچارے میں مقابلے کی سکت کہاں تھی، بساسیری نہایت آسانی سے قلبِ اسلام پر قابض ہو گیا (۶ ذیقعدہ ۴۵۰ھ) اور اپنی باقاعدہ حکومت قائم کر کے بغداد، واسط اور کوفہ وغیرہ میں فاطمی خلیفہ مصر کا خطبہ جاری کر دیا اور اذان میں کلمہ "حی علیٰ خیر العمل" کا اضافہ کر دیا۔ اس کے فوجیوں اور بنو عقیل کے بدویوں نے قصرِ خلافت کو جی بھر کے لوٹا۔ عباسی خلیفہ کو بساسیری نے معزول کر کے حدیثہ عانہ بھیج دیا جہاں وہ پورے ایک سال تک نظر بندی کے مصائب جھیلتا رہا۔ عید الاضحیٰ کے دن بساسیری، بغداد کی عیدگاہ میں گیا تو چشمِ فلک کو یہ نظارہ بھی دیکھنا پڑا کہ عین عباسی خلافت کے مرکز میں مصری خلافتِ فاطمیہ کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔

خلافتِ عباسی کا وزیر السلطنت رئیس الرؤسا ایک راسخ العقیدہ سُنّی تھا بساسیری نے ذی الحجہ ۴۵۰ھ کے آخر میں اس کو عمید عراق سمیت قتل کرا دیا۔ خلیفہ نے حدیثہ عانہ پہنچ کر سلطان طغرل کو اپنی مصیبت اور بغداد پر بساسیری کے استیلاء سے مطلع کر دیا تھا اور اس سے درخواست کی تھی کہ اگر اسلام کو بربادی سے بچانا ہے تو فوراً بغداد پہنچو۔ طغرل اس وقت اپنے جھگڑوں میں مبتلا تھا وہ فوراً تو خلیفہ کی مدد کے لیے نہ پہنچ سکا تاہم اس نے جواب میں خلیفہ کی تسلی کے لیے یہ آیت لکھ بھیجی:

ارْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ لَا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا
وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِنْهَا أَذِلَّةً وَهُمْ صَاغِرُونَ (سورۂ نمل)

ترجمہ: "(اے قاصد جنہوں نے تجھے بھیجا ہے) اُن کے پاس واپس جا ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے اور (ہم) ان کو وہاں سے ذلیل و خوار کر کے نکال دیں گے۔"

اس جواب کو سن کر خلیفہ بہت خوش ہوا اور کہا کہ انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔

(۶)

ابراہیم اینال کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد طغرل ایک جرار لشکر لے کر بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی آمد آمد کی خبر سن کر بساسیری پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ اپنے بغداد میں داخل ہونے کے ٹھیک ایک سال بعد ۶ ذیقعدہ ۴۵۱ھ کو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ سلطان نے فوراً خلیفہ کو فتح کا بشارت نامہ بھیجا اور اس سے بغداد واپس تشریف لانے کی درخواست کی۔ خلیفہ اس سے پہلے ہی حدیثہ عانہ سے روانہ ہو چکا تھا راستے میں طغرل کی طرف سے وزیر السلطنت عمید الملک کندری نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اسے بڑی شان سے لے کر بغداد کی طرف چلا۔ نہروان پر طغرل نے خود سات مرتبہ زمین بوس ہو کر اس کا استقبال کیا اور معذرت کی کہ وہ ابراہیم کی بغاوت کے سبب بروقت اس کی امداد کے لیے نہیں پہنچ سکا۔ ۲۵ ذیقعدہ ۴۵۱ھ کو خلیفہ بغداد میں داخل ہوا اور سلجوقیوں کی بے پناہ قوت کے بل بوتے

پر عباسی خلافت کا کاروبار پھر بحال ہو گیا۔

طغرل کے حکم سے فوج کے ایک مضبوط دستے نے بساسیری کا تعاقب کیا اور اس کو شام کی طرف بھاگتے ہوئے ایک جگہ جا لیا۔ اس نے کچھ مزاحمت کی لیکن بہت جلد مغلوب ہو گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کا سر ایک نیزے پر رکھ کر بغداد میں پھرایا گیا اور پھر لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے اس کو باب النوبی پر لٹکا دیا گیا۔

۴۵۴ھ میں طغرل کی اہلیہ نے وفات پائی۔ اس سے اگلے سال اس نے خلیفہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دے۔ خلیفہ نے یہ پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن طغرل نے اس شدت سے اصرار کیا کہ بالآخر خلیفہ کو اس کی بات ماننی پڑی۔ چنانچہ شعبان ۴۵۴ھ میں طغرل کا نکاح دخترِ خلیفہ سے ہو گیا۔ دلہن کی رخصتی محرم ۴۵۵ھ میں ہوئی۔ اس رشتہ کے قائم ہونے پر طغرل نے غیر معمولی مسرت اور شادمانی کا اظہار کیا اور خلیفہ اور دلہن کو بیش بہا ہدایا پیش کیے لیکن اس واقعہ کے بعد طغرل زیادہ عرصہ نہ جیا اور چند ماہ بعد ۱۸ رمضان المبارک ۴۵۵ھ / ۱۰۶۳ء کو ستر سال کی عمر میں بعارضہ نکسیر وفات پائی۔

(۷)

سلطان طغرل بیگ نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ چار سال پہلے اس کے بھائی چغری بیگ داؤد نے وفات پائی تھی تو سلطان نے اس کے بڑے فرزند ابو شجاع محمد ملقب بہ الپ ارسلان (یعنی دلاور شیر) کو باپ کی جگہ صوبہ مرو کا گورنر بنا دیا۔ سلطان اپنے اس بھتیجے کو اس کے اعلیٰ ذاتی اوصاف و خصائل کی وجہ سے نہایت عزیز جانتا تھا اور لوگوں کو اس نے یہی تاثر دے رکھا تھا کہ الپ ارسلان ہی اس کا ولیعہد ہے۔ حق بھی یہی تھا کہ وہی ہر لحاظ سے اس کی جانشینی کا اہل تھا لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ سلطان نے وفات سے پہلے اپنی جانشینی کے لیے اپنے دوسرے بھتیجے (الپ ارسلان کے سوتیلے بھائی) سلیمان کو نامزد کر دیا۔ یہ وصیت اس نے سلیمان کی والدہ کے اصرار سے مجبور ہو کر کی جس سے اس نے چغری بیگ کی وفات کے بعد نکاح کر لیا تھا اور جو اس کے مزاج میں بہت

دخیل ہو گئی تھی۔ چنانچہ طغرل کی وصیت کے مطابق وزیر السلطنت عمید الملک کندری نے سلیمان کو تخت و تاج دلانے کی سر توڑ کوشش کی اور رَے میں اس کا خطبہ بھی جاری کر دیا لیکن اکثر با اثر سلجوقی امراء الپ ارسلان کے پر زور حامی تھے۔ انہوں نے قزوین جا کر الپ ارسلان کا خطبہ جاری کر دیا۔

عمید الملک نے سلجوقی سرداروں کی اکثریت کو الپ ارسلان کی طرف مائل پایا تو اس نے بھی خطبے میں سلیمان کے نام سے پہلے الپ ارسلان کا نام داخل کر دیا۔ اُدھر طغرل کی وفات کی خبر سن کر صغانیان اور ختلان کے امراء نے سرکشی پر کمر باندھی اس پر مستزاد یہ کہ سلجوقی خاندان کے دو سر کردہ افراد موسیٰ بیغو اور قتلمش بن اسرائیل نے بھی اپنی اپنی بادشاہت کا علم بلند کر دیا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا لیکن الپ ارسلان بھی بڑا با ہمت اور صاحبِ تدبیر فرمانروا تھا اس نے صغانیاں اور ختلان پر ایسا طوفانی حملہ کیا کہ باغی امیروں کو دم لینے کی مہلت بھی نہ ملی اور وہ اپنے حامیوں سمیت موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اسی طرح اس نے موسیٰ بیغو والی ہرات کو بھی شکست فاش دی تاہم اس نے اظہارِ ندامت کیا تو اس کو ہرات کی ولایت پر برقرار رکھا۔ اس کے بعد وہ قتلمش کی طرف متوجہ ہوا جو ترکمانوں کے ایک جرار لشکر کے ساتھ رَے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دامغان پہنچ کر الپ ارسلان نے اس کو پیغام پر پیغام بھیجے کہ وہ فتنہ انگیزی سے باز آ جائے اور جو صوبہ یا علاقہ اس کو پسند ہو اس کی حکومت سنبھال لے لیکن قتلمش نے اس کے پیغام کو رَدّ کر دیا اور بادشاہی سے کم کسی چیز کے قبول کرنے پر تیار نہ ہوا ناچار الپ ارسلان نے اس پر پوری قوت سے حملہ کیا اور اس کی فوج کو کچل کر رکھ دیا۔ قتلمش لڑائی میں مارا گیا۔ وہ الپ ارسلان کے والد کا چچا زاد بھائی تھا سلطان کو اس کی موت کا بہت رنج ہوا اور وہ بہت رویا۔ اس کے بعد الپ ارسلان فاتحانہ رَے میں داخل ہوا اور سلیمان کو معزول کر کے محرم ۴۵۶ھ (۱۰۶۴ء) میں تمام سلجوقی سلطنت کا بلا شرکت غیرے فرمانروا بن گیا۔ وزیر السلطنت عمید الملک کندری نے اس کی اطاعت پہلے ہی قبول کر لی تھی لیکن سلیمان کو تخت نشین کرنے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا الپ ارسلان اس کو نہ بھولا تھا اس نے چند دن بعد عمید الملک کو گرفتار کر کے مرو الرود میں نظر بند

کردیا اور پھر ذی الحجہ ۴۵۶ھ ۱۰۶۴ء میں قتل کرا دیا۔

اُسی سال جمادی الاولیٰ ۴۵۶ھ ۱۰۶۴ء میں الپ ارسلان نے خلیفہ قائم بامراللہ کی بیٹی کو (جس سے سلطان طغرل نے نکاح کیا تھا) نہایت عزت و احترام کے ساتھ واپس بغداد بھیج دیا اور دربارِ خلافت میں سفارت بھیج کر خلیفہ سے پروانہ سلطنت حاصل کرلیا۔[1] خلیفہ کی طرف سے اس کو ضیاء الدین، عضدالدولہ اور الولد المؤید کے خطابات اور قیمتی خلعت عطا کیے گئے اور ایک فرمان کے ذریعے بغداد میں بھی الپ ارسلان کا خطبہ جاری کر دیا گیا۔

۸

ربیع الاوّل ۴۵۶ھ ۱۰۶۴ء میں سلطان نے مسیحی ارمینیہ اور گرجستان پر زبردست یلغار کی۔ اس مہم میں شہزادہ ملک شاہ اور وزیر السلطنت نظام الملک طوسی بھی اس کے ہمراہ تھے۔

دریائے ارس (ARAXES) کو عبور کر کے سلطان نے نخچوان کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا اور وہاں سے شہزادہ ملک شاہ اور وزیر نظام الملک طوسی کو انجاز (جارجیا) کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ انہوں نے چند دن کے اندر اندر یکے بعد دیگرے کئی قلعے فتح کرلیے۔ انجاز کے حکمران بقراط میں سلجوقی افواج کے طوفانی حملے کو روکنے کی سکت نہ تھی اس نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیئے اور ایک خطیر رقم سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ کر کے سلطان کے حلقہ اطاعت میں آگیا۔ اس کے بعد سلطان نے شہزادہ ملک شاہ اور نظام الملک کو واپس بلالیا اور پوری فوج کے ساتھ مسیحی ارمینیہ پر ہلہ بول دیا۔ تھوڑی ہی مدت میں عیسائیوں کے بہت سے شہر اور قلعے سطوتِ سلطانی کے سامنے سرنگوں ہو گئے اور سلطان تیزی سے پیشقدمی کرتا ہوا آعال قال تک پہنچ گیا جو مسیحی ارمینیہ کا ایک اہم

---

[1] بعض مورخین کا بیان ہے کہ اس موقع پر سلطان نے خلیفہ کو پیغام بھیجا کہ اس نے عمیدالملک کو اس وجہ سے گرفتار کیا ہے کہ وہ سیدہ کو خلیفہ کی اجازت کے بغیر بغداد سے رے لے آیا تھا۔ خلیفہ نے سلطان کے اس اقدام پر بڑی خوشنودی کا اظہار کیا۔

شہر تھا۔ اس کے اردگرد نہ صرف دوہری فصیل تھی بلکہ وہ دو جانب دریا سے اور دو جانب پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا اور اسے ایک ناقابلِ تسخیر مقام متصور کیا جاتا تھا۔ سلطان نے دریا عبور کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا اور محصورین کو رسد پہنچنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ اہلِ شہر نے تنگ آ کر ایک عجیب چال چلی۔ انہوں نے سلطان کے پاس سفیر بھیج کر درخواست کی کہ اپنی فوج ان کے ساتھ بھیجے تاکہ شہر اس کے حوالے کر دیا جائے۔ سلطان نے ان پر یقین کر لیا اور فوج کا ایک دستہ ان کے ساتھ بھیج دیا۔ جونہی یہ دستہ شہر کی بیرونی فصیل کے اندر داخل ہوا اہلِ شہر نے اس کو گھیر کر شہید کر دیا اور دوسری طرف سے سلطان پر اچانک حملہ کر کے سلطانی فوج کو ایک خوفناک اضطراب میں ڈال دیا۔

اس وقت جب محصور فوج حملہ کے لیے آئی سلطان نماز کے لیے کھڑا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دشمن یوں دغا دے گا۔ طبلِ جنگ بجا، حملہ شروع ہوا اور اس اچانک حملہ سے گھبرا کر سلطانی فوج کی صفیں منتشر ہو گئیں لیکن سلطان نے نماز ترک نہ کی اور بڑے سکون اور خشوع و خضوع سے نماز ادا کرتا رہا۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیا، گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنی سپاہِ خاص کو جلو میں لیے دشمن کی صفوں پر اس طرح گرا کہ ان کے اوسان خطا ہو گئے اور بھاگنے کے سوا انہیں کوئی راستہ نہ سوجھا۔ سلطانی فوج اہلِ شہر کی غداری سے سخت غضب ناک ہو گئی تھی اس نے شہر میں داخل ہو کر اسے آگ لگا دی اور غدار شہریوں کو حوالۂ تیغ کر دیا۔

آعال لال کی فتح کے بعد سلطان نے ناحیہ فرس، ڈسل وردھ اور نورہ کو مسخر کیا اور پھر مسیحی آرمینیہ کے دارالحکومت آنی کی طرف پیشقدمی کی۔ یہ شہر دریائے ارس کے کنارے پر واقع تھا اور چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا تھا۔ بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ صرف ایک پُل کے ذریعے قائم تھا اور اس کا دفاعی نظام نہایت مستحکم تھا۔ اس شہر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں پانچ سو سے زیادہ گرجے تھے اور آرمینیہ کا کوئی دوسرا شہر تموّل اور آبادی کے لحاظ سے اس کا ہمسر نہ تھا۔ سلطان نے شہر کا محاصرہ کر لیا لیکن اس کے جلد فتح ہو جانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مؤرخین

نے بیان کیا ہے کہ سلطان نے اس موقع پر ایک شاندار جنگی تدبیر سے کام لیا۔ اس نے لکڑی (اور ایک دوسری روایت کے مطابق اینٹوں) کا ایک بہت بلند اور مضبوط برج بنوایا اور اس پر ایک دیو ہیکل منجنیق نصب کر کے شہر کی فصیل پر ایسی شدید سنگباری کی کہ اس میں سوراخ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی تائیدِ غیبی سے قلعہ کی ایک دیوار اچانک گر گئی[1] اور سلجوقی فوجیں آناً فاناً شہر میں داخل ہو گئیں۔ کثیر التعداد عیسائی مزاحمت کرتے ہوئے مارے گئے یا مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ اس شہر کی تسخیر سے آرمینیہ کی قدیم مسیحی ریاست (BAGARTIDS) کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان نے فوراً خلیفۂ بغداد کو فتح کی خوشخبری بھیجی، اس نے جواب میں سلطان کی تعریف کی اور اس کے حق میں دعائے خیر کی۔ اس کے بعد سلطان نے اصفہان کو مراجعت کی۔

⑨

۴۵۷ھ / ۱۰۶۵ء میں سلطان نے ماوراء النہر اور ترکستان کا دورہ کیا اور جند جا کر اپنے پردادا سلجوق کی قبر پر فاتحہ پڑھی اس نے جند کے فرمانروا کا بیحد اعزاز و اکرام کیا اور اس کی حکومت کو برقرار رکھا۔

۴۵۹ھ / ۱۰۶۷ء میں کرمان اور فارس کے والیوں نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی لیکن سلطان نے نہایت قلیل مدت میں باغیوں کو پیس کر رکھ دیا۔ اس کے بعد سلطان یمن، حجاز، شام اور فلسطین کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ ملک مصر کی فاطمی خلافت کے حلقۂ اقتدار میں شامل تھے لیکن ۴۶۲ھ / ۱۰۶۹ء تک سلطان نے وہاں سے فاطمی خلافت کے اقتدار کا جنازہ نکال کر عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا۔ البتہ دمشق پر بعض نامساعد حالات کی بناء پر اس کا قبضہ نہ ہو سکا۔

---

[1] بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ فصیل کے محافظین نے سنگباری سے گھبرا کر اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور سلطانی فوج کے نقب زنوں نے فصیل کے نیچے پہنچ کر اس کی جڑوں میں شگاف کر دیا۔

علامہ ابنِ اثیرؒ کا بیان ہے کہ اس زمانے میں حلب پر محمود بن صالح بن مرداس کی حکومت تھی۔ اس نے سلطان الپ ارسلان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے فاطمی خلیفہ کا خطبہ موقوف کر کے عبّاسی خلیفہ اور الپ ارسلان کا خطبہ جاری کر دیا لیکن سلطان اس سے مطمئن نہ ہوا کیونکہ اسے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ محمود نے اذان میں حیّ علیٰ خیر العمل (جو فاطمیوں کا شعار تھا) کہنا موقوف نہیں کیا۔ چنانچہ وہ ایک طاقتور فوج کے ساتھ دیارِ بکر سے ہوتا ہوا حلب پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ محمود نے کچھ مدت مقابلہ کیا لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور ایک رات وہ اپنی ماں منیعہ بنت دثّاب نمیری کو ساتھ لے کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بوڑھی خاتون نے اپنے بیٹے کا ہاتھ سلطان کے ہاتھ میں دے کر کہا: "یہ میرا لختِ جگر ہے جو سلوک اس سے چاہو کرو۔" سلطان کا دبدبہ اور جلال اس عرب خاتون کے سامنے سپر انداز ہو گیا۔ اس نے محمود کو عزّت کے ساتھ بٹھایا، اسے خلعت عطا کیا اور حلب کی حکومت اسی کے پاس رہنے دی۔

(۱۰)

۴۶۳ھ / ۱۰۷۰ء میں رومیوں نے مسلمانوں سے اگلے پچھلے بدلے چکانے کی ٹھانی اور قیصرِ روم رومانوس دیوجانس (ROMANUS DIOGENES)[۱] بقول علامہ ابن جوزیؒ "مشرق میں مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے قسطنطنیہ سے اس شان سے نکلا کہ اس کے جھنڈے تلے ایک جرّار لشکر کے علاوہ جنگل کاٹنے والوں، راستوں کو ہموار کرنے والوں اور فصیلوں میں نقب لگانے والوں کی تعداد بھی ایک لاکھ سے کم نہ تھی۔"[۲]

---

[۱] رومانوس دیوجانس پہلے رومی فوج میں جنرل (GENERAL) تھا۔ قیصرہ یوڈوسیا (EUDOCIA) نے اس سے شادی کر کے اس کو قیصرِ روم بنا دیا۔ عربی تاریخوں میں وہ "ارمانوس" کے نام سے مشہور ہے۔

[۲] رومی فوج کی تعداد کے بارے مؤرخین میں اختلاف ہے۔ مغربی مؤرخین نے بالعموم اس فوج کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے لیکن اکثر مسلم مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ فوج دو سے تین لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل تھی اور ایک مسلم مؤرخ ابن الراوندی نے تو اس فوج کی تعداد چھ لاکھ لکھی ہے۔

اس لشکر میں نہ صرف یورپ کے کئی ملکوں کی بہترین فوجیں شامل تھیں بلکہ ہزارہا ارمنی، روسی، گرجی، قفچاقی، غزی اور ہر کسی جنگجو بھی مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے جذبے سے سرشار اس میں موجود تھے۔ قیصر کے آزمودہ کار فوجیوں کے پاس نہایت اعلیٰ درجے کا اسلحہ تھا اور بیسیوں اتنی بڑی بڑی منجنیقیں تھیں کہ ایک ایک کو کھینچنے کے لیے ایک ایک سو بیلوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہر منجنیق میں آٹھ آٹھ درجے تھے اور ہر درجے میں ایک سو پچاس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ قیصر روم اور اس کے جرنیلوں کو اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ وہ کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ "آئندہ موسمِ سرما ہم رَے (سلجوقیوں کے پایہ تخت) میں گزاریں گے اور گرما کا موسم عراق میں اور پھر واپسی میں شامی علاقوں کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے گھر لوٹیں گے۔"

قیصر روم نے تو سارے اسلامی علاقوں کو عیسائی سرداروں میں تقسیم بھی کر دیا تھا۔ اس نے اسی خیالی تقسیم کی بنیاد پر اس سردار کو جس کے حصے میں عراق آیا تھا یہ ہدایت کی تھی کہ "بغداد کے اس بڈھے آدمی کا خیال رکھنا وہ بیچارہ نیک آدمی ہے اور ہمارا دوست ہے۔" ــــ یہ اشارہ خلیفۂ بغداد کی طرف تھا۔

قیصر کے اس لشکر کو مسلمانوں کے خون کی چاٹ بھی لگ چکی تھی کیونکہ ایک سال پہلے (۴۶۲ھ / ۱۰۶۹ء میں) وہ شہر مَنبج (HICRAPOLIS) کو فتح کر کے ہزارہا مسلمانوں کو تہ تیغ کر چکے تھے ـــــ محمود بن صالح والیٔ حلب اور حسان طائی دو عرب سرداروں نے قیصر کا مقابلہ کیا لیکن وہ اس سے منبج واپس نہ لے سکے۔ تاہم کچھ عرصہ بعد موسمِ گرما کی شدت اور رسد کی قلت سے مجبور ہو کر قیصر خود ہی شہر سے اپنا قبضہ اٹھا کر واپس چلا گیا تھا۔ اب کی بار اس نے بڑے اہتمام سے لشکر کشی کی تھی اور ہر امکانی رکاوٹ سے نبٹنے کا پختہ انتظام کر لیا تھا۔ وہ اپنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ صوبہ خلاط میں داخل ہوا اور ملازگرد کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔

(۱۱)

اس زمانے میں سلطان الپ ارسلان، آذربائیجان کے شہر خوئی میں فروکش تھا۔

جہاں اس کے پاس صرف پندرہ ہزار سواروں کا لشکر تھا۔ جب اس کو قیصر کی پُرخروش یلغار کی خبر ملی تو سراسیمہ ہونے کی بجائے اس کا جوشِ شجاعت، بھڑک اٹھا۔ اس کی جمعیت نہایت قلیل تھی اور اس وقت کسی طرف سے اس کو کمک بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ لیکن بلا مقابلہ پیچھے ہٹ جانے کو وہ آئینِ جوانمردی کے خلاف سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے اہل وعیال کو خواجہ نظام الملک کے ہمراہ تبریز (یا بروایتِ دیگر ہمدان) بھیج دیا اور خود توکل علی اللہ، قیصرِ روم سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا۔ اس موقع پر اس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے مجاہدینِ اسلام بلاشبہ ہماری تعداد دشمن کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن ہمیں صبر اور ہمت سے کام لینا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت پر بھروسا کرکے دشمن سے نبرد آزما ہونا ہے اگر فتح یاب ہوئے تو خداوندِ کریم کا عظیم احسان ہے ورنہ درجۂ شہادت پر تو ضرور فائز ہونگے اور میرے بعد میرا بیٹا ملک شاہ تاج وتخت کا مالک ہوگا۔"

تمام لشکر نے آخری دم تک اُس کا ساتھ دینے کے عزم کا اظہار کیا اور سلطان انہی پندرہ ہزار رجال بازوں کے ساتھ نہایت تیزی سے دشمن کی طرف بڑھا۔[1]

۴ ذیقعدہ ۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء کو صنداق ترکی کے زیرِ قیادت سلطانی فوج کے مقدمۃ الجیش کی مڈبھیڑ رومی لشکر کے ہراول سے خلاط کے قریب ہوئی۔ گو رومیوں کے ہراول میں باختلافِ روایت دس سے بیس ہزار آزمودہ کار رومی جنگجو تھے لیکن قلیل التعداد اسلامی ہراول دستے

---

[1] سلطان کی فوج کے بارے میں بھی مؤرخین میں اختلاف ہے۔ اسلامی مؤرخین اس فوج کی تعداد دس ہزار سے پندرہ ہزار تک بتلاتے ہیں۔ بعض مغربی مؤرخین بھی یہی تعداد بتاتے ہیں البتہ گبن اور کچھ دوسرے یورپین مصنفین نے سلطانی فوج کی تعداد تیس ہزار سے چالیس ہزار تک لکھی ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کہ سلطانی فوج کی تعداد پندرہ بیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی کیونکہ وہ کسی خاص مہم پر آذربائیجان نہیں گیا تھا بلکہ یہ اس کا معمولی دورہ تھا اور اس کے اہل وعیال بھی ساتھ تھے۔

نے ایک ہی حملے میں اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور اس کے قائد کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کیا۔ سلطان نے فرطِ غضب میں اس کے کان اور ناک کٹوا کر مالِ غنیمت کے ہمراہ نظام الملک کے پاس "نیک شگونی" کے طور پر بھیج دیئے۔ اس دوران میں قیصر نے ملاذگرد کو فتح کر کے خلاط کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ (بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ اس نے خلاط پر بھی قبضہ کر لیا تھا) جب اسے اپنے ہراول دستے کی شکست کی خبر ملی، تو اس نے اپنی ساری فوج کو جمع کر کے الزہرہ کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ جگہ ملاذگرد اور خلاط کے درمیان واقع تھی۔ اُدھر سلطان بھی پیشقدمی کر کے ۶ ذیلقعدہ ۴۶۳ھ ۱۰۷۰ء کو ملاذگرد کے قریب پہنچ گیا اور رومی لشکر سے دو فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن ہو گیا۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے سلطان نے قیصر کو صلح کا پیغام بدیں الفاظ بھیجا کہ لڑائی میں ہزارہا بندگانِ خدا کی جانیں ناحق ضائع ہوں گی بہتر یہی ہے کہ تم اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ممالک مقبوضہ روم میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کریں گے۔

قیصر کو یہ پیغام ملا تو اس نے اسے سلطان کی کمزوری پر محمول کیا اور نہایت متکبرانہ انداز میں اس کو کہلا بھیجا کہ اے وحشی! اگر تم ایسے ہی امن پسند ہو اور بندگانِ خدا کا خون بہانا پسند نہیں کرتے تو چپکے سے اس جگہ سے چلے جاؤ اور اپنا دارالحکومت رے ہمارے حوالے کر دو تاکہ تمہارے قول کا ثبوت تمہارے فعل سے مل جائے۔

سلطان کو قیصر کی نخوت اور بے ہودہ گوئی پر سخت غصہ آیا اور وہ اسی وقت جنگ کے لیے تیار ہو گیا لیکن امام ابوالنصر محمد بن عبدالملک بخاری حنفیؒ نے جو لشکر کے ہمراہ تھے، سلطان کو مشورہ دیا کہ آج توقف کریں کل جمعہ کے دن تمام عالم اسلام نمازِ جمعہ کے بعد آپ کی فتح ونصرت کے لیے دعا کرے گا اس کے بعد آپ میدانِ جنگ کو روانہ ہوں اس وقت مجاہدین کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی دعائیں بھی آپ کے ساتھ ہوں گی۔ سلطان نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور جنگ اگلے دن تک ملتوی کر دی۔

دوسرے دن سلطان نے تمام مجاہدین کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی اور بارگاہِ رب العزت میں دعا کر کے خوب رویا۔ چہرے پر خاک ملی اور پھر مجاہدین سے اس طرح مخاطب ہوا:

"اے بہادرو! مجھے علم ہے کہ شجاعت جو تمہارا ذاتی جوہر ہے اور جس کے اظہار کا موقعہ تم خدا سے چاہتے ہو تمہیں میری آخری وصیت پر عمل کرنے سے روکے گی لیکن اے ایمان والو! میں تمہاری زندگی کو تمہاری موت پر ترجیح دیتا ہوں اور میری خوشی اسی میں ہے کہ تم میرے بعد زندہ رہو۔ واللہ تمہاری وفاداری اور جاں نثاری شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن میں خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ تم میں سے جو شخص کسی وجہ سے واپس جانا چاہتا ہے وہ بلا تکلف جا سکتا ہے اور خدا کی قسم میں کبھی اس سے زیادہ خوش نہیں ہو سکتا اگر تم میری اس آخری وصیت پر عمل کرو۔ بادشاہی اور افسری ختم ہو چکی، میری حیثیت اب اسلام کے ایک ادنیٰ سپاہی سے زیادہ نہیں رہی۔"

سلطان کی تقریر سن کر تمام مجاہدین پر رقت طاری ہو گئی۔ اور سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا: "ہم ہرگز آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اے سلطان خدا کی قسم ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے۔ وہ شخص ملعون ہے جو لڑائی سے جان چرائے اور وہ روسیاہ ہے جو میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھائے۔"

فوج کا جواب سن کر سلطان نے ترکش پھینک دیا اور نیام سے تلوار نکال کر نیام کو بھی پھینک دیا۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑے کی دُم باندھی اور لباسِ شاہی اتار کر ایک سفید قبا پہنی اور حنوط مل کر کہا کہ "اگر میں شہید ہوا تو یہی میرا کفن ہے اور یہی میدانِ جنگ میرا مدفن ہوگا۔" ـــ ان باتوں سے مجاہدین کے دل میں شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک اٹھے اور وہ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے دشمن کی طرف بڑھے۔ سلطان نے مجاہدین کو رکنے کا اشارہ کیا اور معاً گھوڑے سے اتر پڑا، دستار سر سے اتاری اور فرشِ خاک پر سر بسجود ہو گیا۔ اس وقت ساری فوج پر رقت طاری ہو گئی اور سلطان سمیت سب نے ایک بار پھر نہایت خشوع و خضوع سے حق تعالیٰ سے توفیق و نصرت طلب کی۔ اس کے بعد سلطان اٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر برقِ بے اماں کی طرح دشمن پر لوٹ پڑا۔ رومی بھی جنگ کے لیے سخت بیتاب ہو رہے تھے۔ دونوں پُرجوش فریقوں میں اس زور

کارن پڑا کہ زمین کانپ اٹھی ۔ ایڈورڈ گبن کا بیان ہے کہ اس موقع پر سلطان نے اپنے ترک تیر اندازوں سے زبردست کام لیا وہ ہلال کی شکل میں اپنی جگہ قائم تھے اور رومیوں پر ایسی سرعت اور چابکدستی سے تیر برسا رہے تھے کہ ان کی پچھلی صفیں آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں پاتی تھیں ۔ ان کی اگلی صفوں کو، جو آزمودہ کار جنگجوؤں پر مشتمل تھیں ۔ مسلمانوں کے پے بہ پے طوفانی حملوں نے بہت جلد درہم برہم کر دیا اور ان کے نامی جرنیل باسلاسیوس (BASILACIUS) کو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ اس موقع پر قیصر سے ایک فاش غلطی سرزد ہوئی ۔ وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنی پسپا ہوتی ہوئی فوج کو سنبھالنے کے لیے آگے بڑھتا لیکن اس کے بجائے اس نے ستانے کے لیے اپنے خیمے کا رُخ کیا ۔ مغربی مؤرخین لکھتے ہیں کہ تمازتِ آفتاب نے اس کو لو کھلا دیا تھا اور وہ وقت کی نزاکت کا احساس نہ کر سکا ۔ جب اس کی فوج نے شاہی عَلم کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو اس کی ہمت پست ہو گئی اور اکثر رومی سپاہی بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔ قیصر نے اپنی فوج کی کیفیت دیکھی تو وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوا اور اپنے قلبِ لشکر کے منتخب دستوں کو ساتھ لے کر پھر میدانِ جنگ کی طرف پلٹا لیکن اب لڑائی کا نقشہ بدل چکا تھا ۔ مسلمانوں کے حوصلے دوچند ہو گئے تھے اور وہ رومیوں پر زبردست دباؤ ڈال رہے تھے ۔ قیصر ایک بہادر آدمی تھا اور تاجِ شاہی سر پر رکھنے سے پہلے سالہا سال ایک فوجی جرنیل کی زندگی گزار چکا تھا وہ بڑی جوانمردی اور ثابت قدمی سے لڑا لیکن جلد ہی اس کے ارد گرد کی فوج مسلمان شہسواروں سے مغلوب ہو گئی اور قیصر کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا ۔ اس طرح پندرہ ہزار مسلمانوں نے دو لاکھ جنگجو رومیوں کے ٹڈی دل پر عظیم الشان فتح حاصل کی ۔ مؤرخین نے اس لڑائی کو "جنگِ ملاذگرد" کا نام دیا ہے اور اسے دنیا کی عظیم جنگوں میں شمار کیا ہے کیونکہ اس نے عظیم الشان رومی سلطنت کی ہیبت اور دبدبے کو ملیامیٹ کر دیا اور ایشیائے کوچک کا دروازہ مسلمانوں پر کھول دیا ۔ اس لڑائی میں اس قدر مقتول اور گرفتار ہوئے کہ مؤرخین نے ان کی تعداد بتلانے سے عجز کا اظہار کیا ہے ۔

دوسرے دن قیصر کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا ۔ گبن کا بیان ہے کہ اس وقت

اس مسلمان ہیرو (الپ ارسلان) نے جو عمدہ سلوک شہنشاہِ قسطنطنیہ سے کیا اس کی تعریف و توصیف میں اس کے سخت متعصب دشمن بھی رطب اللسان ہیں۔ اور فی الحقیقت ایک فاتح کا اپنے مفتوح سے ایسا سلوک مہذب دنیا کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ سلطان اپنی نشستگاہ سے اٹھا، چند قدم آگے بڑھا اور نہایت تپاک کے ساتھ شہنشاہ سے مصافحہ (SHAKE HAND) کیا اور عزت و احترام سے اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔[1] پھر اس کی دلجوئی کی اور اسے یقین دلایا کہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے اس کی عزت برقرار رکھی جائے گی۔

سات دن تک میدانِ جنگ میں سلطانی لشکر نے جشنِ فتح منایا۔ اس دوران میں سلطان نے اپنی قیامگاہ کے قریب ایک عظیم الشان خیمہ میں قیصر کو اعزاز کے ساتھ اپنا مہمان رکھا اور اس کی فوج کے کئی جرنیلوں کو بھی اس کے ساتھ رہنے کی اجازت دی، وہ ہر روز دو وقت قیصر کے پاس آتا اور اس کو اپنے ساتھ کھانا کھلاتا۔ آٹھویں دن سلطان نے جنگ کا ذکر چھیڑا اور قیصر سے پوچھا کہ تم اب مجھ سے کس سلوک کی امید رکھتے ہو۔

قیصر نے جواب دیا: "اگر ظالم ہو تو مجھے قتل کر ڈالو گے، اگر متکبر ہو تو ملک میں میری تشہیر کرو گے یا عمر بھر کے لیے حوالۂ زندان کر دو گے اور اگر شاہانہ فیاضی سے کام لینا چاہو تو تاوانِ جنگ لے کر معاف بھی کر سکتے ہو۔"

سلطان اس کے جواب پر متبسم ہو گیا اور پوچھا کہ "اگر میں اس حالت میں تمہارے پاس لایا جاتا تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟"

---

[1] بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ اس موقع پر قیصر سے کہا گیا کہ وہ بساطِ سلطانی کو بوسہ دے۔ اس نے بلا تامل اس حکم کی تعمیل کی۔ اس کے بعد سلطان نے اپنا ایک پاؤں قیصر کے کندھے (یا گردن) پر رکھا۔ کچھ دوسرے مؤرخین لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ہاتھ سے قیصر کو تین کوڑے مارے اور کہا "میں نے تجھے صلح کا پیغام بھیجا تھا لیکن تو نے اسے رد کر دیا۔ اب اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔" قیصر نے ندامت کا اظہار کیا اور کہا کہ "اب سرزنش بیکار ہے خدا تمہاری مدد کر چکا اب جو فیصلہ میرے بارے میں کرو گے میں اس پر راضی ہوں۔" مؤرخ گبن ان روایات کو مشکوک ٹھہراتا ہے۔

قیصر نے بے ساختہ جواب دیا: "بدترین سلوک ——— جو میرے بس میں ہوتا۔" مؤرخ گبن کے بیان کے مطابق قیصر کا جواب یہ تھا کہ میں تیرے لیے سزائے تازیانہ تجویز کرتا (یعنی تجھے کوڑے لگواتا)

سلطان نے کہا کہ اب مجھے تیری ذہنیت کا علم ہو گیا ہے کیوں نہ میں بھی تیرے ساتھ یہی سلوک کروں؟

قیصر نے جواب دیا کہ میں نے اپنی ذہنیت اور فسادِ نیت کا پھل بھی تو پالیا ہے۔

سلطان اس کا جواب سُن کر ہنس پڑا اور کہا کہ "میں دینِ حق اسلام کا پیرو ہوں اور اسلام سلامتی اور امن کا پیامبر ہے، جو سلوک تم میرے ساتھ کرنا چاہتے تھے میں وہ تمہارے ساتھ نہ کروں گا۔"

اس کے بعد دونوں میں دیر تک دوستانہ گفتگو ہوتی رہی۔ سلطان نے قیصر کو بہت سی نصیحتیں کیں اور جو غلطیاں جنگ میں قیصر اور اس کے جرنیلوں سے ہوئی تھیں ان سے اس کو آگاہ کیا[1] پھر دونوں میں پچاس سال کے لیے ان شرائط پر معاہدہ صلح ہو گیا۔

۱۔ قیصر دس لاکھ (اور بروایتِ دیگر پندرہ لاکھ) دینار فدیہ ادا کرے گا۔ اور اس کے بعد ہر سال تین لاکھ ساٹھ ہزار دینار بطور خراج ادا کیا کرے گا۔

۲۔ تمام مسلمان اسیرانِ جنگ رہا کر دیئے جائیں گے۔

۳۔ ضرورت کے وقت قیصر سلطان کو فوجی مدد دے گا۔

تکمیلِ معاہدہ کے بعد سلطان نے قیصر اور اس کے جرنیلوں کو قیمتی خلعت دیئے۔ قیصر نے سلطان سے معانقہ کیا اور رخصت ہوتے وقت بغداد کی سمت جھک کر تین سلام کیے گویا خلافتِ بغداد کی اطاعت کا اظہار کیا۔ سلطان نے تین میل تک اس کی مشایعت کی۔

---

[1] بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ سلطان اور قیصر کے مابین یہ گفتگو اس وقت ہوئی جب وہ پہلی بار اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ قیصر کی مہمانداری اور جشنِ فتح کا انعقاد اس کے بعد ہوا۔ بہر صورت تقدیم و تاخیر کے فرق کے باوجود سبھی مؤرخین نے اس گفتگو کو قریب قریب یکساں الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔

(۱۲)

اُدھر قیصر رومانوس کی شکست کی خبر سن کر رومی پادریوں نے مشہور کر دیا کہ خداوند یسوع مسیح رومانوس سے ناراض ہیں اس لیے یہ شخص بادشاہت کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ سلطنت میں انقلاب برپا ہو گیا اور قسطنطنیہ کے تاج و تخت پر میکائل (میخائیل ہفتم) نے قبضہ کر لیا تھا۔ جب رومانوس سلطان سے رخصت ہو کر اپنے سرحدی قلعہ دقیہ میں وارد ہوا تو اس کو انقلاب سلطنت کا حال معلوم ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ دل شکستہ رومانوس نے اس حالت میں بھی وہاں سے دو لاکھ دینار اور ایک سونے کا طبق جس میں نوّے ہزار دینار کی مالیت کے جواہر تھے، سلطان الپ ارسلان کی خدمت میں روانہ کیے اس کے ساتھ ہی انقلاب سلطنت کا حال لکھا اور بحلف تحریر کیا کہ اس سے زیادہ کچھ ادا کرنے کی اس میں مقدرت نہیں ہے۔

سلطان، رومانوس کی راست بازی اور ایفائے عہد سے بہت خوش ہوا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ رومانوس کے دشمنوں کی سرکوبی کر کے تخت حکومت پھر اس کو دلا دے گا لیکن چند دن بعد اسے خبر ملی کہ بدقسمت رومانوس کو باغیوں نے گرفتار کر کے اندھا کر دیا اور پھر قتل کر ڈالا۔

علامہ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ رومانوس نے اپنی معزولی کی خبر سن کر رہبانیت اختیار کر لی تاہم جن شرائط پر اس نے سلطان الپ ارسلان سے صلح کی تھی اس کے جانشین میکائیل نے انہیں قبول کر لیا۔

سنہ ۴۶۴ھ (۱۰۷۲ء) میں خلیفہ بغداد القائم بامر اللہ نے اپنے فرزند المقتدی بامر اللہ کے لیے سلطان سے اس کی بیٹی صفری خاتون کا رشتہ مانگا۔ سلطان نے یہ پیغام قبول کر لیا اور صفری خاتون کا نکاح المقتدی بامر اللہ سے کر دیا۔

اسی سال فارس کے والی فضلویہ شبانکارہ نے سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ سلطان نے خواجہ نظام الملک اور شہزادہ ملک شاہ کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا انہوں

نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا مگر اس کے اظہارِ ندامت پر سلطان نے اسے رہا کر دیا۔

(۱۳)

سلطان کا مدت سے ارادہ تھا کہ تمام بلادِ ترکستان کو اپنے زیرِ نگین لائے اور پھر چین کی طرف پیشقدمی کرے لیکن اس کی دوسری مصروفیات اس ارادے کی تکمیل میں مانع ہوتی رہیں۔ جنگِ ملاذ گرد کے بعد اس نے مہم ترکستان کے لیے زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں اور ۴۶۵ھ (۱۰۷۳ء) میں ایک زبردست فوج کے ساتھ اس مہم پر روانہ ہوا۔ یہ فوج باختلافِ روایت دو یا ڈھائی لاکھ جنگجوؤں پر مشتمل تھی۔ ان میں پچاس ہزار کے قریب سوار تھے اور باقی پیادہ۔ سلطان نے دریائے جیحوں (OXUS) پر کشتیوں کا پُل بندھوایا اور بیس پچیس دن کے اندر اپنی عظیم الشان فوج اور دوسرے سامان سمیت دریا کے پار اتر گیا اور فربر (یا فربر) کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔

یہاں سلطان کے سامنے ایک سرحدی قلعے کے محافظ (یا قلعہ دار) یوسف خوارزمی کو گرفتار کر کے پیش کیا گیا[۱]۔ سلطان نے اس سے کچھ استفسار کیا۔ یوسف نے بھرے دربار میں نہایت گستاخانہ جواب دیا۔ اس پر سلطان کو غصہ آ گیا اور اس نے حکم دیا کہ اسے چومیخہ کر کے

---

[۱] یوسف خوارزمی کون تھا اور سلطان کے سامنے کیسے لایا گیا، اس کے بارے میں مؤرخین کے بیانات میں اختلاف ہے بعض نے لکھا ہے کہ وہ فرمانروائے ترکستان و ماوراء النہر کی طرف سے سرحدی قلعے برزم (یا بوزم) کا قلعہ دار تھا، اس نے سلطانی لشکر کی بڑی سختی سے مزاحمت کی کئی دن تک مقابلہ پر اڑا رہا آخر شکست کھائی اور گرفتار ہو کر سلطان کے سامنے آیا۔

دوسری روایت کے مطابق یہ قلعہ سلطان کی مملکت میں شامل تھا اور یوسف نے قلعہ کے معاملات میں کوئی جرم کیا تھا اس لیے اس کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شخص خوارزم کا رہنے والا ایک ترک تھا اور بڑا نڈر، غصیلا اور جنگجو تھا۔

قتل کردو۔لہ

یہ سن کر یوسف کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے چلا کر کہا: "او نامرد! (یا بروایت دیگر او مخنث) کیا میرے جیسا بہادر اس ذلیل طریقہ سے قتل کیا جائے گا"

سلطان جوشِ غضب سے تھرّا اٹھا اور اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے چھوڑ دو، پھر کمان پر سہ چوبہ تیر جوڑ کر یوسف پر چلایا۔ سلطان کو تیر اندازی میں کمال درجے کی مہارت تھی اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہ کرتا تھا لیکن بدقسمتی سے اس موقع پر اس کا تیر نشانہ پر نہ لگا۔ سلطان اب فرطِ غیظ میں اپنے تخت سے اتر کر یوسف کی طرف جھپٹا لیکن اس کا دامن تخت کے پایہ سے الجھ گیا (یا اپنے پاؤں کے نیچے آگیا) اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اسی اثناء میں یوسف نے اپنی بغل سے چھری نکال لی اور آناً فاناً آگے بڑھ کر سلطان کو بھونک دی اور پھر پلٹ کر امیر سعد الدولہ گوہر آئین کو زخمی کر دیا جو قریب ہی کھڑا تھا، یہ حادثہ اتنی سرعت سے وقوع پذیر ہوا کہ سارا دربار ششدر رہ گیا۔ اس موقع پر جامع نامی ایک ارمنی فراش نے آگے بڑھ کر ایک 'میخ کوب' یوسف کے سر پر مارا جس سے وہ چکرا کر گر پڑا۔ درباریوں نے اسی وقت اس پر تلواروں کا مینہ برسا دیا اور ایک ثانیہ میں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ واقعہ چھ ربیع الاول ۴۶۵ھ کو پیش آیا۔ زخمی سلطان کو اٹھا کر دوسرے خیمے میں لے گئے۔ طبیبوں اور جراحوں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن زخم کاری تھا کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور دس ربیع الاول ۴۶۵ھ (بمطابق ۱۴ نومبر ۱۰۷۲ء) کو اسلام کے اس مایۂ ناز فرزند نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ میت مرو لے جائی گئی اور وہاں کے شاہی قبرستان میں اس کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔ سات سال پہلے ۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء میں وہ ملک شاہ کو اپنا ولی عہد نامزد کر چکا تھا، وفات سے پہلے اس نے عمائدِ سلطنت کو بلا کر دوبارہ ملک شاہ کے حق میں وصیت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر اس نے ایک عبرتناک تقریر

لہ یعنی چار میخیں گاڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں ان سے باندھ دو اور پھر قتل کر دو۔

کی جس میں حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ :

"مجھ پر جو کچھ گزرا وہ میری خام خیالی کا نتیجہ تھا۔ جب میں نوجوان تھا تو دریائے دجلہ کے کنارے ایک بزرگ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ زورِ بازو پر کبھی ناز نہ کرنا اور دشمن کو کبھی حقیر نہ سمجھنا لیکن افسوس کہ اس بزرگ کے ارشادات میں بھول گیا۔ یہاں آکر جب میں نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنی عظیم الشان فوج پر نظر ڈالی تو میرے دل میں خیال گزرا کہ آج روئے زمین پر مجھ سے بڑا کوئی بادشاہ نہیں ہے اور کسی کو میرا مقابل ہونے کا یارا نہیں ہے پھر جب یوسف کو میرے سامنے پیش کیا گیا تو میں نے اپنے زورِ بازو پر بھروسا کیا اور اسے حقیر جانا! اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہزار مسلح غلامانِ خاصہ کی موجودگی میں خدا نے مجھے ایک معمولی قیدی کے ہاتھ سے مروا دیا۔ میں حق تعالیٰ سے اپنی خام خیالی پر مغفرت طلب کرتا ہوں اور تمہیں بھی وصیت کرتا ہوں کہ ہمیشہ خود بینی سے بچنا اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا۔"

۱۴

تمام مؤرخین نے سلطان الپ ارسلان کی سیرت اور کردار کی بےحد تعریف کی ہے وہ بڑا شجاع، فیاض، خدا ترس اور عادل حکمران تھا اس کے باورچی خانہ میں روزانہ پچاس بکریاں فقراء اور مساکین کے لیے ذبح ہوتی تھیں اور سلطنت کے تمام محتاجوں کو گھر بیٹھے وظیفہ دیا جاتا تھا۔ مقررہ مالگذاری کے علاوہ اس نے رعایا سے اور کسی قسم کا ٹیکس یا محصول کبھی وصول نہ کیا۔ اس کے عدل اور فریاد رسی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اس کے ایک غلام خاص نے کسی دیہاتی کی پگڑی چھین لی۔ جب اس نے سلطان کے پاس فریاد کی تو سلطان نے مجرم کو پکڑ کر قتل کرا دیا اور پھر اس کی لاش کو سرِ عام سولی پر لٹکا دیا تاکہ اس کے خاص ملازموں کو عبرت حاصل ہو اور وہ رعایا کے ساتھ مطلق کسی قسم کی زیادتی نہ کریں۔ وسعت سلطنت اور قوت و شوکت کے لحاظ سے وہ اپنے ہمعصر فرمانرواؤں میں سب سے بڑا فرمانروا تھا اور اس کو سلطانِ عالم

کہا جاتا تھا۔ علامہ ابن اثیر کہتے ہیں:

ودان لہ العالم وبحق قیل لہ سلطان العالم

(عالم سلطان کا مطیع تھا اور اس کو بجا طور پر سلطانِ عالم کہا جاتا تھا)

سلطان ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا اور حضرت امام ابوحنیفہؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ ۴۵۹ھ / ۱۰۵۷ء کو اسے اطلاع ملی کہ امام صاحبؒ کا مزار کسمپرسی کی حالت میں ہے تو اس نے ابوسعد محمد بن منصور شرف الملک مستوفی کو حکم دیا کہ امام صاحبؒ کی قبر پر ایک عظیم الشان قبہ تعمیر کیا جائے اور اس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی تیار کیا جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور تھوڑی ہی مدت میں ایک شاندار قبہ اور مدرسہ تعمیر ہو گیا۔ اس مدرسہ کی رسم افتتاح بڑی شان سے ادا کی گئی اور یہ صدیوں تک تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتا رہا۔

سلطان کی علم دوستی اور معارف پروری کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اسی کے عہد میں اور اسی کے ایما پر وزیر السلطنت خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۷ھ / ۱۰۶۵ء میں اس عظیم الشان نظامِ تعلیم کی بنیاد رکھی جو تاریخ عالم میں "نظامیہ" کے نام سے مشہور ہوا اور مدارسِ نظامیہ سے صدیوں تک علوم و معارف کے چشمے ابلتے رہے۔

سلطان الپ ارسلان نے اپنے پیچھے کثیر اولاد چھوڑی۔ بیٹوں میں ملک شاہ، تتش، تکش، ایاز، ارسلان شاہ، ارسلان ارغون اور بوری برس نے تاریخ میں بڑی شہرت پائی۔ بیٹیوں میں صرف صفری خاتون، عائشہ اور سارہ کے نام معلوم ہیں۔ سلطان ملک شاہ بن الپ ارسلان کے عہد میں سلجوقی سلطنت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی، یہاں تک کہ دنیا کی کوئی سلطنت اس سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔

خواجہ نظام الملک طوسی

وزیر کبیر خواجۂ بزرگ نظام الملک حسن بن علی بن اسحاق طوسی تاریخ اسلام کی ایک مہتم بالشان شخصیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہارون الرشید عباسی کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی[1] کے بعد ایشیا بھر میں اتنا بڑا مدبر، زیرک اور علم دوست وزیر پیدا نہیں ہوا۔ دولت سلجوقیہ کو عظمت و شوکت کے نقطۂ عروج تک پہنچانے میں اس کی مساعی کو بڑا دخل تھا اسی لیے مؤرخین اس کو بجا طور پر دولتِ سلجوقیہ کی پیشانی کا نور کہتے ہیں۔

---

[1] ابو الفضل یحییٰ بن خالد بن جعفر بن جاماسب برمکی وزیر کبیر خلیفہ ہارون الرشید عباسی علوِ قدر، نفاذ امر، قدر و عزت اور جلالت و منزلت کی اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ آج تک نظام الملک کے سوا شاید ہی کسی دوسرے وزیر کو یہ درجہ حاصل ہوا ہو۔

۱۱۹ھ/۷۳۷ء یا ۱۲۰ھ/۷۳۸ء میں ایک مجوسی النسل خاندان میں پیدا ہوا۔ اول اول اس کے دادا جعفر نے اسلام قبول کیا اور پھر اس کے تمام خاندان نے اسلام قبول کر لیا۔ جعفر کا بیٹا خالد نہایت قابل اور منتظم شخص تھا۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت خلیفہ عبداللہ سفاح اور ابو جعفر منصور کا وزیر بن گیا۔ یحییٰ اسی نامور باپ کا فرزند تھا۔ خلیفہ مہدی نے اس کو ہارون الرشید کا اتالیق بنا دیا تھا۔ ہارون الرشید ۱۷۰ھ/۷۸۶ء میں مسندِ خلافت پر بیٹھا تو اس نے یحییٰ کو وزیر کبیر اور مدار المہام بنا کر سلطنت کا تمام نظم و نسق اس کے سپرد کر دیا۔ ہارون اس کو بمنزلہ باپ کے سمجھتا تھا اور بابا جان کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ یحییٰ جود و سخا، علم و فضل، فصاحت و بلاغت، تہور و شجاعت اور تدبیر و سیاست میں اپنی مثال آپ تھا۔ اس کی معارف پروری اور فیاضی کی داستانوں سے تاریخ اور ادب کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ یحییٰ نے اپنی حیات میں ہی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۶۰۷ پر)

نام حسن بن علی اسحاق بن عباس کنیت ابو علی۔ القاب نظام الملک، قوام الدین، خواجہ بزرگ، وزیر کبیر، تاج الحضرتین، اتابک، رضی امیر المومنین —— ان میں سے نظام الملک کا لقب نام کنیت اور دوسرے تمام القاب پر غالب آیا۔

نظام الملک ایران کے مشہور تاریخی شہر طوس[1] کے ایک محلہ یا نواحی گاؤں نوقان میں ۲۱ ذیقعد ۴۰۸ھ / ۱۰۱۷ء کو پیدا ہوا۔ باپ کا نام علی اور ماں کا نام زمرد خاتون تھا۔ آباؤ اجداد کا پیشہ باغبانی تھا۔ (بعض مؤرخین نے اس کو دہقان زادہ لکھا ہے) خواجہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر اور مقامی مکتب میں حاصل کی[2] گیارہ برس کی عمر تک اس نے نہ صرف

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)۔ اپنے فرزند فضل اور اس کے بعد دوسرے بیٹے جعفر کو ہارون کا وزیر بنوا دیا وہ بھی تمام صفات میں اپنے باپ کے مثیل تھے لیکن افسوس کہ آخر میں یہ خاندان ہارون کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ جعفر کو قتل کیا گیا اور خاندان کے دوسرے افراد کو قید میں ڈال دیا گیا۔ یحییٰ نے عالتِ قید میں ربیع الآخر ۱۹۰ھ / ۸۰۶ء میں وفات پائی۔

[1] طوس کا موجودہ نام "مشہدِ مقدس" ہے۔ اس شہر کو سیدنا حضرت علی رضاؑ کی آخری آرام گاہ ہونے کی وجہ سے ابدی شہرت حاصل ہو گئی۔ فی الحقیقت مشہد کا موجودہ شہر پرانے شہر طوس سے پندرہ میل دور شمال مشرق میں واقع ہے۔ طوس کی تاریخ ہزاروں سال پر حاوی ہے۔ دورِ اسلام میں یہ بڑا مردم خیز شہر رہا ہے۔ خواجہ نظام الملک کے علاوہ حجۃ الاسلام امام محمد غزالیؒ۔ امام احمد غزالیؒ۔ ابو نصر سراج صوفی۔ شیخ ابو علی فارمدیؒ۔ شیخ ابوبکر نساجؒ۔ بابا محمودؒ۔ فردوسی اور خواجہ نصیر الدین طوسی جیسی یگانۂ روزگار شخصیتیں طوس ہی کی خاک سے اٹھیں۔

[2] نظام الملک کے والد علی کو اس کے پیشہ زراعت یا باغبانی کی نسبت سے جاہل نہ سمجھنا چاہیے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ علی ایک عالم وفاضل شخص تھا اور جغرہ بیگ داؤد سلجوقی کی طرف سے طوس میں صاحب الخراج (تحصیلدار) تھا۔ اس کا بھائی عبداللہ بھی ایک متبحر عالم تھا اس لیے نظام الملک نے ایک علمی ماحول میں آنکھ کھولی —— اس زمانے میں معمولی دیہات کے مدرسوں میں بھی فیض کے چشمے جاری تھے اور بڑے بڑے صاحبِ کمال لوگ ان مدرسوں میں درس دیتے تھے۔ نظام الملک کا پہلا استاد اور اتالیق فقیہ عبدالصمد قندرجی تھا جو ایک نامور عالم اور مردِ صالح تھا اور نوقان (طوس) کے مقامی مکتب میں درس دیتا ہے۔

فقہ و حدیث کے ابتدائی مسائل پر عبور حاصل کر لیا بلکہ قرآن مجید بھی حفظ کر لیا اس کے بعد وہ نیشاپور جا کر امام موفق ؒ کی مشہور زمانہ درسگاہ میں داخل ہو گیا اور چار برس میں جملہ دینی علوم میں درجۂ تبحر حاصل کر لیا۔ بعض مورخین کے بیان کے مطابق اسی درسگاہ میں حکیم عمر خیام اور حسن بن صباح بھی خواجہ کے ہمدرس تھے امام موفق ؒ سے سندِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد خواجہ نے بخارا کا رُخ کیا۔ یہ شہر بھی اس زمانے میں علم کا مرکز تھا خواجہ نے بخارا کے دارالعلوم سے بھی مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی۔ پھر وہاں سے مرو اور ماوراء النہر ہوتا ہوا غزنین پہنچا اور وہاں کسی دفتر میں ملازم ہو کر دفتر کا کام سیکھا اور حساب اور انشاء میں مہارت حاصل کی چند سال بعد وہاں سے خراسان گیا کچھ عرصہ وہاں گزارا اور پھر وہاں سے بلخ پہنچا۔

اس زمانہ میں چغری بیگ داؤد سلجوقی (والد الپ ارسلان) کی طرف سے ابو علی احمد بن شاذان، بلخ کا گورنر تھا۔ اس نے خواجہ کو جوہر قابل دیکھ کر میر منشی (کاتب) کے عہدے پر فائز کر دیا۔ یہی عہدہ خواجہ کی آئندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ابو علی احمد بڑا قابل اور صاحب تدبیر شخص تھا لیکن مزاج میں کسی قدر خشنت اور تندی تھی اس لیے خواجہ کچھ مدت بعد اس کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو گیا اور استعفا دے کر مرو چلا گیا اور وہاں چغری بیگ داؤد سلجوقی فرمانروائے خراسان کی ملازمت اختیار کر لی۔ چغری بیگ جلد ہی خواجہ کی خداداد صلاحیتوں کو بھانپ گیا اور اس پر حد سے زیادہ مہربان ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کو اپنے فرزند الپ ارسلان کا اتالیق بنا دیا۔ چغری بیگ نے ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء میں وفات پائی اس کے بعد سلطان طغرل بیگ نے الپ ارسلان کو بلخ کا گورنر بنا دیا۔ سلطان طغرل نے چغری بیگ کی وفات کے بعد اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا تھا اسی کے ایماء پر اس نے اپنے دوسرے بھتیجے سلیمان کو (جو الپ ارسلان کا سوتیلا بھائی تھا) اپنا ولی عہد قرار دیا حالانکہ وہ الپ ارسلان سے چھوٹا تھا۔ ۴۵۵ھ / ۱۰۶۳ء میں سلطان طغرل نے وفات پائی تو اس کی جانشینی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک گروہ نے سلیمان کی حمایت کی اور دوسرے نے الپ ارسلان کی۔ خواجہ نظام الملک کا تعلق موخر الذکر گروہ سے تھا۔ اس جھگڑے میں الپ ارسلان کو کامیابی ہوئی

اور محرم ۴۵۶ھ میں وہ بلا شرکتِ غیرے سلجوقی تاج و تخت کا مالک بن گیا۔ سلطان نے امورِ وزارت کو عمید الملک کندری[1] اور نظام الملک کے سپرد کر دیا لیکن یہ مشترکہ وزارت چند ماہ سے زیادہ نہ چل سکی۔ ذی الحجہ ۴۵۶ھ میں سلطان نے عمید الملک کندری کو بوجوہ قتل کرا دیا اور نظام الملک کو مستقل وزیر سلطنت مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں وہ شہزادہ ملک شاہ کی اتالیقی کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ ۴۶۵ھ میں سلطان الپ ارسلان نے شہادت پائی تو خواجہ نے ملک شاہ کو تخت نشین کرنے اور اس کی حکومت کی بنیادیں مستحکم کرنے کے لیے زبردست جدوجہد کی۔ چنانچہ ملک شاہ نے اس کو وزیر السلطنت ہی نہیں بلکہ تمام سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک دیا۔

---

[1] ابو نصر محمد بن منصور ملقب بہ عمید الملک کندری آٹھ سال تک سلطان طغرل بیگ سلجوقی کا وزیر رہا۔ عالم و فاضل آدمی تھا اور عربی و فارسی ادب انشاء پر مشاقانہ قدرت رکھتا تھا محض اپنی ذاتی قابلیت اور محنت کی بدولت معمولی حیثیت سے درجۂ وزارت تک پہنچا۔ مؤرخین نے اس کی جود و سخا اور فضل و کمال کی بڑی تعریف کی ہے لیکن ساتھ ہی لکھا ہے کہ مذہبی معاملات میں تنگ نظر اور متعصب تھا۔ پہلے طغرل بیگ سے اہلِ تشیع پر خطبوں میں لعنت بھیجنے کا حکم جاری کرایا پھر اشعریوں پر لعن بھیجنے کا فرمان حاصل کیا۔ اس کے اس رویے کے خلاف لوگوں میں بے چینی پھیل گئی اور امام ابوالقاسم قشیریؒ اور امام الحرمین جوینیؒ جیسے فضلائے زمانہ دوسرے بیسیوں علماء کے ساتھ نیشاپور سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ سلطان طغرل کے انتقال کے بعد عمید الملک نے در پردہ الپ ارسلان کے مقابلے میں سلیمان کی حمایت کی اس سے الپ ارسلان کے دل میں اس کے خلاف کھٹک پیدا ہو گئی چنانچہ تخت نشین ہونے کے کچھ عرصہ بعد الپ ارسلان نے اس کو وزارت سے معزول کر کے قید کر دیا اور ایک سال بعد (۱۶ ذی الحجہ ۴۵۶ھ کو) قتل کرا دیا۔ قتل کے وقت اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب جلاد تلوار لے کر اس کے سر پر کھڑا ہوا تو اس نے الپ ارسلان کو پیغام بھیجا کہ تیرے چچا نے مجھے وزیر بنایا تھا اور تو شہادت کے رتبے پر فائز کر رہا ہے اس کا مجھے آخرت میں اجر ملے گا۔ نظام الملک کو پیغام بھیجا کہ تو نے بہت برا کیا ہے کہ ان ترک (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خواجہ نظام الملک نے تقریباً انتیس برس وزارت کی۔ اس طویل مدت میں وہ نو برس سلطان الپ ارسلان سے وابستہ رہا اور بیس برس سلطان ملک شاہ کی خدمت کرتا رہا۔ ملک شاہ کے عہد میں اس کی وزارت بادشاہی سے کم نہیں تھی۔ رفاہِ عامہ نشرِ علوم و معارف، ملکی نظم و نسق، تعمیرات، زراعت، تجارت، جنگی مہمات غرض کوئی صیغہ ایسا نہیں تھا جس پر خواجہ کے حسن تدبیر کی چھاپ نہ ہو۔

خواجہ نظام الملک کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اسے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نہایت ارفع اور اعلیٰ مقام عطا کیا، نظامیہ بغداد کی تاسیس ہے۔ یہ ایک عظیم الشان اسلامی جامعۂ علوم (یونیورسٹی) تھی جس نے تمام ملک میں علوم و معارف کے دریا بہا دیئے۔ اس کے ماتحت نیشاپور، طوس، اصفہان، موصل، مرو، بصرہ، ہرات، بلخ وغیرہ میں بھی عظیم الشان مدارس قائم ہوئے اور صدیوں تک اسلامی علوم کا مرکز بنے رہے۔ بدقسمتی سے اخیر میں خواجہ نظام الملک اور سلطان ملک شاہ کے مابین کشیدگی پیدا ہو گئی جو شعبان ۴۸۵ھ میں خواجہ کی وزارت سے معزولی پر منتج ہوئی تاہم سلطان نے اس کے ذاتی اعزاز میں کوئی کمی نہ کی۔ معزولی کے ایک ماہ بعد وہ سلطان کے ہمراہ بغداد جاتے ہوئے ۱۰ رمضان المبارک ۴۸۵ھ کو نہاوند کے مقام پر ایک باطنی فدائی کی چھری کا شکار ہو گیا۔ لاش اصفہان لا کر دفن کی گئی۔ تمام عالمِ اسلام میں اس کی موت کا پُرزور ماتم کیا گیا اور شعراء نے دلگداز مرثیے لکھے۔ ابوالہیجا مقاتل بن عطیہ (شبل الدولہ) کے مرثیے کا یہ قطعہ توزبانِ زدِ خواص و عوام ہو گیا۔

كَانَ الْوَزِيْرُ نِظَامُ الْمُلْكِ لُؤْلُؤَةً ... نَفِيْسَةً صَاغَهَا الرَّحْمٰنُ مِنْ شَرَفٍ

عَزَّتْ فَلَمْ تَعْرِفِ الْاَيَّامُ قِيْمَتَهَا ... فَرَدَّهَا غَيْرَةً مِّنْهُ اِلَى الصَّدَفِ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بادشاہوں کو وزیر کشی کی چاٹ لگا دی۔ وہ دن دور نہیں کہ تو اور تیری اولاد بھی ایسے انجام سے دوچار ہوگی۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس کے قتل میں فی الواقع

یعنی نظام الملک ایک دُرِ یکتا تھا جسے حق تعالیٰ نے دریائے مشرف سے نکالا تھا۔
اس نے دنیا کو اپنی آب و تاب دکھلائی مگر دنیا نے اس کی قدر و قیمت نہ پہچانی اس
لیے غیرتِ الٰہیہ نے اس کو پھر صدف میں رکھ دیا۔[ا]

تمام مؤرخین نے خواجہ نظام الملک کے ذاتی اوصاف و خصائل کی بیحد تعریف کی ہے وہ اربابِ علم و ہنر کا صرف قدر داں ہی نہیں تھا بلکہ خود بھی ایک بلند پایہ عالم اور ادیب تھا اور قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، حکمت، انشا، شعر و ادب وغیرہ تمام علوم میں درجۂ تبحّر رکھتا تھا۔ علامہ ابن خلکان اور بعض دوسرے مورخین نے تو اس کو "محدّث" کا درجہ دیا ہے اور اس سے ایک حدیث بھی روایت کی کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم مسجد کے اندر جاؤ تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرو۔"

دینی مسلک میں وہ فقہ شافعی کا پیرو تھا لیکن نہایت فراخ حوصلہ اور بے تعصب تھا چنانچہ سلطان الپ ارسلان کے عہدِ وزارت میں عہدۂ وزارت سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خطبوں میں اہلِ تشیع اور اشاعرہ پر لعنت بھیجنا موقوف کرا دیا۔

خواجہ کو اربابِ فضل و کمال کی صحبت میں بیٹھ کر دلی راحت حاصل ہوتی تھی اس کے دربار میں ہمیشہ علماء و فضلا کا مجمع رہتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ دیر تک علماء سے علمی گفتگو میں مصروف رہا کرتا تھا اور یہ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔

علامہ ابن خلکانؒ نے لکھا ہے کہ " وَكَانَ مَجْلِسُهٗ عَامِرًا بِالْفُقَهَاءِ" یعنی اس کی مجلس فقہا سے بھری رہتی تھی۔ خواجہ اہلِ علم کی تعظیم و تکریم بھی حد سے زیادہ کرتا تھا اور ہمیشہ ان کی خدمت کرنے کا کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈتا رہتا ہے۔ علامہ عماد الدین اصفہانی کا بیان ہے کہ نظام الملک کو جہاں کسی شہر میں کوئی ممتاز عالم مل جاتا تھا وہ وہیں فوراً ایک مدرسہ اور کتب خانہ قائم کر دیتا تھا اور اس عالم کو اس مدرسہ میں درس و تدریس اور کتب خانے

[ا] صدف میں رکھنے کا کنایہ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ سے ہے۔

کی نگرانی کا کام سونپ دیتا تھا ایسے ہر مدرسہ کے لیے جائداد وقف کی جاتی اور کتابیں وغیرہ مہیا کی جاتی تھیں۔ خواجہ نظام الملک نے ان مدارس کے معلمین اور طلبہ کے معقول وظیفے بھی مقرر کر رکھے تھے اور یہ سارا خرچ وہ صرف شاہی خزانے سے نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے اپنی ذاتی جاگیر کی آمدنی کا دسواں حصہ بھی ان اخراجات کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ صیغۂ تعلیم میں جتنی رقم شاہی خزانے سے لی جاتی تھی اس کے برابر رقم خواجہ نظام الملک اپنی ذاتی جاگیر سے دیتا تھا۔ اہم مدرسوں کے ساتھ ملحق کتب خانوں کے لیے (بالخصوص نظامیہ بغداد کے کتب خانے کے لیے) خواجہ نے اپنے ذاتی کتب خانہ سے ہزاروں کتابیں فراہم کیں۔ ان میں بعض کتابیں نادر و نایاب تھیں [۱]۔

خواجہ کو عبادت اور ذکر الٰہی سے کمال درجے کا شغف تھا۔ نماز باجماعت کی سختی سے پابندی کرتا تھا اور اذان کی آواز سنتے ہی سب کام چھوڑ کر نماز کے لیے لپکتا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہنے کی کوشش کرتا اور تلاوتِ قرآن پاک میں کبھی ناغہ نہ ہونے دیتا۔ ہر سوموار اور جمعرات کو روزہ رکھتا تھا۔ رمضان المبارک کے مہینے میں اس کی طبیعت ہر وقت خشیتِ الٰہی سے معمور رہتی تھی اور اس کا بیشتر وقت روزہ نماز اور علماء کی مجلس میں بیٹھنے میں صرف ہوتا تھا۔ وہ طبعاً نہایت نیک مزاج، بردبار، انصاف پسند، رحمدل، حلیم الطبع، رقیق القلب، صابر و شاکر اور فیاض آدمی تھا۔ مؤرخین نے اس کی جود و سخا اور داد و دہش کے متعدد واقعات لکھے ہیں۔ نہ صرف وزیر السلطنت ہونے کی حیثیت سے صبح سے شام تک حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرتا رہتا تھا بلکہ اپنی ذاتی حیثیت میں بھی (اپنی ذاتی آمدنی سے) فقراء و مساکین کو ہزاروں درہم و دینار تقسیم کرتا رہتا تھا۔

---

[۱] علامہ ابن خلدونؒ کا بیان ہے کہ نظامیہ بغداد کے کتب خانے کو نظام الملک نے جو کتابیں دیں ان میں ابراہیم الحربی کی تصنیف "غریب الحدیث" کی دس جلدیں بھی تھیں جو ابو عمر و بن حیا دیہ کی لکھی ہوئی تھیں۔ اس وقت تمام عالم اسلام میں یہ ایک بےمثل اور نادر کتاب تھی۔

یہ خیرات اس رقم کے علاوہ تھی جو وہ اشاعتِ علم اور دوسرے رفاہی کاموں کے لیے اپنی جاگیر کی آمدنی سے صرف کرتا تھا۔ روزانہ صبح اٹھتے ہی ایک سو دینار خیرات کرنا تو اس کی عادت بن گئی تھی اور پھر جب گھر سے نکلتا تو درہم و دینار سے بھری ہوئی تھیلیاں اپنے ساتھ لے لیتا تھا۔ راستے میں جو محتاج نظر آتا اس کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتا تھا یہاں تک کہ دربار یا دفتر تک پہنچتے پہنچتے سب تھیلیاں تقسیم ہو جاتیں تھیں۔ ایک دفعہ اس کی سواری ایک بوڑھے سبزی فروش کی دکان کے سامنے سے گزری۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا اور عرض کیا کہ کثیر العیال ہوں دکان کی آمدنی اس قدر قلیل ہے کہ فاقوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ خواجہ نے روپوں کی ایک تھیلی اس کی طرف پھینک دی۔ سبزی فروش نے دوکان سے اٹھ کر اپاہج کا بھیس بدل لیا اور دوسرے راستے پر جا بیٹھا۔ خواجہ کی سواری گزری تو آواز بدل کر کہا کہ مفلوج ہوں اور بال بچے سخت مصیبت میں ہیں خواجہ نے ایک تھیلی اور اس کی طرف پھینک دی۔ سبزی فروش نے اب کوئی اور روپ دھارا اور چکر کاٹ کر پھر خواجہ کو سلام کر کے کہا کہ جوان لڑکیاں گھر میں ہیں اور تنگدستی کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیلے نہیں کر سکتا۔ خواجہ نے پھر ایک تھیلی اس کو دے دی۔ سبزی فروش بھی ایک ہی حریص آدمی تھا، چوتھی بار پھر بھیس بدل کر خواجہ کے راستے میں جا بیٹھا اور جب اس کی سواری قریب آئی تو عرض کیا کہ اسپیجاب (ماوراءالنہر کا ایک شہر) کا رہنے والا ہوں۔ جہاد کے لیے نکلا تھا، بدقسمتی سے ہمارے لشکر کو شکست ہوئی اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہوں اب پیسے پیسے کو محتاج ہوں۔ خواجہ نے اس کو پھر ایک تھیلی دینے کا حکم دیا اور ساتھ ہی مسکرا کر کہا "اے بوڑھے سبزی فروش، اپاہج، جوان لڑکیوں کے باپ، اسپیجاب کے مجاہد ایک تھیلی اور لے۔"

اس طرح وہ چوتھی تھیلی لے کر رخصت ہوا لیکن خواجہ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا حالانکہ اس نے ہر مرتبہ اس حریص بوڑھے کو پہچان لیا تھا۔

سیاست، تدبر، دیانت امانت اور انشاء پردازی میں تو خواجہ اپنی مثال آپ ہی تھا اور وہ محض اپنے حسنِ لیاقت کی بدولت ہی اتنے بلند مرتبے تک پہنچا تھا۔

مؤرخین نے خواجہ کی سخن فہمی کی بھی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ خود بھی کبھی کبھار فارسی اور عربی میں شعر کہہ لیتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

فارسی

ایں سربند نخوت کاؤسی را بگزار بجبرئیل۔ طاؤسی را
یعنی ہمہ صوفہائے قیردسی را پیش آر، دگر گاؤ مگر طوسی را

عربی

بَعْدَ الثَّمَانِیْنَ لَیْسَ قُوَّۃٌ قَدْ ذَھَبَتْ شَرَّۃُ الصَّبْوَۃِ
کَاَنَّنِیْ وَالْعَصَاءِ بِکَفِّیْ مُوْسٰی وَلٰکِنْ بِلَا نُبُوَّۃٍ

یعنی ہشتاد سالہ عمر کے بعد قوت نہیں رہتی اور لڑکپن کی امنگوں کا تو نشان بھی نہیں ملتا۔

جب میرے ہاتھ میں عصاء موجود ہے تو گویا میں بھی موسیٰؑ (کی طرح صاحب عصاء) ہوں لیکن بغیر نبوت کے۔

خواجہ نے فارسی نثر کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بے مثل انشاپرداز تھا۔ ان خطوط کے علاوہ جو اس نے وقتاً فوقتاً اپنے فرزندوں کو لکھے مندرجہ ذیل تصانیف بھی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں:

وصایا نظام الملک یا دستور الوزراء

سیاست نامہ

سفرنامہ (حالات سفر از خراسان تا کابل براہ ماوراء النہر) یہ کتاب نایاب ہے۔

مؤرخین نے خواجہ کی خانگی زندگی کے بارے میں بہت کم لکھا ہے اس لیے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اپنی زندگی میں کتنی شادیاں کیں، مختلف روایات کو ملا کر پڑھنے سے اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ جب وہ سلطان جغری بیگ داؤد کے دربار میں پہلی بار وارد ہوا تو شادی شدہ تھا اور دو لڑکوں عبید اللہ اور مظفر کا باپ تھا۔ اس کے علاوہ

خواجہ کے ایک دوسرے عقد کا ذکر بعض مؤرخین نے صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ عقد خواجہ نے ۴۵۷ھ (۱۰۶۴ء) میں انجاز (گرجستان یا جارجیا) کے حکمران بقراط کی بیٹی سے کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان الپ ارسلان نے انجاز فتح کیا تو بقراط نے اپنی بیٹی کا عقد سلطان سے کر دیا تھا۔ سلطان نے کچھ عرصہ بعد اس بیگم کو طلاق دے دی اور خواجہ کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ اس گرجستانی بیوی سے بھی خواجہ کے کئی بیٹے پیدا ہوئے۔

خواجہ کی اولاد میں متعدد بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے دس بیٹوں اور ایک بیٹی کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) فخر الملک ابو الفتح مظفر
(۲) موید الملک ظہیر الدولہ ابوبکر عبید اللہ
(۳) جمال الملک ابو منصور
(۴) ضیاء الملک ابو النصر احمد
(۵) شمس الملک عثمان
(۶) عز الملک ابو عبد اللہ الحسین
(۷) عماد الملک ابو القاسم
(۸) ابو البرکات عماد الدین
(۹) عبد الرحیم
(۱۰) علی
(۱۱) صفیہ

اکثر روایتوں میں ہے کہ خواجہ کے کل بارہ بیٹے تھے لیکن دو بیٹوں کے نام معلوم نہیں ہیں۔ اسی طرح اس کی کئی بیٹیاں تھیں لیکن ایک بیٹی کے سوا کسی کا نام معلوم نہیں۔ صفیہ کا نکاح خلیفہ مقتدی کے وزیر عمید الدولہ ابو منصور محمد بن فخر الدولہ بن جہیر سے ۴۶۲ھ میں ہوا تھا۔ اس نے ۴۷۰ھ میں خواجہ کے سامنے ہی وفات پائی۔

شہیدِ ملّت حسین سفاقسی رحمۃ اللہ علیہ

بحرِ روم کی متموج اور نیلگوں سطحِ آب زمانۂ قدیم سے یورپ، ایشیا اور افریقہ کی مختلف قوموں کا رابطۂ اتصال رہی ہے۔ اس بحرِ زخار میں بے شمار جزائر ہیں جن میں سے بعض خاص اہمیت کے حامل ہیں لیکن تاریخِ عالم پر ایک غائر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ بحرِ روم کے جزیرے سسلی (Sicily) کو (جسے عربوں نے صقلیہ کا نام دیا) تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے اس سمندر کا کوئی دوسرا جزیرہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ ماہرینِ طبقات الارض کی تحقیق کے مطابق تقریباً سولہ ہزار مربع کلومیٹر پر محیط یہ جزیرہ بحرِ روم میں اس وقت سے موجود ہے جب کہ یہ عالمِ ہست و بود بنی نوعِ انسان کے وجود سے یکسر خالی تھی۔ یہ جزیرہ اٹلی کے جنوبی گوشے سے ایک چھوٹی سی دو میل عریض آبنائے سینا کے ذریعہ جدا ہوتا ہے۔ آج کل یہ اٹلی کا ایک حصہ ہے لیکن ماضی قدیم میں اس نے ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے یورپ، ایشیا اور شمالی افریقہ کی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مترتب کیے۔ سسلی کی سیاسی تاریخ کا آغاز ۵۲۳ قم سے ہوتا ہے جب یونانیوں نے وہاں ایک خود مختار ریاست کی داغ بیل ڈالی۔ ۴۰۹ قم میں اہلِ قرطاجنہ (کارتھج) نے شمالی افریقہ سے یلغار کر کے سسلی کے ایک وسیع رقبے پر قبضہ کر لیا اور وہاں اپنی متوازی حکومت قائم کر لی۔ اس کے نتیجے میں یونانیوں اور قرطاجنیوں کے درمیان معرکہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان دونوں قوموں کی باہمی آویزش کا فائدہ اٹھا کر اٹلی کی جمہوری حکومت روما نے پہلے سسلی میں اہلِ قرطاجنہ کی حکومت

ختم کی اور پھر وہاں کی یونانی حکومت کا خاتمہ کر کے پورے سسلی پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ یہ واقعات ۲۱۲ سنہ ق م کے ہیں۔

۳۵ سنہ ق م میں جمہوریت روما کے خاتمہ کے بعد اگسٹس سیزر کی قیادت میں رومن ایمپائر قائم ہوئی تو جزیرہ سسلی اس کا ایک صوبہ بن گیا۔ ۳۷۹ سنہ عیسوی میں رومن ایمپائر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک مملکت غربیہ جس کا دارالسلطنت روم تھا اور دوسری مملکت شرقیہ جس کا پائیہ تخت قسطنطنیہ تھا۔ روما کی اسی مملکت شرقیہ نے تاریخ میں بیزنطی یا بیزنطینی سلطنت کے نام سے شہرت پائی۔ سسلی پر پہلے مملکت غربیہ کا تسلط رہا لیکن اس کے زوال کے بعد اس پر بیزنطی سلطنت کا استیلا ہو گیا۔ یہ ۵۵۱ سنہ کا واقعہ ہے — بیزنطیوں ہی کے دور حکومت میں مسلمانوں کا آفتاب اقبال طلوع ہوا اور ساتویں صدی عیسوی میں سسلی پر عربوں کے حملے شروع ہو گئے۔ نویں صدی کے آغاز میں جزیرے کے خاصے بڑے حصے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اسلامی حکومت کا دائرہ تمام جزیرے پر محیط ہو گیا اور سسلی میں بیزنطیوں کا علم اقتدار ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گیا۔ مسلمانوں کا پرچم اقبال سسلی پر ۸۰۰ سنہ سے ۱۰۹۱ سنہ تک لہراتا رہا۔ اس دوران میں انھوں نے جس عظیم الشان تہذیب و تمدن اور علوم و آداب کی بناء ڈالی، جدید یورپ نے اسی پر اپنی تہذیب و تمدن اور جدید علوم و فنون کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا۔ بدقسمتی سے اپنے اقتدار کی تیسری صدی میں مسلمانان سسلی باہمی تشتت و افتراق کے اس ہولناک مرض میں مبتلا ہو گئے جو قوموں کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ان کی خانہ جنگی نے یورپ کی ایک درندہ صفت قوم کو سسلی پر حملے کے لیے اکسایا۔ یہ نارمن قوم تھی جو بربریت اور اسلام دشمنی میں اپنی مثال آپ تھی۔ نارمن اصل میں ناروے کے باشندے تھے۔ وہاں سے لوٹ مار کے لیے نکلے اور فرانس میں جا ڈیرہ جمایا۔ اپنے اتحاد اور سخت کوشی کی بدولت وہ دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں یورپ میں ایک

سیاسی قوت بن گئے۔ پہلے انہوں نے فرانس میں ایک ریاست نارمن یا نارمنڈی قائم کی۔ اس کے بعد ان کے ایک گروہ نے ولیم فاتح کی سرگردگی میں انگلستان کو تسخیر کر کے وہاں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ ایک دوسرے گروہ نے بحر روم کے ممالک اور جزائر پر حملے شروع کر دیئے۔ اسی گروہ نے ۱۰۵۲ء میں مسلمانوں کے افتراق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سسلی کے شمالی علاقے پر قبضہ کر لیا اور اپنے ظلم و ستم اور بربریت سے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اسی زمانے میں سسلی کے ایک غیرت مند مسلمان سردار ابن البعباع نے نارمنوں کو اپنے ملک سے نکالنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا لیکن عین اس موقع پر جب اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ مصر کی فاطمی حکومت نے محض اس بنا پر کہ ابن البعباع نے اسے خراج دینا منظور نہیں کیا تھا، نارمنوں کو ابن البعباع کا قلع قمع کرنے پر ابھارا۔ نارمن تو دل سے یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ مسلم سسلی کے دارالحکومت پلرم پر یلغار کر دی۔ مسلمانوں نے طویل عرصے تک محصور رہ کر بڑے زور مقابلہ کیا لیکن آخر خوراک کی قلت اور بعض دوسرے اسباب کی بناء پر جنوری ۱۰۷۱ء میں چند شرائط پر شہر نارمنوں کے حوالے کر دیا۔ سقوطِ پلرم کے نتیجے میں سسلی کے دوسرے مسلم علاقوں کی قوتِ مدافعت بھی آہستہ آہستہ جواب دینے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۰۹۱ء میں سسلی کے چپے چپے پر نارمنوں کا استیلا ہو گیا۔

سسلی پر نارمنوں کا قبضہ صرف مسلمانانِ سسلی ہی کے لیے ایک خونچکاں المیہ ثابت نہ ہوا بلکہ اس نے دوسری اسلامی سلطنتوں کو بھی سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ نارمنوں کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ سسلی کے پہلے نارمن فرمانروا راجر اوّل نے اپنا لقب "محافظِ مذہب عیسائیت" رکھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یورپ میں صلیبی جنگوں (CRUSADES) کا صور پھونکنے والا ایک فرانسیسی راہب پیٹر دی ہرمٹ (پطرس) تھا لیکن مؤرخ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ اہلِ یورپ کو ارضِ مقدس فلسطین پر حملہ کرنے کے لیے سب سے پہلے راجر اوّل شاہِ سسلی نے ابھارا اور اسی کی تحریک پر سارے یورپ نے متحد

ہو کر بیت المقدس پر یلغار کر دی جو اس وقت مصر کی فاطمی حکومت کے دائرۂ اقتدار میں تھا۔ فاطمی حکومت بیت المقدس کا دفاع نہ کر سکی اور ۱۰۹۸ء میں صلیبیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں پر ایسے ہولناک مظالم ڈھائے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔ خود مغربی مؤرخ بھی ان مظالم کا ذکر کرتے ہوئے ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔ صلیب کے جھنڈے تلے ان لوگوں نے بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور بیماروں کا بے دریغ قتل عام کیا۔ ملز (MILLS) اور وان سبل (VON SYBEL) عیسائی مؤرخین تو یہاں تک اعتراف کرتے ہیں کہ صلیبی افواج کے کیمپوں میں مسلمانوں کا گوشت دن دہاڑے بکتا تھا اور یہ سب کچھ نارمنوں کا کیا دھرا تھا یا مسلمانوں کے باہمی افتراق کا نتیجہ تھا۔

دوسری اسلامی سلطنت جو براہِ راست نارمنوں کی ترکتازیوں کا ہدف بنی وہ شمالی افریقہ کی دولت صنہاجیہ تھی۔ بدقسمتی سے شمالی افریقہ کے مسلمان بھی باہمی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ انہوں نے نہ سسلی میں اسلامی حکومت کے خاتمہ سے سبق حاصل کیا تھا اور نہ بیت المقدس کے سقوط سے عبرت حاصل کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنہاجی حکومت، جو بنی امیہ، بنو عباس اور بنو فاطمہ کے بعد شمالی افریقہ میں اسلام کا چراغ روشن کیے ہوئے تھی، سخت کمزور ہو گئی اور اس کے کئی صوبے خود مختار یا نیم خود مختار ہو گئے۔ راجر دوم شاہِ سسلی نے اس صورتِ حال کو بھانپ لیا اور اس نے یکے بعد دیگرے نہ صرف ان خود مختار صوبوں (بجایہ، برشک، قابس، طرابلس الغرب وغیرہ) پر اپنا اقتدار قائم کر لیا بلکہ ۱۱۴۸ء میں دارالحکومت مہدیہ پر قبضہ کر کے صنہاجی حکومت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔ شمالی افریقہ کی ایک آزاد مسلم ریاست جس کو سخت نامساعد حالات میں نارمنوں کا باجگزار بننا پڑا، سفاقس تھی۔ وہاں کا والی ایک غیور مسلمان عمر بن حسین تھا۔ مصلحتِ وقت نے اسے عارضی طور پر نارمنوں کے باجگزاری پر مجبور کر دیا تھا لیکن نارمنوں نے مسلمانوں پر جو خوفناک مظالم ڈھائے انہوں نے عمر کے دل میں گہرا گھاؤ ڈال دیا اور وہ

ہر وقت اپنے ملک کو ظالم نارمنوں کے پنجۂ ستم سے آزاد کرانے کے لیے بیتاب رہنے لگا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ عمر کا باپ حسین نارمنوں کے پاس بطور یرغمال سسلی میں نظر بند تھا اس لیے وہ نارمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے ہچکچا رہا تھا۔ عمر کا باپ حسین ایک سچا مسلمان تھا اور مسلمانوں کی مظلومی اور محکومی پر ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا۔

۱۱۵۱ء میں راجر دوم اپنے بیٹے ولیم کے حق میں حکومت سے دستبردار ہوگیا۔ ولیم اول نے برسر اقتدار آکر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کردی اس کے نزدیک دنیا سے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا مسیحیت کی عین خدمت تھی اسی لیے عرب مؤرخین نے اسے غلیالم یا بدنفس کا خطاب دیا ہے۔ ولیم بدنفس کی ستم رانیوں کو دیکھ کر حسین کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ اس کے سینے میں جذبۂ شہادت نے انگڑائی لی اور اس نے اپنے بیٹے عمر والیٔ سفاقس کو خفیہ پیغام بھیجا کہ میں لب گور بیٹھا ہوں، آج نہیں تو کل مرجاؤں گا، میری خوشی اسی میں ہے کہ خدا کے دشمن نارمنوں سے برسرپیکار ہوجاؤ اور میری جان کی مطلق پروا نہ کرو، مسلمانانِ سفاقس کی آزادی کے لیے میں ایک جان تو کیا ہزار جانیں ہوں تو قربان کرسکتا ہوں۔

عمر نے باپ کا پیغام ملتے ہی نارمنوں کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کردیا، ان کا جھنڈا سفاقس کے قلعہ سے اتار پھینکا اور اس پر پرچم اسلام لہرادیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سفاقس کے ان تمام نام نہاد عیسائیوں کو جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے چن چن کر قتل کیا۔ نارمن فرمانروا کو ان واقعات کی خبر پہنچی تو اس نے ایک نہایت تہدید آمیز خط اپنے قاصد کے ہاتھ عمر کے پاس بھیجا۔ عمر نے نارمن قاصد کو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور تین چار دن بعد اس کے سامنے ایک جنازہ نہایت تزک و احتشام سے اٹھانے کا اہتمام کیا جنازہ میں سفاقس کے تمام مسلمان شریک تھے۔ یہ جلوس شہر سے گزر کر قبرستان پہنچا

اور وہاں نارمن ایلچی کے سامنے اس جنازے کو نہایت احترام سے سپردِ خاک کر دیا۔ دوسرے دن عمر نے نارمن قاصد کو دربار میں طلب کیا اور اس سے مخاطب ہو کر کہا :

"کل جو کچھ تم نے دیکھا یہ تمہارے بادشاہ کے خط کا جواب ہے۔ اس سے جا کر کہہ دو کہ سفاقس کی آزادی میں نے اپنے باپ کی جان کے عوض خریدی ہے، میرے باپ نے پیکِ اجل کو لبیک کہا ہے اور میرے ساتھ تمام مسلمانانِ سفاقس نے اس کا جنازہ دفن کر دیا ہے۔ اب ہم لوگ اس کا سوگ کرنے بیٹھے ہیں۔"

نارمن ایلچی نے سسلی واپس جا کر تمام واقعات شاہِ سسلی کے گوش گزار کیے تو اس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور اس نے حکم دیا کہ حسین سفاقسی کو پھانسی چڑھا دیا جائے۔ حسین نے پہلے ہی اپنی جان راہِ حق میں وقف کر رکھی تھی اس نے بادشاہ کا حکم سنا تو شکرِ خداوندی بجا لایا اور نہایت مسرت و اطمینان کے ساتھ تختۂ دار پر چڑھ گیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حسین سفاقسیؒ کا خونِ شہادت رائیگاں نہ گیا۔ اسلام اور وطن کی خاطر اس کی قربانی کی خبر سارے شمالی افریقہ میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ اس نے نارمنوں کے پنجۂ ستم میں گرفتار افریقی مسلمانوں کو ولولۂ تازہ عطا کیا اور انھوں نے جگہ جگہ نارمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ سفاقس میں عمر بن حسین نے نارمنوں کا آخری نشان تک مٹا دیا۔ ابو یحییٰ مطروح نے طرابلس الغرب میں آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ قابس میں محمد بن رشید نے اپنے وطن کے پاؤں سے غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالیں اور مراکش کے موحد فرمانروا عبدالمومن نے بونہ سے نارمنوں کے شجرِ اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ جب شمالی افریقہ کے متعدد مقامات

یکے بعد دیگرے نارمنوں سے چھن گئے تو زویلہ کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا اور انہوں نے نارمنوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ بدقسمتی سے حالات نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ نارمنوں سے شکست کھا گئے۔ نارمنوں نے زویلہ کے مسلمانوں سے ان کی جدوجہد آزادی کا خوفناک انتقام لیا اور ان کے ہزاروں مردوں عورتوں اور بچوں کو نہایت سفاکی سے ذبح کر ڈالا۔ چند مسلمان بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا کر عبدالمؤمن کے پاس مراکش پہنچے۔ انہوں نے اس کے سامنے زویلہ کے مسلمانوں کی مظلومی اور بے کسی کی داستان بیان کی اور اس سے التجا کی کہ وہ زویلہ، سوسہ اور مہدیہ کو نارمن غاصبوں کے پنجۂ ستم سے چھڑائے اور نارمنوں کے مظالم کا بدلہ لے۔ عبدالمؤمن ایک پُرجوش اور غیرت مند فرمانروا تھا وہ سانحۂ زویلہ کا حال سن کر آبدیدہ ہو گیا اور شمالی افریقہ کے چپہ چپہ کو نارمنوں کے وجودِ نامسعود سے پاک کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت شمالی افریقہ میں مہدیہ نارمنوں کی قوت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ۱۱۵۹ء میں عبدالمؤمن نے ایک لاکھ مجاہدین کے ساتھ مہدیہ کا رُخ کیا پہلے زویلہ کو مسخر کیا اس کے بعد آگے بڑھ کر سمندر اور خشکی دونوں طرف سے مہدیہ کا محاصرہ کر لیا۔ سسلی سے ۱۵۰ جنگی جہازوں کا ایک بیڑہ نارمن محصورین کی مدد کے لیے پہنچا لیکن عبدالمؤمن کے بحری بیڑے نے اس کو شکست فاش دے کر بھگا دیا اس پر نارمن محصورین نے ناامید ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور عبدالمؤمن نے مہدیہ میں فاتحانہ داخل ہو کر اس پر پرچم اسلام بلند کر دیا۔ مہدیہ کی فتح کے ساتھ ہی دوسرے تمام مقامات سے بھی نارمنوں نے راہ فرار اختیار کی۔ یوں پانچ سال پہلے حسین سفاقسیؒ نے اپنی جان دے کر آزادی کی جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی تمام شمالی افریقہ میں پھیل گئی اور اس سرزمین کا گوشہ گوشہ نارمن غاصبوں کے قبضہ و استیلا سے پاک ہو گیا۔

ہمارے دور کے ایک مؤرخ مولانا سید ریاست علی ندوی نے تاریخِ صقلیہ"

میں حسین سفاقسیؒ کے بارے میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ
"پہلی صدی (ہجری) میں حسینؓ بن علیؓ کی شہادت نے اسلام
کو نئی زندگی عطا کی تھی، یہ کچھ نام کی برکت ہے کہ چھٹی صدی
(ہجری) کے اس حسین نے اسی کا ایک ادنیٰ نمونہ پیش کیا، خود قربان
ہوگیا اور اپنی قربانی سے سارے افریقہ میں اسلام کو زندہ کر دیا۔"

رحمۃ اللہ علیہ

شیخ محمد بن عبداللہ الحسن رحمۃ اللہ

مُلّائے سومالی لینڈ

(۱)

یہ داستانِ جہاد ہے ملائے سومالی لینڈ کی —— جو ایک مردِ غیور تھا۔

تہذیبِ حاضر کی لعنتوں سے دور افتادہ —— افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا بے شمار ایسے مردانِ غیور کی پُرعظمت اور جرأت آموز داستانوں کے حامل ہیں جن کے کارناموں پر تاریخ صدیوں تک سر دُھنتی رہے گی۔

ہاں وہ تپتے ہوئے صحرا جہاں میلوں تک جُھلستی ہوئی ریت ہے اور کہیں آب و گیاہ کا نام و نشان تک نہیں، انہیں صحراؤں میں خدائے حیّ و قیوم نے ایسے مردانِ اولوالعزم پیدا کیے جنھوں نے صرف اپنے اللہ پر بھروسہ کیا، اسی کے آگے سر جھکایا، اور اسی کی مدد سے بڑی بڑی مہیب طاغوتی طاقتوں کو سرنگوں کر دیا، ہاں! طرابلس کے شیخ سنوسی، سوڈان کے مہدی، الجزائر کے عبدالقادر، ریف کے عبدالکریم اور اسی طرح کے بیشمار مردانِ غیور کی داستانیں ایسی نہیں کہ آسانی سے بُھلائی جاسکیں، ان صحراؤں کا چپہ چپہ بظاہر خشک لیکن بباطن آسمانی خون کا سمندر جذب کیے ہوئے ہے، یہ خون ان علمبردارانِ حق کا ہے جنھوں نے استبداد اور طاغوت کی طاقتوں کو شکست دینے اور عَلَمِ اسلام کو بلند رکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی یہ خون ان علمبردارانِ باطل کا بھی ہے، جو اپنے شیطانی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر سرورِ کونین ﷺ کے نام لیواؤں کے منہ آئے، اور انہیں کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے انہی تپتے ہوئے صحراؤں میں ایک ایسے مردِ مجاہد کی داستانِ جہاد بھی پوشیدہ ہے، جس سے پاکستان کے بہت کم مسلمان آگاہ ہیں۔

ہماری مراد سومالی لینڈ کے مجاہدِ اعظم حضرت سید محمد بن عبداللہ الحسن رح سے ہے۔

قلم کو یارا نہیں کہ اس مردِ مجاہد کی داستانِ جہاد کا پورا خاکہ کھینچ سکے۔ وہ عالمِ باعمل، وہ پیکرِ حریت، وہ علمبردارِ حکومتِ الٰہیہ —— افسوس کہ دنیا اس کے بعد بھی اس کے کارناموں سے آشنا نہیں ہوئی، وہ جس کے کارناموں کا پایہ قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی تگ و تاز سے لگا کھاتا ہے —— وہ جس کی مجاہدانہ للکار نے استعمارِ فرنگ کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ وہ جس نے اپنی ساری متاعِ حیات حکومتِ الٰہیہ کے قیام پر صرف کردی —— وہ جس نے مسلسل بیس سال محض اللہ کے بھروسے پر آتنی خوفناک طاقتوں سے ٹکر لی، جن کے سامنے بڑی بڑی باجبروت سلطنتیں سرنگوں تھیں اور جن کے جھنڈوں کے ابلیسی پھریرے بڑی شان سے دنیا کے ایک وسیع ترین حصے پر لہرا رہے تھے —— افسوس کہ آج اس کے نام کو بھی یہاں جاننے والے خال خال نظر آتے ہیں۔ یہاں قارئین کرام کو اس غیر معروف میدانِ جہاد کا حال بتائیں گے جو چند بے سروسامان غازیوں کے نعرہ ہائے جہاد سے مسلسل بیس سال تک گونجتا رہا، ان غازیوں کے —— جن کے پاس ٹوٹی پھوٹی تلواروں، برچھیوں، اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی سے خریدی ہوئی، یا دشمن سے اپنی قوتِ بازو کے بل پر چھینی ہوئی بندوقوں اور قوتِ ایمانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

(۲)

سومالی لینڈ —— سومالی لینڈ براعظم افریقہ کے شمال مشرقی گوشہ میں تین لاکھ بیس ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا ایک وسیع قطعۂ زمین ہے، اسے افریقہ کا سینگ کہا جاتا ہے، دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اٹلی، فرانس اور برطانیہ نے اسے تقسیم کر رکھا تھا، اس جنگ نے جہاں کئی قوموں کی قسمتیں بدل ڈالی ہیں وہاں سومالی لینڈ کی تقسیم کی صورت بھی بدل گئی ہے۔

آج سے ساٹھ ستر سال قبل جس زمانہ سے ملائے سومالی لینڈ کی داستانِ جہاد وابستہ ہے، سومالی لینڈ کو چار طاقتوں یعنی اٹلی، برطانیہ، فرانس اور حبش نے تقسیم کر رکھا تھا اور اس تقسیم کی صورت یہ تھی:

مشرقی ساحل سے لے کر اندرونِ ملک تک ---------- اٹلی

شمالی حصہ ---------- برطانیہ

مغربی حصہ ---------- فرانس

جنوب مغربی حصہ -------- حبش

سومالی لینڈ کے ساحلی علاقے ریگستانی اور بالکل بنجر ہیں، اس کے بعد پہاڑی علاقہ جہاں شدید گرمی پڑتی ہے، وسطی علاقہ میں البتہ نخلستان، چراگاہیں اور کنوئیں وغیرہ پائے جاتے ہیں، لوگوں کا پیشہ بھیڑ، بکریاں اور اونٹ پالنا ہے، لوگ بے حد غریب ہیں اور بڑی تنگدستی کے ساتھ گزر اوقات کرتے ہیں۔ یہ لوگ خالص عربی النسل ہیں۔ ان کی شکل وشباہت اور رنگ اپنے پڑوسی حبشیوں سے بالکل جدا ہے۔ یہ لوگ محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں، بڑی سے بڑی مصیبت اور بھوک پیاس کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ اپنے مذہب (اسلام) کے بڑے پابند ہوتے ہیں، عام طور پر ان لوگوں کا قیام کسی ایک جگہ نہیں ہوتا، خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر مالِ طیب اور قوت لایموت کے حصول کی خاطر دور دراز کے سفر بھی کر لیتے ہیں۔

سومالی لینڈ کی ابتدائی تاریخ ------ افریقہ کے اس سینگ کے متعلق ساتویں صدی عیسوی سے پہلے کے حالات پر تاریخ کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔ ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں عربوں کی نظریں اس قطعۂ زمین پر پڑیں۔ انہوں نے اس پر مسلسل حملے کر کے اپنے زیر نگیں کر لیا، اور ان کے کئی قبائل یہاں ہی آباد ہو گئے۔ موجودہ سومالی لینڈ کے باشندوں کی رگوں میں انہیں فاتح عربوں کا خون دوڑ رہا ہے۔ ۱۵۰۰ء میں ترکوں نے سومالی لینڈ پر یورش کی، اور یہاں کی ایک بندرگاہ زیلغ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن چند سال کے بعد پرتگیزوں کے زبردست بحری بیڑے نے اس بندرگاہ کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد کافی مدت تک سومالی لینڈ ------ والئی یمن اور شریف مکہ کے زیر اقتدار رہا، اس کے بعد سومالی لینڈ ایک حد تک خود مختار ہو گیا، ہر ایک قبیلہ یا دو تین قبیلے مل کر اپنا ایک امیر منتخب کر لیتے تھے۔ ۱۸۳۹ء میں برطانیہ عدن پر قابض ہوا تو اس وقت سومالی لینڈ خود مختار ہی تھا۔ عدن کی بندرگاہ کے ساتھ سومالی لینڈ کا بڑا تعلق تھا، کیونکہ سومالی لوگ اپنا تمام تجارتی کاروبار اسی بندرگاہ کے ذریعے کرتے تھے، چنانچہ برطانیہ کو عدن پر اپنا پنجہ مضبوط کرنے اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے

سومالی لینڈ کی طرف رجوع کرنا پڑا اور اس نے یہاں کے لوگوں سے ان کے بااثر شیوخ قبیلہ کی معرفت چند تجارتی معاہدے کر لیے۔

۱۸۷۴ء میں سومالی لینڈ کے ساحلی علاقے پر خدیو مصر اسمٰعیل اوّل نے سلطان ترکی سے اجازت لے کر قبضہ کر لیا۔ لیکن ۱۸۸۴ء میں جب مہدی سوڈانی کا ظہور ہوا تو حکومتِ مصر اپنی تمام تر توجہ اسی کی طرف منعطف کرنے پر مجبور ہوئی اور اس نے سومالی لینڈ کے ساحلی علاقے سے اپنا قبضہ اٹھا لیا، حکومتِ مصر کے قبضہ اٹھاتے ہی برطانیہ نے میدان بالکل صاف پایا اور سومالی لینڈ کی مشہور بندرگاہ بربرہ پر قبضہ کر لیا، اور اپنے دندان آز اس غریب ملک پر تیز کرتے شروع کر دیئے۔ سومالی لینڈ کے ایک خاص حصے پر برطانیہ کا اثر ورسوخ تو پہلے ہی کافی تھا، لیکن ۱۸۹۸ء میں برطانیہ کے اربابِ حل وعقد نے فیصلہ کیا کہ سمالی لینڈ کو مکمل طور پر اپنے زیر اقتدار کیا جائے، عین اسی وقت جب برطانیہ ایک آزاد اور غیور قوم کے گلے میں غلامی کا پھندا ڈالنے کے لیے اپنے طلسم سامری سے مسحور کرنے کی کوشش کر رہا تھا، سومالی لینڈ کے تپتے ہوئے صحراؤں سے ایک مردِ غیور اٹھا، اور للکارا کہ خبردار ہم آزاد ہیں، اور آزاد رہیں گے۔ ہماری آزادی میں مت دخل دو، ورنہ ہم کٹ مریں گے، خدا اور رسول کے دشمنوں کی اطاعت ہم کبھی قبول نہیں کریں گے۔ اس مردِ مجاہد نے جو نعرہ بلند کیا، زندگی کے آخری سانس تک اس کے ساتھ نباہ کیا — جو عَلَم بلند کیا — دمِ واپسیں تک اسے سرنگوں نہ ہونے دیا۔

(۳)

مردِ مجاہد —— یہ مجاہد سیّد محمد بن عبداللہ الحسنؒ تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کوشش کے باوجود نہیں مل سکے، البتہ ان کے بعد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، انہوں نے بچپن میں اچھی خاصی دینی تعلیم حاصل کی اور ان کی پرورش بڑے آزادانہ اور اسلامی ماحول میں ہوئی۔ بہر حال انیسویں صدی کے آخر میں سیّد محمد (جو ملائے سومالی لینڈ کے نام سے مشہور ہیں) منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ سومالی لینڈ کے اکثر قبیلے ان کے سلسلہ طریقت میں منسلک ہو چکے تھے اور جو نہیں ہوئے

تھے، وہ بھی ان کے زہد و تقویٰ اور دوسری بیشمار خوبیوں کی وجہ سے ان کا بیحد احترام کرتے تھے۔ ملا صاحب شب و روز سومالی لینڈ کے لوگوں کو ارکانِ اسلام کی پابندی کی تلقین کرتے رہتے تھے اور تمام خلاف شریعت کاموں سے انہیں منع فرماتے تھے، ان کے حلقۂ ارادت میں جو لوگ شامل تھے وہ شرعی احکام پر سختی سے عمل کرتے تھے اور منشیات کے نزدیک تک نہیں پھٹکتے تھے، ملا صاحب کے ارشادات کی بدولت ہر طرف قال اللہ و قال الرسول کا سلسلہ جاری ہو گیا اور قبائل کی باہمی خانہ جنگیاں یکسر موقوف ہو گئیں، غرض ملا صاحب اس وقت سومالی لینڈ میں ایک مقتدر حیثیت رکھتے تھے۔

ابلیس کی انگڑائیاں ——— عین اس وقت جب یہ پاکباز شخصیت خاموشی اور امن کے ساتھ سومالی لینڈ کو رشد و ہدایت کے نور سے منوّر کر رہی تھی، برطانوی شہنشاہیت کے دل میں ابلیسی ولولے پیدا ہونے شروع ہوئے۔ سید محمدؒ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے اسے چوکنا کر دیا، اور اس نے ان کے اثر و رسوخ کو زائل کرنے اور سومالی لینڈ پر اپنا مکمل تسلط جمانے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ اس کا آغاز یوں ہوا کہ بہت سے پادریوں پر مشتمل ایک برطانوی مشن سومالی لینڈ بھیجا گیا جس نے وہاں کے بعض جاہل باشندوں کو ترغیب و تحریص اور دوسرے ناجائز طریقوں سے عیسائی بنانا شروع کر دیا۔ جب سید محمدؒ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو ان کا خون کھول اٹھا، عیسائیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے انہوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیاں بے حد تیز کر دیں، نتیجتہً اس عیسائی مشن کے خلاف سارے سومالی لینڈ میں حقارت اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ برطانیہ سارے حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا اس کے دل میں سومالی لینڈ پر مکمل قبضہ جما لینے کی خواہش رہ رہ کر چٹکیاں لے رہی تھی۔ برطانیہ کے مکّار مدبرین عیسائی مشن کی ناکامی اور نامرادی سے اپنے ناکام عزائم کو مخفی نہ رکھ سکے، انہوں نے سومالی لینڈ کے امن پسند باشندوں کو بزورِ شمشیر غلام بنانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں برطانوی ملوکیت کا بھوت ننگا ہو کر ناچ اٹھا، سب سے پہلے برطانوی قونصل نے ملا صاحب کو ایک دو خطوط روانہ کیے، جن میں ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اور ان کے پیرو قبائل اپنے ہتھیار برطانوی حکام کے حوالے کر دیں، اس کے ساتھ ہی انہیں

مرعوب کرنے کے لیے بربرہ کی بندرگاہ پر دو جنگی جہاز بھیج دیئے، لیکن ملا صاحب پر ان اقدامات کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا، ان کے آدمیوں کے پاس ٹوٹے پھوٹے معمولی ہتھیار تو ضرور تھے، مگر ان کی حق پرست اور غیور طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ وہ فرنگی استعمار کے سامنے سربسجود ہو جائیں، انھوں نے ہتھیار دینے سے صاف انکار کر دیا۔

آغازِ جنگ ——— ملا صاحب کے ساتھ خط وکتابت تو محض ایک بہانہ تھی، برطانیہ کے مکار مدبرین دراصل اپنی ہولناک فوجی قوت کے استعمال کے لیے کوئی حیلہ تلاش کر رہے تھے، چنانچہ انہوں نے ملا صاحب کے باغی ہونے کا اعلان کر دیا، اور ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، سب سے پہلے انہوں نے حکومتِ حبش کو اکسایا کہ وہ ملا صاحب اور ان کے حامیوں کا قلع قمع کر دے۔ حکومتِ حبش نے "تعمیلِ ارشاد" کرتے ہوئے ملا صاحب کے مریدوں کی پُرامن جمعیتوں پر حملے شروع کر دیئے، اور انہیں کافی مالی وجانی نقصان پہنچایا، ملا صاحب اور ان کے حامی پہلے تو حبش کی فوجوں کو ڈھیل دیتے رہے، لیکن آخر حبش کے ظلم وبربریت کا استیصال کرنے کے لیے انہوں نے ہتھیار اٹھا ہی لیے ——— جفجفہ کے مقام پر ملا صاحب کے مجاہد درویشوں اور حبشہ کی فوجوں میں ایک خونریز جنگ ہوئی، جس میں حبشہ کو شکست فاش ہوئی، اور اس کی فوجیں نقصانِ عظیم اٹھا کر تتر بتر ہو گئیں ——— حبش کی شکست نے برطانیہ کے اندازے غلط ثابت کر دیئے اور برطانوی حکومت کے ناخدا جھلا اٹھے۔ انہوں نے ملا صاحب پر پوری قوت سے حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

(۴)

برطانیہ کی پہلی جنگی مہم ——— ۱۹۰۰ء کے آخر میں لفٹننٹ کرنل سوین کی سرکردگی میں ایک لشکر جرار نے بربرہ کی بندرگاہ کے رستے سومالی لینڈ کے بے سروسامان مجاہد پر یلغار کر دی۔ اس لشکر میں پنجاب کی کئی سکھ پلٹنیں، گورا فوجیں اور سومالی لینڈ کے کئی "وفادار" قبائل (جو سید محمد صاحب کے حلقۂ ارادت سے باہر تھے) شامل تھے۔ اس لشکر کے ساتھ بڑا بھاری توپ خانہ اور ہر قسم کے جدید آلات حرب وضرب تھے ——— ادھر ملا صاحب یہ سب کچھ دیکھتے تھے، اور اپنے مولائے کریم سے کفار کے شر سے بچانے کی دعا مانگتے تھے۔

ان کا پائے استقلال ذرہ برابر بھی نہ لڑکھڑایا۔ وہ اپنے درویشوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ ان مجاہد درویشوں نے بھی (جن کی تعداد محض چند ہزار تھی) اپنی جانیں اللہ کی راہ میں وقف کر دی تھیں، انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ بچہ بچہ کٹا دیں گے لیکن کفار کی غلامی قبول نہیں کریں گے۔ وہ جوشِ جہاد میں اس قدر بیقرار ہو گئے کہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر انہوں نے خود برطانوی لشکر پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ دو تین ہزار درویشوں کا ایک لشکر (جن میں اکثریت محض برچھیوں سے مسلح تھی) اللہ اکبر کے نعرے لگاتی سمالہ کے مقام پر برطانوی فوجوں پر ٹوٹ پڑی اور توپوں کے منہ میں مردانہ وار گھس گئی، برطانوی لشکر کو اگرچہ یہاں کافی نقصان اٹھانا پڑا لیکن ان کی زبردست آتشباری نے انہیں شکست سے بچا لیا۔ درویشوں کا لشکر یہاں سے ہٹ کر مختلف مقامات میں پھیل گیا۔ اور ان کے منتشر جتھوں کی برطانوی لشکر سے گاہے گاہے جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر کار فردالدین کے مقام پر ملا صاحب نے اپنی قوت مجتمع کر کے برطانوی افواج سے ایک خونریز جنگ لڑی۔ اس جنگ میں درویش اس جرأت اور جذبہ کے ساتھ لڑے کہ برطانیہ کی قاہر فوج نے باوجود اپنے تمام اعلیٰ ہتھیاروں اور توپخانہ کے بری طرح شکست کھائی —— اور یہاں سے پسپا ہو کر پیچھے لوٹ آئی۔ اس جنگ کے ساتھ ہی برطانیہ کی پہلی جنگی مہم کا خاتمہ ہو گیا۔

مجاہدین سومالی لینڈ پر برطانیہ کا دوسرا حملہ —— جب انگلستان میں بے سروسامان اور فاقہ منش درویشوں کے ہاتھوں برطانوی افواج کی ہزیمت کی خبریں پہنچیں، تو برطانیہ کے طول و عرض میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور برطانوی حکومت نے سومالی لینڈ کو دوسری جنگی مہم بھیجنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۱۹۰۲ء کے موسم گرما میں کرنل سوین ہی کے زیر کمان ایک نئی زبردست برطانوی فوج ملا صاحب اور ان کے درویشوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کے لیے سومالی لینڈ پر حملہ آور ہوئی۔ ملا صاحب بھی اب چوکنے ہو گئے تھے انہوں نے سومالی لینڈ کے تمام فدائیانِ اسلام کو جمع کیا اور انہیں ایک پُرجوش خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"ہم نے انگلستان کا کچھ نہیں بگاڑا، لیکن یہ لوگ پہلے تو بلاوجہ ہمارے مذہب

یں دخل اندازی کرتے رہے، اور اس کے بعد نہایت ظالمانہ انداز میں ہمارے ملک پر حملہ کر دیا، اے اسلام کے فرزندو! اگر تم نے اس بدباطن قوم کی غلامی کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ جاؤ گے۔

اٹھو اور میدانِ جہاد میں سرگرم وغا ہو جاؤ، ذات باری تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے۔"

فقر اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور درویشوں کے دلوں میں اس خطبہ سے آگ بھڑک اٹھی اور انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ہر قیمت پر پرچم حریت کو بلند رکھیں گے۔ ان کی تعداد کا اندازہ تقریباً دس ہزار تھا، جن میں صرف ڈیڑھ دو ہزار جوان بندوقوں سے مسلح تھے، ملا صاحب کے زیر ہدایت اس لشکر نے اس طرح نقل و حرکت شروع کی کہ برطانوی فوجیں ان پر حملہ آور ہونے کا کوئی موقع نہ پاتی تھیں، چار مہینے تک درویش برطانوی فوجوں کو طرح دیتے رہے۔ آخر ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو اریفو کے مقام پر درویشوں اور انگریزی افواج میں مڈبھیڑ ہو گئی اور دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ برطانوی توپخانے اور دوسرے آٹومیٹک ہتھیاروں کے مقابلے میں درویش بڑی بے جگری سے لڑے، سارا دن اریفو کا میدان توپوں کی گرج اور بندوقوں کی آواز سے گونجتا رہا۔ درویش اللہ اکبر کے نعرے لگاتے اور اپنے نیزے ہوا میں ہلاتے بیباکانہ توپوں کے منہ میں گھس جاتے تھے، اور یا تو وہ معبودِ حقیقی سے جا ملتے تھے یا توپچیوں کو جہنم واصل کر کے بیکار کر دیتے تھے زخمیوں کی چیخ پکار، گھوڑوں کے ہنہنانے اور اونٹوں کے بلبلانے سے ہر طرف شورِ محشر بپا تھا شام تک انگریزی لشکر کے دانت کھٹے ہو گئے، اور اس نے ان بے سروسامان درویشوں کے مقابلہ کی تاب نہ لاتے ہوئے رات کو تاریکی میں راہِ فرار اختیار کی۔ انگریزی لشکر کے بیسیوں افسر اور سینکڑوں سپاہی اس معرکہ میں کام آئے۔ ہزیمت خوردہ برطانوی لشکر ایسا حواس باختہ ہوا کہ وہ اپنی پچھلی چوکیوں کا راستہ بھی بھول گیا۔ کئی دن تک جنگلوں کی خاک چھاننے کے بعد نہایت خستہ حالت میں وہ بھوال پہنچا، جو ایک انگریزی چوکی تھی۔

سومالی لینڈ کی سرزمین پر صلیب و ہلال کی تیسری آویزش

اریفو میں برطانوی فوجوں کی شکست کی خبر وحشت اثر انگلستان پر بجلی بن کر گری۔ ملا صاحب کو آج تک وہ

بہت کم اہمیت دیتے تھے۔ لیکن اب ان کی آنکھیں کھلیں کہ یہ سادہ اور غریب سی شخصیت تو ایک کوہ گراں ہے۔ "شیر برطانیہ" نے انگڑائی لی ــــ اپنی قاہر طاقت کو جانچا ــــ اور تیسری مرتبہ پوری تندی و تیزی کے ساتھ سومالی لینڈ پر جھپٹ پڑا۔ اب برطانوی افواج کی کمان کرنل سوین سے لے کر جنرل فیننگ کے سپرد کی گئی، جو ایک آزمودہ کار ماہرِ جنگ تھا۔ یہ یلغار بڑے اہتمام سے کی گئی، اٹلی اور حبش کی حکومتوں نے بھی اس "کارِ خیر" میں برطانیہ کا ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا۔ برطانوی افواج میں سکھوں، بیکانیریوں اور دوسرے ہندوستانی سپاہیوں کی کئی کمپنیاں بھی شامل تھیں۔ یہ لشکر طوفان کی طرح سومالی لینڈ پر شمال، جنوب مشرق، اور جنوب مغرب تین اطراف سے حملہ آور ہوا۔ ملا صاحب اور ان کے درویش سومالی لینڈ کے جنوبی حصے میں گھر گئے، لیکن ان کی نقل و حرکت اور مرکز کا پتہ لگانے میں برطانوی فوج کے تینوں حصے ناکام رہے، کبھی خبر ملتی تھی کہ ملا صاحب غلادی کے مقام پر ہیں کبھی پتہ چلتا تھا کہ وہ دلوال کے مقام پر ہیں۔ غرض کبھی کچھ اور کبھی کچھ اطلاع ملتی تھی، لیکن صحیح مقام کا تعین نہ ہوتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل راستوں کی اور گھنی جھاڑیوں کی موجودگی تھی۔

بالآخر کرنل کوبے کے زیرِ کمان ایک لشکر نے جنوبی سومالی لینڈ میں درویشوں کے مرکز کا سراغ لگانے کے لیے پیشقدمی شروع کر دی۔ یہ لشکر ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء کو جب غنجرو کے مقام پر پہنچا، تو یکایک اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے سینکڑوں درویش جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ کرنل کوبے نے مرکز سے فوراً کمک طلب کی، لیکن پیشتر اس کے کہ یہ مدد پہنچے، درویش سارے لشکر کی تکا بوٹی کر چکے تھے، جب امدادی فوج پہنچی، تو سرفروش درویش اس پر بھی پل پڑے، اور یہ تمام فوج بھی باوجود اپنی اعلیٰ تربیت اور اسلحہ کے موت کے گھاٹ اتر گئی۔ دونوں برطانوی فوجوں کا سارا سامان درویشوں کے ہاتھ لگا، اور ان کی طاقت پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی۔ جب اس شکست کی خبریں برطانوی ہیڈکوارٹر میں پہنچیں تو شمالی فوج کو درویشوں کی طرف پیشقدمی کرنے کا حکم ملا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۰۳ء کو دارطلحہ کے مقام پر درویشوں اور برطانوی فوج میں ایک خونریز جنگ ہوئی،

جس میں درویشوں کی جانبازی اور سرفروشی کی بدولت برطانوی لشکر کو پھر ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا اور وہ رات کو پیچھے ہٹ آیا، ان شکستوں نے برطانوی فوجوں کی کمر توڑ دی اور انہیں ملا صاحب کے درویشوں سے خوف محسوس ہونے لگا، لیکن حکومت برطانیہ بے سروسامان درویشوں سے کب ہار مانتی تھی۔ اب اس نے ایک اور جرار لشکر میجر جنرل ایجرٹن کی زیر سرکردگی درویشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے سومالی لینڈ روانہ کیا۔

درویشوں اور برطانیہ کی چوتھی ٹکر ——— میجر جنرل ایجرٹن نے اب درویشوں سے نپٹنے کے لیے غیر معمولی انتظامات کیے، اطالوی سومالی لینڈ کی بندرگاہ ادیبہ اور برطانوی بندرگاہ بربرہ پر کثیر التعداد فوجیں اتاری گئیں، اور جنگی سامان، رسد اور اونٹوں وغیرہ کا خوب اہتمام کیا گیا۔ اس لشکر کو جگہ جگہ بے سروسامان درویشوں کی بکھری ہوئی ٹولیوں سے لڑنا پڑا جس سے اسے بے حد جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا، لیکن آخر ایک بڑی جنگ میں انگریزی توپ خانہ کی بے پناہ آتشباری کی وجہ سے درویش اطالوی سومالی لینڈ کی مشرقی بندرگاہ ایلغ کی طرف پسپا ہو گئے۔ انگریزوں نے حکومت اٹلی سے اجازت لے کر جنگی جہازوں کے ذریعے ایلغ کے قریب اپنی فوجیں اتار دیں۔ اب ملا صاحب اور ان کے درویش سومالی لینڈ کے اندرونی حصے میں چلے گئے۔ انگریزی فوجیں بھی اب جنگ سے تنگ آ چکی تھیں، ان کے کئی بڑے بڑے افسر مارے جا چکے تھے، اور لاکھوں روپیہ روزانہ صرف ہو رہا تھا۔ انہوں نے ملا صاحب سے مزید چھیڑ چھاڑ مناسب نہ سمجھی اور یوں برطانیہ کی اس چوتھی مہم کا خاتمہ ہو گیا، ۱۹۰۹ء کے آخر میں اطالوی سومالی لینڈ کی ایک دو سرکردہ شخصیتوں کی وساطت سے سید محمد بن عبداللہؒ اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا، جس کی رو سے اندرون ملک کے قبائل کو آزاد اور خود مختار تسلیم کر لیا گیا اور سومالی لینڈ کے باشندوں کو اسلحہ اور غلاموں کی تجارت کے سوا ہر قسم کی تجارت کی آزادی دے دی گئی اور اندرونِ ملک کے تمام قبائل پر ملا صاحب کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا۔

(۵)

برطانیہ کی عہد شکنی اور دوبارہ جنگ کا آغاز ——— یہ عارضی صلح تین سال تک

رہی۔ اس دوران میں ملا صاحب کا اثر و رسوخ بے حد ترقی کر گیا، اور کئی قبائل جو پہلے برطانیہ کے وفادار تھے، ملا صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ یہ تمام قبائل اطالوی اور برطانوی بندرگاہوں پر تجارت کرنے میں آزاد تھے۔ تجارت کی بدولت ان کی دنیاوی حالت میں تبدیلی ہونے لگی اور وہ نسبتاً خوشحال نظر آنے لگے، برطانیہ کے کان پھر کھڑے ہوئے۔ وہ ملا صاحب اور ان کے قبائل کا در پردہ سخت دشمن تھا، اور پچھلی لڑائیوں کے انتقام کی آگ اس کے دل میں سلگ رہی تھی، وہ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتے کب دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں اس نے پھر ملا صاحب سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ پہلے تو ان کے چند ساتھی بلا وجہ گرفتار کر لیے، پھر ان کی ایک تجارتی کشتی گرفتار کر لی۔ ملا صاحب کو برطانیہ کی اس عہد شکنی سے سخت غصہ آیا۔ تاہم انہوں نے پہلے تو برطانوی کمشنر کے پاس پُر امن طریق پر ان امور کے خلاف احتجاج کیا، لیکن جب فرعون مزاج کمشنر نے احتجاج کا جواب تک نہ دیا تو سومالی لینڈ کے اس مجاہد اعظم کی شمشیر خارا شگاف پھر میان سے نکل آئی۔ درویشوں کے جتھوں نے جگہ جگہ برطانوی چوکیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اب برطانیہ کی آنکھیں کھلیں، اور اس نے سومالی لینڈ کو ایک مصالحتی کمیشن روانہ کیا۔ اس کمیشن نے سومالی لینڈ پہنچتے ہی ملا صاحب کو ایک طویل خط لکھا جس میں ان سے درخواست کی کہ متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ گفت و شنید کے ذریعے کر لیا جائے۔ ملا صاحب جیسے سیدھے سادھے مرد مومن کو اس میں کیا عذر تھا، وہ جھٹ مان گئے اور اپنے نمائندے گفت و شنید کے لیے انگریزی کمیشن کے پاس بھیج دیئے، لیکن بڑی کوششوں کے باوجود یہ گفتگوئے مصالحت کامیاب نہ ہو سکی۔ اب برطانیہ نے درویشوں کے خوف سے سومالی لینڈ کی تمام برطانوی چوکیوں کو بڑی تیزی سے خالی کرنا شروع کر دیا۔ یہ ساری فوج بربرہ کی بندرگاہ میں جمع ہو گئی اور سارا اندرون سومالی لینڈ برطانوی لشکر سے خالی ہو گیا۔ برطانیہ نے اب اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کر لی۔ اس نے اپنی مشہور چال "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" پر عمل کرنے کی ٹھانی، اس نے محض ساحلی علاقے پر اپنا اقتدار قائم رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ جتنے قبائل تھے انہیں اپنا حلیف بنا لیا۔ برطانوی حکام کے اشارے سے یہ قبائل وقتاً فوقتاً ملا صاحب

کے علاقے پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ ملا صاحب اپنے گمراہ بھائیوں سے الجھنا تو نہیں چاہتے تھے، لیکن جب انہوں نے حد سے زیادہ پریشان کیا تو (۱۹۱۳ء میں) انہوں نے اپنے درویشوں کو ان کی گوشمالی کرنے کی اجازت دے دی۔ مجاہد درویشوں نے برطانیہ کے تمام حلیف قبائل کو برا کے مقام پر شکست فاش دی اور ان کے بہت سے مویشی چھین لیے۔ ان قبائل نے اب برطانیہ سے مدد مانگی۔ برطانیہ نے ایک طاقتور شتر سوار پلٹن درویشوں کے مقابلے کے لیے بھیجی۔ جانباز درویشوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد اس پلٹن کو بری طرح شکست دی۔ وہ اپنا بے شمار مال و اسباب اور لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ اس فتح سے درویشوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور انہوں نے برطانوی ہیڈ کوارٹر بربرہ تک چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ اب برطانیہ نے سومالی لینڈ پر ایک عظیم ترین عسکری یلغار کی تیاریاں شروع کر دیں، لیکن یکایک ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہو گئی، اور اس نے اپنا تمام لشکر سوائے چند حفاظتی دستوں کے سومالی لینڈ سے واپس بلا لیا۔

۶

جنگ عظیم کے بعد ــــ جنگ عظیم کے دوران میں ملا صاحب اور برطانوی فوجوں میں کوئی بڑا تصادم نہ ہوا، لیکن جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے کئی بمبار طیاروں اور دوسرے جدید ترین آلات حرب و ضرب سے مسلح ہو کر ایک زبردست لشکر کے ساتھ سومالی لینڈ کے مجاہد درویشوں پر چڑھائی کر دی۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں برطانوی طیاروں نے نہتے اور بے زمین درویشوں پر ہولناک بمباری شروع کر دی۔ ان سیدھے سادے فقیر منش لوگوں نے کبھی ہوائی جہاز کی شکل نہ دیکھی تھی، وہ اس ناگہانی افتاد سے سخت پریشان ہوئے، لیکن ہمت نہ ہاری اور اللہ کے بھروسے پر انہوں نے ہر جگہ بڑی پامردی کے ساتھ برطانوی فوجوں کا مقابلہ کیا ــــ برطانیہ جنگ عظیم میں لڑی ہوئی آزمودہ کار فوجیں استعمال کر رہا تھا، اور پھر جنگ عظیم میں جو جو خوفناک آلات حرب و ضرب ایجاد ہوئے تھے ان سب سے کام لے رہا تھا، لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود حق پرست درویش جس بے جگری کے ساتھ لڑے، اس کی

داد دشمنوں نے بھی دی۔ ان کے بیسیوں گاؤں اور قلعے برطانوی طیاروں کی بمباری سے منہدم ہو گئے اور سینکڑوں بچے، بوڑھے، عورتیں اور بیمار برطانوی استعمار کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بالآخر وہ بے سروسامان درویش حبش کے سومالی لینڈ کی طرف پسپا ہو گئے۔

مجاہد ملّا کا عزمِ جہاد —— اتنی مصیبتیں سہنے اور اتنی مہیب طاقت کا سامنا کرنے کے باوجود ملا صاحب نے اپنے پائے استقلال میں ذرہ بھر جنبش بھی نہ آنے دی —— یہ مردِ مومن صحیح معنوں میں قرنِ اول کے مسلمانوں کی یادگار تھا۔ ملا صاحب نے حبش کے سومالی لینڈ میں پہنچ کر پھر درویشوں کا تازہ دم لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔ برطانوی حکومت بھی اب باوجود اپنی بے پناہ قوت کے درویشوں کے جذبۂ جہاد سے (جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا) خم کھاتی۔ انہوں نے ملا صاحب کو امان کا پیغام بھیجا کہ اگر وہ اپنی سرگرمیاں ترک کر دیں، تو برطانوی حکومت ان سے ہرگز کسی قسم کا تعرض نہیں کرے گی لیکن سومالی لینڈ کے مجاہدِ اعظم نے اس پیغام کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا، اور بدستور اپنی فوجیں جمع کرنے میں مصروف رہے۔

غروبِ آفتاب —— لیکن تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ —— خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا، یکایک ملا صاحب پر انفلوانزا کا ایک شدید حملہ ہوا اور چند دن کی علالت کے بعد ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو یہ آفتابِ حریت ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ سومالی لینڈ کے گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی اور دشمنوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے گئے۔ اس مردِ مجاہد کی رحلت کے ساتھ ہی اس جہاد بالسیف کا خاتمہ ہو گیا، جو متواتر بیس سال سے سامراجی طاقتوں کے خلاف جاری تھا، لیکن سید محمد بن عبداللہ الحسن نے آزادی کی جو شمع روشن کی تھی وہ سومالی لینڈ کے بہادر عوام کے سینوں میں پوری آب و تاب سے فروزاں رہی اور وہ آزادی کے لیے مردانہ وار جدوجہد کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جدوجہد کو سید محمدؒ کی رحلت کے چالیس سال بعد کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ سومالی لینڈ اب سومالیہ کے نام سے ایک آزاد اسلامی ملک ہے اور عالمِ اسلام کے اتحاد کا علمبردار ہے۔

کتابیات

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں جن کتابوں سے براہِ راست یا بالواسطہ خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری
۲۔ صحیح مسلم
۳۔ موطا امام مالکؒ
۴۔ مسندِ احمد بن حنبلؒ
۵۔ مسند ابوداؤدؒ
۶۔ جامع ترمذیؒ
۷۔ مستدرکِ حاکمؒ
۸۔ المغازی ــــــ واقدیؒ
۹۔ فتوح الشام ــــــ واقدیؒ
۱۰۔ الطبقات الکبریٰ ــــــ ابن سعدؒ
۱۱۔ تاریخ الامم والملوک ــــــ طبریؒ
۱۲۔ الکامل فی التاریخ ــــــ ابن اثیرؒ
۱۳۔ السیرۃ النبویہ ــــــ ابنِ ہشامؒ
۱۴۔ اُسد الغابہ ــــــ ابن اثیرؒ
۱۵۔ البدایہ والنہایہ ــــــ حافظ ابنِ کثیرؒ
۱۶۔ فتوح البلدان ــــــ بلاذُریؒ
۱۷۔ انساب الاشراف ــــــ بلاذُریؒ
۱۸۔ تذکرۃ الحفاظ ــــــ حافظ ذہبیؒ
۱۹۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ــــــ حافظ ابن عبدالبرؒ
۲۰۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ ــــــ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ
۲۱۔ تہذیب التہذیب ــــــ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ
۲۲۔ الاخبار الطوال ــــــ ابوحنیفہ دینوَری

۲۳۔ المشاہد ——— حکیم رحمان علی خان مرحوم
۲۴۔ حیاۃ الصحابہؓ ——— مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ
۲۵۔ سیر الصحابہؓ (جلد اوّل، دوم و ہفتم)۔ شاہ معین الدین ندویؒ
۲۶۔ سیر انصار (جلد اوّل و دوم) ۔ مولانا سعید انصاری مرحوم
۲۷۔ اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ ——— حافظ مجیب اللہ ندوی
۲۸۔ تابعین ——— شاہ معین الدین احمد ندویؒ
۲۹۔ تبع تابعین ——— حافظ مجیب اللہ ندوی
۳۰۔ اصحاب بدر ——— قاضی محمد سلمان منصور پوریؒ
۳۱۔ تاریخ اسلام ——— شاہ معین الدین احمد ندویؒ
۳۲۔ تاریخ ملّت ——— قاضی زین العابدین میرٹھی
۳۳۔ دائرہ معارف اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام)۔ پنجاب یونیورسٹی (مختلف جلدیں)
۳۴۔ تاریخ صقلیہ ——— سید ریاست علی ندوی
۳۵۔ الفاروق ——— شبلی نعمانیؒ
۳۶۔ عمر فاروق اعظمؓ ——— محمد حسین ہیکل مصری
۳۷۔ البیان المغرب ——— ابن العذاریؒ
(اردو ترجمہ "تاریخ مغرب") ——— محمد جمیل الرحمٰن)
۳۸۔ المعجم فی تلخیص اخبار المغرب ——— عبدالواحد مراکشیؒ
(اردو ترجمہ خلافتِ موحدین ——— محمد نعیم الرحمٰن)
۳۹۔ تاریخ مراکش ——— کرنل اسمٰعیل بیگ
۴۰۔ سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ ——— مولانا عبدالسلام ندویؒ
۴۱۔ سلاجقہ ——— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
۴۲۔ نظام الملک طوسی ——— مولانا عبدالرزاق کانپوریؒ
۴۳۔ تاریخ بخارا ——— پروفیسر ویمبرے۔ ترجمہ عبدالمجید سالک مرحوم
۴۴۔ سوانح مولانا رومؒ ——— شبلی نعمانیؒ
۴۵۔ خالدؓ سیف اللہ ——— ابو زید شلبی
۴۶۔ حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ——— خورشید احمد فارق